تحقیقات وتاثرات

ڈاکٹر سید رضوان علی ندوی

Marfat.com

تحقیقات و تاثرات

تاریخی، دینی، تنقیدی، علمی و تاثراتی

مقالات و مضامین

DATA ENTERED
22/6/09

ڈاکٹر سید رضوان علی ندوی

الفیصل
ناشران و تاجران کتب
غزنی سٹریٹ اردو بازار لاہور

Marfat.com

297.04 Rizwan Ali Nadvi, Dr. Syed
Tehqiqat-o-Tasrat/ Dr. Syed Rizwan Ali Nadvi.- Lahore: Al-Faisal Nashran, 2014.
496p.

1. Islam - Mazameen I. Title.

ISBN 969-503-949-9

۱۲۵۹۰۲

اگست2014ء

محمد فیصل نے

زاہد بشیر پرنٹرز سے چھپوا کر شائع کی۔

قیمت:-/500روپے

AL-FAISAL NASHRAN

Ghazni Street, Urdu Bazar, Lahore. Pakistan
Phone: 042-7230777 & 042-7231387
http: www.alfaisalpublishers.com
e.mail: alfaisalpublisher@yahoo.com

Marfat.com

فہرست مضامین

مقدمہ 7

تاریخ وسیاست

بوسنیا ماضی وحال۔ایک تاریخی وسیاسی جائزہ 13

چیچنیا ماضی وحال۔تاریخ کے آئینہ میں 24

لاہور۔قدیم عربی اور فارسی مآخذ میں 41

کراچی کی تاریخی حیثیت۔ایک نیا انکشاف 66

سیاسی اقتدار اور تاریخ کا سبق 70

خلیج کی جنگ 77

صدام حسین۔کویت اور عراق 88

شخصیات وسوانح

رسول اکرم ﷺ کی زندگی کا سیاسی پہلو 105

رسول اکرم ﷺ کے جد امجد حضرت اسماعیلؑ اور آنحضرت ﷺ کے بارے
میں تورات میں وارد بشارتیں 141

طبری پر شیعیت کا الزام۔تجزیہ وتردید 145

امام شافعیؒ کی ابتدائی زندگی۔حقائق واوہام 178

سید عبداللہ شاہ غازی اور تاریخ 190

گجرات کے بزرگ شاہ دولہ اور تاریخ 197

ٹیپو سلطان شہید۔حریت وشوکت کا علمبردار 206

امام ابن تیمیہ اور سلطان محمد تغلق 213

مولانا محمد علی جوہر اور امت مسلمہ کی قیادت 225

عمران خان کی شادی اور ڈاکٹر اسرار احمد کی بدگمانی 231

Marfat.com

تجزیہ وتنقید

سیرت نبوی ﷺ پر ایک غیر معروف قدیم عربی کتاب 245
ڈاکٹر ملک غلام مرتضیٰ صاحب کی کتاب ''خطباتِ حرم'' کا تنقیدی جائزہ ... 258
نبی اکرم ﷺ کی کفالت کس نے کی؟ 278
''خلافتِ معاویہ ویزید'' پر ایک نظر 285
بعض مشاہیر مصنفین کی ایک اہم تاریخی غلطی 294
کتاب ''نفحة العرب'' ایک تنقیدی جائزہ 302
تاریخی حقائق کو مسخ نہ کریں 315
حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی قبور اور مولانا تقی عثمانی 322
سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کا قرآن کہاں ہے؟ 343
عمران خان کی شادی اور لغت کے بکھیڑے 349
اسلام کا نظام معیشت اور زکوٰۃ۔ ایک تنقیدی جائزہ 356
استنبول و اسلام بول۔ ایک تصحیح وتوضیح 361
ڈاکٹر اسرار احمد صاحب۔ مسئلہ کشمیر اور درسِ مفاہمت 366

دینی افکار

اسلام میں عورت کی حکمرانی۔ ایک تنقیدی جائزہ 383
نور محمدی ﷺ اور حدیثِ جابر رضی اللہ عنہ۔ ایک تحقیقی جائزہ 398
مغرب سے آنے والا ایک نیا سیلابِ بلا 413
خاندانی منصوبہ بندی، شریعت اور قاہرہ کانفرنس 422

ذاتیات

مصر کے ڈاکٹر طٰہٰ حسین مرحوم سے ایک ملاقات 439
دمشق سے کیمبرج تک 447
ڈاکٹر محمد حمید اللہ۔ نقوش وتاثرات 472
ماہر القادری مرحوم۔ نقوش وتاثرات 485

Marfat.com

مقدمہ

اردو زبان میں اس چیز راقم الحروف کی یہ دوسری کتاب ہے۔ میری پہلی اردو کتاب اور زیرنظر مجموعہ مقالات ومضامین کے درمیان پورے بیالیس سال کا وقفہ ہے، اور اگر پہلی کتاب کے سال تصنیف کو پیش نظر رکھا جائے تو یہ وقفہ چوالیس سال کا ہے، کیونکہ نومبر ۱۹۵۵ء میں اپنی کتاب ''تحریک اخوان المسلمین'' کا مسودہ تیار کرکے اور ایک ذمہ دار ہاتھ میں اشاعت کے لیے سپرد کرنے کے بعد میں اپنے اس سال کے دوسرے تعلیمی سفر پر بیرون ملک چلا گیا تھا۔ وہ کتاب ۱۹۵۷ء میں دارالحسنات، رام پور، انڈیا سے شائع ہوئی تھی، اور اب چالیس سال کے بعد اس کے بازیافت ہونے پر دوبارہ تصحیح واضافے کے ساتھ کراچی سے اسی سال (۱۹۹۹ء) شائع ہوئی ہے۔

لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ موجودہ اور اولین اردو کتاب کے درمیان چالیس، بیالیس سال کا جو وقفہ ہے، اس میں تصنیف وتالیف سے میرا کوئی تعلق نہیں رہا۔ تعلق تو یقیناً رہا، لیکن اس درمیان میں جو سات آٹھ کتابیں شائع ہوئیں وہ بیشتر عربی زبان میں اور ایک انگریزی میں (پاکستان کے ایک سرکاری ادارے کی طرف سے شائع شدہ) تھیں۔ وجہ اس کی یہ تھی کہ میں ۱۹۵۵ء سے ۱۹۸۷ء تک تعلیم اور پھر تدریس کے سلسلہ میں مسلسل عرب ممالک میں رہا۔ اس سے قبل ایک تعلیمی ودینی سفر حجاز ومصر کا ہو چکا تھا (اگست ۱۹۵۰ء تا فروری ۱۹۵۵ء)۔ عرب ممالک (سعودی عرب، شام، مصر، لیبیا) میں اس طویل مسافرانہ زندگی کے درمیان تین سال کا ایک وقفہ قیام انگلستان کا ہے، جب کیمبرج یونیورسٹی سے Ph.D کے لیے وہاں مقیم تھا، جہاں میں نے شام ومصر کے ایک مایہ ناز عالم اور مصلح قوم پر انگریزی میں وہ کتاب لکھی تھی جو کافی بعد میں راولپنڈی کے اسلامک ریسرچ انسٹیٹیوٹ سے چھپی (۱۹۷۷ء)۔

پہلی عربی تصنیف ''سلطان العلماء العزبن عبدالسلام'' دمشق کے دارالفکر سے ۱۹۶۰ء میں چھپی تھی، اور پھر لیبیا اور سعودی عرب کی یونیورسٹیوں میں ۲۴ سالہ تدریسی زندگی کے دوران متعدد کتابیں اور مقالات، کویت، بنغازی (لیبیا)، جدہ اور ریاض سے شائع ہوئے اور پھر

Marfat.com

حسن اتفاق کہ کراچی واپس آنے کے بعد جو تحقیقی کتاب کراچی یونیورسٹی میں ریسرچ پروفیسری (۱۹۹۰ء۔۱۹۹۳ء) یعنی چیئر پروفیسر شپ کے دوران لکھی وہ بھی عربی میں تھی، کیونکہ یہ برہان الدین چیئر عربی زبان وعلوم کے لیے ہی قائم ہوئی تھی۔

عرب ممالک میں طویل قیام کے آخری ایام میں میرے دو مضمون اخبار ''جنگ'' میں چھپے تھے، جو میں نے مرحوم میر خلیل الرحمٰن کی تحریک پر ریاض سے ان کو غالباً ۱۹۸۵ء اور ۱۹۸۶ء میں بھیجے تھے۔ میر صاحب مرحوم سے میرا تعارف ریاض میں ہوا تھا، جہاں اپنی یونیورسٹی میں کنگ عبدالعزیز آل سعود پر ایک انٹرنیشنل کانفرنس میں بطور صحافی میں نے موصوف کو بلوایا تھا۔

پہلا مضمون جو تحقیقی نوعیت کا تھا، یعنی ''کراچی کی تاریخی حیثیت۔ایک نیا انکشاف'' اس مجموعے میں نظر ثانی واضافے کے بعد شامل ہے، دوسرا مضمون ایک وقتی سیاسی نوعیت کا تھا بعنوان ''سیاست میں وراثت کے نقیب'' وہ اس مجموعے میں نہیں کہ اس کی نقل میرے پاس محفوظ نہیں رہی، اور وہ جنگ کے بہت مشہور کالم نگار ارشاد احمد حقانی صاحب کے ایک کالم کی تنقید میں تھا، جس میں موصوف نے بے نظیر بھٹو کی لندن سے پاکستان واپسی سے کچھ ہی قبل ذوالفقار علی بھٹو کی سیاسی وارث کی حیثیت سے میدان ہموار کرنے کی کوشش کی تھی۔

عرصہ دراز تک عرب ممالک و انگلستان میں رہنے کے سبب اردو سے میرا رشتہ تقریباً منقطع ہو گیا تھا۔ ۱۹۸۷ء میں واپسی سے دو تین سال قبل میں نے کبھی کبھار ریاض میں روزنامہ جنگ و تکبیر (ہفتہ وار) پڑھنا شروع کر دیئے تھے، جس سے دوبارہ اردو سے لگاؤ پیدا ہوا تھا، واپسی کے بعد اردو میں لکھنے کا پہلا موقع ہفتہ وار تکبیر میں ملا، جس میں خانوادۂ نبوت اور خلافت بنی امیہ سے متعلق میں نے ایک تحقیقی سلسلۂ مقالات لکھا، جو کراچی کے ایک مقرر وخطیب سے ایک فکری و عملی مباحثہ میں مبدّل ہو گیا تھا۔ بعد میں نام نہاد دینداروں کے ایک مجلّہ نے ان سب کو یکجا شائع کر کے پیسے کمائے، پھر بعض احباب کے تقاضے پر میں نے ان کی اشاعت کے لیے قدم اٹھایا، اور مسودہ نظر ثانی ومقدمہ کے بعد دہلی میں ایک تجارتی ادارۂ نشر واشاعت کو تین چار سال قبل سپرد کر دیا، مگر افسوس کہ وہ مقالات جو کتابی شکل میں تقریباً ۱۸۰ صفحات میں کمپوز ہو چکے تھے اور پہلی پروف ریڈنگ بھی میں نے کر دی تھی، وہ اب تک شائع نہ ہو سکے۔

Marfat.com

تکبیر میں ایک سلسلۂ مضامین کی اشاعت کے بعد میں نے ''جنگ'' اور بعض مجلات میں لکھنا شروع کیا۔ جنگ میں بھی جو کچھ لکھا وہ بیشتر علمی و تحقیقی نوعیت کا تھا۔ ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کی تنقید میں جو میرا مضمون چھپا تھا اور جو اس مجموعہ میں شامل ہے اس کے بعد جنگ کے ادارتی صفحہ کے ایڈیٹر ارشد امام صاحب میرے گھر ملنے آئے اور مجھ سے تقاضا کیا کہ میں مسلسل ''جنگ'' کے لیے لکھا کروں۔ اس کے بعد دس گیارہ مضامین شائع ہوئے، لیکن پھر صحافی اظہر سہیل کی تنقید میں جو خالص علمی موضوع پر تھی جب میرا مضمون روک لیا گیا اور ضائع کر دیا گیا تو مجھے افسوس ہوا اور میں نے جنگ میں لکھنا چھوڑ دیا۔ یہ بینظیر بھٹو کے دوسرے دور حکومت کے ابتدائی ایام کی بات ہے۔ یوں بھی جنگ کا معیار اب بہت پست ہو چکا ہے۔ اس میں اشتہاروں کی بھرمار ہوتی ہے۔

موجودہ مجموعے میں جو مقالات و مضامین شامل ہیں ان کی اشاعت کا محرک میرے بعض احباب کا تقاضا ہے۔ اس میں تقریباً وہ تمام مقالات و مضامین آ گئے ہیں جو ناچیز کے کم عمر مجلہ ''البیان'' (۱۹۹۰ء۔۱۹۹۱ء)، ترجمان القرآن (لاہور)، معارف (اعظم گڑھ۔انڈیا)، اشراق (لاہور)، فکر و نظر (اسلام آباد)، تہذیب (کراچی)، اردو ڈائجسٹ (لاہور)، ہفتہ وار زندگی (لاہور)، تکبیر (کراچی) اور روزنامہ جنگ (کراچی) وغیرہ میں ۱۹۹۰ء اور ۱۹۹۶ء کے درمیان شائع ہوتے رہے ہیں۔ بعض پر نظر ثانی کرتے وقت میں نے کافی اضافہ کیا ہے، جیسے مقالہ ''لاہور عربی و فارسی مآخذ میں'' اور ''دمشق سے کیمبرج تک''۔ ایک مقالہ ایسا ہے جو اس سے قبل کہیں نہ چھپا، وہ ہے پنجاب کے ''گجرات کے صوفی شاہ دولہ اور تاریخ''۔

اصحاب علم ملاحظہ کریں گے کہ ان میں بیشتر مقالات و مضامین تحقیقی نوعیت کے ہیں، حتیٰ کہ وہ بھی جو موقر ماہناموں کے علاوہ روزنامہ جنگ یا ہفتہ وار تکبیر و ہفتہ وار زندگی میں چھپے تھے۔ اہل علم حضرات کی طرف سے ان نگارشات کو قدر کی نگاہ سے دیکھا گیا تھا، اور میری کافی ہمت افزائی کی گئی تھی۔

اس مجموعہ مقالات و مضامین میں ملک کی بعض مشہور شخصیات کے افکار پر جو تنقید ہے، اس کا مقصد ہرگز ان کی تنقیص نہیں بلکہ میرا جذبۂ محرکہ تصحیح و توضیح تھا، اور یہ بات کسی سے مخفی نہیں کہ تنقید کے بغیر افکار کی تہذیب و تنقیح نہیں ہوتی۔

Marfat.com

اہل علم کو اس مجموعہ میں بعض نادر چیزوں کے پڑھنے کا موقع ملے گا، مثلاً مطہر بن طاہر کی کتاب ''البدء والتاریخ'' سے منقول توراۃ میں حضور ﷺ سے متعلق بشارتیں اصل عبرانی توراۃ ہے، عبرانی الفاظ میں، یا عباسی خلیفہ المتوکل (وفات ۲۴۷ھ) کے ہاتھ پر اسلام لانے والے ایک مشہور یہودی طبیب وعالم علی بن ربن الطبری کی کتاب ''الدین والدولة'' کا تعارف جس میں اس نے اسلام اور یہودیت وعیسائیت کا تقابلی مطالعہ کر کے رسول اکرم ﷺ کی نبوت کی حقانیت کو اجاگر کیا ہے۔

آخر میں اپنے عزیز دوست محمد راشد شیخ صاحب کا شکر گزار ہوں جنہوں نے ان مقالات کے کتابی شکل میں شائع کرنے کا مجھ پر برابر تقاضا کیا اور آخر میں میرے ساتھ اس سلسلہ میں بہت تعاون کیا ہے۔ میں اپنے محترم دوست حیدر جمیل رضوی صاحب کا بھی شکر گزار ہوں جنہوں نے پروف ریڈنگ میں میری کافی مدد کی۔ میں بارگاہ خداوندی میں دست بدعا ہوں کہ میری اس ناچیز کاوش کو قبول فرمائے۔

سید رضوان علی ندوی

۱۸ جمادی الاولیٰ ۱۴۲۰ھ

۳۱ راگست ۱۹۹۹ء

Marfat.com

تاریخ وسیاست

Marfat.com

Marfat.com

بوسنیا، ماضی وحال-ایک تاریخی وسیاسی جائزہ

تقریباً چار ماہ سے ہم برابر اپنے ذرائع ابلاغ (اخبارات وٹیلی ویژن وغیرہ) میں اس کشمکش اور جنگ وتباہ کاری کا حال پڑھ رہے اور سن رہے ہیں، جو مشرقی یورپ کی اس واحد مسلمان سرزمین کے خلاف سابقہ یوگوسلاویہ کی حکومت بلغراد وسربیا نے جاری کر رکھی ہے اور جس کی شدت وتباہ کاری روز بروز بڑھتی جا رہی ہے۔ جہاں تین ماہ کے عرصہ میں ۵۰ ہزار مسلمان شہید ہو چکے ہیں، اور ۱۲ لاکھ کے قریب مختلف علاقوں میں پناہ لے چکے ہیں، لیکن افسوس کہ عالمی ضمیر اب تک بلغراد کی اس بربریت اور صلیبی متعصبانہ جنگ پر خاموش ہے یا سطحی طور پر جنگ بندی اور مصالحت کی بعض کوششیں یورپین برادری کی طرف سے جاری ہیں اور امریکہ کا کردار تو اس موقع پر بہت افسوسناک اور غیر انسانی ہے، وہی امریکہ، جو اپنے آپ کو دنیا میں انسانی حقوق کا محافظ سمجھتا ہے، جو عربوں کی آپس کی مخالفت کے دوران کویت کی حمایت کے پردہ میں عراق پر چڑھ دوڑا تھا اور اس کی اینٹ سے اینٹ بجادی تھی اور آج تک کویت کی واپسی کے بعد بھی وہ اس کے درپے آزار ہے۔

یورپ وامریکہ کو چھوڑیے کہ ان کے لاشعور میں صلیبیت کا زہر گھلا ہوا ہے اور یہ کوئی قدم اپنا فائدہ دیکھے بغیر انسانی ہمدردی اور عدل وانصاف کے تقاضوں کے لیے نہیں اٹھاتے ہیں۔ خود ہمارے تمام مسلمان ملکوں کا یہ حال ہے کہ وہاں بوسنہ کے مسلمانوں پر اس ظلم وبربریت کے خلاف کوئی اجتماعی وسیاسی بیداری نہیں اور نہ پرزور احتجاج ہے اور نہ بڑے پیمانے پر کوئی امدادی مہم جاری ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ عوام تو کیا خواص بھی اس ملک میں مسلمانوں کی تاریخ واحوال سے بے خبر ہیں، عالم یہ ہے کہ ہمارے ملک کے ذرائع ابلاغ میں اس کا صحیح اسلامی نام تک نہیں لکھا جاتا۔ اخبارات وٹیلی ویژن میں برابر اس کو بوسینا وہرزگووینا لکھا اور کہا جاتا ہے، حالانکہ ترکی اور عربی تواریخ میں اس کا نام ''بوسنہ وہرسک'' ہے۔ ترکوں ہی نے یہاں اسلام کو چھ سو سال قبل

Marfat.com

روشناس کرایا اور انہوں نے ہی اس کو سیاسی طور پر اسلامی تشخص دیا۔

ابھی سال ڈیڑھ قبل کی بات ہے کہ ہم میں سے بیشتر افراد اس کے نام سے بھی واقف نہ تھے، بلکہ ہم ایک اشتراکی ملک یوگوسلاویہ کو جانتے تھے، جس کی چھ جمہوریتوں میں سے ایک چھوٹی، جمہوریہ بوسنہ وہرسک (بوسنیا وہرزگووینا) تھی۔ سوویت یونین کے آٹھ نو ماہ قبل خاتمہ کے بعد یوگوسلاویہ بھی شکست وریخت سے دوچار ہوا اور وہاں مختلف قومیتوں کی بنیاد پر تین ملک قائم ہوئے، جن میں سے ایک یہی ''بوسنہ وہرسک'' ہے اور اسی کا ایک تاریخی جائزہ پیش کرنے کی یہاں کوشش کی جارہی ہے، تاکہ مشرقی یورپ کے اس مسلمان ملک کی موجودہ مشکلات کا ہم صحیح ادراک کرسکیں اور پھر بحیثیت مسلمان قومی سطح پر اس سے تعاون کرتے ہوئے ان مشکلات کے ازالہ اور حلول میں اس کی ہر ممکنہ مدد کریں۔

قسطنطنیہ کی فتح سے کافی پہلے ۱۳۸۹ء میں جنوبی سربیا میں قوصوو (Kosovo) کے میدان میں سلطان مراد اول کی فتح اور پھر ۱۳۹۴ء میں سلطان بایزید یلدرم کی نیکوپولس کے معرکہ میں مختلف یورپی ممالک کی صلیبی اتحادی قوتوں پر فتح کے بعد سربیا ترکوں کے زیر نگین آگیا تھا، اور اس کے بعد شمال میں بوسنہ کا جنوبی حصہ بھی ان کے باج گزار تھا، لیکن ہنگری و آسٹریا کی قومی سلطنتیں برابر ترکوں کے خلاف رزم آرا تھیں۔

سلطان محمد فاتح کے عہد میں مشرقی یورپ کے اس جنوبی حصہ یا بلقان میں فتوحات کا نیا سلسلہ شروع ہوا۔ ۱۴۵۳ء میں قسطنطنیہ کی فتح (جس کی بنا پر اس کو فاتح کا لقب ملا) اور بعض دوسرے محاذوں پر کامرانی کے بعد محمد فاتح بلقان کی طرف متوجہ ہوا، ہنگری کی مسلسل ریشہ دوانیوں کے سبب، اس نے ۱۴۶۳ء میں بوسنہ کے تمام علاقہ کو فتح کر کے اس کو اپنی عظیم سلطنت کا ایک حصہ بنالیا، یہاں اس کو کسی خاص مزاحمت کا سامنا نہیں کرنا پڑا، کیونکہ بوسنہ کے عیسائی، جو ایک خاص فرقہ بوگومیل (Bogomiles) سے تعلق رکھتے تھے، ایک دوسرے فرقے یعنی رومن کیتھولک حاکم کے ظلم سے نالاں تھے، انہوں نے ہی محمد الفاتح سے اپیل کی تھی کہ وہ ان کو پوپ کے تابع اس حاکم سے نجات دلائے، اس لیے انہوں نے ترکوں کو خوش آمدید کہا۔

''بوگومیل'' فرقہ کے لوگوں کے اعتقادات عام عیسائی اعتقادات سے بہت ہی مختلف

Marfat.com

تھے، اور بقول آرنلڈ مسلمانوں کے عقائد سے بڑی حد تک مشابہہ تھے، نہ تو وہ حضرت مریم علیہا السلام کی عبادت کرتے تھے اور نہ بپتسمہ کے قائل تھے، نہ صلیب کو دینی رمز سمجھتے تھے۔ ان کے کلیسا عیسیٰ اور حضرت مریم علیہا السلام وغیرہ کی تصویروں سے خالی اور بہت سادہ تھے اور وہ ان کی یا دوسرے اپنے مقدس بزرگوں کی تصویروں اور مجسموں کے سامنے رکوع کرنے یا احتراماً جھکنے کو ایک طرح کی بت پرستی سمجھتے تھے، بلکہ ان کا عقیدہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں یہاں تک تھا کہ ان کو سولی نہیں دی گئی، بلکہ ان کی جگہ ایک اور شخص لایا گیا تھا۔ جیسا کہ قرآن کریم میں ہے، وہ شراب کو بھی بہت برا سمجھتے تھے۔ یہ وہ عقائد ہیں جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے زمانہ کے فوراً ہی بعد کئی صدی تک عیسائیوں کے ایک فرقہ آریوس میں رہے، جو بڑی تعداد میں مصر میں تھے اور موحد تھے۔

بوگومیل کے ان عقائد کی وجہ سے روما کے پوپ ان کو مرتد خیال کرتے تھے اور تقریباً سو سال سے ان کے خلاف صلیبی جنگوں کا سلسلہ جاری تھا، پندرھویں صدی میں وہاں کے رومن کیتھولک بادشاہ اسٹیفن نے ان کے خلاف سخت ظلم و جور قائم کر رکھا تھا، جس کی وجہ سے ''دعوت اسلامی'' (Preaching of Islam) کے مصنف آرنلڈ کے مطابق چالیس ہزار بوگومیل اپنا ملک چھوڑ کر پڑوسی ملکوں میں پناہ لینے پر مجبور ہو گئے اور ہزاروں طوق و سلاسل میں جکڑے ہوئے، روم پوپ کے پاس بھیج دیئے گئے تھے، انہوں نے اپنی عافیت اسی میں دیکھی کہ ترک مسلمانوں کو دعوت دیں، کیونکہ وہ اپنے مفتوحہ ممالک میں بزور شمشیر اپنا مذہب نافذ نہیں کرتے تھے اور وہاں تمام عیسائی فرقوں کو اپنے اپنے عقائد پر عمل کرنے کی اجازت تھی۔ لہٰذا سلطان محمد فاتح کو انہوں نے خوش آمدید کہا اور اسی مصنف کے بقول ایک ہفتہ کے اندر ستر شہر ترکوں کے ہاتھوں میں آ گئے۔ یہ یاد رہے کہ قسطنطنیہ کی فتح کے بعد سلطان محمد فاتح کی عیسائی باشندوں اور مذہبی رہنماؤں کے ساتھ بے مثال رواداری، رعایت اور احترام کے قصے تمام بلقان اور یورپ میں مشہور تھے، جبکہ یورپ ان دنوں بدترین مذہبی تعصب اور تنگ نظری کا شاہکار تھا (جس کا آج کل سیاسی انداز میں درپردہ اظہار ہو رہا ہے)۔

اس فتح کا نتیجہ یہ نکلا کہ بہت جلد ہی یہ سارے بوگومیل عیسائی برضا و رغبت اسلام میں داخل ہو گئے۔ (ملاحظہ ہو Preaching of Islam چھٹا باب) ترکوں نے ان کو اسلام کی

Marfat.com

طرف رغبت دلانے کے لیے وہ تمام مراعات دیں، جن کا اسلام نے حکم دیا ہے، ان کی اراضی ان کے لیے چھوڑ دی گئیں، ہر قسم کے ٹیکس سے ان کو معاف رکھا گیا وغیرہ وغیرہ۔ اسی طرح دوسرے عیسائی فرقوں، آرتھوڈکس اور رومن کیتھولک کے ساتھ بھی رواداری کا برتاؤ کیا گیا۔

یہاں ایک اہم بات قابل ذکر ہے، جس کو شاذ و نادر ہی کوئی جانتا ہوگا، وہ یہ کہ مشرقی یورپ کے اس علاقہ میں اسلام اس صورت حال سے دو ڈھائی سو سال قبل متعارف ہو چکا تھا، بلکہ غالباً اس سے بھی قبل اور سقوط بغداد اور ترکوں کی حکومت سے بھی پہلے۔ اس کا ذکر ہم کو ساتویں صدی ہجری/ تیرھویں صدی عیسوی کے مشہور عرب جغرافیہ نویس یاقوت کی کتاب معجم البلدان میں ملتا ہے، جو بہت دلچسپ اور حقیقت افروز ہے۔ وہ سن ۱۲۲۸ء میں مشرقی یورپ کے بعض مسلمانوں سے شام کے مشہور شہر حلب میں ملنے کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتا ہے:

''میں نے حلب میں باشغرد لوگوں کا ایک بڑی جماعت دیکھی، ان کے بال سنہرے اور چہرے سرخ و سفید تھے۔ یہ امام ابوحنیفہ کے مذہب کے مطابق (حنفی) فقہ کی تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ میں نے ان سے ایک آدمی سے پوچھا کہ تم کس ملک کے رہنے والے ہو اور وہاں تمہارے کیا حالات ہیں، اس نے جواباً کہا کہ ہمارا ملک قسطنطنیہ کے پرے (اس وقت تک قسطنطنیہ بیزنطی عیسائی امپائر کا پایہ تخت تھا) فرنگیوں (یورپین) کی ایک مملکت ہنکر (ہنگری) ہے۔ ہم مسلمان ہیں اور اس مملکت کی رعایا ہیں، اس ملک کے اطراف میں تقریباً تیس گاؤں ہیں، جن میں سے ہر ایک، ایک چھوٹا سا قصبہ ہے، لیکن ہنگری کا بادشاہ اس خوف سے کہ ہم اس کی اطاعت سے نکل نہ جائیں، ان قصبوں میں ہم کو فصیل بنانے کی اجازت نہیں دیتا ہے اور اس طرح ہم عیسائی ممالک کے عین وسط میں ہیں، ہمارے شمال میں ''سلاذ'' نسل کے لوگ آباد ہیں، قبلہ کی سمت (یعنی جنوب مغرب) پوپ کا ملک یعنی روم ہے اور پوپ سارے یورپین عیسائیوں کا سربراہ اور ان کے نزدیک حضرت عیسیٰ کا نائب ہے اور ہمارے مغرب میں اندلس اور جنوب و مشرق میں بیزنطینیوں کا ملک اور قسطنطنیہ اور اس کے مضافات ہیں۔ ہماری زبان فرنگی زبان ہے اور ہمارا لباس بھی فرنگیوں (یورپین) جیسا ہے، ہم ان کی فوج میں خدمات انجام دیتے ہیں، کیونکہ وہ مسلمانوں سے جنگ نہیں کرتے ہیں۔

Marfat.com

”میں (یاقوت) نے اس سے پوچھا کہ کفار کے ممالک کے بیچوں بیچ رہتے ہوئے تم کس طرح مسلمان ہوئے، اس نے جواباً کہا کہ میں نے اپنے بعض بزرگوں سے سنا ہے کہ ہمارے ملک میں بہت زیادہ پہلے ملک بلغار (دریائے وولگا کے کنارے جنوبی روس) سے سات مسلمان آئے تھے، جنہوں نے ہمارے یہاں سکونت اختیار کی۔ انہوں نے انتہائی محبت و پیار سے بتایا کہ ہم کس گمراہی میں مبتلا ہیں اور ساتھ ہی ہمیں دین اسلام کی طرف رہنمائی کی، اللہ نے ہم کو ہدایت دی، اللہ کا شکر ہے کہ اس کے بعد ہم سب مسلمان ہو گئے۔ اللہ تعالیٰ نے ایمان کے لیے ہمارے دلوں کو کھول دیا تھا، ہم اب اس ملک (شام) میں آتے ہیں اور دین کا علم حاصل کرتے ہیں اور پھر جب ہم اپنے ملک واپس جاتے ہیں، ہمارے ہم وطن ہماری بڑی عزت و احترام کرتے ہیں اور ہمیں دینی امور کا نگراں بناتے ہیں۔“

مشہور انگریز مستشرق آرنلڈ یہ اقتباس یاقوت سے نقل کرنے کے بعد لکھتا ہے کہ ”ہنگری کے باشغرد قبیلہ کے لوگوں میں ۱۳۴۰ء تک اسلام رہا“ حتیٰ کہ اس سال وہاں کے بادشاہ چارلس روبرت نے اپنی تمام رعایا کو جو عیسائی نہ تھی، مجبور کیا کہ ”یا تو وہ عیسائی بن جائیں ورنہ ہنگری چھوڑ کر چلے جائیں۔“

ہم نے یہ طویل اقتباس یہاں اس لیے نقل کیا ہے کہ یہ معلوم ہو جائے کہ بوسنہ وہرسک کے مسلمان ترکوں کی عسکری فتوحات کے نتیجہ میں مسلمان نہیں ہوئے تھے، بلکہ اسلام ان کے یہاں ترکوں کی آمد سے ڈھائی سو سال پہلے تک موجود تھا، ان کو بزور شمشیر ایک عیسائی بادشاہ نے عیسائی بنا لیا تھا اور اب ترکوں کی فتوحات کے بعد دوبارہ مسلمان ہو گئے تھے یا بالفاظ دیگر اپنے دین کی طرف واپس آ گئے تھے۔

یہاں اس بات کا ذکر دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ بحر خزر (کیسپین) کے عین شمال میں اور دریائے وولگا کے دہانہ پر جو قوم آباد تھی، اس کو قدیم زمانہ میں بلغار کہا جاتا تھا، عباسی دور میں یہاں پہلی بار اسلام کی کرنیں چمکی تھیں اور پھر یہاں کے حاکم نے عباسی خلیفہ المقتدر کے پاس ایک وفد بھیجا تھا کہ اسلام کی طرف صحیح اور مکمل رہنمائی و تعلیم کے لیے ایک وفد بھیجا جائے، تا کہ وہاں اسلام کی اشاعت ہو سکے اور بنی عباس کی دعوت عام کی جائے۔ المقتدر کی طرف سے ۳۰۹ھ/۹۲۱ء میں

Marfat.com

ایک سرکاری وفد بھیجا گیا، جس میں علماء اور تاجر وغیرہ تھے، اس وفد کے ایک ممبر ابن فضلان نے عربی زبان میں اس طویل سفر کا ذکر کیا ہے، جس میں ''بلغار'' یا ''سلاؤ'' قوم کے بارے میں ہمیں پہلی بار مستند حقائق معلوم ہوئے ہیں، یہ سفرنامہ دمشق کی عرب اکیڈمی کی طرف سے کافی پہلے چھپ چکا ہے۔ انہیں قوم بلغار میں سے، جو کہ اوائل دسویں صدی عیسوی میں مسلمان ہو چکے تھے، وہ سات آدمی ہنگری گئے تھے، جنہوں نے اپنی تبلیغ سے ہنگری اور اس کے نواح میں اسلام پھیلایا تھا اور جن کا ذکر ہنگری کے ان مسلمان طلبہ نے مشہور مورخ وادیب وجغرافیہ نویس عالم یاقوت کو ۱۲۲۸ء میں شہر حلب میں سنایا تھا، جو ترکی کے جنوب مغرب میں شام کا مشہور اور قدیمی شہر ہے۔

عثمانی ترکوں کی فتح کے بعد بوسنہ (بوسنیا) بلقان میں اسلام کا اہم مرکز بن گیا، کیونکہ وہاں کی بیشتر آبادی نے برضا ورغبت اسلام قبول کر لیا تھا، یہیں سے سولھویں صدی عیسوی کے اوائل میں بوسنہ کے شمال میں فتوحات کا سلسلہ جاری رہا۔ حتیٰ کہ ۱۵۲۲ء میں سلطان سلیمان قانونی نے بلغراد کو فتح کیا اور پھر ہنگری اور اس کے بعد سن ۱۵۳۸ء میں ویانا پر سلیمان قانونی کا پہلا حملہ ہوا اور ایک صدی بعد دوسرا حملہ، مگر ایک سپہ سالار کی کمزوری وخیانت کے سبب یہ حملہ ناکام رہا اور وسطی یورپ اسلام کی برکات سے محروم رہا جن سے بلقان یا جنوب مشرقی یورپ پانچ سو سال تک فیضیاب ہوا اور اب صرف بوسنہ دہرسک کی چاروں طرف عیسائی ممالک سے گھری ہوئی مسلم جمہوریہ وہاں اسلام کا قلعہ ہے۔

یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ ان فتوحات میں بوسنہ کے مسلمانوں نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور بوسنہ کی ترقی بھی ترکی عہد میں بہت ہوئی بلکہ موجودہ پایۂ تخت جس کو ہم سب آج کل سرائیو دیا سراجیو کے نام سے جانتے ہیں، وہ بھی ترکوں کا ہی آباد کردہ ہے، یہ ترکی لفظ ''سرائے''، محل کے معنی میں ہے، اس کے آخر میں (Vo) کا اضافہ سلادی زبان کے مطابق کر دیا گیا ہے۔ ترکی نقشوں میں اس کا نام سرائے ہی دکھایا گیا ہے۔

بوسنہ کا نام اس نہر کے نام پر ہے جو ملک کے وسط میں بہتی ہے، اس کا قدیم نام یہی تھا۔ پندرھویں صدی عیسوی کے وسط میں بوسنہ کے بادشاہ کے خلاف کونسل کے ایک ممبر نے بغاوت کی، اور اپنے آپ کو بوسنہ کے جنوبی علاقہ کا ہرسک یعنی ڈیوک یا حاکم قرار دیا اور اس بناء پر یہ چھوٹا جنوبی

Marfat.com

علاقہ ہرسکوویناؔ (یعنی علاقہ ہرسک) کہلایا جانے لگا اور ان دونوں علاقوں کا ایک مشترک نام بوسنہ وہرسک پڑ گیا۔

ترکی عہد میں جب کہ بوسنہ وہرسک سلطنت عثمانی کا ایک اہم صوبہ تھا، اس کا رقبہ موجودہ رقبہ سے بہت زیادہ تھا جیسا کہ انسائیکلوپیڈیا آف اسلام کے مقالہ نگار جورجیو نے لکھا ہے اور یہ ۱۴۶۳ء سے لے کر ۱۸۷۸ء تک سلطنت عثمانیہ کا ایک یورپین صوبہ رہا۔ ترکوں نے بوسنہ کے لوگوں سے پوری مساوات کا معاملہ رکھا، کیونکہ وہ بھی اسلام کے سچے اور وفادار خادم تھے اور اس باہمی تعلق کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ سولھویں صدی اور سترھویں صدی کے اوائل میں تقریباً ستر سال کے عرصہ میں بوسنہ کے باشندوں میں سے ۹ افراد سلطنت عثمانیہ کے صدر اعظم یعنی وزیر اعظم کے عہدہ پر فائز رہے اور یہاں کے ایک خاندان صوقولو نے اتنی عظمت و رفعت حاصل کی کہ اس خاندان کے تین فرد اس بلند ترین منصب سے سرفراز ہوئے، حقیقت یہ ہے کہ بوسنہ کے مسلمان بلقان کے علاقہ میں صدیوں اسلام کے پشتی بان رہے اور اسلام کے لیے جہاد میں ان کا بہت بڑا کردار رہا، یہاں کہ قدیم گورنروں میں غازی خسرو باشا کا نام خاص طور پر قابل ذکر ہے، جو سولھویں صدی کے اوائل میں ۱۵۰۶ء سے لے کر ۱۵۴۲ء تک دو مراحل میں ۲۸ سال تک یہاں تک والی یا گورنر رہے، ان کے زمانہ میں بوسنہ اور خاص طور پر سرایو میں بہت ترقی ہوئی، آج تک ان کی تعمیر کردہ عظیم مساجد، مدارس اور خانقاہیں موجود ہیں۔

ترکی عہد میں یہاں بڑے پیمانے پر علمی ترقی ہوئی اور دین و شریعت اور تاریخ و سیاست وغیرہ میں یہاں بڑے علماء پیدا ہوئے، بلکہ خود قسطنطنیہ میں جو بہت سے ترکی مورخ وغیرہ مشہور ہوئے، وہ نسلی طور پر بوسنہ کے تھے، یہ ترکی، فارسی، عربی اور سربی کرواتی زبانوں میں لکھتے رہے، یہاں کے ایک عالم حسن کافی نے ''نظام الاسلام'' کے نام سے سولھویں صدی کے اواخر میں عربی زبان میں ایک ایسی عظیم الشان کتاب لکھی جس کا ترجمہ مشرقی زبانوں کے علاوہ جرمن اور فرنچ میں بھی ہوا۔

بوسنہ کی اسلامی تاریخ انتہائی تابناک و درخشاں اور مشرقی یورپ میں تہذیب و تمدن، عدل وانصاف، رواداری وانسانی خدمت اور تعمیر و ترقی کی داستانوں سے پر ہے، اس کو یہاں اجمالی طور

Marfat.com

پر بھی بیان کرنا ممکن نہیں، یہاں سیکڑوں مدارس، مساجد، خانقاہیں، حمامات وغیرہ اسلامی طویل دور میں تعمیر ہوئے۔ عثمانی ترکوں نے پرچم اسلام کو یہاں پہنچایا تھا اور توحید کے پیغام کو عام کیا تھا۔ بوسنہ کے مسلمانوں نے یورپ میں ترکوں کے زوال کے بعد اس پرچم کو تھامے رکھا اور آج یوگوسلاویہ وسربیا کے متعصب وخونخوار درندے ان کو اسی کی سزا دے رہے ہیں۔

آپ نے مشہور انگریز مستشرق، لندن یونیورسٹی کے پروفیسر اور علامہ اقبال کے استاد آرنلڈ کی زبانی ان کے اسلام کی داستان سنی، مگر پھر بھی غضب ہے کہ آج یہ سربیائی ان کو ترک کہہ رہے ہیں، یہ ترک نہیں، اس سرزمین کے اصلی باشندے (Sons of the Soil) ہیں، ان کو ہر انسانی وبین الاقوامی قانون کے مطابق اس کا پورا حق ہے کہ وہ جو عقیدہ پسند کریں یا کر چکے ہیں، اس پر قائم رہیں۔ اقوام متحدہ کے مشورے وتائید کے بعد ہی انہوں نے اپنے یہاں ریفرنڈم کرایا۔

۶۸ء۶۳ فیصد کا فیصلہ سابق یوگوسلاویہ سے آزادی کے حق میں تھا، جس کے بعد اس کو اقوام متحدہ کا ایک آزاد ملک کی حیثیت سے ممبر تسلیم کرلیا گیا۔ مگر افسوس کہ اقوام متحدہ کے سیکرٹری جنرل نے امریکہ کے زیر اثر رہتے ہوئے بوسنہ کے خلاف ایک انتہائی غیر عادلانہ، غیر انسانی بلکہ ظالمانہ رویہ اختیار کئے رکھا ہے۔ کیونکہ وہ خود ایک قبطی عیسائی اور ایک یہودی بیوی کے شوہر ہیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ اقوام متحدہ کے اس ممبر ملک کی فوجی امداد کے لیے ان کے پاس فنڈ نہیں ہے، یہ ایک فریب اور عذر لنگ ہے۔

بوسنہ پر صلیبی مظالم کی ابتدا درحقیقت ترکوں کے زوال سے شروع ہوگئی تھی وہی سلطنت عثمانیہ جس کے خلاف مرحوم لبنانی مورخ ومصلح قوم امیر شکیب ارسلان کے قول کے مطابق سو صلیبی حملے مختلف ادوار میں ہوئے (حاضر العالم الاسلامی) اور یہ آج تک مختلف صورتوں میں جاری ہیں۔

عظیم تر بوسنہ شہر سنجق کے مسلمان لیڈر ڈاکٹر سلیمان اوغلیانین کا کہنا ہے کہ آج جو وہاں مسلمانوں کا کشت وخون ہو رہا ہے، یہ نیا نہیں، بلکہ اس کی ابتدا ۱۸۴۴ء میں ہوئی جب سربیا نے اپنے قومی پروگرام کا اعلان کیا تھا کہ بوسنہ وہرسک اور سنجق اور قوصوو (Kosovo) یا کوسوو کے تمام مسلمان باشندوں کو یا تو یہ ملک چھوڑنا پڑے گا یا پھر عیسائی آرتھوڈکس مذہب قبول کرنا پڑے گا"

Marfat.com

جو سربیا کا قدیم مذہب ہے اور یہ فیصلہ کروشیوں کے حق میں بھی کیا گیا تھا جو کیتھولک مذہب کے متبع ہیں، اس کی وجہ سے آج تک کروشیوں اور سربیانیوں میں یہ تاریخی دشمنی برقرار ہے اور اسی وجہ سے کروشی مسلمانوں کے حلیف ہیں۔

ہمیں یاد رکھنا چاہیے کہ تمام یورپین ملک اور خاص طور پر برطانیہ، فرانس، جرمنی اور روس اٹھارھویں اور انیسویں صدی میں تقریباً دو سو سال تک عظیم سلطنت عثمانیہ کے در پے آزار رہے، مسلسل صلیبی جنگوں سے اس کو کمزور کرتے رہے تا آنکہ ۱۸۷۷ء کو آسٹریا کے قبضہ میں دے دیا، پہلی جنگ عظیم اور آسٹرو ہنگرین امپائر کے خاتمہ کے بعد ۱۹۱۸ء میں سربیا کی آزاد مملکت میں سلوونیا، کروشیا بھی شامل تھے، دوسری عالمی جنگ کے دوران اس پر جرمنی کا قبضہ ہو گیا، ۱۹۴۵ء میں اتحادیوں کی فتح کے بعد یہ سارا علاقہ ایک نئی مملکت یوگوسلاویہ کے نام سے ٹیٹو کی قیادت میں ظہور پذیر ہوا، جس میں چھ جمہوریتیں تھی، ان ہی میں سے ایک بوسنہ و ہرسک کی جمہوریہ تھی۔ ۱۸۷۸ء کے معاہدۂ برلن کے بعد سے جو نقصان اس قدیم مسلم علاقہ کو ہوا وہ یہ کہ اس کی انفرادیت کم ہوتی چلی گئی، تا آنکہ مسلمانان عالم یہ بھول ہی گئے کہ پانچ سو سال تک یہاں ایک مسلم اکثریت کا علاقہ رہا ہے، لوگوں کو صرف یوگوسلاویہ یاد رہا، اب جبکہ یوگوسلاویہ کا وجود ختم ہوا اور سلووینیا اور کروشیا کی آزاد مملکتیں قائم ہوئیں تو بوسنہ و ہرسک کے مسلمانوں کا بھی حق تھا کہ وہ اپنی آزاد مملکت قائم کریں جو بالفعل جمہوری طریقہ سے ایک ریفرنڈم کے بعد قائم ہوئی، لیکن بلغراد کی سربیائی حکومت اس کو تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں ہے۔

اور اب تو آخر میں ان کی ڈھٹائی اور سینہ زوری کا یہ عالم ہے کہ وہ یہ کہہ رہے ہیں کہ وہ بوسنہ و ہرسک کے مسلمانوں کا کشت و خون یا ان کو وہاں سے نکلنے پر اس لیے مجبور کر رہے ہیں کہ وہ یورپ کو اسلام سے محفوظ رکھ سکیں!!!

مصدقہ اطلاعات کے مطابق، بلغراد میں ۲۰۰ مساجد کو ڈھایا جا چکا ہے اور ۱۰۰ سے زائد ائمہ مساجد کو قتل کیا جا چکا ہے اور بوسنہ میں تو خاص طور پر متدین خاندانوں، مساجد اور دین کے طلباء وائمہ مساجد کو نشانہ ظلم و بربریت بنایا گیا ہے۔ یہ ظلم و بربریت نیا نہیں، اس صدی کے چوتھے عشرے میں بھی اسی طرح کے وحشیانہ مظالم ہو چکے ہیں جب کہ ان متعصب سربیانیوں نے

Marfat.com

مسلمانوں کے پورے پورے گاؤں جلا دیئے تھے۔ مسلمان عورتوں، مردوں اور بچوں کی ہزاروں لاشوں سے دریائے میلونیا اور دریائے درینا بھر گئے تھے اور آخر الذکر نہر کے پل ''قوارچہ'' پر ڈاکٹر سلیمان اوغلیانین کے مطابق چھ ہزار مسلمانوں کو ذبح کر کے ان کی لاشیں نہر میں پھینک دی گئی تھیں، انہی بوسنین ڈاکٹر صاحب کا کہنا ہے کہ ہم کو یہ چنگیزی مظالم اسلام کے راستہ سے ہٹا نہیں سکے اور ان شاء اللہ اب جو کچھ ہو رہا ہے وہ بھی برداشت کریں گے لیکن اسلام نہیں چھوڑیں گے۔

بوسنہ کے مشیخۃ اسلامیہ (مذہبی امور) کے پریزیڈنٹ شیخ صالح احمد صالح جولاکوفیتش نے جو ایک ماہ قبل یورپ کے دورے پر تھے، لندن میں امریکہ کے عربی مجلہ ''امل'' کو انٹرویو دیتے ہوئے کہا کہ بلغراد کی حکومت دنیا میں جھوٹا پروپیگنڈہ کرنے میں مشغول ہے کہ بوسنہ کے مسلمان یہاں کے اصلی باشندے نہیں بلکہ عثمانی ترک ہیں، جو ترکی فتح کے دوران یہاں آئے تھے، یہ سراسر جھوٹ ہے، ہم یہاں کے اصلی باشندے ہیں، ہم آسٹریا کے استعمار کے دوران مسلمان رہے اور اپنے حقوق کی حفاظت کے لیے ان سے نبرد آزما رہے، دوسری عالمی جنگ کے دوران ہم نے نازیوں کے خلاف گوریلا جنگ میں حصہ لیا، اس کے بعد کمیونسٹ عہد میں ہم پر برابر ظلم و تعدی ہوتا رہا، ہم نے اس کو بھی برداشت کیا اور اسلام پر قائم رہے اور آئندہ بھی قائم رہیں گے، انہوں نے بتایا کہ اس زمانہ میں ہماری ساری مساجد اور مدارس بند نہیں کیئے گئے تھے، ہمیں اس کا اعتراف ہے۔

شیخ صالح نے بتایا کہ سربین ہمیں صرف ہمارے اسلام کی وجہ سے کشت و خون اور وحشی بربریت کا نشانہ بنا رہے ہیں، ساتھ ہی ساتھ وہ نسل پرست بھی ہیں، لیکن ان کی یہ مذہبی اور نسلی عداوت ناکام رہے گی، کیونکہ مسلمانوں میں سے تیس لاکھ بوسنہ و ہرسک میں اور باقی ۳۰ لاکھ کوسوو، مقدونیہ، سلووینا اور جبل اسود (مونٹی نیگرو) میں موجود ہیں۔

یہاں اس حقیقت کا اظہار بھی ضروری ہے کہ بلغراد کی حکومت نے اپنی شکست و ریخت کے بعد پہلے سلووینا کو بزور شمشیر اپنے ساتھ رکھنا چاہا، لیکن آسٹریا کی حمایت کی وجہ سے جلد ہی ان کو اپنے اس ارادے سے باز آنا پڑا، پھر انہوں نے کروشیا کے خلاف جنگ شروع کی، لیکن وہاں جرمنی آڑے آیا کہ کروشیا کے عیسائی کیتھولک مذہب کے ہیں، یہاں بھی وہ اپنے عزائم میں ناکام رہے تو انہوں نے بوسنہ و ہرسک کو آتش و آہن کے ذریعہ اپنے زیر نگیں رکھنا چاہا اور پوری بربریت

۱۲۵۹۰۲

Marfat.com

کے ساتھ نہتے مسلمانوں کی خونریزی کا وہ سلسلہ شروع کیا جو اب تک جاری ہے۔

بوسنہ کے مسلمانوں کی سب سے بڑی ضرورت اس وقت بھاری تعداد میں وہاں اسلحہ پہنچانا ہے، مگر عالم یہ ہے کہ مسلمان حکومتیں اور خاص طور پر ہمارے انتہائی مالدار عرب بھائی ہتھیار تو درکنار وہاں منظم طور پر غذا اور دوائیں فراہم کرنے کے لیے تیار نہیں، ان مسلمان حکومتوں پر وہ بے حسی اور مردنی چھائی ہوئی ہے کہ الحفیظ والامان، ان حکومتوں نے اتنا تک نہیں کیا کہ فوراً بلغراد کی حکومت سے اپنے تعلقات منقطع کر لیتیں، وہاں تیل کی سپلائی بند کر دیتیں، مگر ''حمیت نام تھا جس کا گئی ''اعراب'' کے گھر سے''۔ جو کچھ مدد آ رہی ہے، غذائی صورت میں یا جو عملی احتجاجی اقدام اٹھائے جا رہے ہیں، وہ غیروں کی طرف سے یعنی یورپین برادری کی طرف سے، مصر کے عالم جلیل محمد غزالی کے الفاظ میں ''آج دنیا میں سب سے سستا خون مسلمانوں کا خون ہے۔'' اور عجیب بات یہ ہے کہ مسلمانوں ہی کو اس کا احساس نہیں ہے۔ پاکستان نے افغانستان کے لیے بہت کچھ کیا، لیکن آج بوسنہ کے مظلوم، یتیم بچے، بیوائیں، ذبح شدہ لاشیں آواز دے رہی ہیں، پاکستان کو بوسنہ کے مسلمانوں کے لیے حرکت میں آنا چاہیے، حکومت کو بھی عوام کو بھی، وہ مسلمان ہی کیا جس کے دل میں مسلمان کا درد نہ ہو، وہ ہاتھ ہی کیا جو اپنے مظلوم بھائیوں کی مدد کے لیے نہ اٹھ سکیں، ہمارا فرض ہے کہ اٹھیں اور پوری قوت کے ساتھ اٹھیں۔(۱)

۱۔ یہ مقالہ ستمبر ۱۹۹۲ میں لکھا گیا تھا اور کراچی کے ہفتہ وار مجلہ تکبیر میں شائع ہوا تھا۔ بحمداللہ بوسنیا کے مسلمانوں کی بے مثال قربانیاں بالآخر اپنا رنگ لائیں اور سن ۱۹۹۵ء میں ان کی مملکت کو امریکہ و یورپ نے تسلیم کیا اور وہاں امن قائم ہوا۔ (مصنف)

Marfat.com

چیچنیا
ماضی وحال......تاریخ کے آئینہ میں

ایک ہفتہ سے قوقاز (قفقاز) کے چھوٹے سے مسلمان ملک چیچنیا پر روسیوں کی بمباری جاری ہے، اس چھوٹی سی مسلمان مملکت کا پایہ تخت گروزنی اور اس کی امن پسند شہری آبادی اس وحشیانہ مسلسل بمباری کا نشانہ ہے جس کے بارے میں ہم اخباروں میں پڑھ رہے ہیں، ٹیلی ویژن پر اس ظالمانہ و بہیمانہ جارحیت کے آثار تباہ شدہ مکانات و عمارات اور زخمی و مردہ انسانوں کی شکل میں دیکھ رہے ہیں۔ اور اپنے مسلمان بھائیوں کی مظلومیت پر کف افسوس مل رہے اور ان کی بربادی پر کڑھ رہے ہیں۔

آخر یہ چیچن کون ہیں؟ ان کی تاریخ کیا ہے؟ ان کا کردار کیا ہے؟ اس سب کے بارے میں ہماری معلومات تقریباً صفر ہیں، ہماری صحافت میں جو چند مضامین شائع ہوئے ہیں ان سے ان سوالات کا پورا جواب نہیں ملتا، کیونکہ ان میں زیادہ تر حالیہ واقعات اور سیاسی پہلوؤں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ زیر نظر مضمون میں کوشش کی گئی ہے کہ چیچنیا کی اسلامی تاریخ اور اس کی مجاہدانہ تحریک و کردار کو کسی قدر تفصیل سے پیش کیا جائے۔

اٹھارھویں اور انیسویں صدی سے جو یورپین استعمار اسلامی ممالک پر مسلط ہوا تھا اس نے ہم کو ہماری تاریخ سے غافل کر دیا ہے۔ ہم میں سے بیشتر لوگ عام لوگ نہیں بلکہ وہ جن کو تعلیم یافتہ کہا جاتا ہے یورپ و امریکہ کی چھوٹی چھوٹی ریاستوں کے بارے میں تفصیلی علم رکھتے ہیں۔ لیکن مغرب کے ثقافتی استعمار کی وجہ سے، جو ہنوز قائم ہے، اپنے ہم مذہب مسلم ممالک کی تاریخ سے بڑی حد تک ناواقف ہیں اور مزید افسوس اس بات کا ہے کہ مسلم ممالک کی نمائندہ تنظیم او آئی سی نے بھی اس بارے میں افسوسناک غفلت سے کام لیا ہے اور عمومی سطح پر دنیا کے مختلف مسلم ممالک کی تاریخ اور ان کے روابط کو متعارف کرانے کی کوشش نہیں کی ہے۔

Marfat.com

بھلا ہو اس تازہ روسی جارحیت کا کہ اس نے کم از کم ہم کو جھنجھوڑ کر بیدار کیا اور اپنے ان دور افتادہ بھائیوں کی طرف متوجہ کیا جس طرح تین سال قبل ہم پہلی مرتبہ بوسنہ و ہرسک (بوسنیا ہرزیگووینا) کی اسلامی شخصیت سے واقف ہوئے، ورنہ اس سے قبل ہم صرف یوگوسلاویہ کو جانتے تھے اور اس سے قطعاً ناواقف تھے کہ اس یوگوسلاویہ کے اندر ایک قدیم مسلم مملکت بوسنیا بھی ہے، یہی نہیں ہم قدیم وسیع و عریض اسلامی ملک ترکستان (قدیم ماوراء النہر) کو بھی بھول چکے تھے جو اسلامی تہذیب و علوم کا ایک بڑا مرکز رہا ہے اور ستر سالہ روسی تسلط کی وجہ سے ہم اس کو سوویت روس کا ایک حصہ سمجھتے تھے، لیکن بھلا ہو جہاد افغانستان اور افغانیوں کی قربانی کا جنھوں نے سوویت یونین کو شکست و ریخت سے دوچار کیا اور اسی کے نتیجے میں مسلم ترکستان کو حیات نو ملی۔ دنیا کے نقشہ میں وسطی ایشیا کی پانچ مسلمان جمہوریتیں نمایاں ہوئیں۔ بوسنیا کا اسلامی تشخص نمودار ہوا اور اب آخر میں چیچنیا کی اسلامی حیثیت ہمارے سامنے نمودار ہوئی ہے جس کے بارے میں ہم متجسس ہیں اور اس کے لیے ہمارے دل دھڑک رہے ہیں:

میری صراحی سے قطرہ قطرہ نئے حوادث ٹپک رہے ہیں
میں اپنی تسبیح روز و شب کا شمار کرتا ہوں دانہ دانہ

مغرب کے ثقافتی استعمار کی ستم ظریفی یہ ہے کہ اگرچہ ہم ان گزشتہ چند ہفتوں میں چیچنیا کی اسلامی حیثیت سے واقف ہوئے ہیں، لیکن ابھی تک ہمارے بعض صحافی اس کو روس کا ایک علاقہ سمجھ رہے ہیں جہاں مسلمانوں کی ایک آبادی ان کی جارحیت کا شکار ہوتی ہے۔ چنانچہ سب سے پہلے ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم اپنے ذہنوں کو اس بارے میں صاف کریں اور اس حقیقت سے واقف ہوں کہ جغرافیائی، نسلی، تہذیبی اور دینی، غرض کسی اعتبار سے بھی چیچنیا روس کا کوئی حصہ نہیں، نہ قوقاز کے دوسرے علاقے جن کو روس نے بزور اپنے روسی فیڈریشن کی اکائیاں بنا رکھا ہے، کسی بھی اعتبار سے اس کا کوئی جزء ہیں۔

قفقاز یا قوقاز (کاکیشیا) جس کو عربی مآخذ میں قفقاس کے نام سے یاد کیا جاتا ہے اور جس کو ایک عام آدمی کوہ قاف کے نام سے جانتا ہے، ایشیا کا حصہ ہے۔ یہاں قدیم زمانے سے جو اقوام آباد ہیں ان کا روس سے کوئی تعلق نہیں، اس انتہائی بلند پہاڑ کے جنوبی اور شمالی علاقوں میں

Marfat.com

مختلف جنگجو قبائل آباد ہیں جن کا ذکر گیارہ بارہ سال قبل لکھی ہوئی عربی جغرافیہ کی کتابوں میں موجود ہے اور ان میں قدیم ترین ماخذ خلافت عباسیہ کے ایک اہم عہدہ دار اور مصنف ابن خرداذبہ (وفات ۳۰۰ھ) کی کتاب ''المسالک والممالک'' ہے۔ انہی قبائل میں سے آوار، لاز، بلکاز، آلان، انگش، ایدیگی، چرکس (عربی شرکس) وغیرہ کے ساتھ چیچن (عربی شاشان) بھی ایک قبیلہ کا نام ہے، جس کے نام پر روس کے کمیونسٹوں نے روسی انقلاب ۱۹۱۷ء کے بعد سن ۱۹۳۴ء میں ایک داخلی طور پر خود مختار جمہوریت چیچنیا انگوشیا تشکیل دی اور اس طرح چیچنیا کا نام وجود میں آیا۔

یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ مشہور لبنانی مورخ وزعیم امیر شکیب ارسلان کے قول کے مطابق انقلاب روس سے قبل شمالی وجنوبی قوقاز کا وسیع علاقہ گرجستان (جورجیا) داغستان (عربی طاغستان) اور ملک چرکس (عربی شرکس) کے نام سے موسوم تھا لیکن روس نے جس طرح ماوراء النہر یا ترکستان میں وسطی ایشیا کے مسلمانوں کی وحدت کو پارہ پارہ کرنے کی غرض سے وہاں ازبکستان، ترکمانستان، تاجکستان وغیرہ کی پانچ جمہوریتوں کو جنم دیا، اسی طرح انہوں نے قوقاز یا قفقاسیا میں جورجیا، داغستان چیچنیا، انگوشیا، کباردیا، بلکاریا، کراچای، اویگا، اوستینیا شمالی اور استینیا جنوبی کی آٹھ خود مختار اور نیم خود مختار جمہوریتوں کو قائم کیا۔ ان میں سے گرجستان یا جورجیا و جنوبی اوستینیا کے علاوہ باقی سب چھوٹی چھوٹی جمہوریتوں میں مسلمان غالب اکثریت میں ہیں یہ قدیم سے اسلامی تہذیب کے حامل ہیں اور اگرچہ نسلی اعتبار سے ان میں قدرے اختلاف ہے لیکن ان میں ترکی لسانی اثرات نمایاں ہیں خاص طور پر مغربی قوقاز کی جمہوریتوں میں جو طویل زمانہ تک عثمانی سلطنت کا حصہ رہی ہیں۔ لہٰذا امریکی انتظامیہ کا یہ کہنا کہ چیچنیا اٹھارھویں صدی کے وسط سے روس کا ایک حصہ ہے اور اس لیے یہ حقیقتاً روس کا ایک داخلی معاملہ ہے (نیوز ویک ۲۶ دسمبر ۱۹۹۴ء) تاریخ کے ساتھ ایک مذاق اور مغربی سامراجی ذہن کی عکاسی ہے۔ دانستہ طور پر تاریخی حقائق سے منہ موڑنے کی امریکن پالیسی کی حد یہ ہے کہ امریکی حکومت نے اپنے اس بیان میں چیچنیا کے مسئلہ کو لاس اینجلس کے فسادات سے تشبیہ دی ہے، اس میں ہماری امریکہ نواز حکومت کے لیے ایک تازیانۂ عبرت ہے۔

Marfat.com

چیچنیا کی اسلامی تاریخ

چیچنیا سے متصل قوقاز کا جنوبی علاقہ یعنی موجودہ جورجیا و ارمینیہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں یعنی سن ۱۸ھ سے ۲۴ھ تک مسلمانوں کے زیر سایہ آ چکا تھا۔ یہی نہیں بلکہ چیچنیا سے مشرق میں متصل قوقاز کا وہ علاقہ جو تقریباً دو سو سال سے داغستان (یعنی کوہستان، داغ یا طاغ بہ معنی کوہ) کے نام سے یاد کیا جاتا ہے، اس کا مشہور شہر دربند (عربی میں باب الابواب) بھی دو صحابیوں حضرت سراقہ بن عمر اور حضرت سلمان بن ربیعہ الباہلی کی مشترکہ کوششوں سے اسلام کے زیر نگیں ہو گیا تھا (یہی وہ علاقہ ہے جہاں حصول تسلط میں روسی حکومت اب تک ناکام رہی ہے) اس علاقہ قوقاز کی فتح میں بعض صحابہ کرام یعنی عبدالرحمٰن بن ربیعہ، بکیر بن عبداللہ اللیثی، حبیب بن مسلمہ، حذیفہ بن اسید کا ذکر بھی عربی تواریخ میں آتا ہے۔ ان میں سے بہت سے صحابہ باب الابواب یا دربند میں مدفون ہیں، یہ قدیم شہر داغستان کے مشرقی حصہ میں، بحر خزر یا کیسپین کے کنارے آج بھی آباد ہے۔ اس کے بعد یہ علاقہ خلافت راشدہ اور پھر اموی وعباسی خلافت کے زیر نگیں رہا۔ حضرت عثمانؓ اور پھر اموی عہد میں خلیفہ اموی ہشام بن عبدالملک کے بھائی مسلمہ بن عبدالملک کے ہاتھوں سن ۱۰۵ھ میں یہاں مزید فتوحات ہوئیں۔ ہزارہا عرب خاندان یہاں آباد ہوئے، اس کے بعد سے عربی زبان یہاں عام ہو گئی، جس کے آثار روسی انقلاب تک وہاں نمایاں تھے۔ روسیوں نے اور خاص طور پر کیمونسٹوں نے وہاں جس طرح عربی اور ترکی زبانوں کو مٹانے کی کوشش کی ہے یہ ایک الگ داستان ہے۔

یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ قدیم اسلامی تواریخ جیسے بلاذری کی فتوح البلدان اور تاریخ طبری وغیرہ میں اس علاقہ کی فتوحات کا ذکر ارمینیہ کی فتوحات کے ضمن میں آتا ہے کہ ظہور اسلام کے وقت ایران کے شمال اور ترکی کے مغرب میں ارمینیہ کی وسیع عیسائی مملکت قائم تھی اور قوقاز کے کچھ پہاڑی علاقے اس کے تابع تھے اور مغربی وشمالی سمت میں کچھ علاقے بیزنطینی سلطنت کے تابع تھے، بحر کیسپین یا خزر کے مغربی ساحل پر مملکت خزر تھی اس کے علاوہ شمالی قوقاز میں چھوٹی چھوٹی قبائلی ریاستیں تھیں ان کا ذکر یہاں باعث طوالت ہوگا۔ لیکن قابل ذکر بات یہ ہے کہ ان میں سے بیشتر قبائلی ریاستیں صلح کے ذریعہ خلافت اسلامی کی باج گزار ہو گئی تھیں اور داخلی طور پر آزاد تھیں،

Marfat.com

شمالی قوقاز کے علاقہ میں قوموق (Komok) پہلا قبیلہ تھا جس نے ازخود اسلام قبول کیا۔

سن ۲۷۷ھ تک قوقاز کا یہ علاقہ عباسی خلافت کے تابع تھا، پھر اس کے بعد سن ۳۲۹ھ تک مشرقی قوقاز میں ایک مسلمان خاندان بنی ساج کی حکومت رہی، پھر بیزنطینی حکومت کے تعاون سے عیسائیوں نے گرجستان (جورجیا) پر تفلیس تک سن ۴۱۷ھ میں قبضہ کرلیا۔لیکن اس صدی میں سلجوقی سلطان الپ ارسلان نے سن ۴۶۵ء میں دوبارہ گرجستان کو اپنی اسلامی حکومت کے تابع کرلیا۔پھر منگولوں یا تاتاریوں کی تاخت وتاراج کے زمانہ میں قوقاز کا جنوبی علاقہ تاتاریوں کی مسلمان ایرانی سلطنت ایل خانیوں کے تابع ہوگیا جبکہ شمالی قوقاز مسلمان تاتاریوں کی دوسری شاخ یعنی طلائی قبیلہ (Golden Horde) کا باج گزار تھا کیونکہ جنوبی روس اور یوکرائن میں ان کی حکومت قائم تھی جن کا پایہ تخت دریائے وولگا کے کنارے سرائے کا شہر تھا اس وقت موسکو کی چھوٹی سی ریاست، سرائے میں قائم استراخان کی اس عظیم مسلمان حکومت کو سالانہ خراج ادا کرتی تھی اوراس کے رحم وکرم پر قائم تھی اس کے بعد چودھویں صدی عیسوی میں یہ علاقہ تیمور لنگ کے زیراثر آیا جس کا موسکو پر حملہ مشہور ہے،اس کے بعد یہ علاقہ ترکمانی سلطنت کے بانی اوزون حسن کے زیرتسلط رہا جس نے تیمورلنگ کی وفات کے بعد مغربی وسطی ایشیا میں اپنی طاقتور حکومت قائم کی تھی اور جو ترکی کے سلطان محمد الفاتح کا معاصر تھا، پھر اس کے وارثوں کے عہد میں سلطنت کی کمزوری کے سبب قفقاز کا مغربی علاقہ کچھ تو کریمیا کے مسلمان خانوں کے زیراثر رہا اور کچھ ترکی حدود سے متصل سلطنت عثمانیہ کا تابع ہوگیا۔

اس طرح قوقاز کے وسیع علاقہ میں عربی تاتاری اور ترکی اثرات نمایاں رہے جس سے وہاں کے اصلی باشندے کافی متاثر ہوئے، خاص طور پر وہاں عربی اور ترکی اسلامی ثقافت کا گہرا اثر رہا۔مشرقی قوقاز یعنی داغستان میں کمیونسٹوں کے تسلط سے قبل تک عربی وفارسی بولی اور سمجھی جاتی تھی جب کہ مغربی قوقاز میں ترکی زبان دوسری ملکی زبان تھی۔

سولھویں صدی کے اواخر میں روس کی بڑھتی ہوئی طاقت نے بحرکیسپین کے شمال میں استراخان کی اسلامی سلطنت پر قبضہ کرنے کے بعد شمالی قوقاز میں مداخلت شروع کی، سترھویں صدی کا نصف اول روس کی شمالی قوقاز میں پیش قدمی کا زمانہ ہے لیکن لوکل حکمرانوں اور ترکی وایران کے

Marfat.com

دباؤ کے باعث ان کو اس میں کوئی خاص کامیابی حاصل نہیں ہوسکی بلکہ ان کو بار بار پسپائی کا سامنا کرنا پڑا یہاں تک کہ زار روس پیٹر اعظم (۱۶۸۶ء تا ۱۷۲۵ء) کے زمانہ میں روسیوں نے ایک لاکھ فوج سے شمالی قوقاز پر حملہ کیا۔ یہ زمانہ ایران اور ترکی عثمانی سلطنت کے انحطاط کا تھا۔ زبردست روسی افواج نے ۱۷۲۲ء میں داغستان کے پایہ تخت دربند اور اس کے بعد باکو پر قبضہ کرلیا لیکن وہ ان مقبوضات کو زیادہ دن تک اپنے ہاتھوں میں نہ رکھ سکے کیونکہ نادر شاہ درانی کی دھمکی پر ۱۷۳۵ء میں ان کو اپنے ان مقبوضات سے دستبردار ہونا پڑا اور روس نے ۱۷۳۹ء میں معاہدہ بلغراد کے تحت شمالی قوقاز کی آزادی کو تسلیم کرلیا۔ اب بھی عثمانی سلطنت میں اتنا دم خم تھا کہ اس نے روس کی شمالی قوقاز میں پیش قدمی کو روکتے ہوئے کریمیا کے بحیرۂ ازوف اور بحر اسود میں روسی بحریہ کے داخلے کو ممنوع قرار دیا۔

لیکن سن ۱۷۷۴ء کا ترکی و روس کا معاہدہ کوچک کینارجی ایک نقطۂ انعطاف (Turning point) تھا۔ سلطنت عثمانیہ جس پر یورپی طاقتوں کا مغرب و مشرق دونوں طرف سے سخت دباؤ تھا۔ جو تین سو سال سے ان یورپی طاقتوں سے مقابلہ کرتے کرتے تھک گئی تھی اس نے مجبور ہو کر اس معاہدے کے تحت کریمیا پر اپنے قبضہ سے دستبرداری کرتے ہوئے اس کو ایک آزاد مملکت تسلیم کرلیا تھا۔ اس طرح کریمیا اور اس کے ساتھ شمالی قوقاز دونوں ہی اب بڑھتی ہوئی روسی طاقت کے رحم و کرم پر تھے جس نے مختلف حیلوں کے ذریعہ صرف دس سال بعد ہی سن ۱۷۸۳ء میں کریمیا پر قبضہ کرلیا اور چونکہ شمالی قفقاز کریمیا کی جنوبی حدود میں آتا تھا۔ اس لیے روس نے قانونی طور پر قفقاز میں مداخلت کا دعویٰ شروع کر دیا اور بالفعل یہ مداخلت انتہائی سفاکانہ طور پر شروع بھی کردی اسی دوران یعنی ۱۷۷۷ء میں شمالی قفقاز میں کئی ہزار طوغانی قبائل کا قتل کرایا۔ یہ وہ انداز سیاست اور توسیع پسندی تھی جس کا اولین مظاہرہ ایوان دہشت پسند (Invan the Terror) زار روس کے عہد میں استراخان پر قبضہ کے دوران ہوا تھا اور جس پر بعد کے تمام زار اور پھر کمیونسٹ حکمران خاص طور پر اسٹالن کاربند رہا اور جس کا اعادہ اب بورس یا لسن نے چیچن کی امن پسند ریاست پر وحشیانہ بمباری کر کے کیا ہے۔

بہر حال روس کی اس نئی سامراجی پالیسی اور عسکری قوت کے مظاہرے نے جہاں قفقاز کے

Marfat.com

باشندوں میں بحیرہ خزر سے بحر اسود تک بے چینی پھیلا دی، وہیں ان میں روسیوں کے مقابلہ کے لیے ایک نئی تحریک جہاد کو بھی جنم دیا جس سے ہمارے یہاں کے لوگ بڑی حد تک بے خبر ہیں۔

قفقاز کی تحریک جہاد

اس تحریک جہاد کو منظم کرنے اور اس کی اولین قیادت کا سہرا چیچنیا ہی کے ایک دینی رہنما اور نقشبندی سلسلۂ تصوف کے ایک مرشد شیخ منصور کے سر ہے جن کو شمال قفقاز کے لوگوں نے ۱۷۸۵ء میں اس تحریک کا پہلا امام مقرر کیا، اگرچہ بعد میں اس تحریک جہاد کی امامت جو تحریک مریدین کے نام سے مشہور ہے داغستان کے علماء وشیوخ کے حصہ میں آئی۔ یہاں ایک اہم سوال یہ ہے کہ آخر اس دوران قفقاز کے حکمرانوں کا کیا دور تھا؟ اور وہ حکمران کون تھے؟ اس کی کچھ تفاصیل ہمیں امیر شکیب ارسلان کی مشہور و بے نظیر عربی کتاب ''حاضر العالم الاسلامی'' (چار جلدیں) سے معلوم ہوتی ہیں جو درحقیقت ایک امریکی مصنف (Lothrop Stodard) کی عالم اسلام پر ایک کتاب پر انتہائی تفصیلی اضافوں اور تصحیحات کے بعد ایک نئی کتاب ہوگئی ہے۔ اس کے مطابق شمالی قفقاز ہر دو بڑے قبیلوں قوموق اور قایتاق کے امراء کی حکومت تھی جن کے لقب علی الترتیب شامکال اور عصمی تھے جو داغستان اور دوسرے علاقوں پر سولھویں صدی سے اٹھارھویں صدی عیسوی تک حکمرانی کرتے تھے۔ ان حکمرانوں نے شروع میں روس کے قدم قفقاز میں نہیں جمنے دیئے اور ڈٹ کر ان کا مقابلہ کیا خاص طور پر شامکال حکمرانوں نے جو سترھویں صدی میں سلطنت عثمانیہ کے تابع ہو گئے تھے۔ یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ شمالی قفقاز میں چیچنیا سے ملحق صرف داغستان ہی ایک وسیع اور منظم ریاست کا علاقہ تھا اور چیچنیا اسی کا ایک حصہ تھا۔ اس کے ساتھ شمالی قفقاز کے مختلف قبائلی حکمران ایک طرف عثمانی سلطنت اور دوسری طرف حکومت ایران کے دست نگر تھے لیکن اٹھارھویں صدی کے اواخر میں جب یہ دونوں بڑی سلطنتیں کمزوری کا شکار ہوئیں تو روس کے مقابلہ میں قفقاز کی حفاظت کی ذمہ داری ان مقامی چھوٹے چھوٹے حکمرانوں پر آن پڑی۔

انیسویں صدی عیسوی کے اوائل میں ان حکمرانوں نے باہمی اتحاد کے ذریعہ روس کے مقابلہ کی کوشش کی اور روس کو کافی نقصانات کا بھی سامنا کرنا پڑا۔ لیکن بالآخر ان کی ہمت جلد ہی

Marfat.com

جواب دے گئی اور چونکہ ان کے دل جذبۂ جہاد سے معمور نہیں تھے۔ لہٰذا انہوں نے روس کی ماتحتی قبول کرلی یا بعض کو روسیوں نے فوجی افسر بنا کر موسکو بھیج دیا۔ یہی وہ وقت تھا جب وہاں کے علماء و شیوخ نے عوام میں جذبۂ جہاد کو پیدا کیا جو ان کی قیادت میں اپنے ان کم ہمت وجاہ پسند حکمرانوں اور روسیوں کے خلاف کھڑے ہو گئے شمالی قفقاز میں وہ طویل تحریک جہاد شروع ہوئی جو تقریباً سو سال تک نشیب وفراز کے مراحل میں جاری رہی۔

اس تحریک جہاد کا قابل ذکر پہلو یہ ہے کہ یہ اس نقشبندی سلسلۂ تصوف کی قیادت میں برپا ہوئی جس کا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے جہاں وسطی ایشیا اور قفقاز میں علانیہ اور پوشیدہ طور پر مسلمانوں کے دلوں میں شعلۂ اسلام کو فروزاں رکھا وہاں طلب اقتدار سے دور رہتے ہوئے مسلمانوں کی سیاسی وعسکری رہنمائی بھی کی۔ اس نقشبندی سلسلہ کی ایک برگزیدہ اور مشہور ترین ہستی ہمارے برصغیر میں مجدد الف ثانیؒ تھے جن کے فکری وقلمی جہاد اور علمی اقدامات نے اکبری الحاد و بے دینی سے برصغیر کو محفوظ کیا اور جو اسلام کی فکری وسیاسی تاریخ کا ایک روشن باب ہے۔

قفقاز میں تحریک جہاد یا تحریک مریدین کے پہلے امام شیخ منصور نے شروع میں بڑی کامیابیاں حاصل کیں۔ انہوں نے شمالی قفقاز کے وسطی علاقے (جس میں چیچنیا بھی آتا ہے) میں ولادی قوقاز کے شہر سے لے کر موزوک تک کے سارے روسی قلعے اپنے چھاپوں سے برباد کیے۔ پھر جب روس کی ملکہ کیتھرین دوئم نے ۱۷۸۷ء میں ترکی کے خلاف اعلان جنگ کیا تو انہوں نے شمالی قفقاز کے مغربی علاقے یعنی سرکیشیا کو اپنی سرگرمیوں کا مرکز بنایا اور ترکوں کے ساتھ روس کے خلاف جنگ میں حصہ لیا، جب بحر اسود کے اس علاقہ میں ترکوں کو ۱۷۸۹ء میں شکست ہوئی تو روسیوں نے شیخ کو گرفتار کر کے سینٹ پیٹرز برگ بھیج دیا اور وہیں ان کا انتقال ہوا۔

شیخ منصور کی گرفتاری اور انتقال سے یہ تحریک جہاد ختم نہیں ہوئی بلکہ اس نے مزید زور پکڑنا شروع کیا۔ ان کے بعد شمالی قفقاز کے دفاع کے لیے لوگوں نے ایک عالم دین غازی محمد کو اپنا امام مقرر کیا۔ روسیوں کی پیش قدمی، بے پناہ طاقت کے ساتھ جاری تھی وہ اٹھارھویں صدی کے آخری عشرے اور انیسویں صدی کے ابتدائی برسوں میں نہ صرف شمالی قفقاز بلکہ جنوبی ارمینیہ، گرجستان (جورجیا) بلکہ اور نیچے آذربائی جان پر قابض ہو چکے تھے، غازی محمد گوریلا جنگ میں سن ۱۸۳۲ء

Marfat.com

میں شہید ہو گئے۔ اب ان کی جگہ حمزہ بیگ امام منتخب ہوئے، دو سال تک ان کی قیادت میں شمالی قفقاز کے مجاہدین روسیوں سے لڑتے رہے اور آخر کار وہ بھی شہید ہو گئے اور پھر اس تحریک جہاد کی قیادت ایک ایسے امام کے ہاتھوں میں آئی جو نہ صرف قفقاز بلکہ عالم اسلام کا ایک عظیم اور مشہور مجاہد تھے۔ یعنی شیخ شامل اور جن کا طویل جہاد اسلامی تاریخ کا ایک روشن باب ہے۔ شیخ شامل کی شخصیت اور ان کا جہاد ایک مستقل مضمون کا طالب ہے جو یہاں ممکن نہیں۔ اتنا کہنا کافی ہے کہ آج بھی شیخ شامل کا نام شمالی قفقاز میں زندہ ہے اور چیچنیا میں روس کے خلاف موجودہ تحریک مقاومت و آزادی انہی کے جہاد کی صدائے بازگشت ہے خواہ اس کا اعلان نہ کیا جائے۔

انیسویں صدی کا نصف اول جہاں یورپ کی سامراجی قوتوں، فرانس، برطانیہ اور روس کا عالم اسلام پر سخت دباؤ اور یلغار کا زمانہ ہے وہاں یہ ان جہادی تحریکوں کا بھی زمانہ ہے جو الجزائر، ہندوستان اور شمالی قفقاز میں برپا ہوئیں، شیخ شامل، امیر عبدالقادر الجزائری کے معاصر ہیں جنہوں نے فرانس کے خلاف الجزائر میں دس سال تک جہاد کیا۔ روس کے خلاف شیخ شامل کا جہاد تقریباً ۳۵ سال تک جاری رہا وہ اگر چہ داغستان کے ایک گاؤں ''کمرہ'' کے باشندے تھے لیکن ان کی قیادت میں پورا شمالی قفقاز روس کے خلاف اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ بیسیوں معرکوں میں انہوں نے روسیوں کو شکست دی۔ ان سے تمام پہاڑی قلعے خالی کروائے بلکہ جنوبی حصے سے ان کو بالکل نکال دیا۔ دس سال کے مسلسل جہاد کے بعد ان کو سب سے بڑی فتح ۱۸۴۴ء میں حاصل ہوئی جب انہوں نے روسیوں کو شکست دے کر ہزاروں روسی فوجیوں کو قید کر لیا پانچ توپیں اور بہت سا روسی اسلحہ ان کے قبضہ میں آیا۔ دلچسپ بات یہ کہ روسیوں نے بھی اس کے بعد داغستان میں مسلمانوں کے خلاف مقدس جنگ کا اعلان کیا۔ ان کے شاعروں نے ان جنگی معرکوں کے بارے میں نظمیں لکھیں روس کی سیکڑوں گنا عظیم طاقت نے اپنا سارا زور شمالی قفقاز میں لگایا، نئی افواج کے ساتھ حملہ کیا جس کے مقابلہ میں لڑتے رہے آخر کار اسلحہ کی کم یابی اور ہزاروں مجاہدین کی شہادت کے بعد ان کو ۱۸۵۹ء میں ہتھیار ڈالنے پڑے، روسیوں نے بھی اس عظیم و شریف مجاہد کا احترام کیا عزت سے ان کو روس میں رکھا اور پھر ان کو ۱۸۷۰ء میں حج کی اجازت دی حج کے بعد وہ مدینہ منورہ میں مقیم تھے کہ فروری ۱۸۷۱ء میں انہوں نے داعی اجل کو لبیک کیا۔

Marfat.com

شیخ شامل کی وفات کے بعد بھی یہ تحریک جہاد کسی نہ کسی صورت میں وہاں جاری رہی اور یہ سلسلہ ان کے لائق فرزند شیخ کامل کی قیادت میں ۱۸۹۵ء تک جاری رہا، لیکن پھر روس نے اس علاقہ کے سابق امیروں کو کٹھ پتلی حکمرانوں کی حیثیت سے لا بٹھایا پھر ۱۸۹۷ء میں مجاہدین قفقاز نے روس و ترکی کی جنگ سے فائدہ اٹھاتے ہوئے قوموق (Komok) کے قلعہ پر قبضہ کیا۔ جو بدلتے ہوئے سیاسی و عسکری احوال کے سبب برقرار نہ رہ سکا کہ اب روسیوں نے قفقاز کو براہ راست اپنی تحویل میں لے لیا تھا۔

کمیونسٹ انقلاب اور قفقاز و چیچنیا

یہ موضوع بھی شیخ شامل کی جہاد کی طرح ایک مستقل مضمون کا متقاضی ہے۔ یہاں مختصراً اتنا ہی کہا جا سکتا ہے کہ اس انقلاب کے ساتھ ہی وسطی ایشیاء اور قفقاز کے محکوم مسلمانوں میں آزادی و اتحاد کی ایک نئی لہر دوڑ گئی تھی، بانیان انقلاب کے وعدوں کی روشنی میں ان کو یقین ہو چلا تھا کہ اب ان کو زار روس کی شہنشاہیت سے نجات ملے گی اور ان کو آزادی میسر ہو گی، فروری ۱۹۱۷ء کے پہلے اشتراکی انقلاب سے لے کر اکتوبر ۱۹۱۷ء تک قفقاز کے مسلمانوں نے مختلف بڑی کانفرنسیں منعقد کیں اور متحدہ شمالی قفقاز کے نام سے ایک مرکزی مجلس عاملہ کی تشکیل کی اور پھر نومبر میں اس مجلس عاملہ کو عارضی حکومت کا نام دے کر روس سے علیحدگی کا اعلان کر دیا۔ اب روسی کیمونسٹوں کی دورخی سیاست کا ظہور اس طرح ہوا کہ وہ روسی آبادکار جو زار روس کے زمانہ میں قفقاز میں آباد کر دیئے گئے تھے اور اب انہوں نے اشتراکیت کا لبادہ اوڑھ لیا تھا، قفقازی مسلمانوں کی اس عارضی حکومت کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے۔ جنوری ۱۹۱۸ء میں کیمونسٹوں نے شمالی قفقاز کے بعض شہروں پر قبضہ کر لیا اور "تیرک" کی علیحدہ "عوامی سوویت" کی حکومت قائم کر لی اور پھر دو ماہ بعد بھاری اسلحہ کے ساتھ شمالی قفقاز اور داغستان کے حریت پسندوں کے مرکز تیرک قلعہ (ولادی قوقاز) پر حملہ کر دیا۔ اب صورتحال یہ تھی کہ شمالی قفقاز کی روسی بستیوں پر کیمونسٹ قابض تھے، جب کہ حریت پسند مسلمانوں کی عارضی حکومت اپنے علاقوں پر قائم تھی۔

دوسری جنگ عظیم میں اتحادیوں کی فتح کے بعد انگریزوں نے قفقاز پر قبضہ کر لیا اور بعد میں یہ علاقہ اہل قفقاز کے بجائے سفید روس کے انقلابیوں کے سپرد کر دیا۔ سفید روس کی کیمونسٹ

Marfat.com

حکومت نے اب بڑے پیمانے پر فوج کشی شروع کی اور حریت پسندوں کے مراکز کی طرف پیش قدمی شروع کر دی۔ اس دوران شمالی قفقاز کی عارضی حکومت نے ترکی سے تعاون حاصل کرنے کے لیے مذاکرات شروع کر دیئے۔ ترکی کے شہر ترابزون میں منعقدہ ان مذاکرات میں گرجستان (جورجیا) ارمینیہ اور آذربائیجان کے نمائندے بھی شریک تھے۔ اگرچہ مذاکرات میں پورے قفقاز کے وفاق کی تجویز ارمینیہ اور گرجستان کی مخالفت کی وجہ سے ناکام رہی، لیکن اس کے نتیجہ میں شمالی قفقاز کے نمائندوں نے ۱۱ مئی ۱۹۱۸ء کو متحدہ جمہوریت شمالی قفقاز کا اعلان کر دیا، عبدالمجید چرئے اس کے صدر اور داغستان کے حیدر بامات اس کے وزیر خارجہ مقرر ہوئے اس کے دو ہفتہ بعد گرجستان، ارمینیہ اور آذربائیجان نے بھی روس سے اپنی آزادی کا اعلان کر دیا۔ عثمانی سلطنت نے قفقاز کی ان تمام ریاستوں کی آزادی کو قانونی طور پر تسلیم کر لیا جرمنی نے ان کی عملاً (de facto) آزادی کو تسلیم کیا۔ اس سلسلہ میں ترکی کے نمائندے امیر شکیب ارسلان کے جرمن حکومت سے مذاکرات کامیابی سے ہمکنار نہیں ہو سکے۔ آزادی کے اعلان کے ساتھ شمالی قفقاز کے وفد نے استنبول میں ترکی سے تحالف کے معاہدے پر دستخط کئے سفید روس کی کمیونسٹ حکومت نے اس آزاد حکومت کو سختی سے کچلنے کا فیصلہ کیا۔ لیکن داغستان کے حریت پسند مجاہدین نے کمیونسٹوں کے حملے پسپا کرتے ہوئے ان کے تین ڈویژن تباہ کر دیئے۔ داغستان و شمالی قفقاز کی آزاد حکومت اور کمیونسٹ روسیوں میں جنگ جاری تھی۔ انور پاشا کے بھائی نوری پاشا کی قیادت میں ایک فوج ''قفقاز اسلام اوردہ'' یعنی قفقاز کی اسلامی فوج کے نام سے تیار کی گئی جس کی کمک کے لیے ترکی سے فوج کا ایک ڈویژن قفقاز پہنچا، اس فوج نے ستمبر ۱۹۱۸ء میں باکو اور دوسرے ماہ دربند کو فتح کر کے روسیوں کو وہاں سے نکال دیا شمالی قفقاز، جمہوریت کے صدر عبدالمجید چرئے فاتحانہ دربند میں داخل ہوئے، وہاں سات ستاروں کا نئی اسلامی جمہوریت کا پرچم لہرایا گیا۔ لیکن افسوس کہ ترکی جو ان دنوں جرمنی کے ساتھ دوسری جنگ عظیم میں شامل تھا، شکست سے دوچار ہوا، ۳۰ اکتوبر کو جنگ بندی کے معاہدہ پر دستخط کرنے کے بعد وہ اپنی فوج کو قفقاز سے واپس بلانے پر مجبور ہو گیا۔ اس کے باوجود شمالی قفقاز کے حریت پسندوں نے روس کے خلاف اپنی جنگ آزادی جاری رکھی جو تقریباً تین سال تک جاری رہی پہلے دو سال سفید روسیوں کے خلاف اور اس کی

Marfat.com

پسپائی کے بعد بالشویک یا سرخ کیمونسٹوں کے خلاف دونوں نے شمالی قفقاز کے ان حریت پسندوں کی آزاد حکومت تسلیم کرنے کے وعدے کیئے، جو ایک فریب تھا۔ یہ حریت پسند اس دھوکہ میں نہیں آئے اور انہوں نے اپنی خوں ریز جنگ جاری رکھی۔ وہ انہی روسیوں کے اسلحہ پر قبضہ کرتے تھے یا پھر دست بدست تلواروں اور بندوقوں سے لڑتے تھے۔ وہاں کی عورتوں نے بھی اس جنگ آزادی میں حصہ لیا۔ اس جنگ آزادی میں داغستان کے مفتی نجم الدین غوتسو اور چیچن قبیلہ کے حاجی اوزدن کے نام نمایاں ہیں اس میں چیچن انگش قبائل نے بہادری کے بڑے جوہر دکھائے۔ ان علماء و مشائخ فوجی قائدین میں محمد البلو کانی، سید امین اور درویش محمد الاندی کے نام بھی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

سن ۱۹۲۰ء میں کیمونسٹ روسیوں کے ساتھ بڑی خونریز جنگیں ہوئی، جن میں حریت پسندوں کو بڑی کامیابیاں ہوئیں لیکن روس نے لاکھوں کی تعداد میں اپنی فوج یہاں جھونک دی۔ سن ۱۹۲۱ء میں روس کا ارمینیہ، گرجستان (جورجیا) اور آذربائیجان پر قبضہ دوبارہ قائم ہو گیا۔ اب شمالی قفقاز ہر طرف سے گھر گیا تھا۔ حریت پسندوں کے لاکھوں افراد شہید ہو گئے تھے، ان کے پاس ہتھیار تقریباً ختم ہو چکے تھے، مجبوراً سن ۱۹۲۱ء کے وسط میں ان کی یہ مسلح مدافعت ختم ہو گئی۔ ہزاروں قفقازی ترکی اور وہاں سے مصر و حجاز ہجرت کر گئے۔ روسیوں نے شمالی قفقاز کے ممتاز کمانڈروں کو مختلف طریقوں سے قتل کرا دیا اور شمالی قفقاز پر کیمونسٹ روس کا اقتدار مسلط ہو گیا۔ جو زاران روس کی شہنشاہیت کا تسلسل تھا بلکہ کینہ پروری اور دینی عداوت میں ان کے دور سے بھی بدتر تھا۔ یہ ایک تاریک رات تھی جو قفقاز کے قدیم ایشیائی مسلمانوں پر طاری ہو گئی تھی۔

روس جانتا تھا کہ وہ متحد قفقاز کو کبھی اپنے قبضہ میں نہیں رکھ سکتا، اس لیے اس نے ''پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو'' کی سیاست پر عمل کیا اور سن ۱۹۲۴ء میں شمالی قفقاز کو چھ چھوٹی چھوٹی نیم خود مختار جمہوریتوں میں تقسیم کر دیا جس کا ذکر اوپر ہوا اور اس طرح چیچنیا کا ظہور عمل میں آیا جہاں آج تاریخ پھر اپنے آپ کو دہرا رہی ہے۔

چیچنیا انگش جمہوریہ

شمالی قفقاز پر کیمونسٹ روسیوں نے قبضہ کے بعد لاکھوں کی تعداد میں روسیوں کو آباد کیا،

Marfat.com

اس کے نتیجہ میں یہاں مسلمانوں کا تناسب جو پہلے نوے فیصد تھا ۱۹۷۹ء کی مردم شماری کے مطابق گھٹ کر ۶۶ء۵ فیصد رہ گیا۔ اس کے پایۂ تخت گروزنی کی آبادی اس وقت ۴ لاکھ ہے، کمیونسٹ روس نے یہاں عربی رسم الخط ختم کر کے روسی رسم الخط جاری کیا اور وسطی ایشیا کی طرح ان پر روسی زبان مسلط کر دی، لادینیت کی منظم طریقہ پر ترویج کی گئی، صنعتوں میں روسی آباد کاروں کو بھر دیا گیا، یہ سبز و شاداب اور تیل کی دولت سے مالا مال ملک روس کے لیے سونے کی ایک چڑیا بن گیا، لیکن روس اپنے سارے جبروت اور لادینیت کے پرچار کے باوجود اس علاقے کے لوگوں کے دلوں میں جذبۂ حریت کو نہ مٹا سکا اور نہ ان کو دین اسلام کی دولت سے محروم کر سکا۔

دوسری جنگ عظیم کے دوران جب جرمنی کریمیا پر قابض ہو گیا تھا تو چیچنیا کے مسلمان باشندوں نے روس سے اپنی آزادی کی امید میں جرمنوں کے ساتھ تعاون کیا تھا۔ اس جنگ عظیم کے خاتمہ کے بعد چنگیز و ہلاکو سے زیادہ سفاک اسٹالن نے چیچنیا کی تمام مسلم آبادی کو جو کئی لاکھ نفوس پر مشتمل تھی، سائبیریا اور کازاخستان کے برفانی اور صحرائی علاقوں میں جلا وطن کر دیا جہاں وہ ۱۹۴۴ء سے ۱۹۵۷ء تک رہے۔ اسٹالن کی موت کے بعد سوویت پریسیڈیم نے خرد شچیف کے عہد میں اس فیصلے کو غلط قرار دیتے ہوئے چیچن لوگوں کو اپنے وطن واپس آنے کی اجازت دی تب کہیں یہ لوگ وطن واپس آئے۔

اسے اسلام کا معجزہ کہیے یا چیچنیا کے ان مظلوم جلا وطن مسلمانوں کی خوش نصیبی کہ ان کے لیے یہ جلا وطن اسلامی عقیدے میں اور پختگی کا سبب بن گئی، پیرس میں مقیم ایک روسی پروفیسر الیگزینڈر بینکسن نے اپنی کتاب ''روس کے مسلمان'' میں اس کی بعض تفصیلات بیان کی ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ چیچن جمہوریہ اس علاقہ قفقاز میں اسلام کا مضبوط ترین قلعہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسٹالن نے اس پر بدترین مظالم ڈھائے، وہاں کی ساری مساجد مسمار کر دیں، وہاں کی پوری مسلمان آبادی کو سائبیریا وغیرہ کے دور دراز علاقوں میں جلا وطن کر دیا لیکن اس جلا وطنی میں صوفی سلسلوں کے ذریعہ اسلام سے ان کی روحانی وابستگی اور پختہ ہو گئی۔ اس کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ ۱۹۷۸ء میں ایک اندازے کے مطابق چیچنیا کے آدھے مسلمان نقشبندی سلسلۂ تصوف سے منسلک پائے گئے یہی نہیں ان جلا وطن چیچن (شاشان) مسلمانوں کے اثر سے کازاخستان اور کرغیزیا کے

Marfat.com

مسلمانوں میں بھی قادری سلسلہ تصوف پھیلنے لگا جو اسلام میں ان کی پختگی کا سبب بنا۔ حقیقت یہ ہے کہ خود چیچنیا میں اسلام سترھویں اور اٹھارھویں صدی عیسوی میں نقشبندی اور قادری سلسلہ تصوف کے ترکی مسلمانوں کے ذریعہ پھیلا تھا۔ اب جب یہ جلاوطنی چیچن انگش باشندے جلاوطنی کی نئی سرزمین میں پہنچے تو انہوں نے وہاں وہ صوفی اخویات (Bortherhoods) قائم رکھیں جو کونتا (حجی) القادریہ کے نام سے پہلے ان کے ملک میں قائم تھیں۔ قادری ''اخویات'' نے اس سلسلہ میں کازاحستان میں بڑی سرگرمی سے کام کیا۔ جہاں ''نوراخویہ'' کے نام سے ۱۹۵۵ء میں ایک نئی صوفی یا روحانی تنظیم قائم ہوئی جس کی رہنما شیخ اویسی حجی زاغیف تھے، روسی ادب میں اس صوفی تنظیم کو (Cap Brotherhood) کا نام دیا گیا، کیونکہ وہ اللہ کے ذکر کے وقت اونی ٹوپیاں پہنتے تھے، ان کے اثر سے کازاحستان میں تصوف کا سلسلہ پھیلنے لگا اور یہ خانقاہی تصوف عوامی تنظیم بن گئی، یہاں تک کہ چیچنیا انگوشیا میں ان کی تعداد مذکورہ بالا روسی فرنچ مصنف کے بیان کے مطابق ایک لاکھ اور ایک لاکھ اسی ہزار کے مابین تھی اور یہ خوش آیند حیرت کا مقام ہے کیونکہ اس مصنف کے بقول کمیونسٹ انقلاب ۱۹۱۷ء سے پہلے چیچنیا میں ۶۰ ہزار مرید اور ۳۸ مرشد یا رہنما تھے۔ ایک قابل ذکر بات یہ ہے کہ ان کے قومیت کا تصور دینی قومیت ہے، وطنی قومیت کا وہاں کوئی تصور نہیں۔

ان چیچن باشندوں کی اپنی وطن واپسی کے بعد حکومت نے گروزنی میں ان کو صرف ایک مسجد بنانے کی اجازت دی ۱۹۸۰ء میں قریب کے گاؤں میں مساجد کھولنے کی اجازت ملی شمالی قفقاز کی اس مسلمان قوم کی معاصر تاریخ پر علامہ اقبال کا یہ شعر صادق آتا ہے:

اسلام کی فطرت میں قدرت نے لچک دی ہے
اتنا ہی یہ ابھرے گا جتنا کہ دبا دینگے

روسیوں نے ان کے یہاں اسلام کو جتنا مٹانے کی کوشش کی اتنی ہی شدت سے وہ ان کے یہاں ابھرا اور اس کے عظیم ترین مظاہر سن ۱۹۹۱ء کے بعد کے واقعات ہیں۔ اس ملک کے نام نہاد روشن خیال سیکولر طبقے کے لیے ان میں بڑا سبق ہونا چاہیے کہ چیچنیا سب سے پہلی سوویت روس جمہوریہ تھی جس نے افغانستان میں روس کی شکست وریخت کے اوائل میں ستمبر ۱۹۹۱ء میں

Marfat.com

اپنی آزادی کا اعلان کیا، پھر ماسکو ریڈیو کے مطابق سن ۱۹۹۲ء میں چیچنیا کے صدر دودائیف نے پارلیمنٹ کے اندر حکومت کے تمام نامزد وزراء اور اعلیٰ ترین عہدیداروں کے لیے ضروری قرار دیا کہ حکومت کی ذمہ داری لیتے ہوئے اس وقت جو حلف لیں وہ قرآن کریم پر ہو اور اس مضمون میں یہ الفاظ شامل کیے گئے کہ ''اگر میں اس حلف کی خلاف ورزی کروں تو مجھ پر خدا اور عوام کی پھٹکار ہو۔''

اس کے بعد صدر دودائیف نے قدم بہ قدم اپنی اس جمہوریہ کے لیے وہ سیاسی، انتظامی اور مالی اقدامات کیے جس سے ان نو آزاد ملک کو استحکام حاصل ہوا، ان اقدامات کی تفصیل کی یہاں گنجائش نہیں، دلچسپی رکھنے والے قارئین کے لیے مجلہ وسطی ایشیا انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹیڈیز (اسلام آباد) کا تازہ شمارہ کافی ہوگا۔ ہاں اتنا کہنا ضروری ہے کہ اپنی اسی مطلقاً آزاد جمہوریہ کا نام انہوں نے پارلیمنٹ کے فیصلہ سے ''اچکیر یہ'' قرار دیا اور فروری ۱۹۹۲ء میں روسی کرنسی روبل کی جگہ نئی چیچن کرنسی متعارف کرائی ایک روبل کی مالیت کی نئی کرنسی کو سوم (Som) کا نام دیا گیا اور روس روبل کے مساوی کرنسی نوٹ کا نام ''تیوم'' (Tyom) رکھا گیا، گیارہ مارچ ۱۹۹۲ء کو پارلیمنٹ کے ایک نئے قانون کے مطابق چیچن زبان کے لیے روسی رسم الخط کے بجائے لاطینی رسم الخط اختیار کیا گیا۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر ماسکو کی حکومت نے چیچنیا کے اعلان آزادی کو کس طرح برداشت کیا اور اب تین سال کے بعد بورس یالسن نے اس بات کے خلاف یہ کارروائی کیوں شروع کی ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ افغانستان میں ذلت آمیز شکست کے بعد روسی افواج میں یہ ہمت نہ تھی کہ وہ ایک ایسے علاقے میں جنگ کریں جس نے ۳۵ سال تک امام شامل کی قیادت میں زار شاہی روس کے خلاف گوریلہ جنگ لڑی تھی اور جس میں ایک اندازے کے مطابق تین لاکھ روسی فوجی کام آئے تھے، مالی طور پر انتہائی بدحال بلکہ فقیر اور سکڑی ہوئی نئی روسی حکومت کے خزانہ میں اتنی سکت نہ تھی کہ ایک نئی جنگ کے مصارف برداشت کر سکے۔

لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ روس نے خوشدلی سے چیچنیا کی آزادی کو تسلیم کر لیا تھا، یا اس کو دوبارہ اپنے قابو میں کرنے کا ارادہ چھوڑ دیا تھا۔ جب ماسکو کی حکومت امریکی مالی امداد کی وجہ

Marfat.com

سے ۹۳ء میں اپنے پاؤں پر کھڑی ہوئی اور اس کی اقتصادی حالت بہتر ہوئی تو اس نے کسی فوجی کارروائی سے قبل داخلی منافرت و بغاوت اور مالی رشوت کا طریقہ اپنایا۔ اس مقصد کے لیے اس نے حزب مخالف کے لیڈر عمر اختر خانوف کو اپنا آلۂ کار بنایا جس کے دماغ سے ابھی کمیونزم کی بو نہیں نکلی تھی، لندن کے مجلہ ''اکانومسٹ'' (۲۴ ستمبر ۹۴ء) کی رپورٹ کے مطابق ان عمر اختر خانوف کو ماسکو نے دس بلین روبل کی خطیر رقم دی تا کہ وہ اس کو صدر دوایف کی حکومت کے خلاف استعمال کریں اور اس کو غیر مستحکم کر کے ملک میں بے چینی پھیلائیں بورس یالسن نے چیچنیا کی آزاد مملکت کے خلاف اور بھی بہت سے اقتصادی حربے استعمال کیے جن میں سرفہرست تیل کی صنعت تھی جو تقریباً تمام تر روسیوں کے ہاتھ میں تھی اور روسی انجنیئروں کی واپسی کے سبب اس صنعت کو بڑا نقصان پہنچایا گیا، اسپیئر پارٹس روس سے نہ آنے کے سبب اور ماہرین کی ماسکو مراجعت کے سبب بہت سی فیکٹریاں اور کارخانے بند ہو گئے۔ ہسپتالوں میں آلات جراحی اور دوائیں جو روس سے آتی تھیں ناپید ہو گئیں وغیرہ وغیرہ، ان سب اقتصادی پابندیوں کا مقصد یہ تھا کہ بغیر کسی فوجی کارروائی کے چیچنیا دوبارہ روس کی غلامی اختیار کر لے، مگر ماسکو اپنے اس ناپاک اور غیر جمہوری مقصد میں ناکام رہا۔

حزب مخالف کے ذریعہ عوامی بہبود کے نعروں کی بنیاد پر بے چینی پھیلانے اور خانہ جنگی برپا کرنے کی کوششیں بھی ناکام ہوئیں، ٹیلی ویژن اور ریڈیو اسٹیشن پر قبضہ کی جو کوشش حزب مخالف کے افراد کی طرف سے کی گئی، اس کو ستمبر ۹۴ء میں ناکام بنا دیا گیا۔ چیچنیا کی افواج نے حزب مخالف کی مسلح ملیشیا سے جس کو ماسکو سے ہتھیار سپلائی کیے گئے تھے۔ ارگون (Argon) کا علاقہ کولا بازانوف واگزار کرا لیا اور اسی طرح انہوں نے روسی ایجنٹوں کو ایک اور شہر ٹولسٹوی یورت سے مار بھگایا۔

اپنی ان پے در پے ناکامیوں سے صدر یالسن بوکھلا گئے اور دسمبر ۹۴ء کے آخری عشرہ میں انہوں نے وہ ظالمانہ فوجی اقدام کیا ہے جو عالمی ضمیر کے لیے ایک بڑا چیلنج ہے اور جس پر امریکہ کے سوا سبھی نے ماسکو حکومت کی مذمت کی ہے۔ اب تقریباً سب کو معلوم ہو چکا ہے کہ روس اپنے تیل کی ضروریات کے لیے چیچنیا کا محتاج ہے جو بعض لوگوں کے اندازے کے مطابق قفقاز کا

Marfat.com

کویت ہے اور ایوی ایشن فیول پر بھی جہاں سے روس کی تقریباً نوے فیصد ضروریات پوری ہوتی تھیں، روس دوبارہ اس اہم دولت پر اپنا قبضہ جمانا چاہتا تھا۔ خاص طور پر اس صورتحال کے پیش نظر کہ کچھ عرصہ قبل صدر ددوائیف نے صدر بورس یالسن کے نام ایک پیغام بھیجا تھا کہ اگر فوری طور پر ان کو تیل کی واجب الاداء رقوم نہ بھیجی گئی تو وہ پیٹرو کیمیکل مصنوعات کی ترسیل روک دیں گے۔

سوال یہ ہے کہ پھر یہ کیا قوت ہے جس نے چیچنیا کو روس سے ٹکر لینے پر آمادہ کیا ہے اس کا جواب بھی نیوز ویک کے اس مضمون کی ابتداء میں ہے جو یہ ہے کہ ''درجنوں غازی'' جنہوں نے مقامی ائمہ (مساجد) کے سامنے قسم کھائی ہے، روسی حملے کے مقابلہ کے لیے تیار ہیں۔ پچیس سال کے ایک کلاشنکوف بردار خنجر بکف نوجوان نائب عیدی گوف کا کہنا ہے کہ ''اگر ہم جیئے تو خوشحال ہوں گے اور اگر مرتے ہیں تو ہم اللہ کے حضور میں ہوں گے اور خوش نصیب ہوں گے۔'' یہ ہے وہ قوت ایمانی جس کے بل بوتے پر چیچنیا کے عوام ایک بہت بڑی مغربی طاقت کا مقابلہ کر رہے ہیں:

شہادت ہے مطلوب و مقصود مومن
نہ مال غنیمت نہ کشور کشائی

Marfat.com

لاہور
قدیم عربی اور فارسی مآخذ میں

قدیم عربی اور فارسی کتابوں میں لاہور کا نام چار مختلف شکلوں میں نظر آتا ہے جو یہ ہیں لاہور، لہور، لوہور اور لوہاور۔

ان میں سے پہلا نام تو مشہور عرب مورخ البلاذری کی کتاب فتوح البلدان میں، دوسرا دنیا کے جغرافیے پر ایک فارسی کتاب حدود العالم تصنیف ۳۷۲ھ میں اور تیسرا، چوتھا بلکہ دوسرا بھی مشہور مصنف ابوریحان البیرونی کی ''کتاب الہند'' میں ذکر کیے گئے ہیں۔ بعد کے عرب اور فارسی مصنفین نے انہیں ناموں کو نقل کیا ہے، فارسی تصانیف میں تو جلد ہی یہ لاہور کے نام سے مشہور ہو گیا مگر عربی تالیفات میں دوسرے نام بھی لکھے جاتے رہے۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آیا یہ چاروں نام ایک ہی شہر کے ہیں یا مختلف شہروں کے؟ اگر مختلف شہروں کے ہیں تو ان میں سے کون سے نام کا اطلاق موجودہ شہر لاہور پر ہوتا ہے۔

اس سے پہلے کہ اس مسئلے پر بحث کی جائے۔ اس بات کی طرف اشارہ ضروری ہے کہ چوتھی صدی ہجری تک کے عرب جغرافیہ نویسوں اور سیاحوں نے اپنی کتابوں میں لاہور کا ذکر کسی صورت میں نہیں کیا ہے حالانکہ بلوچستان، سندھ اور جنوبی پنجاب کے متعدد شہروں کا ذکر ان کی کتابوں میں ملتا ہے۔ یہ جغرافیہ نویس اور سیاح جن میں سے اکثر ان علاقوں میں آئے، المسعودی، مسعر بن مہلہل، الاصطخری، ابن حوقل اور بشاری المقدسی ہیں، جن کی کتابیں بھی شائع ہو چکی ہیں اور اہل علم ان سے ناواقف نہیں۔

ان مصنفین کی خاموشی کی بظاہر وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ ان کے زمانے تک یعنی چوتھی صدی ہجری کے خاتمے اور سلطان محمود غزنوی کی فتوحات پنجاب اور ہندوستان کے مغربی سواحل تک اسلام پہنچنے سے قبل، اور بلاد السند یا اقلیم السند کے نام سے یہ حصہ عالم اسلام کا جزء

Marfat.com

تھا جو ان کی جغرافیائی تصانیف کا اصل موضوع تھا یا جہاں وہ بغرض سیاحت جاتے تھے اور چونکہ شمالی پنجاب اس وقت فتح نہیں ہوا تھا اور نہ وہاں اسلام پہنچا تھا، اس لیے انہوں نے اس کے شہروں کا ذکر نہیں کیا۔ یہ بات بھی مدنظر رہنی چاہئے کہ غزنوی فتوحات سے قبل لاہور شمالی پنجاب کا کوئی نمایاں اور اہم شہر نہیں تھا۔ بعض اہل علم کا تو یہ خیال ہے کہ لاہور غزنوی عہد میں آباد ہوا۔ ایسے لوگوں میں سلیم اللہ صاحب پروفیسر اورینٹل کالج منصورہ شامل ہیں۔ موصوف نے یہ رائے قاضی اطہر مبارکپوری مصنف کتاب ''ہندوستان میں عرب حکومتیں'' کے نام ایک خط میں ظاہر کی ہے۔

ہمیں اس رائے سے اتفاق نہیں، کیونکہ پروفیسر شورتز برگ (Schwartzberg) نے اپنے مرتب کئے ہوئے جنوبی ایشیا کے مستند تاریخی اٹلس میں ہندوشاہی عہد یعنی تیسری و چوتھی صدی ہجری مطابق نویں و دسویں عیسوی میں لہور نام کا ایک چھوٹا شہر موجودہ لاہور کی جائے وقوع پر دکھایا ہے۔ (اے ہسٹاریکل اٹلس آف ساؤتھ ایشیا شکاگو ۱۹۷۸ء، صفحہ ۳۱۔۳۲)۔

اگرچہ موصوف کے نقشوں سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ یہ لہور، ٹیکسلا، جلندھر (جالندھر)، سیالکوٹ، پرشاپور (پشاور) ادھبند (ویہند) کی طرح سیاسی، مذہبی اور ثقافتی حیثیت سے کسی نمایاں حیثیت کا حامل نہیں تھا۔ اس بات کی تائید اس حقیقت سے بھی ہوتی ہے کہ ساتویں صدی عیسوی کے ربع اول میں جب مشہور چینی سیاح ہوان تسنگ ہندوستان آیا اور پنجاب و صوبہ سرحد کے مختلف شہروں میں گیا تو ان شہروں میں لہور کا نام کہیں نہیں ملتا۔

قرین قیاس بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ آٹھویں عیسوی میں جب سرحد اور شمالی پنجاب کے علاقہ میں ہندوشاہی حکومت قائم ہوئی اور پھر دسویں صدی میں اپنے عروج کو پہنچی تو اس درمیان میں لاہور شہر آباد ہوا۔ اگرچہ غزنوی فتوحات یعنی اواخر دسویں صدی عیسوی (اواخر چوتھی صدی ہجری) تک یہ لہور، نندانہ اور نگرکوٹ کی طرح کوئی نمایاں مرکزی شہر نہ تھا اور نہ پنجاب کے بعض قدیم مذہبی شہروں کی طرح اس کا کوئی مقام تھا۔

اس طرح یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ لہور یا لاہور غزنوی عہد سے قبل موجود تھا اگرچہ

Marfat.com

اس کی کوئی نمایاں حیثیت نہ تھی اور اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ حیثیت اس کو غزنوی عہد میں حاصل ہوئی۔

اب ہم اپنے اصل موضوع کی طرف لوٹتے ہیں۔ سب سے پہلا عرب مصنف جس نے ایک شہر کا ذکر ''الاہور'' کے نام سے کیا ہے، وہ مؤرخ البلاذری ہے، وہ لکھتا ہے کہ ۴۴ھ مطابق ۶۶۴ء یعنی امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے عہد میں مہلب بن ابی صفرہ نے بنہ اور الاہور پر حملہ کیا۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ الاہور موجودہ شہر لاہور ہے یا کوئی اور مقام؟ لفظی مشابہت کی وجہ سے کچھ لوگوں نے اس کو لاہور ہی سمجھا ہے جن میں کتاب فتوح البلدان کے محقق اور مشہور عرب (شامی) اسکالر ڈاکٹر صلاح الدین المنجد اور مولانا قاضی اطہر مبارک پوری مصنف ''ہندوستان میں عرب حکومتیں'' شامل ہیں۔ ہمارے نزدیک یہ رائے سہل انگاری کا نتیجہ ہے اور کئی وجوہ سے قابل قبول نہیں۔

۱۔ سب سے پہلے تو یہ کہ اس وقت یعنی ۴۴ھ مطابق ۶۶۴ء میں لاہور کا ذکر کسی صورت میں ہندوستان کے تاریخی نقشوں میں نہیں ملتا بلکہ محمد بن قاسم کے حملہ فتح سندھ سن ۹۳ء ۹۶ھ مطابق ۷۱۱۔۷۱۳ء تک اس کا کہیں ذکر نہیں ملتا، البتہ ۷۲۴ء میں ہندوشاہی حکومت کے صوبہ سرحد و شمالی پنجاب میں قائم ہونے کے بعد اس کے زمانہ عروج یعنی نویں اور دسویں صدی عیسوی میں یہ نام پنجاب میں نظر آتا ہے، جیسا کہ اس سے قبل ذکر کیا گیا۔

۲۔ دوسری بات یہ کہ اموی خلافت کے ابتدائی دور کے اس مختصر حملے میں کسی طرح یہ ممکن نہ تھا کہ عرب حملہ آور دریائے سندھ و جہلم و چناب کو عبور کر کے اس الاہور یا لاہور تک پہنچ سکیں، کیونکہ ان کے لیے دریاؤں کو عبور کرنا کافی مشکل تھا، خاص طور پر پاکستان کے یہ بڑے دریا۔ خود محمد بن قاسم کے لیے راجہ داہر سے فیصلہ کن جنگ کے لیے دریائے سندھ کو عبور کرنا کافی مشکل ہوا تھا اور وہ بڑے تردد اور مقامی عناصر کی امداد کے بعد ہی یہ دریا پار کر کے راوڑ میں داہر کو شکست دے سکا تھا جیسا کہ مشہور کتاب ''چچ نامہ'' سے ظاہر ہوتا ہے۔

ان وجوہات کے پیش نظر پروفیسر محمد سلیم صاحب کی یہ رائے بہت دقیع اور صحیح معلوم ہوتی ہے کہ جس ''الاہور'' کا ذکر البلاذری نے کیا ہے وہ ''لوہور'' نام کا ایک گھاٹ تھا جو دریائے سندھ

Marfat.com

پر اٹک کے اوپر اور تربیلا کے پاس واقع ہے۔(ا) اس طرح یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچتی ہے کہ البلاذری کے ''الاہور'' سے موجودہ لاہور مقصود نہیں۔

البلاذری کے بعد پہلا مصنف جس نے پنجاب کے ایک شہر ''لہور'' کا ذکر کیا ہے وہ کتاب ''حدود العالم'' کا نامعلوم مصنف ہے۔ جس نے اپنی یہ کتاب ۳۷۲ھ/۹۸۲ء میں لکھی جب کہ صوبہ سرحد اور شمالی پنجاب کی ہندوشاہی حکومت اپنے عہد شباب پر تھی اور مشہور راجہ جے پال اس کا حاکم تھا۔

اگر حدود العالم کے بیان کو غور سے پڑھا جائے تو فوراً یہ بات یقین کر لینے کو جی چاہتا ہے کہ اس کے ذکر کردہ لہور سے موجودہ لاہور مراد ہے، جیسا کہ پروفیسر مینورسکی نے اس کتاب کے تشریحی نوٹس میں سمجھا ہے، مگر حقیقت یہ ہے کہ موصوف سے اس بات میں سہو ہوا ہے، کیونکہ کتاب کے مصنف نے لہور کا ذکر کرتے ہوئے یہ بھی لکھا ہے کہ اس شہر میں چلغوزہ، بادام اور ناریل کے درخت پائے جاتے ہیں۔ (حدود العالم اکا انگریزی ترجمہ ص ۸۹۔۹۰) اب یہ ایک کھلی حقیقت ہے کہ لاہور کی سرزمین ایسی نہیں کہ جہاں ان میووں کے درخت پائے جا سکیں جو انتہائی سرد اور پہاڑی علاقوں میں پائے جاتے ہیں، جیسے مری اور صوبہ سرحد کے علاقے۔ ناریل کے درختوں کا ذکر اور بھی عجیب ہے کیونکہ یہ جنوبی ایشیا کے استوائی اور مرطوب علاقوں میں پائے جاتے ہیں۔ یہ آخر الذکر بات مصنف کی ایک کھلی غلطی معلوم ہوتی ہے۔ ہم آگے چل کر دیکھیں گے کہ ان سے مقصود آزاد کشمیر سے ملحق وہ مقام ہے جس کا ذکر البیرونی نے کیا ہے۔

اس کے بعد تیسرا مصنف وہ مشہور و معروف عالم اور یگانۂ روزگار محقق ہے جس کو ہم البیرونی کے نام سے جانتے ہیں اور چوتھی صدی ہجری (دسویں صدی عیسوی) کے ہندوستان پر جس کی ''کتاب الہند'' آج بھی حرف آخر سمجھی جاتی ہے۔ یہ کتاب اس نے ہندوستان کی بالخصوص پنجاب، سندھ و صوبہ سرحد کی طویل سیاحتوں کے بعد ۴۲۱ھ میں لکھی ہے۔

ا۔ پروفیسر محمد سلیم صاحب نے مزید یہ بھی لکھا ہے کہ جے پال نے لمغان کو چھوڑ کر پہلے اسی کو اپنا دارالسلطنت بنایا تھا اور محمود غزنوی کا پہلا حملہ اسی پر ہوا تھا، نہ کہ راوی کے کنارے لاہور پر، لیکن البیرونی جس نے محمود غزنوی کے ساتھ آ کر سرحد، پنجاب اور کشمیر وغیرہ کی سیاحت کی اور اپنی کتاب الہند میں وہاں کے سیکڑوں شہروں اور قصبوں کا ذکر کیا ہے۔ اس نے اس لاہور کا کہیں ذکر نہیں کیا ہے اور نہ ہی پروفیسر شوارٹز برگ نے اپنے مذکورہ اٹلس کے انتہائی مفصل اور دقیق مختلف ادوار کے تاریخی نقشوں میں اٹک کے اوپر کہیں اس لاہور کا ذکر کیا ہے۔

Marfat.com

البیرونی نے انتہائی تفصیل کے ساتھ اپنی اس عربی کتاب "تحقیق ماللہند من مقولہ" میں بھارت و پاکستان کے بیسیوں شہروں کا ذکر کیا ہے جن میں لوہاور اور لوہور کے دو نام آتے ہیں، اس لوہور کو اس نے ایک جگہ لہور بھی لکھا ہے۔ (بحوالہ کتاب الہند، عربی، مطبوعہ حیدر آباد دکن۔ ص ۱۶۵۔۱۶۷۔۶۷۰)

البیرونی کے بیان سے واضح طور پر یہ معلوم ہوتا ہے کہ جس لوہاور کا اس نے ذکر کیا ہے اس سے موجودہ لاہور مراد ہے، کیونکہ اس نے اپنی اس کتاب کے صفحہ ۱۶۵ پر لکھا ہے کہ "یہ شہر نہر ایراوہ کے مشرقی ساحل پر آباد ہے" اور ایراوہ نہر راوی کے پرانے سنسکرت نام ایراوتی کی بگڑی ہوئی شکل ہے۔

اس کے بعد وہ قلعہ لہور کا ذکر کرتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی اس نے قلعہ راجگری کا بھی ذکر کیا ہے اور بتایا ہے کہ قلعۂ لہور کلار جک نامی پہاڑ کے مغرب میں اور کشمیر سے تقریباً ۵۶ میل جنوب میں ہے۔ ساتھ ہی یہ ذکر بھی کیا ہے کہ اس نے ان دونوں قلعوں سے مضبوط کوئی قلعہ نہیں دیکھا۔ وہ مزید لکھتا ہے کہ قلعۂ لہور سے بارہ میل دور راجوری نام کا ایک شہر ہے جہاں ہمارے تجار یعنی مسلمان تاجر اپنا سامان تجارت لاتے ہیں اور اس کے آگے نہیں جاتے۔

البیرونی کے ان بیانات سے جو امور واضح ہوتے ہیں، وہ یہ ہیں:

۱۔ لوہاور اور لہور یا لوہور دو علیحدہ مقامات تھے۔

۲۔ لوہاور دریائے راوی کے کنارے پر تھا جب کہ لہور اور لوہور کشمیر کے جنوب میں کلار جک نامی پہاڑ کے دامن میں مغرب کی سمت میں۔

۳۔ لوہور سے قریب ایک شہر راجوری تجارتی مرکز کی حیثیت سے آباد تھا، جو مسلمانوں کا آخری مرحلہ سفر تھا۔

۴۔ قلعہ لوہور کے بارے میں اس کا بیان ایک عینی شہادت ہے۔

۵۔ اس لوہور سے کشمیر کے مرکزی شہر (سری نگر) کا فاصلہ ۵۶ میل ہے۔

ان توضیحات کی روشنی میں یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچتی ہے کہ موجودہ لاہور وہ شہر ہے جو البیرونی کے زمانے یعنی پانچویں صدی ہجری / گیارھویں صدی عیسوی میں لوہاور کے نام سے

Marfat.com

مشہور تھا۔

بعد کے عرب جغرافیہ نویسوں، خاص طور پر مشہور ترین جغرافیہ نویس یاقوت الحموی نے بھی اپنی کتاب معجم البلدان میں، جو اس نے ساتویں صدی ہجری کے اوائل میں لکھی، لاہور کو لہاور کے نام سے یاد کیا ہے اور متعدد علماء کا ذکر کیا ہے جو اللہاوری کے نام سے مشہور تھے جیسے عمرو بن سعید اللہاوری، محمد بن المامون بن الرشید بن ہبتہ اللہ اللہاوری وغیرہ وغیرہ، جن میں سے بعض عرب ممالک یا خراسان وغیرہ جا کر آباد ہو گئے، مگر ایک جگہ اس نے لوہور کا نام لکھ کر یہ بیان کیا ہے کہ اس شہر کا مشہور نام لہاور ہے اور یہ ہندوستان کا ایک بڑا اور معروف شہر ہے۔ اس نے تصریح کی ہے کہ لوہور اور لہاور ایک ہی شہر کے دو نام ہیں (ملاحظہ ہو جلد پنجم مادۃ لوہور ولہاور، بیروت ایڈیشن ۱۹۷۹ء)

ہوسکتا ہے کہ یاقوت کے زمانے میں لوہور اور لہاور دونوں کا اطلاق موجودہ لاہور پر ہوتا ہو، یا محض اس مصنف نے یہ تاویل ضروری سمجھی ہو غلط یا صحیح۔ لیکن البیرونی کا بیان بہت واضح اور مفصل ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ''لہاور'' یعنی لاہور سے کافی دور شمال میں اور کشمیر کے جنوب مغرب لہور یا لوہور ایک مشہور و مضبوط قلعہ کا نام تھا اور ''راجوری'' نامی شہر کے قریب تھا۔ راجوری آج بھی انڈیا میں جموں میں پونچھ کا ایک ضلع ہے جو آزاد کشمیر میں میرپور کے عین مشرق میں ہے۔

البیرونی کے بیان کی تصدیق ان متعدد نقشوں سے بھی ہوتی ہے جو پروفیسر جے۔ ای شوارٹز برگ نے اپنے مذکورہ منفرد اٹلس میں ہندوستان کے مختلف ادوار سے متعلق بڑی دیدہ ریزی سے تیار کئے ہیں۔ وہ آٹھویں صدی عیسوی سے بارھویں صدی عیسوی تک کے مختلف تاریخی نقشوں میں لوہار کوٹ نامی ایک شہر کا ذکر کرتے ہیں جو کشمیر کے جنوب مغرب میں اسی مقام پر تھا جس کا ذکر البیرونی نے کیا ہے۔ البیرونی نے کوٹ کا ترجمہ عربی لفظ قلعہ سے کر دیا ہے۔ اس نے کتاب الہند (ص ۲۵۹) میں لکھا ہے کہ کوٹ قلعہ کو کہتے ہیں۔

پاک و ہند کے بہت سے شہروں کے ساتھ کوٹ کا لاحقہ لگا ہوا ہے، جو سنسکرت میں قلعہ کے ہم معنی ہے۔ جیسے پٹھان کوٹ، سیالکوٹ، نگرکوٹ، شہرکوٹ، چریاکوٹ وغیرہ وغیرہ۔

آخر میں اس حقیقت کا اظہار ضروری ہے کہ غزنوی عہد کی برکات کی وجہ سے لہاور تو لاہور

Marfat.com

کے نام سے پاک و ہند کے برصغیر کا ایک عظیم شہر ہو گیا، خاص طور پر جب سے غزنویوں نے ان کے ہاتھ سے غزنہ وافغانستان نکل جانے کے بعد لاہور کو اپنا دارالسلطنت بنالیا اور لوہور یا لوہار کوٹ (جو جموں میں واقع تھا) قصر گمنامی میں چلا گیا اور پھر نابود ہو گیا۔

مزید تحقیق واضافہ

یہ مضمون جو ریاض، سعودی عرب میں لکھا گیا تھا، ایک کثیرالاشاعت اور عمومی نوعیت کے ماہنامہ (اردو ڈائجسٹ) میں شائع کیا گیا تھا (جون ۱۹۸۹ء) اس عرب ملک میں بعض اہم مآخذ میرے پیش نظر نہیں تھے، اب ان مضامین کی اشاعت کے وقت میں نے جب اس پر نظر ثانی کی تو کچھ مزید تحقیق واضافہ ضروری سمجھا، امید کہ اس تازہ تحقیق کے نتائج سے اہل علم زیادہ مطمئن ہوں گے۔

سب سے پہلے تو یہ بات کہ میں آج بھی اپنی سابقہ اس تحقیق پر مطمئن ہوں کہ قدیم زمانے یعنی ابتدائی غزنوی عہد میں یا غزنویوں کی آمد سے قبل لاہور کوئی اہم شہر نہیں تھا، مگر اس وقت یہ چھوٹا شہر موجود ضرور تھا اور اس کا نام "لہور" تھا۔ جیسا کہ پروفیسر شوارٹز برگ نے اپنے مذکورۂ بالا تاریخی اٹلس کے اس نقشۂ ہندوستان میں دکھایا ہے جو تقریباً ۷۰۰ء سے لے کر ۹۷۵ء (۳۶۵ ہجری) کے زمانے سے متعلق ہے (صفحہ ۳۱) اس عہد سے قبل کے جو متعدد نقشے اس بے مثال تاریخی اٹلس میں ہیں، جو چھٹی صدی عیسوی قبل مسیح سے لے کر ۷۰۰ء تک کے زمانے پر محیط ہیں، ان میں کہیں پنجاب کے "لہور" یا جموں (کشمیر) کے "لوہر کوٹ" یا "لوہار کوٹ" کا ذکر نہیں۔ اگرچہ ان نقشوں میں جو "پورانا" (Puranic) اور موریہ وغیرہ عہود سے متعلق ہیں اور ان میں گندھارا عہد کے ٹیکسلا (Taxila) اور ویہند (موجودہ ہنڈ) وغیرہ کے علاوہ پنجاب کے شہر جلندھر (جالندھر) اور مولتھان (بعد کا مولتان / ملتان) وغیرہ موجود ہیں۔

اس سے یہ ثابت ہوا کہ پنجاب کا یہ شہر غزنویوں کی آمد سے تھوڑے ہی زمانہ قبل آباد ہو چکا تھا، اس لیے بعض لوگوں کا یہ کہنا درست نہیں کہ یہ شہر غزنویوں نے آباد کیا، ہاں یہ ضرور ہے کہ غزنویوں کے اولین عہد ہی میں اس کے صوبہ دار ملک ابوالنجم ایاز کی کوششوں سے یہ ایک اہم شہر بن گیا تھا اور اس میں نئی تعمیرات ہوئی تھیں۔

Marfat.com

البیرونی پانچویں صدی ہجری/ گیارھویں صدی عیسوی کے ابتدائی زمانہ میں سلطان محمود غزنوی کے ساتھ ہندوستان آیا تو اس نے اپنی عظیم وانتہائی اہم کتاب ''تحقیق ماللہند من مقولۃ مقبولۃ فی العقل او مرذولۃ'' یا کتاب الہند میں ہندوستان کے مختلف شہروں کے ذکر کے ضمن میں پنجاب کے شہر ''لوہاور'' اور جموں (کشمیر) کے شہر ''لوہور کوٹ'' کا ذکر ''قلعہ لہور'' کے نام سے (صفحہ ۱۶۷) اور پھر صفحہ ۲۷۰ پر ''قلعہ لوہور'' کے نام سے کیا ہے، اس سے یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ اس نے واقعی کسی قلعہ کا ذکر کیا ہے، بلکہ اس سے اس کی مراد شہر لہور/ لوہور ہے، اس نے صرف لفظ ''کوٹ'' کا عربی ترجمہ قلعہ سے کر دیا ہے، جیسا کہ آج کل بعض عرب نیویارک کا ترجمہ ''یورک الجدیدۃ'' کرتے ہیں۔ اس بات کی تائید اسی صفحہ ۲۷۰ پر اس کے اس قول سے ہوتی ہے کہ:

''میں نے قلعہ لوہور کا عرض البلد اپنے حساب سے ''لدی'' پایا۔(۱)

یہ بات اس نے پنجاب، سرحد، سندھ اور افغانستان کے مختلف شہروں کے اپنے حساب سے نکالے ہوئے عروض البلد (Latitudes) کے ضمن میں کہی ہے۔ اس کے بعد وہ ''قلعہ لوہور'' سے کشمیر کے صدر شہر (سری نگر) تک کے فاصلے کا ذکر کرتا ہے جو ۵۶ میل ہے اور یہ بھی بتایا ہے کہ اس مسافت کا کچھ حصہ پہاڑی ہے اور کچھ ہموار زمین ہے۔(۲)

علاوہ ازیں اس نے کشمیر کے پہاڑ ''کلار جک'' (پیر پنجال؟) کے ذکر کے ضمن میں اس کے مغرب میں ''قلعہ لہور/ لوہور کا ذکر کرتے ہوئے کہا ہے کہ میں نے ''قلعہ لوہور اور قلعہ راجگری سے جو کلار جک پہاڑ کے جنوب میں ہیں زیادہ محفوظ قلعے نہیں دیکھے۔(۳)

اس دوسرے بیان سے معلوم ہوا کہ اس نام سے ایک قلعہ بھی موجود تھا۔

۱۔ ابجدی حروف (ل دی) کے اعداد کے حساب سے یہ ۳۴ ڈگری ہوتا ہے۔

۲۔ کتاب الہند۔ ص ۲۷۰

۳۔ ایضاً صفحہ ۱۶۷۔ یہی وہ قلعہ ہے جس کو بعد کے مصنفین جیسے سجان رائے وغیرہ نے ''لوہ کوٹ'' لکھا ہے۔ ملاحظہ ہو اس مصنف کی خلاصۃ التواریخ اردو ترجمہ ڈاکٹر ناظر حسن زیدی (لاہور ۱۹۷۷ء) ص ۲۲۹۔ اور یہی وہ قلعہ تھا جس کے استحکام کی وجہ سے محمود غزنوی اپنے فتح کشمیر کے حملے میں ۴۱۲ھ/ ۱۰۲۱ء میں ناکام رہا۔

Marfat.com

پنجاب کے شہر یا علاقے ''لوہاور'' کا ذکر اس نے دو بار کیا ہے، صفحہ ۱۶۵ پر ہندوستان کے مختلف شہروں کے درمیان فاصلوں کا ذکر کرتے ہوئے وہ ''لوہاور'' کا ذکر کرتا ہے اور ساتھ ہی اس کا مرکزی شہر (قصبہ) ''مندھوکور'' بتاتا ہے۔ پھر آگے چل کر وہ دوبارہ ''لوہاور'' اور ''تاکیشر'' کا ذکر کرتے ہوئے کہتا ہے کہ ''ان دونوں کی حدود سے کلار جک کا پہاڑ نظر آتا ہے جس پر ہمیشہ برف جمی رہتی ہے۔''

پروفیسر شوارٹز برگ کے مذکورہ بالا تاریخی اٹلس میں اس ''لوہاور'' کا املاء انگریزی میں (Lahour) لکھا ہے، جو بآسانی بگڑ کر ''لوہور'' ہوسکتا ہے اور واقعتہً ایسا ہی ہوا۔ جیسا کہ عرب جغرافیہ نویس یاقوت الحموی کی تصریح اوپر گزری کہ لوہور اور لوہاور (یاقوت کے یہاں لہاور ہوگیا ہے) دونوں نام ایک ہی شہر کے ہیں۔

افسوس کہ اردو دائرہ معارف اسلامیہ، پنجاب یونیورسٹی میں مقالہ ''لاہور'' کے فاضل مقالہ نگار ڈاکٹر سید محمد عبداللہ نے اپنے انتہائی مفصل مقالے (کافی بڑے حجم کے ۶۲ صفحات) میں لاہور کے بارے میں البیرونی کے بیانات تفصیل کے ساتھ ذکر نہیں کیے اور اس سے یہ بیان منسوب کیا ہے کہ ''لاہور کسی شہر کا نہیں بلکہ ایک علاقے کا نام ہے جس کا دارالحکومت مندھوکور ہے۔''

اس ''مندھوکور کا تو البیرونی نے دوبارہ کہیں ذکر نہیں کیا، لیکن صفحہ ۱۶۷ پر اس نے شہر ''تاکیشر'' کے ساتھ دوبارہ ''لوہاور'' کا ذکر کیا ہے، جہاں سے کلار جک (پیر پنجال) پہاڑ کی برف سے ڈھکی ہوئی چوٹی نظر آتی ہے۔ اس بیان سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ لوہاور (لاہور) کسی شہر کا بھی نام تھا۔ پھر یہ کہ اس نے یہ منفی بیان نہیں دیا ہے کہ ''لاہور کسی شہر کا نام نہیں بلکہ ایک علاقے کا نام ہے۔'' اس نے تو صرف اس قدر کہا ہے کہ ''لوہاور (لاہور) کا ''قصبہ'' (مرکزی شہر) ''مندھوکور'' ہے۔''

اور پھر یہ کہ البیرونی نے انہی صفحات میں کشمیر کا ذکر کرتے ہوئے اس کو علاقہ بھی کہا ہے اور مدینۂ کشمیر (شہر کشمیر) بھی کہا ہے، یعنی ایک ہی نام سے ایک شہر اور علاقہ معروف تھا۔ شہر کشمیر سے اس کی مراد ''سری نگر'' ہے اور ایسا آج بھی دنیا کے بعض ممالک میں ہے، جیسے شمالی افریقہ کے عرب ملک تونس (ٹیونس) کا پایہ تخت (Capital) تونس شہر ہے۔ اور یہ کوئی شہری مملکت (City State) نہیں، بلکہ اس میں متعدد بڑے شہر اور بھی ہیں، جیسے قفصہ، قیروان، سوسہ،

Marfat.com

بنزرت وغیرہ۔ اسی طرح تونس کے برابر دوسرے عرب ملک الجزائر کا معاملہ ہے، اس کا پایۂ تخت الجزائر نام ہی کا شہر ہے۔ انتہائی افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ اس کو ہمارے ذرائع ابلاغ (اخبار، ٹی وی وغیرہ) الجزیرہ کہتے ہیں، جو ایک جاہلانہ بات ہے بلکہ دنیا کا ایک مشہور نشریاتی ادارہ بی بی سی (اردو میں) بھی اس کو ''الجزیرہ'' بولتا ہے، لیکن عرب ممالک میں ایسا نہیں، خود اہل ملک ان دونوں کو ''تونس العاصمۃ'' (پایۂ تخت تونس) اور ''الجزائر العاصمۃ'' (پایۂ تخت الجزائر) کہتے ہیں۔ میں نے ان دونوں ممالک کے سیاحت کی ہے اور وہاں یہ استعمال عام دیکھا ہے۔

پھر یہ کہ جنوبی ایشیا کے مذکورہ بالا اٹلس میں صفحہ ۳۲ پر جو نقشہ ۹۷۵ء تا ۱۴۰۰ء کے عہد سے متعلق ہے (یعنی غزنوی عہد) اس میں لہور نام کا شہر اور علاقہ دونوں دکھائے گئے ہیں اور یہی صورت بعد کے ان نقشوں میں ہے جو غوری اور ممالیک وسلطنت دہلی کے عہد سے متعلق ہیں۔ درحقیقت پنجاب کے نام کا صوبہ تو انگریزوں کے عہد میں وجود میں آیا، ورنہ عہد مغلیہ میں بھی یہ صوبہ لاہور کے نام سے موسوم تھا۔ خلاصۃ التواریخ کا مصنف سجان رائے بٹالوی جس نے اپنی یہ کتاب ۱۱۰۷ھ/ ۱۶۹۵ء یعنی عہد عالمگیر کے آخری برسوں میں لکھی، وہ اس دور کے اٹھارہ صوبوں میں ایک صوبہ لاہور کا بھی ذکر کرتا ہے، جس کا دارالحکومت لاہور ہی تھا اور اس صوبے میں جالندھر، سیالکوٹ، بٹالہ وغیرہ کے تمام شہر(۱) ملتان کو چھوڑ کر تھے (ملتان ایک علیحدہ صوبہ تھا)۔

اور مولانا عبدالحیؒ حسنی کی عربی کتاب ''الہند فی العہد الاسلامی'' کے بیان کے مطابق مشرق میں دہلی سے لے کر مغرب میں ملتان تک کا سارا علاقہ مغلیہ عہد میں صوبہ لاہور میں شامل تھا جس کا مرکزی شہر لاہور تھا، بلکہ امرتسر اور جموں وغیرہ بھی اس میں شامل تھے۔ (۲)

لہٰذا ایسی صورت میں اردو دائرہ معارف اسلامیہ کے مقالہ نگار کا یہ کہنا کہ لاہور کسی شہر کا نہیں بلکہ صرف ایک علاقہ کا نام تھا درست نہیں۔

لاہور کے نام پر مزید بحث سے قبل اس حقیقت کا اظہار دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ البیرونی کے بیان کردہ دوسرے شہر ''لوہور کوٹ''، جس کا نام ہم کو البیرونی کے تقریباً دو سو سال بعد تک ہندوستان

۱۔ خلاصۃ التواریخ۔ اردو ترجمہ ص ۱۰۵

۲۔ الہند فی العہد الاسلامی۔ مطبوعہ حیدرآباد الدکن ۱۹۷۲ء

Marfat.com

کے تاریخی نقشوں میں ملتا ہے وہ تیرھویں صدی عیسوی/ساتویں صدی ہجری سے غائب ہوگیا، کیونکہ اس نقشے میں جو پروفیسر شوارٹز برگ نے اپنے مذکورہ بالا تاریخی اٹلس میں ۱۱۷۰ تا ۱۴۹۰ء کے عہد سے متعلق پیش کیا ہے اس میں اب اس شہر کے بجائے پونچھ کے اس علاقے میں ایک قوم (Loharas) کا ذکر ہے اور شاید انہی لوگوں کے نام پر بعد کو دہلی کے مضافات میں ریاست لوہارو (Loharo State) قائم ہوئی جس کے حکمران نواب لوہارو کہلاتے تھے، یہ لوگ کشمیر میں اشاعت اسلام کے بعد مسلمان ہوگئے ہوں گے اور مغلیہ دور میں دہلی کے قریب آبسے ہوں گے۔

البیرونی کے چھوٹے معاصر اور سلطان مسعود بن محمود غزنوی کے دربار کے نائب میر منشی ابوالفضل محمد بن حسین البیہقی کی کتاب تاریخ البیہقی (فارسی) میں ہم دیکھتے ہیں کہ وہ اس شہر کا نام دس بارہ جگہ ''لاہور'' لکھتا ہے اور صرف دو جگہ اس نے اس کو ''لوہور'' لکھا ہے (نویں جلد)۔

اسی طرح بیہقی کا ایک دوسرا معاصر زین الدین گردیزی فارسی کتاب زین الاخبار میں اس کا نام لاہور اور لوہور دونوں لکھتا ہے۔ مگر دلچسپ اور عجیب بات یہ ہے کہ ان دونوں کے مابعد کا مشہور لاہوری فارسی شعر مسعود سعد بن سلمان اپنے دیوان میں اس شہر کے نام کی چھ مختلف شکلیں لکھتا ہے، جن میں دو وہ شکلیں بھی ہیں جو یاقوت الحموی نے لکھی ہیں۔ ''یعنی لوہور ولہاور'' اور وہ شکل بھی جو البیرونی نے لکھی ہے یعنی لوہاور لیکن اس نے اردو دائرہ معارف اسلامیہ پنجاب کے مقالہ نگار کے مطابق کہیں اس کا املاء یا شکل لاہور نہیں لکھا۔(۱) اور نہ اس نے کہیں وہ شکل لکھی ہے کہ جو جغرافیہ کی قدیم ترین فارسی کتاب حدود العالم میں پائی جاتی ہے، اور جس کا ذکر ہم اوپر کر چکے ہیں یعنی ''لہور''۔

لیکن جیسا کہ ہم نے اس سے قبل ذکر کیا ہے کہ بادام و چلغوزہ وغیرہ کے درختوں کی مناسبت سے جس کا ذکر مصنف حدود العالم نے ''لہور'' کے ساتھ کیا ہے یہ جموں والا ''لہور'' یا لہور کوٹ معلوم ہوتا ہے جس کا ذکر بیرونی نے بھی کیا ہے۔

۱؎ ملاحظہ ہو جلد ۱۸۔ ص ۲۔ ڈاکٹر سید عبداللہ کے مقالہ لاہور پر اضافہ کرتے ہوئے ادارہ نے جو بیان صبح الاعشی کے مصنف قلقشندی سے بعض علماء کی نسبت لہاوری کے بارے میں منسوب کیا ہے، وہ اس میں یکسر نہیں بلکہ یاقوت الحموی کی کتاب معجم البلدان میں مادہ لہاور میں ہے۔

Marfat.com

فارسی کا ایک اور مصنف محمد بن منصور المشہور بہ فخر مدبر اپنی کتاب ''آداب الحرب والشجاعۃ'' میں اس شہر کا نام متعدد بار ''لوہور'' لکھتا ہے اس نے یہ کتاب سلطان شمس الدین ایلتتمش کے ابتدائی عہد حکومت سن ۶۰۷ھ/ ۱۲۱۰ء میں لکھی۔ یہ عرب جغرافیہ نویس، مورخ اور ادیب یاقوت الحموی کا معاصر ہے۔(۱)

مشہور شامی مؤرخ ابن الاثیر جو ''یاقوت'' اور ''فخر مدبر'' کا معاصر ہے، ساتویں صدی ہجری/ تیرھویں صدی عیسوی کے ربع اول میں اپنی ضخیم تاریخ ''الکامل'' میں لاہور کا نام متعدد بار ''لہاوور'' لکھتا ہے (ملاحظہ ہو جلد ۹ صفحات ۳۴، ۳۱۰۔ طبع دار الکتاب العربی، بیروت ۱۹۶۷ء) اس عظیم عرب مورخ نے غزنوی اور غوری سلاطین اور ان کی ہندوستان میں فتوحات کے احوال اپنی کتاب کی ساتویں، آٹھویں اور نویں جلدوں میں تفصیل سے دیئے ہیں، جو مختلف سنین کے تحت (Annals) تاریخ طبری کی طرح مرتب کئے گئے ہیں۔ غالباً عتبی کی تاریخ یمینی، تصنیف ۴۱۲ھ (اب نایاب) اور ابوالفضل بیہقی کی تاریخ بیہقی موسوم بہ تاریخ مسعودی تصنیف ۴۵۱ھ، ۳۰ جلدیں (اب صرف نویں موجود و مطبوع اور باقی مفقود ہیں) اس کے پیش نظر تھیں اور غوری عہد میں یہ خود موجود تھا۔ لیکن اس نے لاہور کے نام کی ایک نئی صورت لہاوور اختیار کی ہے۔

ہمارے پیش نظر سبکتگین اور محمود غزنوی کے مورخ عتبی (وفات ۴۲۷ھ) کی تاریخ یمینی نہیں، لیکن اس کتاب کی شارح احمد بن علی المنینی نے جو شام کا باشندہ اور اٹھارویں صدی عیسوی کے نصف اول کی شخصیت ہے (وفات ۱۸۵۹ء) اپنی کتاب الفتح الوہبی فی شرح تاریخ العتبی (۲ جلدیں) نے اپنی کتاب میں لاہور کا نام ''لوہور'' لکھا ہے۔ بلکہ وہ ایک ''شیخ لوہوری'' سے اپنی ملاقات کا بھی ذکر کرتا ہے۔(۲)

آٹھویں صدی ہجری/ چودھویں صدی عیسوی کے ایک مشہور مصری مورخ ابن فضل اللہ العمری (وفات ۷۴۹ھ/ ۱۳۴۹ء) نے اپنی ضخیم کتاب ''مسالک الابصار فی ممالک الامصار''

۱۔ سید ہاشمی فرید آبادی نے اپنی کتاب مآثر لاہور مطبوعہ ۱۹۵۶-۱۹۷۶ء میں اس کے حالات دیے ہیں، کتاب بعد کو چھپ گئی ہے۔

۲۔ الکامل فی التاریخ (طبع مذکورہ بالا) فٹ نوٹ نمبر ۵ جلد ۷ ص ۲۳۸۔

Marfat.com

(۲۷ جلدیں) کے اس حصے میں جو مملکتہ الہند و السند یعنی برصغیر ہندو پاکستان سے متعلق ہے، ہندوستان کے دو علماء شیخ مبارک بن محمود الانباتی اور قاضی القضاۃ سراج الدین عمر بن اسحاق الاودھی سے ذاتی ملاقات کے بعد ان دونوں کی زبانی ہندوستان کے جو حالات عہد محمد بن تغلق سے متعلق انتہائی تفصیل سے لکھے ہیں، اس میں وہ لاہور کا نام دو بار ''لہاور'' لکھتا ہے۔(۱)

ایک انتہائی دلچسپ بات یہ ہے کہ اسی آٹھویں صدی ہجری میں (یکم محرم ۷۳۴ھ) کو مشہور مراکشی سیاح ابن بطوطہ کابل کے راستے سے ہندوستان پہنچا، وہ اپنے سیاحت نامہ (رحلۃ ابن بطوطہ) میں پنج آب (پنجاب) کا ذکر کرتا ہے اور غلطی سے اس کو وادی السند کہتا ہے، وہ وہاں سیدھا ملتان پہنچتا ہے جس کا اس نے کافی تفصیل سے ذکر کیا ہے، پھر ضمناً فتح دہلی اور اس کے بادشاہوں کے ذکر میں شہر ''لاہور'' کی فتح کا بھی ذکر کرتا ہے۔ یہ وہ واحد عرب سیاح ہے جو لاہور کا نام بنو تغلق کے عہد میں ''لاہور'' لکھتا ہے۔

ساتویں صدی ہجری کے نصف اول کا مشہور مورخ اور شمس الدین التتمش کے عہد سے دوبار دہلی سے وابستہ مصنف منہاج سراج بھی اپنی فارسی کتاب طبقات ناصری میں اکثر و بیشتر اس شہر کو ''لاہور'' کے نام سے یاد کرتا ہے، لیکن آٹھویں باب میں سلطان غیاث الدین غوری کی فتوحات کا ذکر کرتے ہوئے اس کو ''لوہور'' لکھتا ہے۔(۲)

سید ہاشمی فرید آبادی نے اپنی محققانہ کتاب ''مآثر لاہور'' میں اس کے قدیم نام اور تاریخ پر کافی تفصیل و شواہد سے لکھا ہے، انہوں نے خاص طور پر فخر مدبر کی مذکورہ بالا کتاب ''آداب الحرب والشجاعۃ'' سے کافی فائدہ اٹھایا ہے اور ان کے بقول یہ واحد کتاب ہے جس میں قبل اسلام لاہور کی تاریخ کا مفصل ذکر ہے۔

۱۔ ملاحظہ ہو مسالک الابصار الباب الاول فی مملکۃ الہند والسند تحقیق محمد سالم بن شدید العوفی، الریاض سعودی عرب ۱۴۰۴ء ۱۰۹ میری سابق یونیورسٹی، جامعۃ الامام محمد بن سعود کے نوجوان استاد نے یہ کتاب شائع کر کے بڑی خدمت انجام دی ہے، مگر اس میں ناموں کی کافی اغلاط رہ گئی ہیں۔

۲۔ طبقات ناصری، اردو ترجمہ مولانا غلام رسول مہر، جلد اوّل ص ۶۴۱۔ مترجم نے ''لوہور'' لکھ کر قوسین میں اس کی تشریح میں لاہور لکھ دیا ہے، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ دوسری جگہوں پر فاضل مترجم نے تصرف کر کے ''لوہور'' کو لاہور نہیں بنایا ہے۔

Marfat.com

قدیم لاہور کی تاریخ تو ہمارا موضوع بحث نہیں، لیکن فخر مدبر کی اس فارسی کتاب کے حوالے سے سید ہاشمی فرید آبادی مرحوم نے بجا طور پر یہ ثابت کیا ہے کہ تیسری صدی ہجری/نویں صدی عیسوی میں ''لوہور'' ایک جداگانہ ہندو ریاست کا نام تھا، جو بیاس تا چناب پھیلی ہوئی تھی اور اس ریاست کے راجاؤں نے جن کا شمال کے ہندو شاہی خاندان سے کوئی تعلق نہ تھا راوی کے کنارے ''لوہور'' آباد کیا۔ مزید یہ کہ ''آداب الحرب'' کے مصنف کے بقول اسی ریاست کے ایک راجہ ہترت (۱) نے لوہور کو سورج دیوتا کا مندر بنا کے چار چاند لگائے اور ساتھ ہی ایک قلعہ بھی بنایا۔ جس راجہ نے فخر مدبر کے مطابق ''لوہور'' کو آباد کیا وہ پچ بھنڈرا تھا اور ہترت اس کا بیٹا تھا جو ۷۵ سال تک لاہور کا امیر رہا اور اس نے ۹۳ برس کی عمر میں وفات پائی۔ اسی قدیم صنف کی روایت کے مطابق ۳۸۹ھ/ ۹۹۹ء میں ہندو شاہی حکومت کے راجے جے پال نے لوہور کی اس ریاست پر قبضہ کر لیا تھا۔(۲)

(ملحوظ رہے کہ اس وقت ویہند ''مردان میں موجود و معمولی قصبہ ہنڈ'' اس ہندو شاہی حکومت کا پایہ تخت تھا)۔

لیکن سید ہاشمی فرید آبادی کا یہ بیان درست نہیں کہ فخر مدبر اس انکشاف کا واحد راوی ہے کہ غزنوی عہد سے قبل، تیسری صدی ہجری میں لاہور اپنے پرانے نام ''لوہور'' سے موجود تھا۔ ہمارے مذکورہ سابق ''تاریخی اٹلس، جنوبی ایشیا'' کے مصنف پروفیسر شوارٹز برگ نے اپنے اٹلس میں ایک نقشہ (نمبر iv-1) ۷۰۰ء تا ۹۷۵ء/ ۸۱ھ تا ۳۶۵ھ کا دیا ہے (یعنی غزنوی عہد میں کافی قبل) اس میں ''لہور'' کا شہر دکھایا ہے۔ اس نقشہ سے فخر مدبر کی روایت کی تائید تو ہوتی ہے، لیکن یہ اس مصنف کی نشاندہی پر نہیں تیار کیا گیا ہے۔ کیونکہ آداب الحرب والشجاعۃ اس عظیم و بے نظیر نقشہ نویس (Cartographer) و مورخ کے مآخذ میں نہیں (۳) یقیناً پروفیسر موصوف نے یہ نقشہ قدیم ہندی کتب یا اسلامی عہد سے قبل کی ملکی یا غیر ملکی روایات کی بناء پر تیار کیا ہے۔

۱۔ دائرہ معارف اسلامیہ پنجاب کے مقالہ لاہور کے مصنف ڈاکٹر سید عبداللہ نے اس نام کو ''چندرت'' لکھا ہے جو زیادہ صحیح معلوم ہوتا ہے۔

۲۔ مآثر لاہور، ص ۶-۳۰۹

۳۔ ۳۵۲ صفحات اور اخباری سائز کے اس اٹلس میں مآخذ (کتابیات کی فہرست (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

Marfat.com

بہر حال فخر مدبر کی روایت یقیناً صحیح ہے۔ جس کی تائید بیرونی کی کتاب الہند سے بھی ہوتی ہے، جس نے علاقہ ''لوہاور'' (لاہور) کا ذکر کیا ہے اور اس کا مرکزی شہر مندھوکر بتایا ہے۔ پروفیسر شوارتز برگ نے اپنے اٹلس میں بیرونی کے ذکر کردہ ہندوستان کے شہروں، علاقوں اور دریاؤں سے متعلق ایک خاص نقشہ علیحدہ سے تیار کیا ہے۔ مگر افسوس کہ انہوں نے بیرونی کے ذکر کردہ دو شہروں سنام اور ججنیر کے درمیان ایک اور شہر ''ادت ہور'' (ا) کو نہیں دکھایا۔ جس کا لاہور کے قدیم نام ''لوہور'' سے بہت اہم رشتہ ظاہر ہوتا ہے۔ ہر انسان کے کام میں بہر حال کوئی نہ کوئی نقص رہ جاتا ہے، کمال صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کی ذات اور اس کے کلام کو ہے۔

سلطان محمود غزنوی کے مورخ العتبی اور مسعود غزنوی کے مورخ ابوالفضل بیہقی کے مطابق اس شہر کا قدیم نام ''لوہور'' ہے، اس کے ساتھ ہم البیرونی کے بیان کردہ شہر ''ادت ہور'' پر نظر رکھیں اور ساتھ عالمگیری عہد کے مورخ سجان رائے بٹالوی کے اس قول کو یاد کریں کہ یہ شہر رام چندر کے لیے ''لو'' نے آباد کیا تھا یا اس کے نام پر رکھا گیا ہے تو اس سے بات متحقق ہوتی ہے کہ ''لوہور'' دو لفظوں سے مرکب ہے ''لو+ ہور''، جس طرح ادت ہور دو لفظوں سے مرکب ہے، سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس ترکیب میں ''ہور'' کے کیا معنی ہیں۔

''ادت'' کے معنی ہندی میں دیوتاؤں کی ماں کے ہیں، البیرونی نے ''ادت'' کے معنی سورج لکھے ہیں۔ غالباً سنسکرت میں (کتاب الہند، ص ۱۷۲) اس نے اس موقع پر سورج کے معنی کے لیے آٹھ لفظ لکھے ہیں ''ہور'' کے معنی مرحوم کرنل خواجہ عبدالرشید نے نقوش کے لاہور نمبر (فروری ۱۹۶۲ء) میں اپنے مضمون میں قلعہ کے لکھے ہیں۔

اس طرح ادت ہور کے معنی ہوئے، دیوتاؤں کی ماں کا قلعہ'' یا ''سورج کا قلعہ'' اور لوہور کے معنی ہوئے ''لو'' کا قلعہ۔

---

۳۵ صفحات پر پھیلی ہوئی جس میں دسیوں زبانوں، سنسکرت، ہندی، عربی، فارسی، انگریز، فرنچ، جرمن وغیرہ قلمی و مطبوع بنیادی اور ثانوی مآخذ کا علیحدہ علیحدہ ذکر ہے سیکڑوں کی تعداد میں ہیں لیکن افسوس کہ اس میں فخر مدبر کی آداب الحرب کا ذکر نہیں۔

لے کتاب الہند، ص ۱۶۵

Marfat.com

''آداب الحرب'' میں فخر مدبر کی تصریح سے ہمارے اس خیال کی تائید ہوتی ہے، وہ صراحت سے کہتا ہے کہ ہندو شاہی عہد سے پہلے لاہور کے نوآباد شہر میں (جو پنج بھنڈرا نے آباد کیا تھا) اس کے بیٹے ہترت (ڈاکٹر سید عبداللہ کے نزدیک چندرت) نے سورج دیوتا کا بڑا مندر اور ایک قلعہ تعمیر کرایا اور بہت ممکن ہے کہ یہ قلعہ اس نے برکت یا کسی اور وجہ سے رام چندر کے بیٹے ''لو'' سے منسوب کیا ہو اور اس طرح اس پورے شہر کا نام ''لوہور'' پڑ گیا ہے۔ پرانے زمانے میں یہ ہوتا رہا ہے کہ مندروں اور قلعوں کے اردگرد شہر آباد ہوتے اور بڑھتے چلے گئے ہیں۔

اس طرح مصنف خلاصۃ التواریخ کی بات تھوڑی سی ترمیم کے بعد یعنی اس شہر کا نام رام چندر کے بیٹے ''لو'' کے نام (۱) پر رکھا گیا درست معلوم ہوتی ہے، لیکن یہاں ایک یہ بات پیچیدگی پیدا کرتی ہے کہ البیرونی نے اس کا نام ''لوہور'' نہیں بلکہ ''لوہاور'' لکھا ہے یعنی ''لو'' کے ساتھ جو لفظ مرکب ہے وہ ''ہور'' نہیں بلکہ ''ہاور'' ہے۔ بہت ممکن ہے کہ یہ اس سنسکرت لفظ کا عام روزمرہ کا تلفظ ہو، اور اس کو غیر عربی زبان مثلاً انگریزی میں لکھا جائے تو یہ (Haur) ہوگا اور تلفظ ''ہور'' اور ''ہاور'' دونوں ہو سکتے ہیں۔ یا اس نے جنوبی کشمیر میں واقع قلعہ ''لوہور'' سے اس کو مخلط کرنے کے خوف سے یہ املاء (لوہاور) لکھا ہو۔

بہرحال بیرونی کے چھوٹے معاصر گردیزی نے اپنی کتاب ''زین الاخبار'' کے صفحہ ۷۹ پر اس کو ''لوہور'' ہی لکھا ہے اور اسی قدیم فارسی کتاب کے صفحہ ۱۰۴ پر اس کا نام لاہور بھی لکھا ہے، یہ سلطان مسعود بن غزنوی کے عہد کی بات ہے جب اس نے اپنے بیٹے مجدود کو لاہور کا گورنر بنا کر بھیجا (۲) اس کے برخلاف ابوالفضل بیہقی نے اس موقع پر لاہور کا نام لوہور لکھا ہے، اگرچہ اس سے قبل متعدد بار اس نے شہر کا نام لاہور لکھا ہے اور یہ بھی گردیزی کا معاصر ہے اس نے اپنی کتاب گردیزی کے تقریباً گیارہ سال بعد لکھی یا کم از کم اس کی نویں موجود و مطبوع تاریخ بیہقی کے مطابق یہ واقعہ ۴۲۷ھ کا ہے۔ (۳)

۱۔ سبحان رائے بٹالوی نے اپنی اس کتاب میں، جیسا کہ اوپر گزرا، لکھا ہے کہ رام چندر کے بیٹے ''لو'' نے یہ شہر آباد کیا جو یقیناً غلط ہے کیوں کہ پرانی سنسکرت کتابوں میں اس کا کہیں ذکر نہیں ملتا۔

۲۔ بحوالہ مقالہ لاہور۔ اردو دائرۂ معارف اسلامیہ پنجاب، جلد ۱۸ ص ۱

۳۔ تاریخ بیہقی، عربی ترجمہ یحیی الخشاب وصادق نشات، ص ۵۳۹ بیروت۔ ۱۹۸۲ء

Marfat.com

اس بحث کو ختم کرنے سے قبل ضروری ہے کہ ایک اور اہم قدیم عربی ماخذ یعنی چھٹی صدی ہجری کے مشہور مصنف ابوسعد السمعانی کی کتاب ''الانساب'' پر بھی ایک نظر ڈال لیں جنہوں نے عالم اسلام کے مختلف علماء، فضلاء اور دیگر اہم شخصیات کی شہری نسبتوں کے ساتھ ان کے مختصر حالات اپنی ضخیم اور منفرد کتاب میں جمع کئے ہیں۔ مگر اس سے رجوع کرنے پر وہ صورت پیش آئی جس کا ذکر مرحوم جگر مرادآبادی نے اس طرح کیا ہے۔

تو نے سلجھ کر گیسوئے جاناں
اور بڑھا دی دل کی الجھن

اس کتاب میں سمعانی نے اس شہر کا نام ''لوہور'' لکھا ہے اور یہ نہیں کہا جا سکتا ہے کہ یہ ناسخ یا کتاب کی غلطی ہے، کیونکہ مصنف نے اس لفظ کی ہجاء حروف کے ذریعہ اس طرح لکھی ہے۔ ''بفتح الام، والھاء بین الواوین ثم واؤ ثالثۃ وفی آخرھا الراء'' (یعنی ل پر زبر اور دونوں واؤ کے درمیان ھا پھر تیسرا واؤ اور آخر میں ر)۔

اور پھر ساتھ ہی یہ بھی لکھا ہے، ''اس کو لوہور اور لہاور کہا جاتا ہے(۱)'' اور وہاں بہت سے علماء ہوئے، جن میں سے انہوں نے دو کے نام دیئے ہیں، جو یہ ہیں:

۱۔ ابوالحسن علی بن عمر بن الحکیم اللوہوری، جو عالم، ادیب شاعر، کثیر الحفظ اور بہت خوش کلام تھے اور ان کے دو شاگردوں ابوالفضل محمد بن ناصر السلامی البغدادی اور ابوالفتوح عبدالصمد بن عبدالرحمٰن الاشعثی سے سمعانی نے سمرقند میں حدیث نبوی سنی، ان کی وفات ۵۲۹ھ میں لوہور (لاہور) میں ہوئی۔

۲۔ ابوالقاسم محمود بن خلف اللوہوری، یہ ایک فقیہ اور ماہر مناظر تھے، انہوں نے سمعانی کے دادا ابوالمظفر سے فقہ پڑھی اور حدیث کا علم حاصل کیا، خود سمعانی ان کے شاگرد تھے، جنہوں نے ابوالقاسم محمود سے اسفرائین (شمال مشرق ایران میں اور نیشاپور کے شمال میں ایک قدیم شہر ہے) میں تھوڑی بہت حدیث کی تعلیم حاصل کی کیوں کہ شیخ ابوالقاسم محمود اسفرائین میں قیام پذیر ہو گئے تھے، ان کی وفات تقریباً ۵۴۰ھ میں ہوئی۔

۱؎ کتاب الانساب، جلد ۵۔ ص ۱۴۸، تحقیق عبداللہ عمر البارودی، دارالجنان، بیروت ۱۹۸۸ء

Marfat.com

ان مؤخر الذکر لاہوری عالم کا ذکر جو سمعانی کے استاد تھے، تقریباً سمعانی کے ساٹھ سال بعد یاقوت الحموی نے بھی اپنی معجم البلدان جلد پنجم میں کیا ہے اور ان کو شہر ''لہاور'' کے ذکر کے ضمن میں ''لہاوری'' کے لقب سے یاد کیا ہے۔ البتہ یاقوت نے سمعانی کے استادوں کے استاد ابوالحسن علی سید عمر بن الحکیم اللوہووری کا ذکر نہیں کیا۔

یاقوت نے لاہور کے دیگر دو علماء کا ذکر کیا ہے، اس کے یہاں یہ ''لہاوری'' ہیں اور وہ یہ ہیں:

ا۔ عمر بن سعید اللہاوری۔

۲۔ محمد بن المامون بن الرشید المطوعی اللہاوری، جو طلب علم میں لاہور سے نکلے، پہلے خراسان (مشرقی ایران) میں اقامت اختیار کی، شافعی فقہ میں فضیلت حاصل کی، پھر بغداد گئے، وہاں کچھ مدت رہے، جہاں لوگوں نے ان سے حصول علم کیا اور آخر میں ''آذربائیجان میں سکونت پذیر ہوئے، جہاں وہ وعظ کہتے تھے، بالآخر ملحدین (باطنی فرقے کے لوگ) نے ان کو وہاں ۶۰۳ھ میں شہید کر دیا (ا)۔ (یہ وہ زمانہ ہے جب خود یاقوت ایک معروف و مشہور عالم و ادیب تھا کہ اس کی وفات بیس سال بعد ۶۲۶ھ میں ہوئی)۔

اس طرح چھٹی صدی ہجری کے ان دو مشہور علماء و مورخین نے چار لاہوری علماء کا ذکر کیا، لیکن ایک ان کو ''لوہووری'' لکھتا ہے اور دوسرا انہی کو ''لہاوری'' لکھتا ہے۔

سمعانی و یاقوت کو چھوڑ کر جب ساتویں صدی ہجری میں یاقوت الحموی کے معاصر فارسی مورخوں اور تذکرہ نویسوں کو پڑھتے ہیں جو خود لاہور میں رہے تو جیسا کہ ہم نے کافی پہلے کہا ان میں سے ایک یعنی فخر مدبر اس شہر کو ''لوہور'' لکھتا ہے جب کہ دوسرا زیادہ مشہور تذکرہ نویس عوفی اپنی مشہور کتاب ''لباب الالباب'' میں اس شہر کو لوہور (باب یازدہم۔ شعرائے غزنہ و لوہور) اور لاہور (قدیم شاعر استاد رونی کے ذکر میں، مولد و منشائے او خطۂ لاہور، ص ۲۴۱۔ ج ۲) دونوں لکھتا ہے (۲) اور اسی طرح ان دونوں کا چھوٹا معاصر منہاج سراج یہ دونوں شکلیں لکھتا ہے (۳)، اگرچہ بیشتر اس نے لاہور ہی لکھتا ہے۔

ا۔ معجم البلدان۔ ص ۲۷، جلد ۵، طبع بیروت۔ ۱۹۷۹ ۲۔ بحوالہ مآثر لاہور از سید ہاشمی فرید آبادی صفحہ ۲۲۸۔۲۲۹

۳۔ ملاحظہ ہو، طبقات ناصری جلد ا، ص ۶۴۱ (اردو ترجمہ مولانا غلام رسول مہر، اردو سائنس بورڈ لاہور، طبع دوم ۱۹۸۵ء، مسالک الابصار، ص ۱۰۴)

Marfat.com

فخر مدبر، منہاج سراج اور عوفی نے وہی کیا ہے جو بیہقی نے اپنی تاریخ میں تقریباً دو سو سال قبل کیا تھا اور جس کا ذکر ہم اوپر کر چکے ہیں۔ یعنی لوہور اور لاہور دونوں لکھا ہے۔

اردو دائرہ معارف اسلامیہ پنجاب کے فاضل مقالہ نگار ڈاکٹر سید عبداللہ نے اپنے مقالہ ''لاہور'' میں اس کے نام کی سترہ مختلف شکلیں لکھی ہیں۔ جن میں سے بعض تو بلاشبہ ناسخ یا کاتب کا سہو قلم ہے، جسے ''لوہاوز'' (آخر میں ز) اور اگر وہ ناسخین کی ایسی اغلاط کو درخور اعتناء سمجھتے ہیں تو ابن فضل اللہ عمری کی کتاب ''مسالک الابصار'' کے بعض قلمی نسخوں میں ان کو ''نہاوز'' اور ''بہاوز'' (۳) بھی لکھا ملتا ہے اور اس طرح اس نام کی انیس شکلیں ہو جائیں۔ مگر اس طرح کی کتابت کی اغلاط کو ایک علمی بحث کی بنیاد بنانا کوئی درست بات نہیں۔

بہر حال اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ لاہور کے نام کی مختلف شکلیں قدیم عربی، فارسی اور ہندی مآخذ میں ملتی ہیں افسوس کہ ڈاکٹر سید عبداللہ نے اس کی نہ کوئی توجیہ پیش کی ہے اور نہ کسی نام کی ترجیح، جو ایک سنجیدہ اور نتیجہ خیز علمی بحث کے لیے ضروری ہے۔

گزشتہ صفحات میں جو کچھ کہا گیا ہے اس کا خلاصہ اس طرح پیش کیا جا سکتا ہے:

۱۔ اس شہر کا قدیمی نام لہور اور لوہور تھا اور اس کا بانی تیسری صدی ہجری کے اواخر میں ایک ہندو خاندان تھا، جو سرحد اور شمالی پنجاب میں حکمران ہندو شاہی حکومت کا معاصر تھا، چچ بھنڈرا اس کا بانی تھا اور اس کے بیٹے چندرت کے طویل عہد حکومت میں اس شہر نے کسی قدر ترقی کی اور وہاں ایک قلعہ تعمیر ہوا، اس لیے یہ کہنا درست نہیں کہ اس شہر کی بنا سلطان محمود غزنوی اور اس کے بیٹے، سلطان مسعود کے عہد کی مشہور شخصیت ایاز نے ڈالی۔

۲۔ ۳۸۹ھ/ ۹۹۸ء میں ہندو شاہی حکمراں جے پال کے اس پر قبضے کے بعد اسکی نمایاں حیثیت ختم ہو گئی تھی۔

۳۔ بلاذری نے فتوح البلدان میں حضرت معاویہ کے عہد میں سن ۴۴ھ مہلب بن ابی صفرہ کے حملہ میں بنہ (بنوں) کے ساتھ جس ''لاہور'' (۱) کا ذکر کیا ہے اور جس کو قاضی اطہر مبارکپوری نے اپنی کتاب ''عربوں کی حکومتیں ہندوستان میں (ص ۷۶) موجودہ لاہور سمجھا ہے، وہ درست

۱۔ فتوح البلدان (تحقیق المنجد، القاہرہ ۱۹۵۶ء) ص ۵۳۱

Marfat.com

نہیں، یہ الاہور اٹک کے قریب دریائے سندھ کے مغربی کنارے پر کوئی چھوٹا شہر تھا۔ یا اب بھی ایک گھاٹ ہے۔

۴۔ قدیم مورخ البیرونی نے اس کو اپنی کتاب الہند میں ''لوہاور'' لکھا ہے، جو بعد کو بگڑ کر دوسری عربی تصنیفات میں لہاور، لوہاوور اور لہوور ہو گیا۔

۵۔ اسی قدیم ہند کی تاریخ وثقافت پر ایک ماہر مورخ نے جنوب مغربی کشمیر میں ایک شہر لہور اور لوہور کا بھی ذکر کیا ہے، جہاں اسی نام کا ایک انتہائی مستحکم قلعہ تھا جس کا ہندی نام لوہار کوٹ یا لوہر کوٹ تھا اور اسی لیے شہر کا بھی یہی نام تھا (۱)۔

۶۔ سلطان محمود غزنوی کے عہد میں عرب یا عربی زبان میں لکھنے والے مصنفین عتبی، بیرونی نے اس کا نام لوہور اور لوہاور لکھا اور بعد کے عرب مصنفین سمعانی، یاقوت اور ابن الاثیر، ابن فضل اللہ العمری اور قلقشندی وغیرہ نے یہی دو نام لکھے، بلکہ ''لوہاور'' یاقوت کے یہاں بگڑ کر ''لہاور'' ہو گیا اور اسی نام کی نسبت سے یہاں کے بعض علماء عرب ممالک میں ''لہاوری'' کہلائے۔

۷۔ بیرونی وعتبی کے معاصر فارسی میں لکھنے والے غزنوی دربار کے مورخ گردیزی وبیہقی نے اس شہر کا نام لوہور اور لاہور لکھا اور تقریباً دو صدی بعد فارسی میں لکھنے والے دوسرے مصنفین فخر مدبر اور عوفی وغیرہ نے بھی بیہقی کی تقلید میں یہی کیا ہے۔

۸۔ مورخین اور جغرافیہ نویس خواہ وہ عرب ہوں یا افغانی وایرانی النسل ان کو چھوڑ کر جب غزنوی عہد کے انتہائی مشہور لاہوری شاعر مسعود سلمان (وفات ۵۱۵ھ/۱۱۲۱ء) کے دیوان پر نظر ڈالتے ہیں تو نظر آتا ہے کہ اس نے کچھ زیادہ ہی غضب کیا ہے اور لاہور کے نام کی اس نے چھ مختلف شکلیں لکھی ہیں (۲): لوہور، لہاور، لوہاور، لوہاوور، لاوہور اور لاہوور۔ اور ایک موقع پر اس نے حد کر دی ہے کہ برابر دو شعروں میں دو مختلف نام استعمال کیے ہیں۔

۱۔ A Historical Atlas of South Asia, Map iv-1, page 31

۲۔ یہ شکلیں اس شاعر کے دیوان کے علاوہ مقالہ ''لاہور'' اردو دائرہ معارف اسلامیہ پنجاب ص ۲ پر دیکھی جا سکتی ہیں اور کچھ اشعار جن میں چار شکلیں موجود ہیں۔ سید ہاشمی فرید آبادی کی کتاب آثر لاہور (ص ۲۴۸۔۲۶۴۔۲۷۰) میں دیکھی جا سکتی ہیں۔

Marfat.com

محملے باید از خدا وندم که ازو بوئے لووہور می آید
که ہمی ز آرزوئے لوہاوور جاںن و دل درتنم ہمی آید

۸۔ اس میں ایک ساتویں شکل ''لووہور'' بھی آ گئی ہے۔کوئی شک نہیں کہ مسعود سلمان نے ان میں سے بعض شکلیں ضرورت کی وجہ سے بھی اختیار کی ہیں، لیکن اہم بات یہ ہے کہ ان میں وہ تین چار شکلیں بھی ہیں جو قدیم عرب اور ایرانی مورخین نے استعمال کی ہیں یعنی لوہور، لہاور اور لوہوور۔

۹۔ عام طور پر قدیم عرب مصنفین نے لاہور کے نام کو لوہور اور لہاور لکھا جب کہ غزنوی اور بعد کے عہد کے ایرانی مصنفین نے ساتویں صدی ہجری تک اس کو لوہور اور لاہور لکھا۔

۱۰۔ بالآخر مغلیہ عہد سے لاہور ہی اس کا نام قرار پایا۔

عربی اور ایرانی مصنفین کے اس اختلاف کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ عربی زبان میں لوہور اور لوہاور کوئی ثقیل لفظ نہیں، ان کی زبان میں ''لو'' بمعنی ''کاش کہ'' کثرت سے استعمال ہوتا ہے اور بعض الفاظ میں دو واو بھی جمع ہوتے ہیں، لیکن فارسی زبان میں لوہور لوہاور کے الفاظ میں ثقالت ہے، اس لیے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایرانی النسل مصنفین کی زبان و قلم پر لوہور کے بجائے لاہور رائج ہو گیا۔

عرب مصنفین میں مشہور عرب سیاح ابن بطوطہ وہ قدیم مصنف ہے جس نے ۷۳۴ھ میں ہندوستان آنے پر اس شہر کا نام لاہور لکھا ہے (۱)۔

آخر میں ایک اہم اور نئی بات یہ ہے کہ البیرونی نے جیسا کہ اوپر ذکر ہوا کتاب الہند میں ''مندھوکر'' کو علاقۂ لوہاور (لاہور) کا مرکزی شہر یا پایۂ تخت لکھا ہے، سید ہاشمی فرید آبادی نے اپنی کتاب مآثر لاہور میں اس لفظ پر کافی بحث کی ہے اور اس کی توجیہ یہ کی ہے کہ یہ دراصل ''منڈی کھوکر'' ہے، جو بگڑ کر عربی میں مندھوکر ہو گئی (۲)، یہ توجیہ کافی بعید از قیاس ہے، مگر بہر حال ایک ذی علم مورخ و محقق کی رائے ہے۔

۱۔ رحلۃ ابن بطوطہ، مطبوعہ مصر، جلد ۲ ص ۲۱ (ذکر فتح دہلی)

۲۔ مآثر، لاہور، ص ۱۰

Marfat.com

ان کے علم میں یہ بھی تھا کہ یہی لفظ تاریخ بیہقی میں ''مندکور'' ہے، دونوں میں کافی فرق ہے اس پر انہوں نے کوئی اظہار خیال نہیں کیا۔ لیکن بیہقی کے یہاں یہ ایک قلعہ ہے اور صرف ایک بار اس کا ذکر ہوا ہے۔

اردو دائرہ معارف اسلامیہ پنجاب میں مقالہ ''لاہور'' کے فاضل مقالہ نگار ڈاکٹر، سید عبداللہ نے بھی صرف بیرونی کا قول ذکر کیا ہے اور گویا اس کو صحیح ہی سمجھا ہے۔ لیکن ان حضرات کی نظر سے بیرونی کی ایک اہم کتاب القانون المسعودی نہیں گزری جو اس نے ''کتاب الہند'' کے بعد لکھی تھی، اہم اور نئی بات یہ ہے کہ اس نے اس کتاب کی دوسری جلد میں شہر لکماور (مدینہ لکماور) کو ''لوہاور'' کا مرکزی شہر لکھا ہے (۱)۔ یہ نام اس نے اپنی اس کتاب کے دسویں باب کی ان جداول میں لکھا ہے جن میں اس نے دنیا کے ان مختلف شہروں کے خطوط طول البلاد وعرض البلاد دیئے ہیں جو قدیم بطلیموسی نظام کے مطابق سات اقلیموں میں گنائے جاتے ہیں۔

اب ظاہر ہے کہ مندھوکور اور لکماور میں کافی فرق ہے، ایسے عظیم مصنف ومحقق کے یہاں یہ تضاد بیانی بڑی عجیب ہے اور افسوس کہ لاہور پر کتابیں لکھنے والے کسی قدیم وجدید مصنف نے (جن میں ڈاکٹر محمد ناظم اور ڈاکٹر محمد باقر بھی شامل ہیں) اس تضاد بیانی کو ملحوظ نہیں کیا، کیونکہ کسی نے القانون المسعودی سے جو علم ہیئت وفلک کی کتاب ہے، رجوع ہی نہیں کیا، سلطان مسعود غزنوی سے منسوب یہ کتاب اپنے میدان میں بیرونی کی انتہائی معرکہ آراء تصنیف ہے۔

بات لوہاور یا لاہور کے مرکزی شہر کی نہیں جس کے بیرونی نے دو بالکل مختلف نام دیئے ہیں اور اپنی تضاد بیانی کو پیش نظر نہیں رکھا بلکہ آگے چل کر اس نے اقلیم چہارم میں جنوبی کشمیر کے اس شہر کو جسے اس نے کتاب الہند میں (جیسا کہ ہم نے پہلے لکھا ہے) قلعۂ لوہور/لہور کا نادیا ہے۔ اسی کو وہ قلعۂ لوہاور کا نام دیتا ہے (قلعۃ لوھاور فی جبال کشمیر) (۲)۔

اس طرح کوہستان کشمیر کا لوہور اب بیرونی کی اس کتاب میں وہی ''لوہاور'' ہو گیا جس کا ذکر اس نے پنجاب کے شہروں یا علاقے کے ضمن میں کتاب الہند میں کیا ہے۔

۱۔ القانون المسعودی، جلد دوم ص ۶۲، دائرۃ المعارف العثمانیہ، حیدرآباد دکن ۱۹۵۵ء۔

۲۔ القانون المسعودی، جلد ۲ ص ۵۷۴۔

Marfat.com

اس تضاد بیانی کی جس کو بیرونی نے محسوس نہیں کیا، اس کے سوا کیا توجیہ کی جا سکتی ہے کہ لوہور اور لوہاور مترادف ہیں کم از کم القانون المسعودی میں وارد ناموں کے حوالے سے ہے۔

یہ بات ہنوز تشنہ ہے کہ اس نے پنجاب کے اس شہر کو جو غزنوی عہد سے قبل لہور یا لوہور کے نام سے موجود تھا اور جس کو بیرونی کے معاصرین عتبی، گردیزی اور بیہقی نے لوہور لکھا اس کو بیرونی نے ''لوہاور'' کیوں کر دیا؟ ہم نے گزشتہ صفحات میں ایک توجیہ پیش کی ہے کہ بہت ممکن ہے کہ بیرونی کے عہد کی سنسکرت کی کتابوں میں اس کا نام لوہاور ہو یا اس کے برعکس لوہور اور مقامی بولی میں ''لوہاور'' ہو، لہٰذا اس نے مقامی بولی کا تلفظ لکھ دیا یا صورت حال اس کے برعکس بھی ہو سکتی ہے جو زیادہ قرین قیاس ہے۔

بہر حال اب قانون مسعودی میں وارد نام کے پیش نظر میری ذاتی رائے یہی ہے کہ اس شہر کا علمی نام ''لوہاور'' ہی رہا ہوگا، کیونکہ قانون مسعودی، کتاب الہند سے زیادہ دقیق کتاب ہے اور عام بولی میں اس کا نام اس زمانے میں بھی لوہور یا لہور رہا ہوگا، ایرانیوں یا افغانیوں نے اس کو اپنی زبان میں لاہور کر دیا، لیکن دلچسپ بات یہ ہے کہ اہل پنجاب کی زبان پر یہی قدیم نام ''لہور'' رائج ہے، جو لوہور ہی کی بگڑی ہوئی آسان شکل ہے اور بیشتر قدیم عرب اور فارسی مصنفین نے اس کو ''لوہور'' لکھا ہے، اور یہی ان سکوں پر نقش ہے، جو سلطان مودود (وفات ۴۴۱ھ/ ۱۰۴۹ء) کے عہد میں لاہور کی ٹکسال میں ڈھالے گئے جو لاہور کے میوزیم میں موجود ہیں (۱)۔

ل محمد لطیف کی انگریزی کتاب لاہور، ص ۳۹۸، بحوالہ آثر لاہور از سید ہاشمی فرید آبادی، ص ۱۱

Marfat.com

کتابیات☆

۱۔ البلاذری (۲۷۹ھ) فتوح البلدان، القاہرۃ۔۱۹۵۶ء۔

۲۔ ابن خرداذبہ (تقریباً ۳۰۰ھ) المسالک والممالک، برل، لائیڈن، ۱۹۸۹ء۔

۳۔ ابن حوقل (۳۸۰ھ) صورۃ الارض، مکتبہ دار الحیاۃ، بیروت۔ (ت۔ن)

۴۔ المقدسی البشاری (۳۸۰ھ) احسن التقاسیم فی معرفۃ الاقالیم، برل، لائڈن ۱۹۰۶ء۔

۵۔ غیر معلوم مصنف (۳۷۲ھ) حدود العالم (فارسی)

۶۔ عتبی (۴۲۷ھ) تاریخ یمینی۔ لاہور

۷۔ البیرونی (۴۴۴ھ) کتاب الہند، دائرۃ المعارف العثمانیہ، حیدرآباد دکن ۱۹۵۸ء

۸۔ 〃 〃 القانون المسعودی (۲ جلدیں) 〃 〃 ۱۹۵۴۔۱۹۵۶ء

۹۔ بیہقی (۴۷۱ھ) تاریخ مسعودی المعروف بہ تاریخ بیہقی، عربی ترجمہ بقلم ڈاکٹر یحییٰ الخشاب وصادق نشأت، بیروت۔۱۹۸۳ء

۱۰۔ السمعانی (۵۶۲ھ) کتاب الانساب، تحقیق عبداللہ عمر البارودی، (۵ جلدیں) بیروت ۱۹۸۸ء

۱۱۔ یاقوت الحموی (۶۲۶ھ) معجم البلدان (۵ جلدیں) بیروت۔۱۹۷۹ء

۱۲۔ ابن الاثیر (۶۳۰ھ) الکامل فی التاریخ (۹ جلدیں) بیروت۔۱۹۶۷ء

۱۳۔ القزوینی (۶۸۲ھ) آثار البلاد واخبار العباد، بیروت۔۱۹۶۷ء

۱۴۔ ابن فضل اللہ العمری (۷۴۹ھ) مسالک الابصار (مملکۃ الہند والسند تحقیق محمد سالم العوفی، الریاض ۱۹۹۰ء

۱۵۔ ابن بطوطہ (۷۷۹ھ) رحلۃ ابن بطوطہ۔ القاہرۃ ۱۹۵۸ء

☆ جن کتابوں سے اس مقالے کی تیاری میں رجوع کیا گیا، ان کے نام زمانی ترتیب سے دیے گئے ہیں۔

Marfat.com

۱۶۔ فرشتہ، محمد قاسم (تقریباً ۱۶۰۴ء) تاریخ فرشتہ (فارسی) نول کشور پریس، لکھنؤ ۱۲۸۱ھ/ ۱۸۶۴ء

۱۷۔ سجان رائے (تقریباً ۱۶۹۶ء) خلاصۃ التواریخ (فارسی) اردو ترجمہ ڈاکٹر ناظر حسن زیدی، مرکزی اردو بورڈ، لاہور۔ ۱۹۶۶ء

۱۸۔ سید ہاشمی فرید آبادی۔ مآثر لاہور، طبع دوم ۱۹۷۶ء

۱۹۔ ڈاکٹر محمد ناظم، مقالہ ''محمود غزنوی'' اردو دائرہ معارف اسلامیہ پنجاب، لاہور۔ ۱۹۸۲ء

۲۰۔ ڈاکٹر سید محمد عبداللہ، مقالہ ''لاہور'' ، ، ، ،

۲۱۔ Schwartzberg, J.E., A Historical Atlas of South Asia, Chicago, 1978.

۲۲۔ ماہنامہ نقوش، لاہور نمبر، لاہور۔ ۱۹۶۲ء

Marfat.com

کراچی کی تاریخی حیثیت۔ایک نیا انکشاف

پاکستان کے اس اہم ترین اور سب سے بڑے شہر کے بارے میں عام لوگ تو کیا اچھے خاصے اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگوں کی معلومات بھی انتہائی سطحی ہیں، عام طور پر یہ مشہور ہے کہ اس خطۂ زمین پر کسی مائی کلاچی یا کولاچی کے نام پر ایک قصبہ آباد ہوا، جو بڑھتا چلا گیا، بعد میں یہ لفظ مرور زمانہ سے بدل کر کراچی ہوگیا۔

اس عام افسانوی روایت سے قطع نظر، پاکستان کے ایک مشہور محقق اور تاریخ سندھ کے رازداں جناب ڈاکٹر نبی بخش بلوچ (سابق وائس چانسلر سندھ یونیورسٹی، سابق وفاقی سیکرٹری تعلیمات، وحال چیئر پروفیسر سندھالوجی، حیدرآباد) نے سندھ کی قدیم اور مشہور ترین فارسی تاریخ، فتح نامہ سندھ المعروف بہ چچ نامہ پر اپنے تحقیقی تفصیلی نوٹس میں سندھ کے قدیم ساحلی شہر دیبل (دیول) کے محل وقوع سے بحث کرتے ہوئے اور انیسویں صدی کے مشہور انگریز مورخ ایلٹ کی اس رائے کی تردید کرتے ہوئے کہ کراچی ہی وہ شہر ہے جہاں عربوں کا ذکر کردہ قدیم شہر دیبل آباد تھا، لکھا ہے کہ:

''سن ۱۷۲۵ء سے پہلے کراچی کا کوئی وجود نہیں تھا اور بندرگاہ کی حیثیت سے کراچی سب سے پہلے سن ۱۷۲۹ء میں استعمال ہوا۔'' (ملاحظہ ہو چچ نامہ، تصحیح وتحقیق وشرح ڈاکٹر نبی بخش خاں بلوچ، اردو ترجمہ جناب اختر رضوی ص ۳۷۱، سندھ ادبی بورڈ، حیدرآباد۔۱۹۶۳ء)

ڈاکٹر صاحب موصوف نے اپنے انتہائی محققانہ تاریخی حواشی میں اپنے اس دعویٰ کی تائید میں کوئی تاریخی حوالہ پیش کرنا ضروری نہیں سمجھا ہے، گویا ان کے نزدیک یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے۔اگرچہ انہوں نے اپنی دوسری تشریحات میں کافی اور مستند حوالے دیئے ہیں اور غالباً کراچی کی تاریخی حیثیت پر عام اور مقبول نقطۂ نظر یہی ہے، کیونکہ موصوف نے وثوق کے ساتھ یہی ایک بات تحریر کی ہے کہ سن ۱۷۲۵ء سے قبل کراچی کا کوئی وجود نہیں تھا، ورنہ اگر یہ کوئی اختلافی بات ہوتی تو محقق موصوف تاریخی حوالوں سے بھرپور اپنے حواشی (نوٹس) میں اس موضوع پر کوئی

Marfat.com

حوالہ پیش کرتے۔

اب خواہ یہ ڈاکٹر نبی بخش کا نظریہ یا تحقیق ہو یا کسی دوسرے مورخ و محقق کا نقطۂ نظر، لیکن حقیقت یہ ہے کہ ایک انتہائی اہم لیکن غیر معروف وقدیم عربی ماٰخذ میں موجود نا قابل تردید شواہد کی بناء پر یہ ایک قطعی غلط نظریہ ہے، جس کی تصحیح مورخین و مصنفین اور اہل کراچی و سندھ کو کر لینی چاہیے۔ ان شواہد کے مطابق ڈاکٹر نبی بخش بلوچ کے بیان کردہ سال سے دوسو سال قبل بلکہ اس سے بھی پہلے کراچی نہ صرف موجود تھا بلکہ ایک اہم بندرگاہ تھا۔

تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ جزیرہ عرب کے ایک مشہور ملاح (Navigator) اور جہا' رانی وسمندری علوم کے مصنف سلیمان بن احمد بن سلیمان المہری نے اپنی کتاب ''المنہاج الفاخر فی علم البحر الزاخر'' میں کراچی کی بندرگاہ کا متعدد بار ذکر کیا ہے۔ سلیمان المہری مشرقی یمن میں آباد قبیلہ بنی مہرہ کا ایک فرد تھا، اب یہ علاقہ سلطنت عمان (ع پر پیش اور بغیر تشدید کے میم کے ساتھ، جس کو اردو صحافت میں غلط طور پر اومان لکھا جاتا ہے۔ یہ اردن کے پایہ تخت سے جدا ہے، اگرچہ دونوں کا املاء ایک ہے، لیکن تلفظ میں فرق ہے) میں شامل ہے، وہ غالباً عمان کا رہنے والا تھا، یہی وہ عمان ہے جس کی مختلف بندرگاہوں سے بادبانی جہاز افریقہ اور ایران و ہندوستان کے سواحل ہوتے ہوئے چین کی بندرگاہوں تک جاتے تھے، اور اسی ملک کا وہ طلسماتی ملاح تھا جسے سندباد البحری کے نام سے روایتوں میں ذکر کیا جاتا ہے۔

سلیمان المہری اپنے زیادہ مشہور پیش رو یعنی پندرھویں صدی عیسوی کے نصف آخر کے جہاز ران ابن ماجد کی طرح جہاز رانی، سمندری علوم اور بحر عرب و بحر ہند کے ساحلی شہروں کے بارے میں متعدد عربی کتابوں کا مصنف ہے، جن میں دو کتابیں ''المنہاج الفاخر فی علم البحر الزاخر'' اور ''العمدۃ المہریہ'' بہت مشہور ہیں۔ اول الذکر کتاب سن ۱۵۱۲ء یعنی سولھویں صدی کے اوائل میں مصنف کے بقول لکھی گئی۔

یہ دونوں کتابیں سلیمان المہری کے بعض دوسرے رسائل اور احمد بن ماجد النجدی کے بعض منظوم رسائل کے ساتھ پیرس کے ایک قلمی نسخے سے ایک فرنچ مستشرق گبریل فیران (Gabriel Ferrand) نے سن ۱۹۲۵ء میں پیرس سے عکسی صورت میں شائع کی تھیں، جو

Marfat.com

ہماری نظر سے گزری ہیں۔ اس کے بعد ایک شامی مصنف ابراہیم خوری نے دمشق میں موجود ایک نئے قلمی نسخہ کی مدد سے المنہاج الفاخر کو باقاعدہ ایڈٹ کر کے دمشق سے ۱۹۷۰ء میں شائع کیا ہے۔

سلیمان المہری ایک ایسا جہاز راں تھا، جو اپنے بادبانی جہازوں کے ساتھ خلیج فارس سے برابر مکران وسندھ اور ہندوستان کے مغربی سواحل تک آتا رہتا تھا۔ اس نے اپنی اس کتاب میں دوسرے ملاحوں کی سہولت ورہنمائی کے لیے بحیرہ عرب و بحر ہند کے محفوظ بحری راستوں اور مذکورہ ممالک کی بندرگاہوں پر جہازوں کے لنگر انداز ہونے کا محفوظ طریقہ بتایا ہے۔ اس نے اس ضمن میں سواحل سندھ وہند کی بندرگاہوں کا تذکرہ کرتے ہوئے کراچی کا بھی پانچ مرتبہ ذکر کیا ہے، دو مرتبہ صفحہ ۱۰ پر، ایک مرتبہ صفحہ ۱۳۹ پر اور پھر دو مرتبہ صفحہ ۱۴۰ پر۔ وہ کراچی کو اپنی کتاب میں ''کراشی'' لکھتا ہے، یہ اس لیے کہ عربی زبان میں حرف (چ) نہیں ہے، اور اکثر قدیم عرب مصنفین نے فارسی وہندی الفاظ میں (چ) کی جگہ (ش) کو استعمال کیا، بعض مواقع پر انہوں نے (چ) کی جگہ (ص) بھی استعمال کیا ہے، جیسا کہ تیسری و چوتھی صدی ہجری اور بعد کے عرب جغرافیہ نویس (بلوچ) کو (بلوص) لکھتے ہیں۔ موجودہ زمانے کے عرب، مصریوں کی تقلید میں (چ) کی جگہ (تش) استعمال کرتے ہیں اور اس طرح وہ چرچل کو تشرشل اور کراچی کو کراتشی لکھتے ہیں۔

ایک اہم بات ضمناً یہ ہے کہ وہ کراچی کو خلیج دیول (قدیم دیبل) کا ''راس'' یعنی سرشار کرتا ہے، بالفاظ دیگر پہلی بندرگاہ، جو آج بھی درست ہے۔

یہاں یہ بات دلچسپی سے خالی نہیں کہ اس مصنف کے زمانے یعنی سولھویں صدی عیسوی تک قدیم عربی کتابوں میں مذکورہ سندھ کی قدیم ومشہور بندرگاہ ''دیبل'' عرب جہاز رانوں کے یہاں اپنے قدیم ہندی نام ''دیول'' سے معروف تھی، اور یہی نام مشہور انگریز مصنف میجر جنرل ہیگ (M.R. Haig) نے اپنی محققانہ کتاب The Indus Delta Country میں لکھا ہے۔

ایک دوسری اہم بات یہ ہے کہ وہ ملاحوں کی رہنمائی کے لیے کراچی کے سمندر کے بارے میں ہدایت کرتا ہے ''اور یہ بات یاد رکھو کہ جب تم کراچی پہنچ جاؤ تو خلیج (یعنی خلیج دیول) میں جانے اور وہاں سے نکلنے کے لیے ایک مقامی رہنما (گائیڈ) اپنے ساتھ لے لو۔'' (ص ۱۴۰)

Marfat.com

، کیونکہ یہاں پر پچ کھاڑی میں جہازوں کے پھنسنے یا ٹکرانے کا اندیشہ رہتا ہے۔

یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ سلیمان المہری نے کراچی سے متصل مشرقی جانب وہ چھوٹے جزیروں کا بھی ذکر کیا ہے اور جہاز رانوں کو بتایا ہے کہ وہ کراچی کے علاوہ ان دونوں جزیروں پر بھی لنگر انداز ہو سکتے ہیں، یہ دونوں جزیرے یقیناً منوڑا اور بابا بھٹ ہیں۔

سلیمان المہری کی یہ اہم کتاب انگریزوں اور ہمارے محققین کے سامنے نہ تھی، ورنہ وہ ہرگز یہ نہ لکھتے کہ کراچی اٹھارھویں صدی عیسوی کے اوائل یعنی ۱۷۲۵ء سے قبل موجود نہ تھا، اور یہ کہ وہ بندرگاہ کی حیثیت سے ۱۷۲۹ء میں پہلی بار استعمال ہوا، کیونکہ مذکورہ بالا کتاب پہلی بار سن ۱۹۲۵ء میں پیرس سے عکسی شکل (Facsimile) میں شائع ہوئی، اس کا ذکر لائیڈن کی شائع شدہ انسائیکلوپیڈیا آف اسلام کے نئے ایڈیشن میں بھی ہے، جو کافی پہلے طبع ہوئی ہے۔ افسوس ہے کہ پنجاب یونیورسٹی سے شائع شدہ ضخیم دائرہ معارف اسلامیہ میں بھی کراچی کی تاریخ کے بارے میں وہی قدیم معلومات ہیں، جن کا ذکر ہم نے اپنے مقالے کے شروع میں کیا، اور جو ناقابل اعتبار ہیں۔

ہمارے پیش کردہ شواہد کی روشنی میں یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ گئی کہ کراچی شہر کا وجود سن ۱۹۲۵ء میں نہیں بلکہ اس سے دو سو سال پرانا ہے، یعنی اس شہر کو اپنی جگہ پر تقریباً پانچ سو سال ہو چکے ہیں، ہو سکتا ہے کہ یہ اس سے پہلے بھی موجود ہو اور دیول (دیبل) کی اہمیت مرور زمانہ کے ساتھ کم ہونے کے سبب کراچی کی اہمیت بڑھتی چلی گئی ہو حتیٰ کہ اب دیول (بھنبھور) کھنڈرات کی صورت میں ہے اور کراچی دنیا کا ایک اہم شہر اور بندرگاہ ہے۔ اس کی جو ترقی پاکستان بننے کے بعد ہوئی ہے، وہ بھی اظہر من الشمس ہے اور شہر اسی طرح بگڑتے اور بنتے رہے ہیں۔

ہماری اس تحقیق و تحریر سے ایک اور بات واضح ہوتی ہے کہ کراچی بلکہ مکران کے سواحل کی تاریخ عربی مآخذ سے رجوع کیے بغیر صحیح طور پر نہیں لکھی جا سکتی، اور افسوس کہ ہماری یونیورسٹیوں میں اس کا فقدان ہے اور عربی مدارس کے طلبہ تو کیا اساتذہ تک ان مآخذ بلکہ جغرافیہ کے اس علم سے ہی نابلد ہیں جو کسی علم البلدان کے نام سے عربوں کا ایک مایۂ ناز علم تھا اور جس سے یورپی اقوام نے اس علم کی متعدد عربی کتابیں شائع کر کے بہت فائدہ اٹھایا اور علم و معرفت کی بڑی خدمت کی ہے۔ وہ یقیناً اس خدمت کے لیے ہمارے شکریہ کے مستحق ہیں۔

Marfat.com

سیاسی اقتدار اور تاریخ کا سبق

سیاسی اقتدار یا منصب حکمرانی نے انسانی تاریخ میں عجیب عجیب کرشمے دکھائے ہیں، اس اقتدار کا مظہر کبھی کوئی بادشاہ رہا ہے، کبھی شہنشاہ، کبھی ڈکٹیٹر، کبھی سلطان وخلیفہ اور کبھی جمہوری طور پر منتخب شدہ صدر اور وزیر اعظم۔ ان چھوٹے، بڑے اور بہت بڑے حکمرانوں کے کرشموں کی تو کوئی حد نہیں ہے، کبھی کوئی فرعون اپنی قوم سے کہہ رہا ہے۔ "اَنَا رَبُّكُمُ الْاَعْلٰى" (سورۃ النازعات، آیت ۲۴) یعنی "میں تمہارا سب سے بڑا پروردگار ہوں۔ کبھی کوئی نیرو Nero عظیم شہر روما کو جلوا کر نشۂ قوت میں خوشی کی بانسری بجاتا ہے، کبھی کوئی ہنری ہشتم اپنے آپ کو زمین پر عیسیٰ علیہ السلام کا نمائندہ اور چرچ کا مقتدر اعلیٰ گردانتا ہے، کبھی کوئی اکبر دین الٰہی ایجاد کرتا ہے اور اپنی ذات کو مظہر خداوندی سمجھ کر روز صبح کو رعیت کو اپنا درشن کراتا ہے اور ہندو روایتی حکمراں تو مہاراج، ان داتا سے کم پوزیشن پر راضی ہی نہیں ہوتے۔

ان قولی یا فعلی کرشموں کا محرک وہ نشۂ قوت ہے جس کے بارے میں علامہ اقبال نے کہا تھا:

تاریخ امم کا یہ پیام ازلی ہے
صاحب نظراں نشہ قوت ہے خطرناک
اس سیل سبک سیر و زمیں گیر کے آگے
عقل و نظر و علم و ہنر ہیں خس و خاشاک

مگر ان کرشموں میں سب سے عجیب کرشمہ وہ ہے جس کا ظہور حکمراں کی ہمہ دانی کے زعم میں ظہور پذیر ہوتا ہے۔ دوسری اقوام کی تاریخ سے قطع نظر ہم اس غرور علم ودانش کے آثار و مظاہر اور اس کے نتائج بد کو اسلامی تاریخ کے ماضی وحال میں دیکھنا چاہتے ہیں تاکہ اس میں ہمارے لیے سامان عبرت ہو اور ہمارے حکمراں اس کی روشنی میں اپنا اور قوم کا مستقبل تاریک کرنے سے محفوظ رہیں۔ عباسی خلیفہ ہارون الرشید کا بیٹا خلیفہ المامون ہمارے سیاسی وفکری عروج کا ایک انتہائی

Marfat.com

تابناک ستارہ تھا۔اس کے عہد میں جو علمی ترقی ہوئی، وہ کسی صاحب علم سے مخفی نہیں، وہ خود بڑا ذی علم تھا۔علماء و مفکرین کی قدر دانی اور سرپرستی کرتا تھا، اس کے عہد میں ہارون الرشید کا قائم کردہ ''بیت الحکمۃ'' ترقی اور علمی فیض رسانی کے اعلیٰ مدارج پر پہنچا، جہاں انسانی فکر کی تقریباً تمام اہم تخلیقات کو عربی زبان میں منتقل کر دیا گیا اور یہ سلسلہ بعد کو تقریباً سو سال تک جاری رہا۔جس کے سبب مسلمان سائنسی علوم میں بڑی اہم خدمات انجام دے سکے۔

اپنی اس علم دوستی و دانش پروری کی وجہ سے المامون رعایا کو انتہائی محبوب تھا لیکن آخر عمر میں اس نے اپنے غرور علم کے سبب ایک ایسی غلطی کی جس کی وجہ سے اس کی شخصیت عام رعایا کی نظر میں اور بعد کو تاریخ کی نظر میں انتہائی مکروہ و ناپسندیدہ ہوگئی۔اس نے یونانی فلسفہ اور معتزلی علماء کے اثر سے متاثر ہو کر قرآن کریم کے متعلق جمہور سے ہٹ کر یہ عقیدہ عام کیا کہ وہ ''مخلوق'' ہے، اسلام کی فکری تاریخ میں اس کو ''عقیدۂ خلق القرآن'' کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔المامون نے ریاستی جبر سے اس کو اپنی قلمرو میں زبردستی نافذ کیا، علماء کو اس پر مختلف قسموں کے دباؤ سے مجبور کیا، جن دو تین حق پسند و حق گفتار علماء نے المامون کے اس جبر کے سامنے سر نہیں جھکایا جن کو پابند سلاسل کیا گیا، ان میں سرفہرست امام احمد بن حنبلؒ کی ذات گرامی تھی، جنہوں نے المامون اور بعد کو خلیفہ المعتصم اور الواثق کے ہر ظلم و جور کو برداشت کیا، قید و بند کی اذیتیں سہیں مگر اس فاسد عقیدہ کو نہ تو قبول کیا اور نہ دوسروں کے لیے جائز سمجھا، کیونکہ جمہور مسلمین کا یہ عقیدہ رہا ہے کہ قرآن اللہ کا کلام ہے اور اس کا کلام اس ذات کی طرح لافانی ہے جب کہ وہ ہر شے جو مخلوق ہے فانی ہے۔

امام احمد بن حنبلؒ تو بالآخر متوکل کے عہد میں باعزت رہا ہوئے اور اسی خلیفہ کے حکم سے یہ فاسد عقیدہ ختم ہوا، لیکن المامون نے ہمیشہ کے لیے اپنا نام خراب کیا، اور وہ صرف اس وجہ سے کہ اس کو غرور ہو گیا تھا کہ وہ اس مسئلہ میں اپنی قطعی رائے دینے اور اس کے نفاذ کا حق رکھتا ہے۔

برصغیر کی اسلامی تاریخ میں مغل شہنشاہ اکبر نے فیضی و ابوالفضل کے مشوروں اور تائید سے ''دین الٰہی'' ایجاد کیا، خود کو مظہر خداوندی کہہ کر رعایا سے اپنے لیے سجدہ کرایا۔اسلامی احکام میں قطع و برید کی، اسلامی قدروں کو پامال کیا۔اس کی برقراری کے لیے ہر طریقے سے ریاستی جبر کو استعمال کیا، جس کی کچھ جھلک ہمیں معاصر مورخ عبدالقادر بدایونی کی منتخب التواریخ (فارسی) اور

Marfat.com

مجدد الف ثانی کے مکتوبات میں نظر آتی ہے لیکن آخر کار نتیجہ یہ نکلا کہ اس کے مرنے کے بعد مجدد الف ثانیؒ کی سعئ مسلسل اور قربانیوں سے عہد جہانگیری میں یہ سرکاری ایجاد کردہ دین الٰہی ختم کر دیا گیا، اور اکبر کو پس مرگ بدنامی ہی نصیب ہوئی اور دین الٰہی تو قصۂ پارینہ ہو ہی گیا۔ اس طرح کی دین میں ناروا اور ظالمانہ تحریفوں کے انجام کے بارے میں ارشاد ربانی ہے۔ ''وَقَدِمْنَا اِلٰی مَا عَمِلُوْا مِنْ عَمَلٍ فَجَعَلْنٰهُ هَبَآءً مَّنْثُوْرًا'' (الفرقان ۲۳) یعنی ہم نے رخ کیا اس عمل کی طرف جو انہوں نے کیا تھا اور (بالآخر) ہم نے اس کو بکھرے ہوئے ذرات کی طرح نیست و نابود کر دیا۔

اسلامی تاریخ کے زمان و مکاں میں اس طرح کی یا اس سے ملتی جلتی اور مثالیں بھی مل سکتی ہیں۔ مگر ہم انہی دو مثالوں پر اکتفا کرتے ہوئے جب انتہائی طاقتور حاکمان وقت نے اپنے غرور علم و دانش کی بناء پر دین میں قطع و برید کی کوششیں کیں لیکن ان کو دین و دنیا کی رسوائی کے سوا کچھ نہ ملا، عصر حاضر کی بعض مثالوں کی طرف آتے ہیں۔

مصر کے انتہائی ہر دلعزیز لیڈر جمال عبدالناصر نے انقلاب مصر کے کچھ عرصہ بعد اسلام کی ایک نئی ترجمانی کرتے ہوئے، اشتراکیت (سوشلزم) کو اس کی روح قرار دیا، صبح و شام سرکاری ریڈیو سے اس کا ڈھنڈورا پیٹا گیا کہ اسلام ایک اشتراکی دین ہے، پیشہ ور اور بے ضمیر علماء سے اشتراکیت اور اسلام کے موضوع پر کتابیں لکھوائی گئیں۔ صحافت میں اس کا مسلسل چرچا کیا گیا، روس اور مشرقی یورپ کے اسلامی بلاک سے دوستی کی پینگیں بڑھائی گئیں، اخوان المسلمین کی انتہائی مقبول اور عظیم اسلامی تحریک کو جو اشتراکیت کی مخالف تھی، ہر طرح سے دبایا گیا، اس کے رہنماؤں کو پابند سلاسل کیا گیا، پھانسیاں دی گئیں، ملک بدر کیا گیا، مگر نتیجہ کیا نکلا؟ وہی جو اکبر کے دین الٰہی اور المامون کے ''عقیدۂ خلق قرآن'' کا ہوا تھا۔ جمال عبدالناصر کا یہ سوشلزم بھی هَبَآءً مَّنْثُوْرًا (بکھرے ہوئے ذرات) میں تبدیل ہو گیا، آج مصر میں اس کا کوئی نام لیوا نہیں اور ناکامی و رسوائی اس مصری لیڈر و حکمران کا مقدر بنی۔

ترکی میں کمال اتاترک نے اسلامی قدروں کو مٹانے کی جو کوشش کی تھی، عربی زبان میں اذان و قرآن کی تعلیم و طباعت کو جو ختم کیا تھا، وہ بھی اس صدی کی پانچویں دہائی میں هَبَآءً مَّنْثُوْرًا

Marfat.com

ہو گئی، اور اب وہاں سرکاری اسکولوں میں عربی زبان میں قرآن کی تعلیم دی جاتی ہے، لادینیت وہاں اب ایک ناپسندیدہ و کریہہ چیز ہے اور اسلامی تحریک کامیاب و رواں دواں ہے۔ اور اگر وہاں ریاستی جبر نہ ہو تو ترک قوم اپنے ملک میں شریعت اسلامی کو نافذ کرنا چاہتی ہے۔ وہ صحافی حضرات جو اپنے مخصوص نقطہ ہائے نظر یا صرف انقرہ کے احوال پر نظر رکھنے کے سبب اس سے اختلاف رکھتے ہیں، ان سے میں عرض کروں گا کہ اب تو حال ہی دوسرا ہے کہ نہ صرف استنبول بلکہ ترکی کے طول و عرض میں سعید نورسی کی دینی تحریک اور نجم الدین اربکان کی اسلامک آئیڈیالوجی کی رفاہ پارٹی اور اس کی کامیابیاں سب کے لیے عیاں ہیں، لیکن اب سے ٹھیک ۳۷ سال پہلے جب میں پہلی بار استنبول گیا تھا (۱۹۶۰ء) تو اس وقت وہاں کی مساجد میں مردوں اور عورتوں کی جو حاضری دیکھی تھی اور بعض مساجد میں خاص خواتین کی مجالس وعظ دیکھی تھیں، اور جن میں سے ایک میں میرے ایک ترکی دوست اور لاء کالج کے نوجوان طلب علم احسان توکسرے نے درس دیا تھا، اس کو دیکھ کر میں وہاں مرد و زن میں دینی بیداری پر حیرت کناں اور کمال اتاترک کی کوتاہ نظری اور بے بصیرتی پر ماتم کناں تھا، کہ وہ ترک قوم کے مزاج کو اپنی مغربی تعلیم کی وجہ سے سمجھ ہی نہ سکا کہ اس قوم کا تو خمیر ہی غازی عثمان اول کی اس جہادی تحریک سے اٹھا تھا جو اس نے چودھویں صدی عیسوی کی ابتداء میں بیزنطینی امپائر کے خلاف ایشیائے کوچک (ترکی) کے شمال مغربی سواحل پر شروع کی تھی اور جس کا نقطۂ انجام نوجوان سلطان محمد فاتح کے ہاتھوں ۱۴۵۳ء میں قسطنطنیہ کی فتح تھی۔

میں نے صرف مساجد کی یہ حاضری اور عظیم مسجد ابی ایوب انصاریؓ میں سو ترک بچوں کے حفظ قرآن کا منظر دیکھا تھا، بلکہ استنبول کے قدیم محلہ چہار شنبہ کی ایک چھوٹی سی مسجد میں گفتگو کے دوران ایک معمر ترک نے ہونٹوں پر خاموشی کے لیے انگلی رکھتے ہوئے مجھ سے کمال اتاترک کے بارے میں کہا تھا ''کافر، کافر'' یعنی وہ تو کافر تھا۔ راز داری اس لیے کہ اسی سال یعنی ۱۹۶۰ء میں جنرل جمال گورسل نے ایک فوجی انقلاب کے ذریعہ عدنان مندریس کی حکومت ختم کر دی تھی ان پر اور صدر جمال بایار پر الزام تھا کہ وہ ترکی کو سیکولر کمال ازم کی راہ سے ہٹانے کے مجرم ہیں:

اب تو وہاں دینی بیداری اور سرکاری مدارس میں عربی و دینی تعلیم کا عالم ہی دوسرا ہے۔ سو

Marfat.com

اس طرح عصر حاضر میں چالیس سال قبل ترکی کے سب سے بڑے لیڈر بلکہ بابائے اتراک (کمال اتاترک) کے سیکولرزم کا جنازہ نکلا۔ جس طرح اب بیسویں صدی کی اس آخری دہائی کے شروع میں روس میں سوشلزم کا جنازہ نکلا ہے، یہ سیکولرزم کا نتیجہ تھا، اس غرور علم و دانش کا نتیجہ تھا جس کا منبع جمہوریت کی آڑ میں بے پناہ و بے لگام سیاسی اقتدار تھا، خلیفہ سلطان یا ڈکٹیٹر کا اقتدار نہیں بلکہ ایک صدر جمہوریت کا آئینی اقتدار۔

اب ہم اپنے ملک کی طرف آتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ یہاں کے حکمرانوں نے خواہ وہ منتخب وزرائے اعظم ہوں یا صدور مملکت، اسلام اور اس کی شریعت و اقدار کی ترجمانی کی خود کبھی کوشش نہیں کی، بلکہ یہ کام انہوں نے اہل اختصاص یعنی علماء اور ان اصحاب دانش و بینش کے لیے چھوڑ دیا جنہوں نے عمر عزیز کا کافی حصہ اسلامی علوم و شریعت کو پڑھنے اور سمجھنے میں صرف کیا ہو، لیکن وطن عزیز میں غالباً پہلی بار ہماری موجودہ وزیر اعظم نے جو پیپلز پارٹی کی چیئر پرسن بھی ہیں، اپنے آپ کو اس کا اہل سمجھا ہے کہ وہ دین اسلام اور اس کے اقدار و شریعت کی ترجمانی کر سکتی ہیں، بلکہ موصوفہ نے شاید یہ ترجمانی اپنا فریضہ سمجھا ہے۔ نہیں معلوم نہیں کہ انہوں نے یہ علمی اہلیت کب اور کہاں حاصل کی، کیونکہ بچپن سے لے کر جوانی تک تو ان کی تعلیم مشنری اسکولوں اور امریکہ و آکسفرڈ میں ہوئی ہے، جس کے بعد وہ عملی سیاست میں آگئیں۔

ہماری محترمہ وزیر اعظم کی طرف سے دین کی اس ترجمانی کا پہلا ظہور ۱۶ مارچ ۱۹۹۴ء کو ہوا جب موصوفہ نے ڈیفنس کالج راولپنڈی میں فورسز کے سربراہان اور دیگر اعلیٰ فوجی افسران کے سامنے ایک تحریری لیکچر دیا۔ حسن اتفاق کہ میں نے یہ پورا لیکچر سنا، پھر بعد میں یہ اردو و انگریزی اخبارات میں بھی شائع ہوا، یہ تقریباً ایک گھنٹہ کا طویل لیکچر تھا، اس میں موصوفہ نے دیگر سیاسی، دفاعی، بین الاقوامی امور کے علاوہ اسلامی اقدار پر بھی اظہار خیال کیا۔ انہوں نے اسلام میں عورتوں کی آزادی کی مثال ام المومنین حضرت خدیجہؓ کے تجارتی کردار سے دی تھی، مگر انہوں نے یہ نہیں بتایا کہ یہ تجارتی مشغولیت نزول اسلام سے پہلے کی بات تھی اور دوسرے یہ کہ خود حضرت خدیجہؓ اپنے کاروباری سفروں میں کبھی شام وغیرہ نہیں گئیں، بلکہ دوسروں کو اپنا سامان تجارت لے قافلوں کے ذریعے بھیجتی رہیں، کوئی شک نہیں کہ اسلام نے عورتوں کو پوری معاشی آزادی دی

Marfat.com

ہے، میراث میں ان کا حصہ مقرر کیا ہے، اس کے باوجود مردوں کو بحیثیت والد، شوہر، بھائی ان کی کفالت کا ذمہ دار ٹھہرایا ہے۔ اس معاشی آزادی کا ہرگز وہ مقصد نہیں جو مغرب میں ہے کہ بیٹیاں اور بیویاں مائیں اور دادیاں اپنی روزی کمانے کے لیے دفتروں اور فیکٹریوں میں ماری ماری پھریں۔ موجودہ زمانہ میں معاشی آزادی کا یہی تصور ہے جو اسلامی اقدار سے متصادم ہے۔ اسلام ایسی معاشی آزادی کی حمایت نہیں کرتا جس سے اخلاقی قدریں مجروح ہوں، مردو زن میں باہم ربط کشی ہو، شرم وحیا پامال ہو اور اس کے نتیجہ میں معاشرہ میں وہ اجتماعی برائیاں جنم لیں، جن کو مغربی اقدار کے مطابق برائیاں نہیں سمجھا جاتا ہے۔

افسوس کہ بیگم بے نظیر صاحبہ نے حضرت خدیجہؓ کے اس کردار کی طرف کوئی اشارہ نہیں کیا جو انہوں نے بعثت نبوی کے بعد دعوت اسلامی کے اس کٹھن مرحلے میں ادا کیا جب ان کے شوہر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کفار مکہ کی مخالفتوں اور ایذا رسانیوں سے دوچار تھے، اور حضرت خدیجہؓ اپنے سرمایہ اور اخلاقی مدد سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک بڑا سہارا تھیں۔ عورتوں کا مردوں کے ساتھ یہی تعاون اسلام کو مطلوب ہے تاکہ مل جل کر خیر کی اشاعت کی جا سکے۔ اسی لیکچر میں محترمہ وزیراعظم نے حضرت علیؓ اور حضرت فاطمہؓ کے ازدواجی رشتے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے یہ بیان کرنا ضروری سمجھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علیؓ کو دوسری شادی سے منع کر دیا تھا اور اس سے موصوفہ نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ اسلام میں دوسری شادی جائز نہیں۔ انتہائی افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ یہ ان کی اسلامی تاریخ سے لاعلمی کی دلیل ہے۔

حضرت علیؓ نے سیدہ فاطمہؓ کی وفات کے بعد پانچ خواتین سے شادیاں کیں اور بیک وقت ایک سے زیادہ ان کی زوجیت میں موجود تھیں، ان بیویوں سے کثیر تعداد میں حضرت علیؓ کی اولاد ہوئی۔ حضرت علیؓ کی ان ازواج کے نام ابن حزم اندلسی کی کتاب "جمہرۃ انساب العرب" اور انساب کی دوسری کتابوں میں محفوظ ہیں۔ ہم طوالت کی وجہ سے یہاں ان کے ذکر سے گریز کرتے ہیں۔ اب کوئی ذی ہوش یہ تصور نہیں کر سکتا کہ حضرت علیؓ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کی مخالفت کر رہے تھے۔ مزید یہ کہ خود بیگم بے نظیر کے والد محترم ذوالفقار علی بھٹو صاحب نے بیک وقت تین شادیاں کی تھیں اور خود محترمہ دوسری بیوی کی اولاد ہیں۔

Marfat.com

ماہ جون کے پہلے ہفتہ میں محترمہ وزیراعظم نے کراچی میں ایک موقع پر تقریر کرتے ہوئے قانون شریعت کے ایک اصول کی، جس کا تعلق مقدمات میں گواہی سے ہے یوں تفسیر فرمائی کہ اسلام میں مرد و عورت کی گواہی برابر ہے (جنگ ۳ جون صفحہ اخیر) معلوم نہیں کہ خواتین پولیس کے تھانہ کا افتتاح کرتے ہوئے یہ بات وہ رواداری میں کہہ گئیں یا یہ ان کے طے شدہ رائے ہے، کچھ بھی ہو ان کی یہ تفسیر قرآن کریم کے اس صریح حکم کے خلاف ہے جو سورۃ البقرۃ کی آیت ۲۸۲ میں مذکور ہے کہ "گواہی کے لیے اگر دو مرد موجود نہ ہوں تو ایک مرد اور دو عورتوں کی گواہی" پر بھی اکتفا کیا جا سکتا ہے۔ جمہور امت مسلمہ کا اس پر اتفاق اور چودہ سو سال سے اس پر عمل ہو رہا ہے اور یہی ہمارے ملک کی اسلامی نظریاتی کونسل کا متفقہ فیصلہ ہے۔ اپنے سیاسی اقتدار کے زعم میں انہوں نے جو وعدے کیے تھے وہ ذرات کے ریزوں کی طرح بکھر گئے، اور وہ خود بھی ۵ نومبر ۱۹۹۶ء کو اقتدار سے محروم کر دی گئیں۔

Marfat.com

خلیج کی جنگ☆

آخر کار ساڑھے پانچ ماہ کے انتظار، تیاریوں، زبانی معارک اور سیاسی تحرکات اور ان کی ناکامی کے بعد ۱۷ جنوری ۱۹۹۱ء کو ایک عرب سرزمین، عراق میں اس جنگ کا آغاز ہو گیا۔ جس کی تباہ کاریوں اور سنگین نتائج کے بارے میں ابھی کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ اگرچہ سنسر شپ کے بعد جو کچھ ٹیلی ویژن میں دیکھا جا سکتا اور اخباروں میں پڑھا جا سکتا ہے، اس سے ایک انتہائی ہولناک اور الم انگیز تصویر ابھرتی ہے، اس پر کچھ لکھتے ہوئے طبیعت پر گرانی کا شدید احساس ہے اور قلم سے سیاہی کے بجائے آنسو رواں ہیں۔

۲ اگست ۱۹۹۰ء کو عراق نے اچانک ایک بہت چھوٹے سے انتہائی دولت مند ملک کویت پر حملہ کر کے ایک ہی رات میں اس پر قبضہ کر لیا اور دنیا حیرت میں پڑ گئی۔ کویت کے امیر نے اپنے خاندان کے ساتھ بھاگ کر سعودی عرب میں پناہ لی، یہ بھی حیرت کی بات تھی کہ کویت کی افواج نے کوئی خاص مزاحمت نہیں کی، حکمران کے محل کے پاس ایک مختصر سی مزاحمت میں امیر کویت کے ایک بھائی لڑتے ہوئے مارے گئے اور کچھ سپاہی بھی، لیکن ہزاروں لاکھوں کویتی بھاگ کر سعودی عرب پہنچ گئے۔

اس کے بعد کویت میں جو لوٹ مار مچی اور جس طرح غیر ملکی لوگوں کو کویت چھوڑنے پر مجبور کیا گیا یا تنگ آ کر وہ خود بھاگے اور جس طرح عراق کے ساتھ امریکہ و برطانیہ کی ٹھنی ان سب کو قارئین اخباروں میں پڑھتے رہے ہیں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ عراق کے صدر صدام حسین کا یہ اقدام انتہائی ظالمانہ تھا، اس کا کوئی جواز نہ تھا اور اس حقیقت کے پیش نظر کہ یہی کویت تھا جس نے آٹھ سال تک عراق ایران جنگ میں اربوں بلکہ کھربوں روپے سے عراق کی مدد کی تھی (عراق نے بیشتر ہتھیار کویت اور سعودی

☆ یہ اداریہ فروری ۱۹۹۱ء میں لکھا گیا۔

Marfat.com

عرب کی مسلسل مالی امداد سے خریدے تھے) اس لیے عراق کا یہ اقدام اور بھی ظالمانہ اور کریہہ تھا، یہی نہیں بلکہ عراق نے اپنے ٹینک اور افواج کویت کے ساتھ سعوی عرب کی سرحد پر بھی پہنچا دیے تھے۔ خبروں کے مطابق سعودی عرب کو اس سے خطرہ محسوس ہوا کہ اب عراق اس پر حملہ آور ہوگا اور اس لیے اس نے امریکہ سے فوری طور پر فوجی امداد طلب کی۔ امریکہ جیسے تیار ہی بیٹھا تھا آناً فاناً امریکہ سے فوجی ساز و سامان افواج اور جہاز و ٹینک وغیرہ آنا شروع ہو گئے اور اس بڑی تعداد میں کہ جیسے ایک چھوٹے سے تیسری دنیا کے عرب ملک سے نہیں بلکہ روس یا چین یا کسی دوسرے طاقتور ملک سے جنگ درپیش ہے۔

اور یہ جنگی ساز و سامان جس میں کتنے ہی طیارہ بردار جہاز شامل ہیں، نہ صرف دنیا کی سب سے بڑی طاقت (سپر پاور) امریکہ سے آیا، بلکہ اس کے اتحادی حلفاء برطانیہ، فرانس، کینیڈا، آسٹریلیا، اٹلی، مصر اور شام وغیرہ نے بھی مہیا کیا۔

یہ امریکن، برٹش، فرنچ اور دوسری اقوام کے فوجی سعودی عرب کے طول و عرض اور خاص طور پر مشرقی علاقہ میں ظہران (عام طور پر اخبارات میں مذکور، دہران غلط املاء ہے) سے لے کر شمال میں عرعر تک پھیل گئے، بلکہ قطر، امارات (ابوظہبی، دبئی وغیرہ) عمان (اخبارات میں مذکور املاء اومان غلط ہے) بحرین میں بھی مختلف دستے تعینات ہو گئے۔ طیارہ بردار جہاز نہ صرف خلیج فارس یا خلیج عرب میں لنگر انداز ہوئے بلکہ بحر احمر میں بھی کھڑے کر دیے گئے اور اس طرح ایک انتہائی ہولناک اور طویل المیعاد جنگ کا نقشہ تیار کر لیا گیا۔

امریکہ کی طرف سے دعویٰ یہ کیا گیا کہ یہ سب جنگی تیاری کویت کو آزاد کرانے کے لئے کی گئی ہے، جس پر عراق نے ناجائز قبضہ جما لیا ہے، کسی ذی ہوش انسان کے لیے یہ باور کرنا مشکل تھا کہ امریکہ اور متعدد طاقتور یورپی ممالک کی اعلیٰ پیمانہ پر یہ جنگی تیاری صرف کویت کو آزاد کرانے کے لیے کی گئی ہے، مگر امریکہ اور مغربی ممالک کی طرف سے برابر عالمی ذرائع ابلاغ سے ڈھنڈورا اسی بات کا پیٹا گیا اور عراق کو ایک انتہائی خوفناک اور مہلک آلات حرب رکھنے والی طاقت کے طور پر دنیا کے سامنے پیش کیا گیا۔ حالانکہ یہی وہ عراق تھا جو ایک سال قبل تک امریکہ کا منظور نظر تھا، منظور نظر کیوں تھا؟ اس لیے کہ وہ ایک اسلامی ملک ایران سے کئی سال سے جنگ میں مشغول تھا

Marfat.com

اور امریکہ اس کی مختلف انداز سے انتہائی اہم فوجی اور اطلاعاتی امداد کر رہا تھا۔

یہاں ایک اہم سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ایران کے ساتھ ساڑھے آٹھ سالہ جنگ میں جو عراق یا بالفاظ دیگر صدام حسین ہی نے شروع کی تھی، کیا عراق حق پر تھا جس کی وجہ سے امریکہ اس کی مدد کے لیے تیار ہو گیا تھا؟ اور مختلف ذرائع سے برابر آٹھ سال تک عملی اور اخلاقی مدد کرتا رہا؟ اس کا جواب بظاہر یہی ہے کہ امریکہ ایک طرف ایران میں ابھرنے والی کامیاب اسلامی تحریک (شیعیت سے قطع نظر) سے خائف تھا، جس نے وہاں شاہ ایران کے زمانہ سے قائم سی آئی سی کے سینٹر اور اس کی سازشوں کا قلع قمع کر دیا تھا، امریکی یرغمالیوں کے معاملہ میں امریکہ کو انتہائی زک پہنچائی تھی اور اس وسیلہ سے امریکہ میں منجمد کردہ اربوں ڈالر کا ایرانی سرمایہ نکلوا لیا گیا تھا اور دوسری طرف وہ ان دو مسلم طاقتوں کو باہم لڑوا کر ان کو مالی، حربی و نفسیاتی طور پر کمزور کرنا چاہتا تھا۔ لیکن اس میں وہ پوری طرح کامیاب نہ ہو سکا کہ بالآخر ایران و عراق دونوں نے جنگ ختم کر کے باہمی معاملات طے کر لیے۔

لیکن چونکہ اس طویل جنگ کے بعد عراق ایک اعلیٰ عسکری حیثیت سے ابھرا تھا۔ جس کے پاس اسلحہ کا بھی کافی ذخیرہ تھا اور امریکہ اور اس کے پروردہ اسرائیل کو یہ پسند نہ تھا کہ یہ عراقی فوجی طاقت شرق اوسط میں باقی رہے، جو کبھی اسرائیل کے لیے خطرہ بن سکتی ہے اس لیے اس نے عراق کو کویت پر قبضہ کے لیے ایک سازشی منصوبہ کے تحت اکسایا تا کہ اس کو پوری طرح سے خلیج کے اس اہم علاقہ میں جہاں تیل کی بے پناہ دولت موجود ہے، کھل کر کھیلنے کا موقع ملے اور آئندہ بیس پچیس سال کے لیے اپنے مغربی حلفاء کے ساتھ وہ اس علاقہ پر اس طرح اپنا قبضہ جما لے جیسے پہلی جنگ عظیم کے بعد برطانیہ اور فرانس نے شرق اوسط میں کیا تھا۔

اوائل بیسویں صدی کی ان دو مشہور صلیبی اور استعماری طاقتوں نے مسلمانوں سے اپنی دشمنی کا بدلہ جس انداز سے لیا تھا افسوس کہ اس کو عرب اور مسلمان بھول گئے ہیں، مشہور عربی داں مستشرق اور آکسفرڈ کے تعلیم یافتہ لارنس اوف عربیہ نے حجاز کے شریف مکہ کو اس فریب میں مبتلا کیا تھا کہ اگر وہ ترکوں کے خلاف جنگ میں اتحادی یورپین ممالک کے ساتھ شریک ہو جائے تو ترکوں سے خلافت کا ''تاج'' چھین کر ان کو پہنا دیا جائے گا۔ حجاز و شام، فلسطین اور عراق پر ان کی

Marfat.com

براہ راست حکومت ہوگی، شریف مکہ اس جھانسہ میں آگئے شام ولبنان کے وہ عرب قوم پرست بھی انگریزوں کے ہمنوا ہو گئے جنہوں نے عرصہ سے عثمانی سلطنت کے خلاف خفیہ تحریکیں چلا رکھی تھیں، حجاز اور اردن اور شام کے علاقہ میں صلیبی انگریز طاقت نے ترکوں کے خلاف عربوں کی انگریزوں کے زیر سایہ اس فوجی تحریک کو ''عربی انقلاب'' (Arab Revolt) کا نام دیا جو درحقیقت ایک استعماری صلیبی انقلاب تھا، اس پہلی عظیم جنگ میں جرمنی کی شکست کے ساتھ ترکوں کو بھی شرق اوسط کے علاقہ میں شکست ہوئی، عرب حملہ آوروں نے لارنس اوف عربیہ کے منصوبہ کے تحت اس ریلوے لائن کو برباد کر دیا جو ترکوں نے شام سے مدینہ منورہ تک بچھائی تھی اور جس کے ذریعہ ترکی، شام، اردن اور عراق کے لاکھوں حاجی حجاز مقدس آتے تھے (یہ لائن عربوں کی ہزار کوششوں کے باوجود اب تک دوبارہ نہیں پڑ سکی)۔

لیکن شریف مکہ اور دوسرے عربوں کی اس سیاسی خیانت کا وہی نتیجہ نکلا جو بدیہی تھا، انگریزوں نے اپنے اتحادی فرانس کے ساتھ مل کر ایک خفیہ معاہدہ کیا۔ جو سائیکس پیکو معاہدہ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے کہ اس جنگ عظیم کے خاتمہ کے بعد وہ شام، فلسطین اور عراق کے آپس میں حصے بخرے کرلیں گے جن میں سے بعض پر ان کی براہ راست حکومت ہوگی اور کچھ میں وہ اپنے ماتحت کٹھ پتلی (Puppet) عرب حکومتیں قائم کر دیں گے اور یہی ہوا کہ فلسطین پر انگریزوں نے براہ راست اپنی حکومت قائم کی اور اس کو انتداب (Mandate) کا نام دیا، شام اور لبنان کو علیحدہ کر کے فرانس کے قبضہ میں دے دیا۔ عراق میں شریف حسین کے ایک بیٹے فیصل کو بادشاہ بنا دیا جو انگریزوں کے ماتحت تھا اور شرق اردن نام کی ایک چھوٹی سی مملکت فلسطین میں بنا کر شریف حسین کے ایک دوسرے بیٹے عبداللہ (موجودہ شاہ حسین کے دادا) کو اس کا بادشاہ بنا دیا۔ عسکری اور خارجی امور میں انگریز ہی یہاں کے حقیقی حاکم تھے۔

شریف حسین نے اس ذلت آمیز برتاؤ اور وعدہ خلافی پر احتجاج کیا تو اس کو مالٹا میں جلاوطن کر دیا گیا۔ نجد میں ابھرتی ہوئی ایک علاقائی طاقت آل سعود کی اس جنگ عظیم کے دوران انگریزوں نے پیسے اور معمولی ہتھیاروں سے مدد کی تھی اور عبدالعزیز آل سعود (موجودہ شاہ فہد کے والد) نے آٹھ سال بعد بسہولت حجاز پر اپنا قبضہ جما لیا اور سلطان نجد و ملک حجاز

Marfat.com

لقب اختیار کیا، بعد کو ان دونوں ملکوں کو ضم کر کے المملکۃ العربیۃ السعودیۃ (سعودی عرب) کا نام رکھ دیا گیا۔

انگریزوں اور فرانسیسیوں نے فوراً ہی جزیرۂ عرب کے اس نئے فرمانروا کو تسلیم کر لیا اور اس طرح شریف حسین کا عربی خلافت کا خواب دھرے کا دھرا رہ گیا، بلکہ حجاز کی حکومت سے بھی ان کو ہاتھ دھونا پڑے۔

شرق اوسط کی تاریخ پڑھنے والوں کو یاد رہو گا کہ "عربی انقلاب" کی کامیابی کے بعد دمشق میں صلاح الدین ایوبی کی قبر پر آ کر اتحادی افواج کے انگریز کمانڈر جنرل ایلنبی (Allinby) نے کہا تھا "آج صلیبی جنگ ختم ہوئی۔"

یہ یاد رہے کہ اس وقت شرق اوسط میں انگریزی افواج کا ہیڈ کوارٹرز قاہرہ میں تھا آج پھر مصر عراق کے خلاف عملی طور پر امریکہ کا اتحادی ہے۔

اس داستان پارینہ میں جو زیادہ پارینہ بھی نہیں، بڑا سامان عبرت ہے۔ مسلم دنیا میں ابھرتے ہوئے اسلامی شعور اور خاص طور پر ایران میں امریکہ اور اسرائیل کے گہرے اور مخلص دوست سابق شہنشاہ مرحوم کے خلاف اسلامی انقلاب نے دنیا کی سپر طاقت امریکہ کو چونکا دیا تھا، یہ گہرا اسلامی شعور جو نہ صرف اسلامی دنیا بلکہ یورپ و امریکہ میں مقیم لاکھوں مسلمانوں میں شدت سے گزشتہ دو دہائیوں میں ابھرا ہے۔ مغربی حکومتوں اور خاص طور پر امریکہ کے لیے جو دنیا کو اپنے اشاروں پر چلانا چاہتا ہے، دردسر بن رہا تھا، افغانستان میں مجاہدین کی سرفروشانہ قوت اور کامیابی بھی انہوں نے دیکھ لی تھی، مرحوم ضیاء الحق کے اسلامی جذبہ وعمل اور ماہرانہ سیاست نے بھی ان کو خاصہ پریشان کیا تھا جنہوں نے عربوں کو متحد کرنے میں بھی بڑی مہارت کا ثبوت دیا تھا۔ امریکیوں نے ان کو اپنے راستہ سے ہٹایا اور پھر وہی کھیل کھیلنے کا منصوبہ بنایا جو ۱۹۱۴ء، ۱۹۱۸ء کی جنگ عظیم میں انگریزوں نے کھیلا تھا۔

اس میں شک نہیں کہ اب حالات کسی قدر مختلف ہیں، پہلی جنگ عظیم کے دوران انگریزوں نے یہودیوں سے فلسطین میں اسرائیل کو قائم کرنے کا جو وعدہ کیا تھا وہ انہوں نے ۱۹۴۸ء میں پورا کر دکھایا۔ لیکن اسرائیل اس سارے عرصہ چین سے نہ بیٹھ سکا، کوئی شک نہیں کہ وہ تین بڑی جنگوں

Marfat.com

میں عربوں پر فتح حاصل کرنے میں اور فلسطینیوں کی طاقت کو اردن اور لبنان میں امریکہ کی مدد سے کچلنے میں کامیاب رہا، لیکن وہ فلسطینیوں کے جذبہ مقاومت کو ختم نہ کرسکا، اور نہ اپنی بربریت اور قتل و غارت گری کے باوجود اس تحریک مقاومت کو نہ دبا سکا جو تین سال سے مقبوضہ فلسطینی علاقہ (غزہ اور دریائے اردن کے مغربی علاقہ) میں جاری ہے اور جہاں اسکول و کالج کے بچوں کے پتھروں کا جواب اسرائیل فوجی گولیوں سے دیتے ہیں اور ان میں ہزاروں فلسطینی شہید ہو چکے ہیں۔

ادھر ایران سے طویل جنگ کے باوجود عراق کی فوجی طاقت قائم رہی۔ اس کو جنگ کی جو عملی مہارت اور خاص طور پر فضائی برتری حاصل ہوئی، اس نے سابقہ امریکہ منصوبہ (عراق و ایران کی مکمل عسکری و اقتصادی تباہی) کو خاک میں ملا دیا۔ لہٰذا امریکہ نے نیا جہنمی منصوبہ بنایا جس کے ذریعے عراق کی عسکری طاقت کو مکمل طور پر تباہ کیا جاسکے اور خلیج کی مملکتوں کو اپنا دست نگر بنا کر ان کی تیل کی دولت پر قبضہ کیا جائے۔

بظاہر منصوبہ یہ ہے کہ عراق کی تباہی کے بعد شام سے اسرائیل کو تسلیم کرانے کے بعد جولان کا پہاڑی علاقہ اس کو دے دیا جائے اسی لیے امریکہ نے ساز باز کر کے اپنے ازلی دشمن حافظ الاسد کو اپنے ساتھ اس وقت ملا لیا ہے، اردن کی کوئی فوجی طاقت نہیں، شاہ حسین سے جب چاہے امریکہ اسرائیل کو تسلیم کرا سکتا ہے اور سعودی عرب اور خلیج کی دوسری حکومتیں جن کی امریکہ نے براہ راست فوجی مدد کی ہے، معاہدہ صلح پر بآسانی دستخط کر دیں گی، اسرائیل کو تسلیم کرلیں گی اور بہت ممکن ہے کہ شاہ حسین کی چھٹی کر دی جائے، اردن کے علاقہ میں اعتدال پسند فلسطینیوں کی حکومت قائم کر دی جائے، بڑے پیمانے پر فلسطینیوں کی مقبوضہ فلسطینی علاقہ سے اردن میں نقل مکانی کرا دی جائے اور ایک بڑی تعداد کو کویت میں آباد کر دیا جائے اس طرح مقبوضہ فلسطینی علاقہ اور غزہ میں ان دس لاکھ یہودیوں کی جگہ پیدا کر لی جائے جو روس سے اسرائیل آنا شروع ہو گئے ہیں اور جن کی آباد کاری کے لیے اسرائیل نے امریکہ سے اس جنگ چھڑنے کے تین چار روز بعد دس ارب ڈالر مانگے ہیں اور امریکہ نے اس کو بنیادی طور پر قبول کر لیا ہے، خیال رہے کہ اسرائیل اور امریکہ میں اس فلسطینی نقل مکانی کی آوازیں اٹھ رہی ہیں۔

یہ بھی ممکن ہے کہ اب امریکہ شمالی عراق یعنی موصل و کرکوک کے علاقہ میں ان کردوں کی

Marfat.com

مذاکرات جو برسوں سے عراق کے خلاف جدوجہد کرتے رہے ہیں، وہ کرد عراق کی متحدہ حکومت چاہتے ہیں۔ اس کردی تحریک کا ایک زمانے میں مصطفیٰ برزانی لیڈر تھا، وہ ایران و روس کی مدد سے مذاکرات سے ہے، آخر کار سابق شہنشاہ ایران نے عراق سے شط العرب کا علاقہ لے کر اس معاہدہ کو ختم کرا دیا۔ لیکن کردوں کی یہ بغاوت صدام حسین کے عہد میں پھر شروع ہو گئی تھی اور سب جانتے ہیں کہ اس کو کس طرح زہریلی گیس اور مہلک ہتھیاروں سے کچلا گیا تھا۔ لیکن سی این این نے اس جنگ کے دوران ایک کردی لیڈر کا انٹرویو دکھایا تھا جو عراق سے باہر مقیم ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اب امریکہ ان کردوں کی اس علیحدگی کی تحریک کو ہوا دیں گے۔

امریکہ نے اس جنگ سے اپنے سخت مالی بحران کو بھی حل کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ یہ سب جانتے ہیں کہ امریکہ سخت اقتصادی بحران کا شکار ہے، چند روز قبل ہی کا ذکر ہے، امریکی ذرائع ابلاغ نے بتایا ہے کہ امریکہ کو آئندہ بجٹ میں ۳۲۰ ارب ڈالر کی کمی (Defecit) درپیش ہے اور وہاں دس لاکھ انسان بے روزگار ہیں۔ پھر بچت اور قرض دینے والا ایک سرکاری مالی ادارہ (S & L) ایک مالی بدمعاملگی کا شکار ہے اور اس کو ستمبر ۱۹۹۱ء سے قبل ۸۰ ارب ڈالر کی ضرورت ہے ورنہ یہ ادارہ افلاس کا شکار ہوگا اور اس سے بعض دوسرے بینک بھی متاثر ہوں گے، امریکہ کو خلیج کی جنگ میں اس مالی بحران کو حل کرنے کا زریں موقع ہاتھ آیا، اس لیے وہ کویت و عراق کے سیاسی حل کے لیے تیار نہ ہوا اور اس نے دوسری مغربی طاقتوں کو سلامتی کونسل میں تیار کر کے یو این سے قوت استعمال کرنے کی اجازت بھی حاصل کر لی، روس اپنے فقر و فاقہ اور مشرقی یورپ کی سیاسی آزادی کی وجہ سے ایک سپر پاور کی حیثیت سے ختم ہو چکا ہے جو اپنے ویٹو سے امریکی منصوبہ کو سلامتی کونسل میں روک سکتا تھا۔

اس جنگ کے ذریعے امریکہ نے سعودی عرب اور کویت کو سیاسی اور عسکری حیثیت سے اپنا دست نگر اور محتاج بنانے کے علاوہ ان سے اپنے ان قیمتی ہتھیاروں کی قیمت وصول کرنے کا بہترین موقع سمجھا جو روس سے مقابلہ کے لیے بنائے گئے تھے، بلکہ بعض جنگ ستارگان (Star War) کے لیے سابق صدر ریگن کے عہد میں بنائے گئے تھے اور اب روس کا سیاسی و اقتصادی جنازہ نکلنے کے بعد وہ امریکی اسلحہ خانہ میں بیکار پڑے تھے ان میں سے بعض ایسے جنگی ہوائی جہاز

Marfat.com

ہیں جن میں سے ہر ایک کی قیمت دس کروڑ ساٹھ لاکھ ڈالر ہے، جن کو (Stealth) کے نام سے یاد کیا جاتا ہے یا پھر وہ کروز میزائل ہیں جن میں سے ایک ایک کی قیمت دس لاکھ ڈالر یا ان سے زائد ہے اور یہ سیکڑوں کی تعداد میں عراق پر پھینکے گئے ہیں، دوسرے بھاری جنگی ساز وسامان کی قیمت علیحدہ ہے جن میں انتہائی قیمتی ٹینک اور بھاری توپیں وغیرہ ہزاروں کی تعداد میں ہیں۔ اربوں، کھربوں کے ڈالر اس فوجی ساز وسامان کی سعودی عرب سے قیمت وصول کرنے کے علاوہ آئندہ کے لیے امریکہ نے سعودی عرب اور کویت کو بھاری تعداد میں ہتھیار و جہاز فروخت کر کے مزید رقم وصول کرنے اور اپنی فوجی صنعت کو جاری رکھنے کا انتظام کر لیا ہے۔

سعودی عرب اور کویت نے ابتدائی طور پر ۱۳۔۱۳ ارب ڈالر تو امریکہ کو نقد پیش کر دیئے ہیں، باقی بل بھی وہ یقیناً ادا کریں گے اور اگر جنگ طویل ہوئی اور اس کے روزانہ ایک بلین ڈالر مصارف وہ ادا نہ کر سکے تو پھر تیل کے کنوئیں تو ہیں، امریکہ ان سے وصول کرتا رہے تا کہ اور وہ اپنی اور پوری مملکت کی صنعتیں چلانے کے لیے تیل کی قیمت کو کم کرے گا بلکہ تیل کی دولت پر براہ راست اپنا کنٹرول رکھے گا تا کہ دوبارہ اس کو عرب کسی اسرائیل عرب جنگ میں استعمال نہ کر سکیں جس طرح انہوں نے ۱۹۷۳ء کی عرب اسرائیل جنگ میں استعمال کیا تھا۔ اسی طریقہ کا مالیاتی کنٹرول برطانیہ نے انیسویں صدی کے اواخر میں نہر سوئیز اور شہر قاہرہ کی تعمیر میں شاہ خرچیوں کے سبب خدیوی اسماعیل کے عہد حکومت میں کیا تھا جو تقریباً نصف صدی تک جاری رہا۔

امریکہ نے انتہائی ہوشیاری سے شرق اوسط کے لیے اپنے اس نئے نظام میں حصہ دار بنانے کے لیے برطانیہ اور فرانس کو بھی شریک کر لیا ہے جن کی امریکہ کے بعد سب سے بھاری فوجی طاقت اس جنگ میں شامل ہے اور یہ بالکل وہی صورت ہے جو پہلی جنگ عظیم میں اس علاقہ میں انگریزوں کی قیادت میں پیدا ہوئی تھی، اب قیادت امریکہ کے ہاتھ میں ہے اور سیاسی وعسکری نفوذ میں مستقبل کے حصہ دار برطانیہ اور فرانس ہیں۔

اگر صدام حسین نے کویت پر قبضہ کر کے ایک غلطی کی تھی تو تاریخ بتائے گی کہ اس سے بھاری غلطی سعودی عرب نے امریکہ اور برطانیہ وغیرہ کی زبردست افواج وہاں بلا کر کی ہے، اوپر کے صفحات میں واضح کر دیا گیا کہ یہ شریف حسین شاہ حجاز کی پہلی جنگ عظیم میں غلطی کے مشابہ

Marfat.com

ہے۔ جس نے ترکوں کو حجاز و شام وغیرہ سے نکالنے کے لیے برطانوی صلیبیوں کی مدد لی تھی اور نتیجہ خراب نکلا تھا۔

اور دوسری مثالیں اندلس یا مسلم اسپین کی تاریخ میں ہیں۔ جہاں ساتویں صدی ہجری سے ملوک الطوائف (یہی ترکیب درست ہے) کے زمانہ میں جب کسی ایک عرب مملکت پر دوسری مملکت چڑھائی کرتی تھی تو یہ مظلوم مملکت شمالی اسپین کی عیسائی مملکت قشتالہ سے مدد مانگتی تھی، یہ عیسائی مدد ضرور کرتے تھے لیکن اس کے بعد پھر آخر کار خود ہی اس مدد طلب کرنے والی مملکت پر قابض ہو جاتے تھے۔ یہ عبرتناک عمل مسلسل جاری تھا تا آنکہ آخری مملکت غرناطہ نے فرڈی ننیڈ اور ایزابیلا سے اپنی بقاء کے لیے مدد طلب کی اور بالآخر یہ آخری اسلامی مملکت بھی اپنی آزادی کھو بیٹھی اور تمام معاہدوں کے برخلاف فرڈی ننیڈ نے ۱۴۹۲ء میں غرناطہ پر قبضہ کر کے آخری عرب تاجدار ابو عبداللہ کو وہاں سے نکال دیا اور نتیجتاً وہاں صلیبی عیسائیوں نے اسلام کو بیخ و بن سے اکھاڑ پھینکا۔

افسوس کہ ہمارے عرب بھائی اپنے ذاتی مفادات اور تخت و تاج کی حفاظت میں ایسے سرگرداں ہیں کہ وہ ان عبرتناک قصوں کو بھول گئے ہیں اور غیروں سے وفا کی امید کرتے ہیں۔

تم کو ان سے وفا کی ہے امید　　　جو نہیں جانتے وفا کیا ہے

اب وہ پندرھویں صدی عیسوی کا زمانہ تو نہیں اور یہ نہیں کہا جا سکتا کہ امریکہ اور برطانیہ وغیرہ سعودی عرب اور کویت پر قبضہ جما کر سعودیوں اور کویتیوں کو یہاں سے بے دخل کر دیں گے، لیکن یہ یقین سے کہا جا سکتا ہے کہ وہ ان سے ہمدردی کے لیے یہاں نہیں آئے ہیں، وہ سعودی عرب اور کویت اور خلیج کی دوسری چھوٹی ریاستوں پر اپنا اقتصادی قبضہ ضرور قائم رکھیں گے، سب عربوں کو اسرائیل کے یہودیوں کے سامنے جھکائیں گے اور اسرائیل کو شرق اوسط کی واحد طاقتور قوم بنا کر دم لیں گے اور یہ ایک بڑی عبرتناک بات ہوگی۔ "ان فی ذلك لعبرة لاولی الالباب" (اس میں اصحاب عقل کے لیے بڑا سامان عبرت ہے)

عرب لیگ اور مسلم ممالک کی تنظیم (O.I.C) کو وہ بے اثر کر ہی چکے ہیں، امت مسلمہ کی وحدت کو وہ پارہ پارہ کر ہی چکے ہیں، کوئی شک نہیں کہ یہ کفر و اسلام کی جنگ نہیں اور سعودی عرب و

Marfat.com

عراق دونوں کی طرف سے جہاد کے نعرے بے بنیاد ہیں، کوئی بھی اعلاء کلمۃ اللہ کے لیے نہیں لڑ رہا ہے، لیکن اس جنگ نے صلیب و ہلال کی جنگ کی شکل ضرور اختیار کر لی ہے۔ اس وقت یہ بات اٹھانا بے سود ہے کہ کس نے ابتدا کی، لیکن دیکھنے کی بات یہ ہے کہ کیا ہو رہا ہے اور امریکہ و برطانیہ وغیرہ عیسائی طاقتوں کے عزائم کیا ہیں اور ہم ان کا کیا توڑ سکتے ہیں۔

ایک اور عبرتناک مثال ساتویں صدی ہجری میں اسی طرح کے ایک واقعہ کی ہے۔ ۶۴۸ھ میں دمشق کے ایوبی خاندان کے ایک حاکم الملک الصالح اسماعیل نے اپنے بھتیجے اور مصر کے سلطان، الملک نجم الدین ایوب کے دمشق و فلسطین پر قبضہ کے خوف سے صلیبی عیسائیوں کو جو فلسطین اور لبنان کے بعض سواحل پر تا آں وقت موجود تھے، بیت المقدس اور لبنان کے بعض دوسرے علاقے اس شرط پر دے دیئے کہ وہ الملک نجم الدین ایوب کے خلاف اس کی مدد کریں گے اس کے نتیجہ میں ہزاروں صلیبی دمشق میں آکر ہتھیار خریدنے لگے وہاں کے عام مسلمان اس پر بے چین تھے۔ اس وقت کے ایک مشہور و مخلص عالم و فقیہ سلطان العلماء العز بن عبدالسلام الشافعی الدمشقی خطیب جامع مسجد دمشق نے اس خائن حاکم پر مسجد اموی کے منبر سے تنقید کی اور فتویٰ دیا کہ صلیبی عیسائیوں کے ہاتھوں ہتھیار فروخت کرنا ناجائز ہے۔ ان کو جیل میں ڈال دیا گیا، پھر ان کو ملک بدر کر دیا گیا اور وہ مصر چلے گئے۔ ملک صالح اسماعیل اور نجم الدین ایوب میں بیت المقدس کے علاقہ میں گھمسان کی جنگ ہوئی، جس میں اللہ تعالیٰ نے نجم الدین ایوب سلطان مصر کو فتح نصیب کی اور الملک الصالح اسماعیل خوار و ذلیل اور اپنوں میں مطعون ہو کر ختم ہوا۔ اور دوبارہ بیت المقدس مسلمانوں کے قبضہ میں آ گیا اور یورپ کے صلیبی عیسائیوں کو وہاں سے بھاگنا پڑا۔

خلیج کی جنگ میں فریقین میں بے پناہ عدم توازن کی جو صورت ہے اس سے بظاہر اور صدام حسین کے اقوال کے بالکل برخلاف یہ تو نظر نہیں آتا کہ یہاں عراق کو امریکہ اور اس کے طاقتور یورپی اتحادیوں پر فتح ہوگی، بلکہ نتیجہ ظاہر ہے کہ بڑی تباہی و بربادی کے بعد آخر کار شکست ہی مقدر ہے لیکن اتنا ضرور ہے کہ اس جنگ کے نتیجہ میں تمام دنیا میں اور ان ممالک میں بھی جن کے امریکہ سے پرانے اور دوستانہ تعلقات ہیں۔ امریکہ کے خلاف ایک شدید جذبۂ نفرت پیدا ہو چکا ہے۔ عالم اسلام کے گوشہ گوشہ میں اس کے خلاف مظاہرے ہو رہے ہیں اور یقین ہے کہ جنگ

Marfat.com

ختم ہونے پر یہ جذبات خود انہی عرب ممالک کے عوام میں مزید بڑھیں گے جو آج امریکہ کے اتحادی ہیں یا جنہوں نے امریکہ کو اپنی نجات کے لیے خلیج میں بلایا ہے۔اسی طرح امریکہ کا نفوذ ایک ظالم و جابر قوت کی حیثیت سے تو غالباً شرق اوسط میں قائم رہے لیکن امریکہ کے خلاف نفرت کا جو ابال اٹھے گا وہ امریکہ کو یہاں چین سے نہ بیٹھنے دے گا اور مسلمان باہم متحد ہو جائیں گے۔

اب تک جو کچھ ہوا ہے اس کا ایک مثبت نتیجہ تو ظاہر ہے وہ یہ کہ مسلمانوں کو یہ احساس ہو گیا ہے کہ وہ امریکہ اور یورپ کی صلیبی طاقتوں کے خلاف کھڑے ہو سکتے ہیں اور جواباً عسکری میدان میں ان کو نقصان پہنچا سکتے ہیں، دنیا کی عظیم ترین طاقت امریکہ جس کے ساتھ دوسری یورپین طاقتیں اپنے جہنمی اسلحہ اور تکنیکی مہارت کے ساتھ موجود ہیں۔ایک تنہا مسلمان ملک سے نبرد آزما ہیں اور صبح و شام اس پر آگ و آہن کی بارش کر رہے ہیں۔مگر پھر بھی وہ اس عظیم طاقت بلکہ طاقتوں کے سامنے ڈٹا ہوا ہے اور وہی امریکہ جس نے کہا تھا کہ زیادہ سے زیادہ دس روز میں یہ جنگ ختم ہو جائے گی۔بائیس دن گزر جانے کے باوجود عراق کو زیر کرنے میں ناکام رہا ہے اور دو بدو زمینی جنگ سے بھاگ رہا ہے۔اس تاخیر کو امریکہ اپنی جنگی حکمت عملی قرار دے رہا ہے لیکن یہ "یلقی الرعب فی قلوبھم" کا عملی مظہر بھی ہو سکتا ہے کہ بہرحال عراقی کلمہ گو تو ہیں، یہ تصور کرنا غلط ہے کہ ان کی جنگ سعودیوں یا کویتیوں سے ہو رہی ہے، یہ بہرحال امریکہ اور یورپی ممالک سے ایک جنگ ہے جن کے لاشعور میں صلیبی جذبہ کارفرما ہے۔

ہمارے کمانڈر ان چیف نے اپنی حالیہ تقریر میں اس کو معرکۂ کربلا سے تشبیہ دی تھی جو اپنی جگہ بالکل صحیح تھی کہ وہاں بھی ظلم و جبروت ایک انتہائی مختصر حق کی طاقت سے نبرد آزما تھا۔یہاں وہی استکبار و جبروت صلیبیت کے جذبہ کے ساتھ ایک چھوٹی سی مسلمان طاقت کو ہر قیمت پر کچلنے پر اڑا ہوا ہے۔

"والی اللہ المشتکی وھو المستعان"

جمادی الاخریٰ ۱۴۱۱ھ

فروری ۱۹۹۱ء

Marfat.com

صدام حسین ۔ کویت اور عراق

ایک لغوی، سیاسی، تاریخی اور جغرافیائی جائزہ

کویت پر عراق کے قبضہ اور پھر خلیج کی حالیہ جنگ کے بعد سے کویت اور صدام حسین و عراق لوگوں کا موضوع سخن بنا ہوا ہے، ہماری صحافت میں ان کے بارے میں عجیب و غریب باتیں لکھی جا رہی ہیں۔ مثلاً روزنامہ جنگ کی ۲۳ جنوری کی اشاعت میں خلیج کی جنگ پر ایک مضمون کے ساتھ ایک مختصر کالم ''صدام کیا ہے'' میں لفظ صدام کے معنی اس طرح بتائے گئے ہیں:

''مرکزی علماء و مشائخ کونسل کے سیکرٹری جنرل صاحبزادہ محمد یونس کاظمی کے مطابق لفظ صدام کے لغوی معنی ''زوال اور حادثہ کو روکنے والا'' کے ہیں۔ نظریاتی کونسل کے ایک رکن سید ذاکر حسین کے مطابق صدام کا ایک مطلب ''اچانک نمودار ہونے والا بھی'' ہے۔ روایت کے مطابق حضرت یعقوب کرخی نے ایسے ناموں کو جو غیر منقوط یا بغیر نقطہ کے ہوتے ہیں ''رعب اور دبدبہ والا قرار دیا ہے۔''

اس کو پڑھ کر وہ آدمی جس کو تھوڑی بہت بھی عربی آتی ہے۔ سر پکڑ کر بیٹھ جاتا ہے۔ ''ناطقہ سر بگریباں کہ اسے کیا کہیے۔'' حسن ظن اور خوش عقیدگی میں لوگ کیا کیا باتیں لکھ جاتے ہیں اور عام قارئین کو کس طرح گمراہ کرتے ہیں۔

مرکزی علماء و مشائخ کے ان سیکرٹری جنرل صاحبزادہ صاحب اور نظریاتی کونسل کے فاضل ممبر صاحب کے ان ''افکار عالیہ'' پر حیرت ہوتی ہے کہ ان کو لفظ ''صدام'' کے یہ عجیب و غریب ''لغوی'' معانی کس لغت میں نظر آئے! کسی عربی اسکول میں پڑھنے والا ایک بچہ بھی جانتا ہے کہ ''صدام''، فعل صدم، یصدم۔ صدماً و صدمۃ سے ماخوذ صیغہ مبالغہ ہے، بالکل اس طرح جیسے جبار، علام، قتال، حنان (یعنی بہت زیادہ جبر کرنے والا، بہت زیادہ جاننے والا، بہت زیادہ قتل کرنے

Marfat.com

والا، بہت زیادہ شفقت کرنے والا) وغیرہ ہیں اور عربی فعل صدم کے معنی لغت میں کسی سخت چیز کو دوسری سخت چیز سے ٹکر مارنے کے ہیں یا دھکا دینے کے ہیں اور اس طرح ''صدام'' کے معنی سخت ٹکر مارنے والے کے ہیں۔

عربی زبان کے مشہور ترین اور مستند ترین لغات ''القاموس المحیط'' (مختصراً قاموس) چار اجزاء دو جلدیں اور لسان العرب (۱۵ جلدیں) ہیں، جو عام طور پر عرب علماء و محققین استعمال کرتے ہیں ان میں دیکھا جائے تو یہی معنی نظر آئیں گے اور مصر کی زبان و ادب کی اکیڈمی مجمع اللغتہ کی شائع کردہ لغت ''المعجم الوسیط'' میں بھی یہی نظر آئے گا اور بھی ایک تیسرے درجہ کی مختصر لغت المنجد میں ملے گا۔

نہ معلوم ان دو صاحبان علم و فضل کو اس کے بالکل برعکس یہ دو معانی زوال اور حادثہ کو روکنے والا اچانک نمودار ہونے والا'' کس لغت میں نظر آ گئے'' اس فعل ''صدم'' کا ایک مصدر ''صدمہ'' ہے جو اردو میں معنی کی کسی قدر تبدیلی کے ساتھ غم اور دل پر چوٹ پڑنے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے، اس میں بھی وہی لغوی معنی پنہاں ہیں۔ حدیث شریف میں آتا ہے۔ "الصبر عند الصدمة الاولی'' (صبر وہ ہے جو پہلی چوٹ پر ہو) جب سمندر میں دو جہاز ٹکراتے ہیں تو اس کو اصطدام کہا جاتا ہے اور اب یہ کار ایکسیڈنٹ کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے۔ عربی ممالک میں رہنے والے پاکستانی بھی اس سے واقف ہوں گے کہ جب موٹر کار کی ٹکر کا کوئی حادثہ پیش آتا ہے، تو اس کو (اسی مادہ ص دم سے ماخوذ باب افتعال) کہا جاتا ہے۔ اردو میں اس لفظ کی دوسری صورت تصادم استعمال ہوتی ہے۔

یعقوب کرخی سے منسوب کر کے جو بات کہی گئی ہے وہ بھی غیر معقول بلکہ لغو ہے۔ اگر بغیر نقطہ کے جو نام ہوتے ہیں وہ کسی رعب و دبدبہ والے کے ہوتے ہیں تو پھر حضرات ابوبکرؓ، عثمانؓ، خالد بن ولیدؓ، ہارون الرشید، صلاح الدین، بابر، اکبر، اورنگزیب اور ایوب خان وغیرہ سیکڑوں عظماء تو رعب و دبدبہ سے بالکل محروم قرار پائیں گے، اور کون ذی عقل و ہوش ہے جو ایسا کہے گا۔

اندھی عقیدت اور جہل کیسے کیسے کرشمے دکھاتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ صدام حسین کا نام اسم بامسمی ثابت ہوا، کہ پہلے تو انہوں نے ایران کو

Marfat.com

ایک بہت بڑی ٹکر ماری، یعنی اس سے طویل جنگ چھڑی اور اب کویت پر قبضہ کر کے ایک ایسی ٹکر ماری ہے کہ اس سے پورا خلیج کا علاقہ اس ٹکر کی زد میں آ گیا ہے۔ اور اب اس کے نتیجہ میں امریکہ اور اس کی اتحادی قوتوں اور خاص طور پر برطانیہ وفرانس نے ایسی ٹکر ماری ہے اور مار رہے ہیں کہ یہ ٹکر یا جنگی تاریخ میں یادگار رہے گی۔

صدام حسین کے غلط اقدام یعنی کویت پر قبضہ کی وجہ سے عراق کے شہروں اور ہمارے عراقی بھائیوں پر امریکہ و برطانیہ کی طرف سے جو ظلم کا پہاڑ ٹوٹا ہے اور جس طرح یہ صلیبی اور استعماری طاقتیں عراق میں تباہی و بربادی مچا رہی ہیں اس پر واقعی ہم سب غمگین ہیں، عالم اسلام کے بیشتر مسلمانوں کے جذبات عراق کے ساتھ ہیں۔ لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ ہم صدر صدام حسین کے لیے ان کے نام کے نت نئے توصفی معانی گھڑیں ان کو زوال اور حادثہ کو روکنے والا یا اچانک نمودار ہونے والا، یا رعب و دبدبہ والا کہیں، کہ نہ تو اچانک نمودار ہوئے ہیں بلکہ بیس بائیس سال سے ایک آمر کی حیثیت سے حکومت کر رہے ہیں، نہ انہوں نے زوال وحادثہ کو روکا ہے، بلکہ انہوں نے حوادث پیدا کیے ہیں اور سب سے بڑا حادثہ یہ خلیجی جنگ ہے اور ان کا رعب و دبدبہ بے نقط نام ''صدام'' کی وجہ سے نہیں، بلکہ اس سخت گیری اور ظلم کی وجہ سے ہے، جس کی داستانیں بہت طویل ہیں اور اس وقت ان کو دہرانے کا موقع نہیں۔ قدرت نے ان کو ظالم سے مظلوم بنا دیا ہے، یہ ان کی اپنی غلطیوں کے نتائج اور حالات کی ستم ظریفیاں ہیں۔

سعودی عرب اور کویت، بلکہ امریکہ و مصر بھی اس غلطی میں برابر کے شریک ہیں کہ سعودی عرب اور کویت کے پیسہ سے ہی وہ آٹھ سال تک ایران سے لڑنے کے لیے ہتھیار خریدتے رہے، امریکہ ان کو برابر ایران کے خلاف اہم جنگی معلومات اپنے معلوماتی سیاروں کے ذریعے فراہم کرتا رہا اور مصر کے سپاہی وہاں ایران کے خلاف لڑتے رہے اور مصر سے سامان جنگ بھی آتا رہا۔ لوگ شاید اس بات کو بھی بھول گئے ہیں کہ صدام حسین نے دس سال قبل ایران پر حملہ کرنے سے پہلے مرحوم شاہ خالد سے ملاقات کی تھی اور ان کی طرف سے ''سبز اشارے'' کے بعد ہی انہوں نے یہ غلط اور تباہ کن قدم اٹھایا تھا، پھر عراق کے حق میں اس کا نتیجہ صفر تھا، سوائے اس کے کہ اس کے پاس بہت سامان جنگ جمع ہو گیا جو اب امریکہ تباہ کر رہا ہے، اور نہ صرف اربوں ڈالر کا سامان جنگ،

Marfat.com

لڑاکا ہوائی جہاز، بحری جنگی جہاز، ٹینک، توپیں وغیرہ برباد کر رہا ہے، بلکہ پل، سڑکیں، ایئر پورٹس، فیکٹریاں، شہری عمارات تباہ کر کے عراق کی اقتصادیات کو تباہ و برباد کر رہا ہے۔ اس پر ہم جتنا بھی افسوس کریں کم ہے۔ یہ ہمارا اخلاقی اور دینی فریضہ ہے اور یہ بھی ہماری دینی اخوت کا تقاضا ہے کہ امریکہ کے عراق پر مسلسل ظالمانہ فضائی حملے کے خلاف احتجاج کریں اور ان کو رکوانے کی کوشش کریں، جیسا کہ ہمارے وزیراعظم نواز شریف صاحب نے اپنے امن مشن کے ذریعہ بالفعل کوشش کا آغاز کیا ہے۔

بعض سیاسی علماء نے صدام حسین کو عصر حاضر کے صلاح الدین ایوبی کا لقب تک دیا ہے۔ یہ مبالغہ اور شاعرانہ قصیدہ خوانی کی حد ہے اور اس کا حقیقت سے دور کا واسطہ بھی نہیں، صلاح الدین ایک باعمل اور انتہائی متدین مسلمان تھا۔ جس نے ان صلیبیوں (عیسائی مذہبی دیوانوں) کے خلاف علم جہاد بلند کیا تھا جو برسوں سے مسلمانوں کا خون بہا کر فلسطین اور بیت المقدس پر قابض تھے۔ اللہ تعالیٰ کی نصرت اس کے شامل حال تھی۔ اس لیے وہ صلیبیوں کو بیت المقدس اور فلسطین سے نکالنے میں کامیاب ہوا۔

اس کے بالکل برعکس صدام حسین ایک مشہور ایسی پارٹی کے لیڈر ہیں جو مذہب کو سیاست میں داخل نہیں کرتی، بلکہ وہ اپنے منشور کے مطابق ایک لادین سوشلسٹ پارٹی ہے یعنی ''حزب البعث العربی الاشتراکی'' جو ۱۹۴۲ء میں دمشق (شام) میں ایک عیسائی اسکول ماسٹر میشیل عفلق اور اس کے شریک کار صلاح الدین البیطار نے قائم کی تھی (میشیل عفلق نے پیرس میں بھی تعلیم حاصل کی تھی)

پھر پارٹی میں آپس کے اختلاف کے سبب چھٹی دہائی میں میشیل عفلق جن کو ''استاذ'' کے نام سے یاد کیا جاتا ہے، دمشق سے بغداد منتقل ہو گئے، جہاں جنرل احمد حسن البکر کی قیادت میں بعث پارٹی کی حکومت قائم ہو گئی تھی جس نے شام و عراق دونوں جگہ فوج میں نفوذ حاصل کر لیا تھا، لیکن شام و عراق کے ازلی اختلافات اور بعث پارٹی کے لیڈروں کی آپس کی رقابت کی وجہ سے عراق کی بعث پارٹی شام کی بعث پارٹی سے صدام حسین کی قیادت میں علیحدہ ہو گئی۔

صدام حسین نے مصر میں قانون کی تعلیم حاصل کی تھی وہ اپنے عزیز جنرل احمد حسن البکر

Marfat.com

صدر عراق کے سہارے فوج میں نفوذ حاصل کرنے اور پھر اقتدار پر قبضہ جمانے میں کامیاب ہو گئے جیسا کہ جرمنی میں ہٹلر نے کیا تھا۔

ہم یہاں اس وقت شماتت ہمسایہ کے مرتکب ہونا نہیں چاہتے ہیں، لیکن وہ مولوی صاحبان جو صدر صدام حسین کو عصر حاضر کا صلاح الدین ایوبی قرار دیتے ہیں، ان کو چاہیے کہ وہ موصوف کے خیالات ان کی مختصر کتابوں ''نظرة في الدين والتراث، دور الديمقراطية مصدر قوة للفرد والمجتمع ''وغیرہ میں پڑھیں، ان کتابوں سے ان کو صدام حسین کے افکار صحیحہ کا پتہ چلے گا یہی وہ افکار ہیں جو میشیل عفلق کی کتاب 'في سبيل البعث' میں پائے جاتے ہیں اور ان کا صلاح الدین ایوبی کے اسلامی افکار سے دور کا تعلق بھی نہیں، بلکہ عربی قومی افکار ہیں اور ان میں بار بار یہ بات کہی گئی ہے کہ مذہب کا ہماری سیاست میں کوئی دخل نہیں ہونا چاہیے اور اشتراکیت ہی ہمارا اقتصادی نظام ہونا چاہیے۔

صدام حسین اور ان کی بعث پارٹی کی فکری بے راہ روی اور ان کے ذاتی آمرانہ وظالمانہ رویہ کے باوجود عراق پر اس انتہائی تباہ کن اور المناک مصیبت کے وقت میں ہمارے نزدیک یہ مناسب نہیں کہ ہم امریکہ، برطانیہ اور فرانس کی عراق میں فوجی کارروائیوں کی تائید کریں اور بغداد کی تباہی کا منظر اطمینان کے ساتھ دیکھتے رہیں اور اس کو صدام حسین کے کرتوتوں کا نتیجہ سمجھیں۔ ہماری ہمدردیاں اس عراق کے ساتھ ہونی چاہئیں جو بہر حال ایک اسلامی ملک ہے اور ان عراقیوں کے خون پر ہم کو ماتم کناں ہونا چاہیے جو بہر حال کلمہ گو اور امت مسلمہ کا ایک جزو ہیں، صدام حسین جیسے لوگ آتے اور جاتے رہتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی ہماری یہ کوشش ہونی چاہیے کہ یہ جنگ ہر حالت میں رکے۔ جس کی ہمارے وزیر اعظم اپنے امن مشن سے کوشش کر رہے ہیں۔

یہاں ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ صدام حسین نے کویت پر قبضہ کرتے وقت یہ جو دعویٰ کیا تھا کہ کویت تاریخی وجغرافیائی طور پر عراق کا ایک حصہ ہے، اس کی آخر کیا حقیقت ہے؟ کویت کی اپنی تاریخ کیا ہے؟ اس کا وجود کتنا پرانا ہے؟ افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ ہماری صحافت میں اس سے متعلق جو تھوڑا بہت مواد مولوی صاحبان کے قلم سے شائع ہوا ہے، وہ حقیقت سے کوسوں دور ہے، بعض حضرات نے ہم سے اس سلسلہ میں استفسار کیا اور یقیناً دوسرے بہت سے لوگ بھی

Marfat.com

جاننا چاہتے ہوں گے، اس لیے آئندہ سطور میں، ہم کویت کی جغرافیائی اور تاریخی حیثیت پر کچھ مختصر روشنی ڈالنے کی کوشش کریں گے۔

کویت کی جغرافیائی و تاریخی حیثیت

نقشہ میں کویت کا محل وقوع دیکھنے سے پتہ چلے گا کہ یہ تقریباً ایک مثلث کی شکل کا قطعہ زمین ہے اس کا رقبہ ۱۷۸۱۸ کلومیٹر مربع ہے، شمالی حدود عراق میں ملتی ہیں اور جنوبی سعودی عرب سے اور اس مثلث کا مشرقی حصہ خلیج فارس یا خلیج عربی یا اب صرف خلیج پر واقع ہے۔ یہ سارا علاقہ ریگستان ہے، موجودہ زمانہ میں کویت میں جو تھوڑی بہت سرسبزی و شادابی ہے، یہ مصنوعی طور پر سمندر کے پانی کو میٹھا کر کے اور سبزہ اگا کر کی گئی ہے۔

قدیم جغرافیائی عربی کتابوں میں جو ابن خرداذبہ، اصطخری، ابن حوقل، البشاری المقدسی وغیرہ کے قلم سے المسالک والممالک کے نام سے (ابن حوقل کی کتاب کا صحیح تحقیقی نام صورۃ الارض ہے) چوتھی صدی / ہجری دسویں صدی عیسوی تک لکھی گئی ہیں، ان میں کویت کا نام نہیں۔ اس سلسلہ کی سب سے اہم اور ضخیم ترین کتاب ساتویں صدی ہجری کے یاقوت الحموی کی کتاب معجم البلدان (پانچ جلدیں) ہے اور یہ ایک ڈکشنری کی صورت میں ہے اس میں بھی کویت کا مطلقاً ذکر نہیں، جبکہ اس میں عالم عرب بلکہ عالم اسلام کے ہزاروں شہروں اور گاؤں تک کا ذکر ہے۔ اسی طرح قدیم تاریخی کتب، تاریخ طبری، تاریخ مسعودی (مروج الذہب) اور تاریخ ابن الاثیر (الکامل فی التاریخ) اور تاریخ ابن خلدون میں بھی اس کا ذکر نہیں ملتا۔

پھر سوال یہ ہے کہ آخر کار کویت کس طرح اور کب وجود میں آیا اور اس کا عراق یا سعودی عرب سے کیا تعلق ہے؟

موجودہ دور میں عربی زبان میں کویت سے متعلق جو کتابیں لکھی گئی ہیں، ان میں سے ایک قدیم کتاب لبنان کے مشہور امریکی شہری، مورخ، ادیب اور سیاح امین الریحانی کی ''ملوک العرب'' ہے جو اس نے جزیرۃ العرب، عراق اور خلیج کی دوسری ریاستوں کی سیاحت کے بعد ۱۹۲۴ء میں لکھی تھی یہ کتاب دنیا کی تمام مشہور زبانوں میں ترجمہ ہو چکی ہے، اس میں کویت کی

Marfat.com

تاریخ پر بہت کچھ تحریر ہے۔ خیر الدین الزرکلی کی ''الاعلام'' میں بھی کویت کے حکام پر کافی مواد ہے، ایک کتاب میرے مرحوم مصری دوست ڈاکٹر شیخ احمد الشرباصی (استاد جامعۃ الازہر) کی ''ایام الکویت'' کے نام سے ہے جو انہوں نے کویت میں ایک سال کے قیام کے بعد ۱۹۵۴ء میں شائع کی تھی۔ ایک دوسری ضخیم کتاب ''البلدان الاسلامیۃ فی العالم المعاصر'' (مسلمان ممالک عصر حاضر میں) ریاض کی امام محمد بن سعود اسلامک یونیورسٹی کی طرف سے ۱۹۷۹ء میں ریاض میں منعقد ''پہلی جغرافیہ اسلامی کانفرنس'' کے موقع پر شائع کی گئی ہے۔

ان چند مستند کتابوں اور تاریخ طبری و معجم البلدان۔ یاقوت میں وارد اشارات سے جو حقائق کویت کی تاریخ کے بارے میں معلوم ہوتے ہیں ان کا خلاصہ مندرجہ ذیل ہے۔

لفظ کویت، کوت کی تصغیر ہے، یہ لفظ عربی زبان کا نہیں کیونکہ یہ کسی عربی لغت میں مذکور نہیں، بعض عرب مصنفین نے اس کو عراقی زبان کا لفظ بتایا ہے۔ درحقیقت جیسا کہ دائرہ معارف الاسلامیہ کے مقالہ نگار نے لکھا ہے یہ ''کوت'' ہندی لفظ کوٹ (۱) ہے۔ ہمارے ملک میں اس لفظ کی ترکیب کے ساتھ عمر کوٹ، بالاکوٹ، سیالکوٹ وغیرہ کے قصبے اور شہر مشہور ہیں۔ عراق میں جا کر اس لفظ کا تلفظ بوٹ کی طرح ''کوت'' ہو گیا اور وہاں اس نام سے بغداد کے جنوب میں دریائے دجلہ کے کنارے ایک شہر کا نام ''کوت العمارۃ'' ہے، جو آج کل صرف ''الکوت'' کے نام سے مشہور ہے، اور عراق کے نقشوں میں دیکھا جا سکتا ہے۔

عراق اور خلیج میں مستعمل عربی زبان میں ہندوستانی اور فارسی زبانوں کے بہت سے الفاظ مستعمل ہیں، جیسے میز، دروازہ، شلغم، دوشک (توشک) وغیرہ وغیرہ۔ اور ''کوت'' ایک چھوٹے سے ایسی قلعہ یا گڑھی کے لئے استعمال ہوتا ہے جس کے آس پاس کچھ دوسرے مکانات بھی ہوں اور یہ عام طور پر کسی دریا، سمندر یا اور کسی قسم کے پانی کے کنارے ہو۔ جس طرح عراق کا ''الکوت'' دریائے دجلہ کے کنارے آباد ہوا۔ اسی طرح مختلف روایات کے مطابق گیارھویں صدی ہجری کے اواخر میں خانہ بدوش بدو قبیلہ بنی خالد کے ایک سردار براک بن غرار الحمیدی نے موجودہ کویت کے علاقہ قرین میں ایک قلعہ یا گڑھی بنائی جس کا نام ''الکوت'' رکھا اور ایک دوسرا چھوٹا قلعہ یا

۱۔ ڈاکٹر احمد الشرباصی مرحوم نے اس کو عراقی (لوکل عراقی) زبان کا لفظ بتایا ہے۔

Marfat.com

گڑھی بنائی جو ساحل سمندر کے پاس تھی اور اس کا نام الکویت رکھا اور اس میں بصرہ سے براہ سمندر آنے والا سامان رسد محفوظ رکھا جاتا تھا اور اس کے آس پاس کچھ مکانات آباد تھے۔ اس زمانہ میں خلیج فارس کے علاقہ میں قبائل میں آپس کی لڑائی اور سمندر میں قزاقی (Piracy) عام تھی، بارھویں صدی ہجری کے اوائل میں جنوبی نجد کے ریگستانی علاقہ ''افلاج'' سے ایک قبائلی سردار صباح اپنے قبیلہ عنزہ کے افراد کے ساتھ آ کر یہاں آباد ہوا۔ اس نے کویت پر قبضہ کر لیا یا کویت کے سردار قبیلہ محمد بن عریعر نے اس کو یہ قلعہ دیدیا، چونکہ یہ لوگ نوشت وخواند سے نا آشنا تھے اور اس زمانہ کا کوئی تحریری سرمایہ موجود نہیں، اس لیے قطعیت کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا کہ اس خاندان کا ورود وہاں کس سن میں ہوا، مختلف زبانی روایات کے مطابق یہ لوگ گیارھویں صدی ہجری کے اواخر یا بارھویں صدی ہجری (اٹھارھویں صدی عیسوی) کے اوائل میں نجد کے ریگستانی علاقہ سے آ کر یہاں آباد ہوئے اور صباح کو یہاں کے لوگوں نے ڈاکٹر شیخ احمد الشرباصی کی روایت کے مطابق ۱۱۱۰ھ میں اپنا سردار چن لیا۔ ایک دوسری تاریخ انہی نے ۱۱۲۵ھ دی ہے۔ میرے نزدیک یہ زیادہ قرین قیاس ہے کہ اس سردار اور موجودہ معزول کویتی حکمران خاندان کے مورث اعلیٰ کی وفات ۱۱۷۵ھ میں ہوئی اور ۶۵ سال تک اس کی ''مشیخت'' یا حکومت نا قابل تصور ہے۔

یہ بات تو یقینی ہے کہ ''کویت'' کی تاریخ اسی ''آل صباح'' کے وہاں آباد ہونے سے شروع ہوتی ہے، یہ ایک غیر آباد ساحلی علاقہ تھا جس میں نئی آبادی شروع ہوئی تھی۔ اس لیے دور تو کیا خود اس علاقہ میں کویت کا کوئی خاص ذکر نہ تھا، جب کہ شمال میں عراق کی بندرگاہ بصرہ اور جنوب میں عمان کے سواحل مشہور تھے، لیکن اس خاندان کے تیسرے حاکم جابر بن عبداللہ بن صباح (۱۲۲۹۔۱۲۷۲ھ) کے عہد میں جس نے ۴۳ سال حکمرانی کی۔ اس چھوٹی سی شہری ریاست کا نوٹس سلطنت عثمانیہ نے لیا۔ اس شیخ نے بصرہ کی داخلی لڑائی میں سلطنت عثمانیہ کے ترکی گورنر کی اپنے آدمیوں سے مدد کی جس پر ترکی حکومت نے اس کو پروانہ حکومت اور ایک سبز پرچم دیا اور سالانہ ڈیڑھ سو من کھجوروں کی مدد مقرر کی جو بعد کو دوسرے حکام کے عہود میں بھی جاری رہی۔

اس طرح کہا جا سکتا ہے کہ کویت کی تاریخ تقریباً صرف تین پونے تین سو سال پرانی ہے اور اس کا سیاسی وجود انیسویں صدی کے نصف اول میں یعنی ڈیڑھ پونے دو سو سال قبل شروع ہوا

Marfat.com

جب کویت کے تیسرے قبائلی سردار جابر بن عبداللہ بن الصباح کو عثمانی سلطنت نے اپنے تابع ایک آزاد حکمران تسلیم کیا۔

یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ اسی حاکم کے عہد میں بعض انگریز انڈیا سے کویت آئے اور انہوں نے شیخ جابر سے یہاں برطانوی پرچم لہرانے کی اجازت طلب کی اور چاہا کہ کویت میں کچھ تجارتی عمارات بنائیں کہ اس صدی میں سمندروں اور سمندری سواحل کی "شاہی" انگریزوں کے قبضہ میں تھی اور وہ برابر اس کو وسیع تر کرنے کی کوشش کرتے رہتے تھے، لیکن جابر الصباح نے عثمانی ترکی سلطنت سے اپنے تعلقات کی بنا پر انگریزوں کے اس مطالبہ کو ماننے سے انکار کر دیا۔

لیکن کویت کے ساتویں حاکم مبارک الصباح نے جو ایک سخت گیر، عالی ہمت، طالع آزما اور مفاد پرست شخص تھا اور اپنے دو بھائیوں کو خفیہ طور پر قتل کر کے حکمران بنا تھا، خاندانی اختلافات اور انتقامی تحریکات کی وجہ سے ترکوں سے ڈر کر انگریزوں کے دباؤ کے تحت ۱۸۹۹ء میں برطانوی حکومت سے معاہدہ کر لیا۔ جس کے تحت کویت انگریزوں کے تابع ہو گیا۔ یہاں قابل ذکر بات یہ ہے کہ کویت کے داخلی فتنہ کے سبب سلطنت عثمانی کا مطالبہ تھا کہ مبارک الصباح یا تو استنبول آ جائے جہاں اسے عزت و احترام کے ساتھ مجلس مشاورت کا ممبر بنا لیا جائے گا یا کسی اور ملک میں چلا جائے اور اس کو سالانہ تنخواہ ملتی رہے گی یا پھر اس کے خلاف قوت استعمال کی جائے گی، انگریزوں کو جب اس کی بھنک پڑی (جو پہلے سے کویت پر اپنا پرچم لہرانے کے خواہش مند تھے) تو انہوں نے اس زمانہ کی اپنی (Gunboat Diplomacy) کے مطابق دو جنگی جہاز کویت کے ساحل پر بھیج دیئے اس طرح بزور کویت سے معاہدہ کر کے اسے اپنے تابع کر لیا۔ اس معاہدہ کے مطابق یہ طے ہوا کہ حکومت آل صباح میں رہے گی۔ کویت اپنے داخلی امور میں آزاد ہو گا لیکن خارجہ پالیسی اور عسکری امور انگریزوں کے ہاتھ میں ہوں گے اور انگریز خارجی حملوں سے اس کی حفاظت کریں گے۔

اس طرح ۹۱ سال قبل کویت انگریزوں کے تابع ہو گیا جیسے تقسیم ہند سے قبل ہندوستان کے نواب اور راجے، مہاراجے، انگریزوں کے تابع تھے۔ ۱۹۶۱ء میں کویت کو آزادی ملی اور اب تیس سال بعد انگریز نئے سیاسی حقائق کے تحت امریکیوں کے ساتھ مل کر کویت پر دوبارہ اپنا قبضہ جمانے

Marfat.com

کے لیے تین ہفتوں سے عراق پر ہولناک بمباری اور کویت کی سرزمین کو عراقیوں کے خون سے لالہ زار بنا رہے ہیں۔

لیکن کویت کی تاریخ کے حوالہ سے دو سوال ہنوز جواب طلب ہیں کہ تین پونے تین سو سال قبل ''کویت'' نام کی سرزمین اچانک تو سمندر سے نمودار نہیں ہوگئی، اس کے وجود کو اس سے قبل کس نام سے پہچانا جاتا تھا اور یہ کہ عراق یا جزیرہ عرب سے اس کا کیا تعلق رہا ہے؟

حقیقت یہ ہے کہ عام تواریخ اس بارے میں خاموش ہیں، نہ تو ملوک العرب کے مصنف امین الریحانی نے اس بارے میں کچھ لکھا ہے اور نہ مصری تصنیف ''ایام الکویت'' نے اس پر توجہ دی ہے۔ خیر الدین الزرکلی نے الاعلام (۳/ ۲۸۵) میں خلیج کے ایک مصنف کی ایک قلمی کتاب ''مذاکرات خالد الفرج'' کے حوالہ سے لکھا ہے کہ کویت کی جگہ پہلے قرین تھا۔ مرحوم الزرکلی نے اس معاصر مصنف کا صرف یہ قول نقل کر دیا ہے اور اپنی طرف سے کوئی یقینی بات نہیں کہی ہے۔

ہمارے نزدیک خالد الفرج کی یہ بات صحیح نہیں معلوم ہوتی، کیونکہ قرین کا نام نہ تو یاقوت کی معجم البلدان میں ہے اور نہ کسی اور جغرافیہ کی قدیم کتاب میں اور نہ اس کا وجود کویت کے تفصیلی نقشوں میں نظر آتا ہے جو کتاب ''البلدان الاسلامیہ'' اور سعید صباغ کے الاطلس العربی میں دیئے ہوئے ہیں۔ درحقیقت ''قرین'' کویت شہر سے کافی جنوب مشرق میں ایک پہاڑ کا نام ہے۔ یہ کویت اور سعودی عرب کے مابین جنوب میں آزاد علاقہ سے متصل ہے اور یہاں کوئی آبادی نہیں۔

ہمارے نزدیک کویت کا علاقہ زمانہ قدیم میں ''کاظمہ'' کے نام سے معروف تھا، اس کی دلیل یہ ہے کہ شہروں اور راستوں کے بارے میں جو قدیم ترین عربی کتاب ابن خرداذبہ کی المسالک والممالک (تصنیف ۲۷۲ھ) موجود ہے، اس میں بصرہ سے یمامہ (موجودہ ریاض) اور یمامہ سے بصرہ کا جو راستہ اور منازل مذکور ہیں ان میں بصرہ کے بعد پہلی منزل یہی کاظمہ ہے، اور یہی بات قدرے تفصیل سے ساتویں صدی ہجری یاقوت نے معجم البلدان میں کاظمہ کے ذکر میں (۴/ ۴۳۱) لکھی ہے اس نے بتایا ہے کہ ساحل سمندر سے قریب یہ ایک داخلی وسیع علاقہ ہے اور یہاں پانی کے کنوؤں پر کافی حوض ہیں اور پانی پینے کے قابل ہے اس نے اس کو بصرہ سے دو منزل

Marfat.com

پر بتایا ہے اور یہ کہ یہ بصرہ سے عرب کے مشرقی ساحل کو جانے والے راستہ پر واقع ہے۔(۱)
ریاض سے کویت جانے والا راستہ آج بھی موجود ہے وہاں سے بصرہ کے لیے میں نے بھی ۱۹۶۴ء
میں سفر کیا تھا۔

اس کاظمہ کا ذکر ہم کو تاریخ طبری میں بھی متعدد بار ملتا ہے، اسلام سے قبل بھی اور اسلام
کے بعد بھی، اس علاقہ میں عربوں اور ایرانیوں کے مابین ایک جنگ کسری شاپور کے زمانہ
میں ہوئی تھی اور ایک دوسری یادگار جنگ ''معرکۃ ذات السلاسل'' کے نام سے حضرت ابوبکرؓ کے
عہد میں جنگ یمامہ کے فوراً بعد ہوئی۔ مسیلمہ کذاب اور اس کے مرتد متبعین کی خالد بن الولیدؓ کے
ہاتھوں یمامہ (ریاض) میں شکست کے بعد حضرت ابوبکرؓ نے اس لشکر کو شمال میں ایرانی علاقہ
(عراق میں واقع حیرہ جہاں بعد کو کوفہ آباد ہوا) کی طرف پیش قدمی کا حکم دیا اور یہاں ایرانیوں کو
زبردست شکست ہوئی۔ (ملاحظہ ہو تاریخ طبری حوادث ۱۲ھ ۳/ ۳۴۸۔ ۴۹۸) یاد رہے کہ اس
زمانہ میں بصرہ کی جگہ قدیم ایرانی پورٹ ابلہ آباد تھا، جہاں ایرانی فوج رہتی تھی جو وہاں سے خلیج
فارس کو کنٹرول کرتی تھی اور عربوں پر حملے کرتی رہتی تھی جیسا کہ طبری نے اس موقعہ پر لکھا ہے اور
''حیرہ'' کے لیے یمامہ کا راستہ ابلہ سے ہو کر گزرتا تھا۔

اب اگر ہم کویت کے موجودہ نقشہ میں دیکھیں تو موجودہ شہر کویت کے مغرب میں خلیج
کویت کے ساحل پر ''کاظمہ'' کا نام نظر آتا ہے۔ جہاں سے وہ پائپ لائن گزرتی ہے جو کویت
کے شمالی تیل کے کنوؤں سے موجودہ بڑے آئل ٹرمینل احمدی تک آتی ہے۔ کاظمہ کے قریب ہی
جنوب مغرب میں جہرہ کا چھوٹا سا شہر ہے، جہاں سے بصرہ کو سیدھی سڑک جاتی ہے۔ کاظمہ اب
ایک چھوٹا سا گاؤں ہے۔

بصرہ سے حج کا راستہ اسی کاظمہ سے ہو کر گزرتا تھا کیونکہ صرف وہاں اس ریگستانی علاقہ
میں وافر مقدار میں پانی موجود تھا جو موجودہ شہر کویت سے صرف بیس پچیس کلومیٹر کے قریب ہے
اب کاظمہ کے بجائے جہرہ کو اہمیت حاصل ہے کہ یہ کویت شہر سے صرف ۱۵ میل دور ہے۔

۱۔ کاظمہ کا نام جاہلی اور اسلامی عہد کے عربی اشعار میں بھی ملتا ہے۔

Marfat.com

یہ تو تفصیل سے واضح ہو گیا کہ موجودہ کویت وہیں آباد ہے جس کے قریب پہلے ''کاظمہ'' آباد تھا جہاں تک اس کے عراق یا جزیرۂ عرب سے تعلق کا مسئلہ ہے تو قدیم عربی جغرافیائی کتابوں میں اسے جزیرۂ عرب کے مشرقی ساحل کا علاقہ کہا گیا ہے، جس کو قدیم اسلامی زمانہ میں ''بحرین'' کے نام سے یاد کیا جاتا تھا اور یہ موجودہ ابوظہبی اور دبی وغیرہ ساحلی علاقوں سے عراق کی حدود تک واقع تھا۔ موجودہ جزیرہ بحرین کا نام اس قدیم زمانہ میں ''اوال'' تھا اور یہ بھی اس قدیمی بحرین یا سعودی عرب کے مشرقی ساحل کا ایک حصہ تھا اور اب قدیمی نام کا اطلاق صرف ایک جزیرے پر ہوتا ہے۔ یہ سعودی ساحل سے اس قدر قریب ہے کہ الخبر سے نظر آتا ہے اور اب اس سعودی ساحلی شہر سے بحرین کو ایک سمندری سڑک ملاتی ہے جس کی تکمیل صرف چار سال قبل ہوئی ہے۔

اس جغرافیائی حقیقت کے پیش نظر درحقیقت یہ موجودہ سعودی عرب کا علاقہ ہے اور اس پر عراق کا دعویٰ صحیح نہیں۔ لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ کویت سعودی عرب کے کسی شہر کے مقابلہ میں عراقی حدود اور اس کی مشہور بندرگاہ بصرہ سے قریب تر ہے، ایسا ہی جیسے آپ کراچی سے حیدر آباد چلے جائیں۔

جہاں تک صدام حسین کے اس دعویٰ کا تعلق ہے کہ یہ سیاسی طور پر عراق کا ایک حصہ ہے تو اس کی حقیقت یہ ہے کہ انیسویں صدی میں جس وقت نجد میں ایک مستقل حکومت قائم تھی اس وقت کویت بصرہ کے ترکی گورنر کے ماتحت تھا، تا آنکہ اس پر انگریزوں نے ۱۸۹۹ء میں قبضہ جما لیا اور پھر کویت بمبئی کے گورنر کے ماتحت رہا اور یہاں ایک پولیٹیکل ایجنٹ (انگریز) رہتا تھا۔

علاوہ ازیں امین الریحانی نے اپنی مذکورہ سابق کتاب ملوک العرب (ص ۶۷۹) میں ۱۹۲۲ء میں دلچسپ انداز میں انکشاف کیا تھا کہ ''کویت اس وقت دو غالب قوموں اور دو طاقتوں اور اس پر قبضہ کی لالچ رکھنے والی دو حکومتوں یعنی نجد و عراق کے درمیان اس طرح ہے جیسے ایک حسینہ دو عاشقوں کے درمیان، کہ دونوں اس کے طالب ہیں۔''

اس کے بعد اس نے یہ بھی مزید انکشاف کیا تھا کہ بغداد میں مجھے ایک ذمہ دار سرکاری شخص نے کہا کہ ''کویت عراق کا ایک حصہ ہے اور کویت عراق کے ساتھ انضمام پسند کرتے ہیں۔'' اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ کویت پر عراق کی نظریں ۲۳-۱۹۲۲ء سے رہی ہیں اور عراق کو کھلے سمندر

Marfat.com

میں اپنے لیے اس بندرگاہ کی سخت ضرورت ہے کیونکہ بصرہ شط العرب (دریا) پر واقع ہے۔

یہ بھی ایک تاریخی حقیقت ہے کہ عراق اور نجد کے قبائل اس صدی کے اوائل میں کویت پر حملے کرتے رہے ہیں، مگر کویت کے حکام نے ہشیاری سے اپنی آزادی کو برقرار رکھا اور ابن سعود (موجودہ شاہ فہد کے والد عبدالعزیز) سے تعلقات استوار رکھے۔

یہ اس وقت کی بات ہے جب کویت میں تیل کی دریافت نہیں ہوئی تھی اور کویت کی آمدنی کا ذریعہ سمندری تجارت، ماہی گیری اور سمندر سے موتی نکالنا تھا اور یہ سب کویت کے مشرقی ساحل پر تھا جہاں زیادہ تر گھر مٹی کے تھے، کویت کا نوے فیصد علاقہ شمال، جنوب اور مغرب میں بے آب وگیاہ ریگستان ہے اور وہاں خال خال ہی کہیں آبادی ہے۔ لیکن ۱۹۳۶ء میں وہاں تیل کی دریافت سے اس سارے صحرائی علاقہ کی اہمیت انتہائی بڑھ گئی ہے۔ تیل شمال، جنوب، مشرق ہر طرف کے علاقوں میں پایا گیا۔ اس درمیان میں دوسری جنگ عظیم چھڑ گئی اور انگریزوں نے جرمنوں کے ڈر سے جن کی نگاہیں شرق اوسط پر تھیں اور جہاں پہلی جنگ عظیم کے بعد سے انگریزوں سے نفرت وبیزاری عام تھی ۱۹۴۲ء میں دریافت شدہ دس بارہ تیل کے کنوؤں کو کنکریٹ سے بند کر دیا اور ۱۹۴۶ء میں دوبارہ یہ کنویں کھولے گئے اور ان سے تیل نکالنا شروع کیا گیا، اور پھر مزید کنویں عراق کی سرحد پر واقع مناطق سے لے کر جنوب میں سعودی سرحد تک دریافت ہوئے اور معلوم ہوا کہ کویت ایک ایسے جہاز کی طرح ہے جو پانی کے بجائے تیل پر کھڑا ہے۔

شیخ احمد الشرباصی مصری لکھتے ہیں کہ کویتی لوگ کہتے تھے (۱۹۵۲ء میں) کہ ہم پانی کے لیے زمین میں کنواں کھودتے ہیں تو کھاری پانی نکلتا ہے، مزید کھودتے ہیں تو تیل نکل آتا ہے سو اب کویت کی اہمیت بہت بڑھ گئی، کویتی برٹش آئل کمپنی تیل کی صنعت پر قابض تھی، جس نے آئل ٹرمینل ''الاحمدی'' میں ایک مستقل انگریز کالونی بنا رکھی ہے۔ (میں نے اس کالونی کو ۱۹۶۴ء میں دیکھا تھا)

عراق میں ۱۹۵۸ء کے فوجی انقلاب کے بعد نوجوان بادشاہ فیصل بن غازی بن الملک فیصل (شاہ حسین کے چچازاد بھائی) کی حکومت ختم کر دی گئی تھی اور جنرل عبدالکریم قاسم حکمران ہوا جیسے ہی کویت کو ۱۹۶۱ء میں آزادی ملی یہ اپنے ٹینک لے کر کویت کی سرحد پر آ گیا۔ انگریز جلد ہی

Marfat.com

مشترکہ فوجی معاہدے کے تحت وہاں پہنچ گئے اور انہوں نے عبدالکریم قاسم کو مجبور کردیا کہ وہ اپنے ٹینک وہاں سے واپس لے جائے، اس طرح کویت انگریزوں کی مدد سے عراق سے بچا۔ یہاں انگریزوں کے اپنے تیل سے متعلق اہم مفادات بھی تھے۔

اس بار ۲/اگست ۱۹۹۰ء کو دوسری بار آناً فاناً ایک بھاری فوج اور ٹینکوں کی مدد سے عراق، کویت پر ایک رات ہی میں قبضہ کرنے میں کامیاب ہوگیا اور عراقیوں کی کویت پر قبضہ جمانے کی نصف صدی کی خواہش پوری ہوئی۔ لیکن اب ۱۹۶۱ء کے حالات نہیں ہیں۔ امریکہ اور روس کی سرد جنگ ختم ہوگئی ہے۔ افغانستان میں شکست کے بعد روس اپنی داخلی سیاسی و اقتصادی مشاکل میں گھرا ہوا ہے اور امریکہ دنیا کی واحد سپر پاور یا طاقت عظمیٰ ہے۔ اس کو گوارا نہیں کہ عراق اپنی زبردست فوجی طاقت کے ساتھ کویت پر قابض رہے اور خلیج میں اس کا نفوذ قائم ہو جس کی تیل کی دولت سے امریکہ و یورپ کی صنعتیں چلتی ہیں، اس لیے وہ اپنی اور اپنے مغربی حلیفوں خاص طور پر پرانے استعماری ملک برطانیہ و فرانس کی زبردست فوجی طاقت کے ساتھ خلیج میں آدھمکا اور عراق کے خلاف وہ ہولناک اور تباہ کن جنگ شروع کی جس کے مناظر صبح و شام ہم امریکن ٹیلی ویژن سی این این پر دیکھ رہے ہیں۔

انتہائی افسوسناک بات یہ ہے کہ مسلمان بلکہ عرب ملک اس جنگ میں دو گروہوں میں تقسیم ہوگئے ہیں۔ اس کو صلیبی، یہودی، امریکن اور یورپی طاقتوں کے ناپاک عزائم کو سمجھ کر ان کے خلاف متحد ہونا چاہیے تھا۔

سعودی عرب اور کویت یا بالفاظ دیگر سعودی اور کویتی حکمرانوں کا باہمی تعلق اور اس نزاع اور فوجی کارروائی میں ان کا باہمی اشتراک بھی اپنے اندر ایک تاریخی پہلو رکھتا ہے جو باختصار یہ ہے۔

کویت کا حکمران خاندان الصباح اسی قبیلہ غزہ سے تعلق رکھتا ہے جس سے آل سعود ہیں اور یہ کویت میں آئے بھی نجد سے تھے ۱۸۹۱ء میں شاہ فہد کے دادا عبدالرحمٰن بن فیصل آل سعود نے نجد کے شمال میں حائل کی ریاست کے حکمران یعنی آل رشید کے ہاتھوں شکست کھا کر کویت میں بھاگ کر پناہ لی تھی اس وقت شاہ فہد کے والد الملک عبدالعزیز آل سعود کی عمر پندرہ سال تھی۔ گیارہ سال تک جلاوطنی میں یہ اپنے والد سابق سلطان نجد عبدالرحمٰن آل سعود کے ساتھ شیخ یا حاکم کویت

Marfat.com

مبارک الصباح کے مہمان رہے اور یہیں پل کر جوان ہوئے۔

پھر انہوں نے مبارک الصباح کی مختصر مالی و عسکری مدد سے ۱۹۰۲ء میں ایک مہم جویانہ اچانک حملہ رات کے اندھیرے میں کر کے ریاض کے غاصب حاکم کو قتل کر دیا اور ریاض پر قبضہ کر لیا اور اس طرح دوبارہ آل سعود کی حکومت ریاض و نجد میں قائم ہوگئی اور پھر آس پاس کے چھوٹے بڑے آزاد علاقوں اور آخر میں حجاز پر قبضہ کر کے الملک عبدالعزیز نے وہ مضبوط مملکت قائم کی۔ جس کو آج ہم سعودی عرب کے نام سے جانتے ہیں۔

آج کویت میں اسی جلاوطن نوجوان عبدالعزیز آل سعود کے بیٹے شاہ فہد کے یہاں اس وقت کے مبارک الصباح کے خاندان کے ایک فرد جابر الصباح حاکم کویت جلاوطنی کی حیثیت سے مہمان ہیں۔ بلکہ اپنی جلاوطن حکومت قائم کیے ہوئے ہیں۔

شاہ فہد کے والد اور دادا نے تو کویت میں گیارہ سال انتظار کیا تھا، لیکن شیخ جابر الصباح کو صرف پانچ ماہ انتظار کرنا پڑا کہ سعودی عرب کے بادشاہ نے ان کو صرف ساڑھے پانچ ماہ انتظار کرا کر کویت کی واپسی کے لیے نہ صرف خود بلکہ دنیا کی سپر امریکن طاقت اور یورپی طاقتوں کو لا کھڑا کیا ہے، اپنے دفاع کے علاوہ سعودی عرب کو کویت کا پرانا سیاسی قرض ادا کرنا تھا جو اب وہ بخوبی ادا کر رہا ہے۔ مگر اس قرضہ چکانے کا ایک اقتصادی حیثیت سے مکمل طور پر برباد کرنے کے درپے ہے اور کر رہا ہے، خدا کرے صلیبی اور یہودی طاقتیں اس ناپاک عزائم میں کامیاب نہ ہوں۔ ''وَهُوَ الْقَاهِرُ فَوْقَ عِبَادِهٖ''

Marfat.com

شخصیات وسوانح

Marfat.com

Marfat.com

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زندگی کا سیاسی پہلو

اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ اور آپ کے اعمال و افعال کو مسلمانوں کے لیے اسوۂ حسنہ (بہترین نمونہ) قرار دیا ہے۔

''لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ'' (سورۃ احزاب آیت ۲۱)

''تمہارے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات میں بہترین نمونہ ہے۔''

یہ ہم سب جانتے ہیں، لیکن افسوس کہ ہم نے ''اسوہ حسنہ'' کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صرف عادات و اخلاق، نوافل و عبادات، زہد و تقویٰ، خشیت و انابت الی اللہ وغیرہ ہی تک محصور کر دیا ہے، ہم ان ہی امور کے ذکر سے لذت حاصل کرتے اور ان کے اتباع کی کوشش کرتے ہیں، کوئی شک نہیں کہ یہ چیز اپنی جگہ مقصود و محمود ہے، لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مبارک زندگی کا ایک دوسرا پہلو بھی ہے، ایک اور بھی اسوۂ حسنہ کا رخ ہے جس سے ہم عام طور پر غفلت برتتے ہیں اور وہ ہے آپ کی زندگی کا سیاسی پہلو۔

ہم میں سے شاید ایک بڑی تعداد یہ نہیں جانتی کہ آپ منصب نبوت کے ساتھ ساتھ ایک انتہائی اعلیٰ سیاستدان، ایک بلند پایہ مدبر، ایک بے مثال قانون ساز (Law Giver) اور ایک آئیڈیل و کامیاب حکمران بھی تھے، بلکہ ہم میں شاید بہت سے لوگ تو سیاست و حکمرانی کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مرتبہ سے ایک فروتر چیز سمجھتے ہیں۔ یہ نتیجہ ہے برسہا برس کے متصوفانہ خانقاہی نظام و مزاج کا اور اس کے بعد عصر حاضر میں مغربی فکر کے تسلط کا، جس نے عیسائیت کے مزاج کے مطابق دین کو سیاست سے جدا کر دیا ہے اور ہم بھی اسی رو میں بہہ رہے ہیں۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دس سال تک حکمرانی و جہاں بانی کی تھی اور نہ صرف مدینہ ہی میں آپ کی حکومت قائم تھی بلکہ فتح مکہ کے بعد سارا جزیرہ عرب (موجودہ سعودی عرب، یمن، عمان اور دیگر خلیجی امارات) آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے زیر نگیں تھا۔

Marfat.com

یہ کس طرح ہوا تھا، معجزات و برکات سے تو نہ ہوا تھا بلکہ اس کے پیچھے آنحضرت ﷺ کی پلاننگ تھی، بیعت عقبہ یا معاہدۂ عقبہ تھا، دستور مدینہ تھا، آپ کی اور آپ کے اصحاب کی قربانیاں تھیں جنگیں تھی، صلحیں تھیں، مختلف عرب علاقوں کے وفود کا استقبال تھا۔ چھوٹے بڑے فرماں روایان عالم کو آپ کے خطوط تھے مدینہ منورہ اور اس کے نواح کو یہودی قبائل کے اقتصادی شکنجہ سے آزاد کرانا تھا، حکومت مدینہ کے انتظامی، مالی عسکری امور تھے، جزیرۂ عرب کی تاریخ میں پہلی مرتبہ ایک محکم و دیرپا مملکت کا قیام تھا جس کو آپ ﷺ کی وفات کے بعد ارتداد و بغاوت کی آندھیاں بھی نہ ہلا سکیں۔

یہ سب کچھ آخر سیاست نہ تھی تو کیا تھا؟

کوئی شک نہیں کہ اس کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تیرہ سال تک مسلسل اپنی قلیل جماعت مسلمین کی تربیت کی تھی، ان کا تزکیہ نفوس کیا تھا، اللہ تعالیٰ سے ان کا تعلق جوڑا تھا۔ ان کو کردار کی بلندیوں پر پہنچایا تھا، لیکن یہ منتہا نہ تھی بلکہ جو کچھ بعد کو مدینہ منورہ میں تکمیل پذیر ہوا یہ اس کی تیاری تھی یعنی ایک ایسی سوسائٹی اور ایسی حکومت کا قیام جس کی معیشت و معاشرت، اقتصاد و تجارت، سیاست و حکومت ایک ایسی نہج پر جس کو انسان کے خالق و مالک نے اپنے بندوں کے لیے پسند کیا ہے اور جو دنیا کے دوسرے نظاموں سے مختلف ہے، نہ صرف یہ کہ وہ اس نئے الٰہی نظام حیات کو اپنی سرزمین پر نافذ کریں بلکہ دنیا بھر میں اس کی تبلیغ کریں اور اس کو قائم کرنے کی کوشش کریں تاکہ انسان اللہ کے بندے بن کر رہیں اپنے جیسے دوسرے انسانوں اور اپنی خواہشات نفس کے بندے نہ ہوں۔

افسوس کہ ہماری محافل اور تحریروں میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اوصاف و اخلاق، عبادات و عادات، زہد و تقویٰ، معجزات و برکات کا ذکر تو بہت کیا جاتا ہے۔ لیکن آپ کی سیاست و جہاں بانی، داخلی و غیر ملکی تعلقات، نظام حکومت و معیشت اور عسکری قیادت کا ذکر شاذ و نادر ہی ہوتا ہے، ہم جس کثرت سے نعتیں اور قوالیاں سنتے ہیں اور ان کو دین کا ایک جزء سمجھتے ہیں اگر اس کا عشر عشیر بھی حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیاست و قیادت اور تنظیم و حکومت کے بارے میں پڑھیں اور سنیں تو شاید ہماری زندگی کا رنگ ہی بدل جائے اس اہم ضرورت کو محسوس کر

Marfat.com

ہوئے ہم یہاں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حیات طیبہ کے سیاسی پہلو پر روشنی ڈالیں گے تاکہ دیکھیں کہ آیا اس میں ہمارے لیے کوئی قابل اتباع چیز ہے۔

سیرت نبوی کا معمولی علم رکھنے والے کو بھی آپ کی زندگی کے دو دور بہت نمایاں نظر آتے ہیں، ایک مکی دوسرا مدنی، مکی دور کے تیرہ برسوں میں آپ ﷺ قریش اور دیگر قبائل عرب کو دعوت اسلام پیش کرتے رہے۔ اس راہ میں آپ ﷺ نے اور آپ کے اصحابؓ کی مختصر جماعت اور افراد خاندان نے انتہائی المناک اور حوصلہ شکن مصائب جھیلے، بہت سے صحابہ اور اقارب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو وطن چھوڑ کر سمندر پار حبشہ ہجرت کرنا پڑی تا آنکہ اللہ تعالیٰ نے آپ کی دعوت توحید کے لیے مکہ سے دور یثرب کی سرزمین میں آبیاری کے اسباب پیدا کیے۔

بیعت عقبہ اور ہجرت

بیعت عقبہ یا معاہدہ عقبہ سے در حقیقت حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیاسی زندگی کا آغاز ہوتا ہے اگرچہ بعض لوگ آپ کی ہجرت مدینہ کو اس کا نقطہ آغاز بتاتے ہیں، لیکن جیسا کہ ہم آگے چل کر دیکھیں گے حقیقت وہی ہے جس کی طرف ہم نے اشارہ کیا، اور در حقیقت انصار مدینہ سے ہونے والا یہ معاہدہ آنحضرت ﷺ کی ہجرت کی تمہید تھی۔

یہاں بیعت عقبہ یا معاہدہ عقبہ سے ہماری مراد دوسرا یا آخری معاہدہ عقبہ ہے۔ حج میں آنحضرت ﷺ نے مختلف قبائل کے سامنے اسلام پیش کرنے کا جو عمل شروع کیا تھا اس کے نتیجہ میں پہلے یثرب کے چھ افراد، دوسرے سال بارہ افراد نے آپ کے ہاتھ پر اسلام قبول کیا تھا۔ اس کے بعد آپ نے اپنے بعض مبلغین، جن میں حضرت مصعبؓ بن عمیر نمایاں تھے، یثرب بھیج دیئے تھے کہ وہاں جا کر وہ اسلام کی تبلیغ کریں اور دعوت اسلامی کے مستقل طور پر زمین ہموار کریں۔ آہستہ آہستہ اوس وخزرج کے قبائل میں وہاں اسلام پھیل رہا تھا اور ایک سال کے اندر کافی کامیابی ہوئی تھی۔

بعثت نبوی کے تیرھویں سال اور مدینہ کو آنحضرت ﷺ کی ہجرت سے تقریباً تین ماہ قبل اوس وخزرج کے سرکردہ افراد کی ایک بڑی مسلمان جماعت (۷۳ افراد جن میں دو خواتین بھی شامل تھیں۔ یہ تھیں نسیبہ بنت کعب اور اسماء بنت عمرو (۱) حج کے موقع پر آئی تھی اور اس نے

Marfat.com

آپ ﷺ کے ساتھ حج کے فوراً بعد منیٰ اور مکہ کے درمیان ایک عقبہ (گھاٹی) میں بیعت کی تھی، جس سے درحقیقت آپ کی سیاسی زندگی کا آغاز ہوتا ہے۔

یثرب کے ان نمائندوں کے ساتھ آپ ﷺ کا جو خفیہ معاہدہ ہوا تھا اور جس میں آنحضرت ﷺ کے ساتھ صرف آپ کے غیر مسلم چچا عباس بن عبدالمطلب شریک تھے۔ آپ کی سیاسی بصیرت اور دوراندیشی کا آئینہ دار ہے، خطرات کے پیش نظر یہ معاہدہ تحریری صورت میں نہیں ہوا تھا، لیکن اس معاہدہ کی تفصیلات پڑھنے سے صاف ظاہر ہے کہ یہ محض عقائد اسلام اور ارکان اسلام پر بیعت نہ تھی بلکہ یہ سیاسی و عسکری معاہدہ تھا۔ (۲)

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قریش مکہ سے ناامید ہو کر دعوت اسلامی کے لیے مکہ سے دور یثرب (مدینہ) میں ایک نئی حکمت عملی اختیار فرما رہے تھے، جہاں آپ کے ارسال کردہ مبلغین کو ایک سال کے عرصہ میں کافی کامیابی ہوئی تھی، آپ کی نظر رسا دیکھ رہی تھی کہ اب قریش جو اپنے ظلم و زیادتی میں حد سے بڑھ چکے تھے اور اسلام کے خلاف آہنی دیوار بنے کھڑے تھے، محض تبلیغ و نصیحت سے اسلام قبول نہیں کریں گے بلکہ عسکری تصادم اب ضروری ہو گیا ہے۔ اس لیے ضرورت تھی کہ مدینہ منورہ ہجرت سے قبل آپ وہاں کے مسلمانوں سے ایک مضبوط سیاسی و عسکری معاہدہ کریں اس موقع پر جو گفتگو حضرت عباسؓ اور انصار کے درمیان ہوئی اور جس چیز کا رسول اللہ ﷺ نے انصار سے مطالبہ کیا اس سے ہمارے دعویٰ کی تائید ہوتی ہے، ان الفاظ کو قارئین غور سے پڑھیں (۳) جو حضرت عباسؓ (اس وقت تک غیر مسلم) نے ان اہل یثرب سے کہے:

۱۔ یہ دونوں اپنی کنیت یا لقب سے مشہور ہیں، پہلے ام عمارہ اور دوسری ام منیع، ان کی بیعت کا ذکر طبقات ابن سعد ج ۸۔ ص ۱۱ پر موجود ہے اور سیرت پر اردو کی کتب میں بھی ہے۔

۲۔ ڈاکٹر محمد حمید اللہ صاحب نے اس کو اپنی کتاب "رسول اکرم کی سیاسی زندگی" ص ۹۱ میں معاہدہ عمرانی کا نام دیا ہے۔ سیرت و تاریخ کی تمام قدیم عربی کتب میں یہ موجود ہے، طبقات ابن سعد ۱/ ۲۲۱، سیرۃ ابن ہشام ۲۹۴۔۳۰۱ طبری ۲/ ۳۶۲ وغیرہ ڈاکٹر محمد حمید اللہ صاحب نے اس بیعت عقبہ کی تمام روایات اپنی مشہور مفید کتاب الوثائق السیاسیہ فی العہد النبوی (ایڈیشن ۴، بیروت ۱۹۸۳ء) میں جمع کر دی ہیں۔ ص ۴۹-۵۱

۳۔ بیعت عقبہ کے لفظ سے صوفیانہ بیعت کا تصور شاید بعض اذہان میں ابھرتا ہو مگر حقیقت اس کے بالکل برخلاف تھی۔ یہ ایک سیاسی اور عسکری معاہدہ تھا۔ ڈاکٹر محمد حمید اللہ صاحب جیسا کہ مذکور ہوا اپنی کتاب رسول اکرم ﷺ کی سیاسی زندگی ص ۹۱ میں اس کو ایک عمرانی معاہدہ کہتے ہیں۔

Marfat.com

''اگر آپ لوگوں میں بہادری وشجاعت کے جوہر ہیں اور جنگ کا تجربہ ہے اور آپ لوگ تمام عربوں سے دشمنی مول لینے کے لیے تیار ہیں تو مشورہ کر کے طے کیجئے اور جو کہنا ہے سچ کہیے، ورنہ ہم محمد ﷺ کی بہرحال کسی نہ کسی طرح حفاظت کریں گے۔''

اس کا جواب انصار نے اثبات میں دیا تھا، یہ بھی متعدد روایات میں مذکور ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کے بعد ان بہتر یا تہتر یثربی مسلمانوں کے سامنے عقبہ کے مقام پر رات کے اندھیرے میں تلاوت قرآن کے بعد ان سے کہا تھا کہ ''میں تم لوگوں سے اس بات پر بیعت (معاہدہ) چاہتا ہوں کہ تم میری اسی طرح حفاظت کرو گے جیسے اپنی اولاد و ازواج کی کرتے ہو۔''

اس پر انصار کے نمائندے براء بن معرور نے جواباً کہا تھا کہ ''ہم آپ کی اسی طرح حفاظت کریں گے جیسے اپنی بیوی بچوں کی، ہم خاندانی جنگجو جانباز ہیں۔''

حضرت عباسؓ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ان الفاظ اور نمائندہ انصار کے جواب سے ایک انسان کیا سمجھتا ہے؟ یہی کہ ان دونوں حضرات کے سامنے آئندہ کے سخت مراحل تھے یعنی کفار مکہ کی مسلح آویزش اور معارک کارزار اور اس کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اہل مدینہ کا پختہ تعاون درکار تھا۔ اسی لیے آپ ﷺ نے جان کی حفاظت کا مطالبہ کیا تھا کہ ابھی عقیدہ توحید اور دین اسلام کو متمکن ہونا باقی تھا اور یہ جدوجہد اور دنیاوی مسائل کے ذریعے ہونا تھا، معجزات وخوارق العادات سے نہیں۔

اور پھر یہ بھی دیکھئے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اسی وقت یہ سیاسی فیصلہ فرما چکے تھے کہ دعوت اسلامی کا مرکز اب یثرب (مدینہ) منتقل کر دیا جائے گا۔ کیونکہ جو سیاسی و عسکری آویزش درپیش آنے والی تھی۔ اس کے لیے ضروری تھا کہ آپ مکہ سے دور اپنا مرکز بنائیں اور یہ چیز ہمیں وضاحت سے آنحضرت ﷺ کے اس جواب میں نظر آتی ہے جو آپ نے ایک دوسرے نمائندہ انصار ابوالہیثم بن التیہان کو دیا تھا۔

ابوالہیثم نے کہا تھا کہ ''یارسول اللہ ہمارے اور یہود کے درمیان تعلقات ہیں اب ہم ان کو ختم کر دیں گے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ اللہ تعالیٰ آپ کو قریش پر غالب کر دے تو آپ ہم کو چھوڑ کر اپنی

Marfat.com

قوم کے پاس (یعنی مکہ) واپس آ جائیں۔"

اس پر آپ نے تبسم فرماتے ہوئے کہا تھا میرا مرنا جینا تمہارے ساتھ ہے۔ میں تمہارا ہوں اور تم میرے، جس سے تم جنگ کرو گے میں اس سے جنگ کروں گا اور جس سے تم صلح رکھو گے میں اس سے صلح کروں گا۔(۱)

مزید یہ کہ سیرت نبوی و اسلامی تاریخ کے تمام قدیم ماخذ میں، جن کا ذکر اوپر ہوا، اس دوسری بیعت عقبہ کو بیعۃ الحرب (عسکری بیعت) لکھا ہے جب کہ اس سے ایک سال قبل بارہ انصار مدینہ سے حضور اکرم ﷺ نے جو بیعت لی تھی اس کو بیعۃ النساء (معاہدہ نسواں) کے نام سے یاد کیا جاتا ہے اور اس لیے نہیں کہ اس بیعت عقبہ اولیٰ میں عورتیں بھی شامل تھیں بلکہ جیسا کہ ان عربی ماخذ میں درج ہے اس لیے کہ اس میں جنگ کا ذکر نہ تھا بیعت اس بات پر تھی کہ وہ زنا، چوری اور دوسری جرائم سے اجتناب کریں گے۔

قدیم مورخین یہ بھی تصریح کرتے ہیں کہ یہ دوسری بیعت یا معاہدہ عقبہ اس آیت قرآنی کے نزول کے بعد کیا گیا تھا۔ جس میں آپ ﷺ کو اب جواباً کفار مکہ سے لڑائی کی اجازت دی گئی تھی اور جسے آیت قتال کہتے ہیں۔ (سورۃ الحج، آیت ۲۹)

اس موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انصار کی اس بڑی جماعت سے بارہ افراد کو مدینہ میں اپنے نمائندوں کے طور پر چنا اور ان سے ایک مجلس نمائندگان تشکیل دی جن کو نقباء (جمع نقیب بمعنی صدر) کا نام دیا گیا، جو مدینہ کے بارہ مختلف ان قبائل کی نمائندگی کر رہے تھے جن میں اسلام پھیل چکا تھا اور حضرت اسعدؓ بن زرارہ انصاری کو اس مجلس یا کمیٹی کا نقیب النقباء (صدر الصدور) نامزد کیا۔

یہاں ایک قابل ذکر بات یہ ہے کہ اس خفیہ معاہدہ کے موقع پر ایک انصاری عبادہ بن نضلہ نے اس معاہدہ کی عسکری اہمیت اور پیش آنے والے خطرات کا اپنے رفقاء کے سامنے ذکر کرنے کے بعد آنحضرت ﷺ سے سوال کیا کہ اس سب مدافعت و جاں نثاری کے بدلہ میں ہم کو کیا ملے گا۔ تو حضور ﷺ نے اس کے جواب میں اتنا کہا تھا "جنت" اور اس پر انصار راضی ہو گئے تھے۔

۱۔ تاریخ طبری ۲/۳۶۲ (دار المعارف مصر ایڈیشن)

Marfat.com

اس دوسرے معاہدہ عقبہ کے بارے میں شرائط کے جوالفاظ تاریخ یعقوبی میں مذکور ہیں، وہ اس معاہدہ کی سیاسی و عسکری اہمیت اور اس کی ہمہ گیری پر پوری وضاحت سے روشنی ڈالتے ہیں۔

ان يمنعوه واهله مما يمنعون منه انفسهم و اهلهم
واولادهم وعليهم ان يحاربوا معه الاسود و
الاحمر و ان ينصروه على القريب و البعيد و
شرط لهم الوفاء بذلك و الجنة(۱)

(کہ آپ ﷺ کی اور آپ کے اہل خانہ کی اس طرح مدافعت کریں جس طرح اپنی اور ازواج واولاد کی مدافعت کرتے ہیں اور ان پر واجب ہے کہ آپ ﷺ کے ساتھ سیاہ و سرخ (یعنی تمام اقوام) سے جنگ کریں اور نزدیک و دور (دشمن) کے مقابلہ میں آپ کی مدد کریں آپ ﷺ نے ان امور پر پورا اترنے کی شرط پیش کی اور اپنی طرف سے ان کو جنت کی بشارت دی)

اس کے بعد ان تمام انصار نے اس معاہدہ کی توثیق میں آپ کے ہاتھ میں ہاتھ دے کر بیعت کی۔(۲)

دوسری بیعت عقبہ کے سلسلہ میں ایک اہم اور قابل غور بات یہ ہے کہ انصار کے اس سوال پر کہ اس کے رسول ﷺ کی نصرت وحمایت اور اس راہ میں ان کی جاں نثاری کے بدلے ان کو کیا ملے گا آپ نے دنیاوی مال ومتاع، غنائم و مادی منفعت کا وعدہ نہیں کیا، صرف جنت یا بالفاظ دیگر جزائے اخروی کا وعدہ کیا تھا، اس جواب اور وعدہ میں ایک دنیائے معانی پنہاں تھی، کہ مستقبل قریب میں مسلمانوں کا کفار مکہ اور دوسرے دشمنان اسلام سے جو تصادم ہونے والا ہے۔ وہ دنیاوی مال ومتاع اور جاہ واقتدار کے لیے نہیں بلکہ رضائے الٰہی اور اس کے پیغام توحید کی اشاعت کے لیے ہوگا، جس کے دروازے قریش اور دوسری کافرانہ طاقتوں نے بند کر رکھے تھے۔

۱۔ تاریخ الیعقوبی، ۲/۳۸

۲۔ دوخواتین کی بیعت کے لئے آپ نے ان کے مردوں کی بیعت ہی کو کافی سمجھا، جیسا کہ طبقات ابن سعد میں مذکور ہے۔

Marfat.com

حضور اکرم ﷺ کے اس یک لفظی جواب سے ان مستشرقین اور دشمنان اسلام کی زبانیں بھی بند ہوتی ہیں جو یہ کہتے ہیں کہ عہد نبوی اور خلفائے راشدین کے زمانہ کی جنگیں اور معرکے مال غنیمت کے لیے تھے، جس کے لیے جزیرہ عرب کے فقیر محتاج بدو مصر و شام اور عراق و ایران کی دولت لوٹنے کے لیے باہر نکل کھڑے ہوئے تھے۔ حضور ﷺ کے انصار کو جواب کی روشنی میں اس کو ایک ہرزہ سرائی ہی سمجھا جائے گا۔

علامہ اقبال نے سچ ہی کہا ہے:

شہادت ہے مطلوب و مقصودِ مومن ——— نہ مال غنیمت نہ کشور کشائی

دستور مدینہ

دوسری بیعت عقبہ کے تقریباً تین ماہ بعد رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے یثرب کی طرف ہجرت کرنے کی اجازت مل گئی، یہاں پہلے ہی سے کافی مہاجرین مکہ سے آچکے تھے اور مدینہ کے تقریباً ہر گھر میں اسلام پھیل چکا تھا۔ ۸ ربیع الاولیٰ کو مدینہ تشریف لانے پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا جیسا استقبال ہوا اور جس طرح انصار اور ان کے بچے بچے نے دیدہ دل فرش راہ کئے وہ سب کو معلوم ہے، یہاں پہنچ کر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جو کام سب سے پہلے کیا وہ اپنی مدینہ کی شہری مملکت (City State) کی تاسیس تھی، اس کے لیے آپ نے مہاجرین وانصار کے مشورہ سے ایک دستور مرتب کیا جس کو ''صحیفۂ مدینہ'' کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

بین الاقوامی قانون کے ماہر اور مشہور زمانہ اسلامی مورخ ڈاکٹر محمد حمید اللہ کی تحقیق کے مطابق یہ دنیا کا پہلا تحریری دستور تھا اور انہوں نے اس کو ''دستور مدینہ''(۱) کا نام دیا ہے۔

اس ''دستور مدینہ'' کو ڈاکٹر محمد حمید اللہ صاحب اور بعض دوسرے عرب اور غیر مسلم مصنفین نے دفعات کی شکل میں مرتب کیا ہے، کسی آئندہ مقالہ میں اس پر تفصیل سے روشنی ڈالی جائے گی۔ ڈاکٹر حمید اللہ صاحب کا اس پر تحقیقی کام تو بہت ہی قابل قدر ہے، جو اردو، انگریزی، فرنچ، عربی اور ترکی زبانوں میں چھپ چکا ہے۔

۱۔ بعض دوسرے معاصر عرب مؤرخین اور مستشرقین نے بھی یہی اصطلاح اختیار کی ہے، ملاحظہ ہو ڈاکٹر حسین مونس مصری کی کتاب ''عالم الاسلام'' مونٹگمری واٹ کی کتاب Muhammad at Madinah

Marfat.com

یہاں صرف اتنا کہا جا سکتا ہے کہ یہ صحیفۂ مدینہ یا دستور مدینہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیاسی زندگی کا منجملہ دوسرے کارناموں کے ایک اہم کارنامہ ہے۔ جس پر افسوس کہ ہمارے دینی و علمی حلقوں کی طرف سے خاطر خواہ توجہ نہیں دی گئی ہے، سیاسی، رہنماؤں اور دستور و قانون پر لکھنے والوں کا تو ذکر ہی کیا، حیرت کی بات تو یہ ہے کہ علامہ شبلی، قاضی سلیمان منصور پوری (مولف رحمۃ للعالمین، ۳ جلدیں) مولانا سید سلیمان ندوی جیسے اردو کے مصنفین سیرت نے اس اہم موضوع پر سرسری انداز میں انتہائی اختصار کے ساتھ چند سطور ہی کو اپنی ضخیم کتابوں میں جگہ دی (۱) ہے، مولانا عبدالرؤف دانا پوری نے تو اس موضوع کو درخور اعتنا ہی نہیں سمجھا ہے اور ''مواخاۃ و تنظیم'' کے عنوان کے تحت چار پانچ سطور پر ہی اکتفاء کیا ہے (۲)۔ یہی حال اردو کے دیگر مصنفین سیرت کا ہے۔

اس کے خلاف عصر حاضر کے مشہور و معروف مصری سیرت نگار مرحوم محمد حسین ہیکل نے اپنی کتاب ''حیات محمد ﷺ'' میں اس پوری دستاویز (Document) کو نقل کر کے اس کو تاریخ کا ایک انتہائی قابل قدر سیاسی وثیقہ قرار دیا ہے اور اس کو اس زمانہ کی سیاسی اور سماجی زندگی کا ایک عہد آفریں باب بتاتا ہے۔ (۳)

یہ دستاویز جس کو عربی اصل میں ''کتاب'' اور ''صحیفہ'' کا نام دیا گیا ہے اور جس کو ڈاکٹر محمد حمید اللہ صاحب اور بعض دوسرے یورپین اور عرب مصنفین، مونٹگمری واٹ، سارجنٹ، حسین مونس مصری نے ''دستور مدینہ'' کا نام دیا ہے، کوئی شک نہیں کہ اس میں اسلام کے بہت سے بنیادی سیاسی، قانونی اور سماجی اصول بیان کر دیئے گئے ہیں اور اس کا انداز تحریر وہی ہے جو کسی دستور کا ہوتا ہے۔

۱۔ ملاحظہ ہو سیرۃ النبی، ص ۱۷۶، دارالاشاعت ۱۹۸۵ء ایڈیشن رحمۃ للعالمین ۱/۱۰۰۔

۲۔ اصح السیر ص ۶۶، کراچی ایڈیشن ۱۹۷۹ء۔

۳۔ حیاۃ محمد، ص ۲۲۸۔۲۴۱ (تیرہواں ایڈیشن، دارالمعارف قاہرہ ۱۹۷۵ء یہاں قابل ذکر بات یہ ہے کہ محمد حسین ہیکل اور ڈاکٹر محمد حمید اللہ صاحب دونوں کی کتاب ایک ہی سال میں چھپی ہے یعنی ۱۹۳۵ء۔ ڈاکٹر صاحب مدظلہ کی پیرس میں اور ہیکل کی قاہرہ میں۔ ان کی تعلیم بھی حمید اللہ صاحب کی طرح پیرس کی ہے، دونوں کا نقطہ نظر ایک ہے۔ گو ڈاکٹر صاحب موصوف نے خاص اس موضوع عہد نبوی کے سیاسی وثائق پر فرنچ میں کام کیا ہے۔ بہت ممکن ہے کہ یہ دونوں کا توارد خاطر ہو، یا ہیکل نے ڈاکٹر صاحب سے یہ نظریہ اخذ کیا ہو۔

Marfat.com

مولانا شبلی سے لے کر مولانا سید ابوالحسن علی مدظلہ تک نے اس ''دستور'' کے لیے صرف سیرۃ ابن ہشام کا حوالہ دیا ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ ابن ہشام کے علاوہ یہ صحیفہ من وعن ابوعبید القاسم بن سلام (متوفی ۲۲۴ھ) کی کتاب الاموال میں بھی موجود ہے اور امام زہری کی روایت سے (۱)۔ اسی طرح دوسری بہت سی قدیم وجدید کتب ہیں جن میں اس کا کلی یا جزئی ذکر ہے۔ ان میں صحاح ستہ اور دوسری کتب حدیث بھی شامل ہیں۔ ڈاکٹر محمد حمید اللہ صاحب نے اپنی کتاب مذکور میں ان کے حوالے دے دیے ہیں۔(۲)

جیسا کہ پہلے عرض کیا گیا یہ صحیفہ یا دستور ایک مستقل مقالہ کا خواہاں ہے۔ یہاں اس کے صرف بنیادی نقاط پیش کئے جا سکتے ہیں، لیکن اس سے قبل یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ ڈاکٹر حمید اللہ صاحب نے اس کو پہلے ۴۷ دفعات میں، پھر کتاب مذکور کے آخری اضافہ شدہ ایڈیشن میں ۵۱ دفعات میں مرتب کیا ہے، مونٹگمری واٹ کی کتاب ''محمد ﷺ مدینہ میں'' ۴۷ دفعات میں مذکور ہے مصر کے مشہور مورخ ڈاکٹر حسین مونس نے ''صحیفہ'' کے مواد کو ۷۰ دفعات میں مرتب کیا ہے۔(۳)

اس دستور کے مواد یا دفعات کو چار مختلف اجزاء میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

پہلا جزء مسلمانوں کے باہمی حقوق و واجبات سے متعلق ہے دوسرا ان یہودیوں کے سیاسی عسکری، اور سول امور سے متعلق ہے، جن کا مدینہ کے عرب قبائل سے تحائف کا تعلق تھا ان کو بحیثیت حلیف، وطن کے دفاع کے لیے امت مسلمہ میں شریک کرلیا گیا۔ (واضح رہے کہ ان میں مدینہ اور اس کے قرب وجوار کے یہودی قبائل بنونضیر، بنوقریظہ، بنوقینقاع شامل نہ تھے) تیسرا جزء مدینہ منورہ کی مرکزی مقدس حیثیت اور بعض سماجی حقوق سے متعلق ہے، چوتھے جزء میں مختلف قوانین ہیں اور ان کا تعلق مسلمانوں سے ہے اور یہود کے ایک مخصوص قبیلہ سے بھی۔ پھر اس میں ان تمام قوانین کی تطبیق میں روحانی واخلاقی اقدار کی اہمیت سے متعلق دو دفعات ہیں اور یہ کہ اس دستور کی توضیح اور دوسرے امور میں اختلاف ونزاع کی صورت میں اللہ اور اس کے رسول ﷺ کو

۱۔ کتاب الاموال، تحقیق خلیل الہراس، ص ۱۹۳-۱۹۲ (قاہرہ، ۱۹۸۱ء)

۲۔ الوثائق السیاسیۃ فی العہد النبوی وعہد الخلفاء الرشدین، ص ۵۷-۶۲

۳۔ ڈاکٹر حمید اللہ صاحب کی کتاب (فرنچ) ۱۹۳۵ء میں واٹ کی ۱۹۵۵ء میں اور حسین مونس کی ۱۹۷۶ء میں پہلی بار طبع ہوئیں۔

Marfat.com

آخری مرجع (Final authortiy) مانا جائے گا۔ اس دستور کے بنیادی اور اہم الفاظ یہ ہیں:

۱۔ یہ دستور محمد النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف سے صادر ہوا۔ برائے مسلمانان قریش (یعنی مہاجرین) اور باشندگان یثرب اور وہ جو ان کا اتباع کرتے ہوئے ان سے مل جائیں اور ان کے ساتھ جہاد کریں۔

اس پہلے فقرہ سے جو اس دستور کا عنوان (Short Title) ہے۔ ظاہر ہوتا ہے کہ یہ مسلمانوں اور یہود کے مابین کوئی میثاق صلح نہیں، جیسا کہ بعض سیرت نگاروں نے سمجھا ہے، بلکہ اس کے مخاطبین مہاجرین و انصار اور بعد کو ان سے ملنے والے مسلمان اور مجاہدین ہیں، ظاہر ہے کہ مجاہدین یا جاہد کا لفظ یہودیوں کے لیے استعمال نہیں ہوسکتا ہے۔

۲۔ اس دستور کی رو سے مذکورۂ سابق فقرہ کے بموجب مسلمان ایک مستقل امت (Nation) قرار پائے ''انهم امة و احدة من دون الناس.''

صحیفہ یا دستور مدینہ میں وارد۔ من دون الناس (اور لوگوں کے علاوہ) کے استثناء سے واضح ہوتا ہے کہ ''امت'' کے اس تصور میں مسلمانوں کے علاوہ دوسرے ادیان کے لوگ شامل نہیں اور اس طرح ان لوگوں کی بات قطعاً درست نہیں، جنہوں نے موجودہ زمانہ میں مغربی جغرافیائی نظریۂ قومیت کو اس دستور مدینہ سے ہم آہنگ کرتے ہوئے مدینہ کے یہودیوں کو بھی ''امت'' میں شامل کرلیا کہ ان یہودیوں سے متعلق بعد کو آنے والے ایک فقرہ یا دفعہ سے غلط فہمی ہوتی ہے۔ جو یہ کہ کہ مدنی قبیلہ بنی عوف کے متحالف یہود مسلمانوں کے ساتھ ایک امت (امة مع المسلمين ہیں امت مسلمہ سے متعلق واضح اور صاف سابقہ تصور کے بعد اس فقرہ کا مطلب یہ سمجھا جائے گا کہ یہ اور دوسرے متحالف یہودی مسلمانوں کی طرح ایک علیحدہ امت ہیں (نہ یہ کہ وہ امت مسلمہ میں داخل ہیں) اور مملکت مدینہ کے شہری ہیں۔

دستور کے دوسرے فقروں سے امت کے بارے میں اس مغربی نظریہ قومیت کی تردید ہوتی ہے یعنی وہ دفعات جن میں یہودیوں کی مسلمانوں کی جنگوں میں علیحدہ سے مالی وعسکری وغیرہ ذمہ داریاں صفائی سے بیان کی گئی ہیں۔ (۱)

لہ اس وقت تک سورۃ براءۃ یا توبہ کا نزول نہیں ہوا تھا اور یہ اہل الذمہ (ذمی) نہ ہوئے تھے، جن پر جزیہ واجب ہوتا ہے اور دفاع وطن کی کوئی ذمہ داری نہیں ہوتی۔

Marfat.com

۳۔ سابقہ داخلی اجتماعی تنظیمات (قبائلی اکائیوں) کے مطابق مسلمان قیدیوں کے فدیہ (Ransom) اور خون بہا کے بارے میں باہمی مالی تکافل وتعاون کرتے رہیں گے (یاد رہے کہ اس وقت مسلمانوں کا بیت المال قائم نہ ہوا تھا۔ جس نے بعد کو اس طرح کی بعض ذمہ داریاں سنبھالیں)

۴۔ ان مالی امور میں قبائلی ذمہ داریوں سے قطع نظر ایک اہم دفعہ یہ ہے کہ اگر کوئی مسلمان قرض دار ہو اور مالی استطاعت نہ رکھتا ہو تو دوسرے تمام مسلمانوں کا فرض ہے کہ وہ، فدیہ اور خون بہا کر رقم کی ادائیگی میں اس کی مدد کریں۔

۵۔ ایک دفعہ یہ ہے کہ متقی مسلمان معاشرہ میں ہر باغی، ظالم، معتدی اور بدکار و شر انگیز کے خلاف متفقہ آواز اٹھائیں گے اور اجتماعی کارروائی کریں گے۔ خواہ وہ اس کا بیٹا ہی کیوں نہ ہو۔'' بالفاظ دیگر یہ دستور معاشرہ کے امن وامان اور اس کی صلاح وراست روی کی پوری گارنٹی دیتا ہے اور اہل تقویٰ مسلمانوں کو اس کا ذمہ دار بناتا ہے۔

۶۔ امت مسلمہ کے ہر فرد کو امن و جنگ کی حالت میں یکساں حقوق حاصل ہیں۔

۷۔ اس میں قصاص اور خون بہا کا بھی ذکر ہے جو مسلمان کے قتل کی صورت میں دوسرے مسلمان یا غیر مسلم پر فرض ہوتا ہے۔

دستور کے دوسرے حصہ میں جو غالباً بعد کو اضافہ کیا گیا، تفصیل سے یہودیوں کے حقوق و واجبات کا ذکر ہے، ایک فقرہ ان کے حقوق سے متعلق اولین حصہ میں بھی ہے، ان کو تقریباً پندرہ دفعات میں عصر حاضر کے مصنفین نے ترتیب دیا ہے، بنیادی افکار یہ ہیں:

۱۔ ان کو پوری مذہبی آزادی ہے، لیکن اس آزادی کے پردہ میں وہ ظلم و بدکاری کے مرتکب نہیں ہو سکتے۔

۲۔ وہ مسلمانوں کے ساتھ مدینہ کی دفاعی جنگ لڑیں گے اور اپنے جنگی مصارف خو[د] برداشت کریں گے۔

۳۔ یہودیوں کی قبائلی تنظیم برقرار رہے گی اور ان کا آپس کا مالی تعاون و تکافل جاری رہے گا۔

Marfat.com

۴۔ مظلوم کی مدد کی جائے گی۔

۵۔ کوئی یہودی محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اجازت کے بغیر مدینہ سے باہر نہیں نکلے گا۔

دستور کے تیسرے جزء میں جو قانون صلح و جنگ کے علاوہ مدینہ کے امن اور اس کے باشندوں کے عام سماجی حقوق اور ان کے فرائض سے متعلق ہے مندرجہ ذیل نقاط خاص طور پر قابل ذکر ہیں:

۱۔ یثرب (مدینہ) ایک مقدس شہر ہے اس میں جنگ وجدال حرام ہے۔

۲۔ پڑوسی کی جان ومال کا حق خود اپنی ذات کی طرح محفوظ ہوگا۔

۳۔ کسی کی عورت کو اس کے اہل واقارب کی اجازت کے بغیر کوئی اپنے پاس پناہ نہیں دے سکتا۔

۴۔ مدینہ کا کوئی فرد دشمنان اسلام قریش اور ان کے حامیوں کو پناہ نہیں دے گا۔

۵۔ اگر یثرب پر حملہ ہوگا تو اہل مدینہ ایک دوسرے کی مدد کریں گے۔

۶۔ شہر کی سیاسی قیادت کی طرف سے جب دشمن سے صلح کی جائے گی تو وہ اس میں رخنہ نہیں ڈالیں گے اور صلح کو تسلیم کریں گے۔

۷۔ آخری فقرہ مرجع اخیر یعنی (Final authority) سے متعلق ہے اور اس میں صراحت ہے کہ اس دستور کو ماننے والوں کے مابین جب اختلاف ونزاع پیش آئے گا جس سے فساد عام کا اندیشہ ہو، تو وہ اللہ اور اس کے رسول محمد رسول اللہ ﷺ سے رجوع کریں گے۔

(یہ ایک سابقہ فقرہ کی حقوق واجبات اہل مدینہ کے ضمن میں تکرار ہے)

دستور کے چوتھے حصہ میں بعض عام امور کے ساتھ یہود کے ایک نئے قبیلہ (بنو الاوس) کی شہرت مدینہ اور ان کے حقوق کا ذکر ہے اور اس کے ساتھ بعض عام انسانی اور اخلاقی اصولوں کے اہم نقاط یہ ہیں:

۱۔ ہر آدمی اپنے فعل کا ذمہ دار اور جواب دہ ہوگا۔

Marfat.com

۲۔ یہ دستور (کتاب) کسی ظالم یا بدکاری کی سزا میں رکاوٹ نہ بنے گا۔

۳۔ مدینہ سے نکل جانے والے اور اس میں مقیم رہنے والے ہر فرد کو امن و امان حاصل ہوگا۔ سوائے ان لوگوں کے جو ظلم اور بدکاری کے مرتکب ہوں۔

۴۔ دستور کی آخری دفعہ ہے۔ اللہ اور محمد رسول اللہ ہر اس انسان کے حامی ہیں جو نیکی اور تقویٰ کی راہ پر گامزن ہو۔

دستور میں ایک عام قانونی قابل ذکر بات یہ ہے کہ حضور ﷺ نے اس دستور میں اپنے اس پایہ تخت کے لئے یثرب اور مدینہ دونوں نام استعمال کیے ہیں لیکن آخر میں مدینہ نے اور وہی اس کا نام پڑ گیا۔

دستور میں مدینہ کے اہم نقاط قارئین کے سامنے ہیں، وہ اس کی قانونی حیثیت اور ہمہ گیری کے بارے میں خود فیصلہ کر سکتے ہیں اور ان مورخین و سیرت نگاروں کے بارے میں بھی رائے قائم کر سکتے ہیں جنہوں نے اس کو صرف یہودیوں کے ساتھ ایک صلح نامہ (موادعۃ) قرار دیا، حقیقت یہ ہے کہ ایسی رائے سہل انگاری، عجلت پسندی اور روایت پرستی پر مبنی ہے۔

آخر میں اس دستور سے ایک اہم بات جو اس کو دنیا کے دیگر انسانی دساتیر سے ممتاز کرتی ہے یہ ہے کہ اس میں نیکی اور بدی کے درمیان متعدد بار (تین دفعات) واضح خط کھینچا گیا ہے۔ (البر دون الاثم) اور نیکی کی دعوت دی گئی ہے بلکہ بتاکید یہ کہا گیا ہے کہ اس دستور کی روح نیکی و خیر ہے اور یہ کہ اللہ کی تائید و نصرت اسی کو حاصل ہوگی جو اس دستور کو نیک نیتی، صدق دل اور خوف خدا کے ساتھ قبول کرے گا اور اس پر عمل پیرا ہوگا۔

افسوس کہ خلافت راشدہ کے بعد قائم ہونے والی مسلم خلافتوں یا سلطنتوں نے اس دستور کو بڑی حد تک بھلا دیا، شخصی حکومتوں میں اور کیا ہوتا! لیکن اس دور میں جب آئین (دستور) کی پکار اور اہمیت بہت بڑھ گئی ہے۔ ہمارا فرض ہے کہ ہم اس دستور مدینہ کو اپنی یونیورسٹیوں کے شعبۂ سیاسیات اور اپنے لاء کالجوں میں توجہ کے ساتھ پڑھیں ہمارے سیاسی لیڈر اس پر بحث و مباحثہ کریں، لکھیں اور اس کو اپنے دستور کی بنیاد بنائیں اس طرح اسلامی نظام قائم ہو سکتا ہے، ورنہ خالی نظام اسلام اور نظام مصطفیٰ کے نعرے لگانے سے یہ نظام قائم نہیں ہو سکتا۔

Marfat.com

دستور مدینہ بھی ہمارے لیے اسوۂ حسنہ ہے جس کا اتباع فرض ہے اور ہمارے لیے مسواک و دستار سے زیادہ مفید بلکہ پوری انسانیت کے لیے سود مند ہے۔

حدود مدینہ کی تعیین

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ایک اہم سیاسی اقدام یہ ہے کہ آپ نے شروع ہی میں مدینہ منورہ کی حرمت (تقدس) کا اعلان کرتے ہوئے اس کی حدود متعین فرمائیں۔

اور اس کی تعیین کے نشان (اعلام) لگوائے، کعبؓ بن مالک سے روایت ہے کہ انہوں نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مجھے بھیجا کہ میں مخیض، حفیا، ذی العشیرہ اور تیم کی چوٹیوں پر نشانات نصب (۱) کروں۔

مسلمانان مدینہ کی مردم شماری

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ایک اور سیاسی وادارتی اقدام مدینہ منورہ کی مردم شماری تھی جو آپ نے مہاجرین وانصار کے درمیان مواخاۃ (رشتہ برادری) قائم کرنے کے بعد پہلے سنہ ہجری میں فرمایا۔

حذیفہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حکم دیا کہ جو اسلام کا کلمہ پڑھتے ہیں میرے لیے ان کے نام لکھو، اس پر ہم نے آپ کے لیے دو ہزار پانچ سو (۲۵۰۰) آدمیوں کے نام لکھے۔(۲)

صلح حدیبیہ

صلح حدیبیہ کے بارے میں ہم سب تھوڑا بہت جانتے ہیں، لیکن کم لوگ یہ جانتے ہیں کہ یہ صلح رسول اکرم ﷺ کی سیاست کا ایک شاہکار تھی، یہ صلح جو ۶ ھ میں مکہ مکرمہ کی حدود حرم سے باہر حدیبیہ (موجودہ شمیسی) کے مقام پر کفار مکہ کے ساتھ منعقد ہوئی، بڑے نازک حالات میں ہوئی تھی۔

۱۔ ڈاکٹر محمد حمید اللہ صاحب نے مطری کی مدینہ منورہ کے بارے میں ایک قلمی کتاب معالم دار الہجر سے یہ روایت نقل کی ہے اور اس کے بعد اس قدیم مصنف کی شرح ہے کہ "یہ سب مدینہ کے پہاڑ ہیں۔ الوثائق السیاسیۃ فی العہد النبوی۔ص ۶۵۔

۲۔ الوثائق السیاسیۃ فی العہد النبوی (بحوالہ کتب حدیث بخاری و مسلم وغیرہ) ص ۶۵۔

Marfat.com

کیونکہ اس سے ایک سال قبل غزوۂ خندق یا غزوۂ احزاب میں کفار مکہ دس ہزار فوجیوں کے ساتھ چڑھ دوڑے تھے، مدینہ کے یہودی (بنی قریظہ) ان کے ساتھ ہو گئے تھے اور مسلمانوں پر ان کی پیٹھ کی طرف سے حملہ کرنے والے تھے، اس موقع پر آنحضرت ﷺ نے عسکری مہارت و خبر رسانی (Intelligence) کے ذریعے ان کے مابین پھوٹ ڈلوادی تھی، بنی قریظہ کو خیانت کے جرم میں سزائے موت دی گئی، باقی یہودیوں کو مدینہ سے خیبر میں جلاوطن کر دیا تھا، لیکن خیبر کے طاقتور اور بااثر یہودیوں کی عداوت اور کفار مکہ کے ساتھ مل کر ریشہ دوانیاں جاری تھیں۔

ذی القعدہ ۶ ھ میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم عمرہ کے لیے تشریف لے گئے تھے، کفار قریش مکہ سے باہر مانع ہوئے، قریب تھا کہ لڑائی چھڑ جائے جس کے لیے مسلمان تیار نہ تھے، اگرچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سفیر حضرت عثمانؓ کے مکہ میں قتل کی افواہ پر آپ نے حدیبیہ میں جہاں آپ کا پڑاؤ تھا، صحابہ کرام سے جنگ کے لیے بیعت لی، لیکن جلد ہی یہ خبر جھوٹی ثابت ہوئی اور کفار مکہ کا ایک وفد سہیل بن عمرو کی قیادت میں آنحضرت ﷺ سے گفتگو کے لیے آیا، قریش کا اصرار تھا کہ امسال آپ اور آپ کے اصحاب عمرہ نہ کریں، آئندہ سال بغیر ہتھیاروں کے آئیں۔

آنحضرت ﷺ حرمت مکہ کے پیش نظر نہیں چاہتے تھے کہ وہاں خون خرابہ ہو اور پھر آپ کو یہودیوں کی طرف سے بھی خطرہ تھا، اس لیے کفار مکہ نے اس وقت صلح کی جو پیش کش کی آپ اس پر راضی ہو گئے، لیکن صلح نامہ میں جو شروط تھیں وہ بظاہر مسلمانوں کے حق میں نہ تھیں اور گویا مسلمان بہت دب کر صلح کر رہے تھے، اس لیے بعض بڑے صحابہ نے ان شرائط پر ناپسندیدگی کا بھی اظہار کیا، لیکن حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس موقع پر اعلیٰ سیاسی مہارت کا جو مظاہرہ کیا وہ تاریخ میں یادگار رہے گا۔ آپ نے ان ظاہری باتوں کو درخور اعتناء نہیں سمجھا جن پر اس زمانہ میں بھی دو متنازع سیاسی طاقتوں کے درمیان گفت و شنید کے موقع پر جھگڑے ہوتے ہیں کہ مندوبین کی نشستیں کس طرح ہوں، کون کدھر بیٹھے وغیرہ وغیرہ۔

حضرت علیؓ یہ معاہدہ صلح لکھ رہے تھے، انہوں نے شروع میں آنحضرت ﷺ کے نام کے ساتھ ''رسول اللہ'' لکھا تو اس پر سہیل بن عمرو نے اعتراض کیا، کہ ہم نے تو ان کو رسول تسلیم ہی نہیں کرتے ہیں، تم یہ لکھ کر ہم کو ان کی رسالت کا قائل قرار دیتے ہو، حضرت علیؓ اور دوسرے صحابہ نے

Marfat.com

کہا کہ ہم ہرگز یہ لفظ نہیں کاٹیں گے۔اس پر حضور ﷺ نے یہ شکلی جھگڑا اس طرح طے فرمایا کہ قلم لے کر اور پوچھ کر "رسول اللہ" کے لفظ پر خود ہی قلم پھیر دیا۔

یہ صلح نامہ سیرت کی کسی کتاب میں بھی دیکھا جا سکتا ہے اور عام طور پر لوگوں کو اس کا علم ہے اس لیے ہم اس کی دفعات کا یہاں ذکر نہیں کریں گے ہاں اس معاہدہ کی جو ایک اہم دفعہ ہے جس نے ایک مکار دشمن یعنی یہودیوں سے ہمیشہ کے لیے اسلامی مملکت کو بے خوف کر دیا اور اس پر ضرور روشنی ڈالیں گے۔

اوپر ذکر ہوا کہ جنگ خندق یا احزاب کے بعد یہودیوں کو حضور ﷺ نے ہی بنو نضیر کی طرح خیبر میں جلا وطن کر دیا تھا، مگر یہ یہودی جن کو قرآن کریم نے مشرکین کی طرح مسلمانوں کا سخت ترین دشمن بتایا ہے۔(۱) کفار مکہ کے ساتھ مسلمانوں کے خلاف ایک نئی ساز باز میں مصروف تھے اور یہ ان خطوط پر ہو رہی تھی کہ حملہ احزاب کے جواب میں اگر مسلمان مکہ پر حملہ کریں تو شمال سے یہودی مدینہ کو خالی پا کر اس پر چڑھائی کر دیں (۲) اور اگر مسلمان خیبر میں یہودیوں پر حملہ آور ہوں تو کفار مکہ جنوب سے مدینہ پر حملہ کر دیں۔

یہ مسلمانوں کے لیے ایک انتہائی تباہ کن صورت ہوتی۔اس صلح نامہ کا پہلا اور اہم فقرہ یہ تھا کہ فریقین دس سال تک ایک دوسرے کے خلاف ہتھیار نہ اٹھائیں گے اور اگر کوئی فریق یا اس کا حلیف اس کی خلاف ورزی کرے گا تو دوسرا فریق فوجی کارروائی کے لیے آزاد ہوگا۔

کفار مکہ کے اس صلح نامہ میں شریک حلیف کی خلاف ورزی سے مسلمانوں کو جو براہ راست فائدہ کافی بعد کو ہوا، یعنی فتح مکہ کا موقع ملا، اس کا ذکر تو سب کرتے ہیں لیکن اس شرط کے نتیجہ میں مسلمانوں کو خیبر کے شر پسند یہودی دشمنوں کے خلاف فوجی کارروائی کا جو موقع ہاتھ آیا اس کے ذکر کو عام طور پر نظر انداز کیا جاتا ہے چونکہ اب مسلمانوں کے ہاتھ ان کے خلاف کھلے ہوئے تھے اور حدیبیہ کے معاہدہ صلح کی رو سے کفار مکہ خیبر کے یہودیوں کی مدد کو نہیں آسکتے تھے اور نہ مدینہ پر حملہ آور ہو سکتے تھے۔

۱؎ سورۃ المائدہ، ۸۲

۲؎ تفسیر قرطبی ۱۶/۲۷۸ میں قتادہ کے قول سے اس کی تائید ہوتی ہے جو "کف ایدی الناس" کی تفسیر میں ہے۔

Marfat.com

یہ نقطہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پیش نظر تھا جس کو وہ بعض صحابہ کرام نہیں دیکھ رہے تھے جو اس معاہدہ سے ناخوش تھے کہ مسلمان اس میں بعض امور میں بہت دب کر صلح کر رہے تھے۔ ہمارے نقطۂ نظر کی تائید اس سے ہوتی ہے کہ صلح حدیبیہ کے فوراً بعد ذی الحجہ میں مدینہ منورہ واپسی پر حضور ﷺ صرف تقریباً بیس روز بعد اوائل محرم ۷ھ میں خیبر کی طرف روانہ ہو گئے اور حکم دیا کہ آپ ﷺ کے ساتھ صرف وہی لوگ جائیں جو حدیبیہ کی ''بیعت الرضوان'' میں شریک تھے، جنہوں نے اپنی جانیں ہتھیلی پر رکھ کر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ہاتھ پر بیعت کی تھی کہ وہ کفار مکہ سے قلیل تعداد کے باوجود لڑیں گے (ان کی تعداد کتب سیرت میں چودہ سو سے لے کر ڈیڑھ ہزار تک بتائی جاتی ہے)۔

مفسرین و سیرت نگاروں کا اس پر اتفاق ہے کہ حدیبیہ سے مدینہ واپس ہوتے ہوئے راستہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر سورۃ الفتح نازل ہوئی جس میں اللہ تعالیٰ نے اس صلح کو ''فتح مبین'' قرار دیا۔

''انا فتحنا لك فتحا مبينا. اور آیت ۱۹ میں ''مغانم کثیرۃ'' (۱) کا ذکر ہے، اس سے مراد فتح خیبر اور اس میں حاصل ہونے والے (۲) غنائم یعنی اموال، ہتھیار اور زمینیں ہیں کہ ابھی تک مسلمانوں کو کسی جنگ میں اتنی مقدار میں غنائم نہیں ملی تھیں۔

بہر حال محرم ۷ھ میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم صلح حدیبیہ کی بیعۃ الشجرۃ یا بیعۃ الرضوان میں شریک ہونے والے سب صحابہ کے ساتھ خیبر کی طرف روانہ ہوئے اور جیسا کہ کتب سیرت و تواریخ و حدیث میں مذکور ہے، محاصرہ و جنگ کے بعد اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو یہاں زبردست فتح نصیب فرمائی۔ ۲۰ ہزار یہودی اور ان کے متعدد قلعے زیر نگیں ہوئے، اس کے بعد شمال ہی میں یہودیوں کے اور مراکز وادی القریٰ، فدک اور تیماء وغیرہ فتح ہوئے۔

۱ۓ آیات کا ترجمہ یہ ہے: ''اللہ مومنین سے راضی ہو گیا جب کہ وہ درخت کے نیچے تم سے (نبی سے) بیعت (قتال) کر رہے تھے اس کو ان کے دلوں کا حال معلوم تھا۔ لہذا اس نے ان کے دلوں کو سکون عطا فرمایا اور ان کو قریبی فتح سے نوازا اور بہت سامال غنیمت عطا فرمایا جسے وہ عنقریب حاصل کریں گے۔

زاد المعاد از ابن القیم ۳/۳۱۲ (طبع بیروت ۱۹۸۵ء) تفسیر ابن کثیر ۴/۱۹۱ میں دوسری مرتبہ مغانم سے غنائم خیبر مراد ہیں، تفہیم القرآن از مولانا مودودی میں تفسیر سورۃ الفتح میں اور معانی بھی دیکھے جا سکتے ہیں۔

Marfat.com

دلوں کی فتح الگ تھی کہ اب مسلمان آزادانہ کفار مکہ سے ملتے ان کو اسلام کی دعوت دیتے تھے۔ ان پر مسلمانوں کی اخلاقی برتری، عفت و امانت، وفا و شجاعت، بے نیازی و قناعت وغیرہ کے جوہر کھلتے اور وہ اسلام قبول کرتے چلے جاتے تھے۔ خالدؓ بن ولید اور عمروؓ بن العاص اسی سال ۷ھ میں اسلام لائے۔

اور اسی کے نتیجہ میں دو سال بعد ہی حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم دس ہزار سپاہیان صحابہ کے ساتھ بغیر کسی جنگ کے مکہ مکرمہ میں داخل ہوئے اور کسی کافر و مشرک میں ہمت نہ ہوئی کہ اس دل بادل کو روک سکے۔ یہ تھیں صلح حدیبیہ میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیاست کی برکات و فتوحات۔

پھر مکہ مکرمہ میں جو برتاؤ آپ نے اپنے پرانے دشمنوں کے ساتھ کیا وہ سیاست میں عالی ظرفی کی ایک سنہری مثال تھی۔ جس نے کفار مکہ کے دلوں کو موہ لیا۔ دیکھئے یہ وہی کفار مکہ ہیں جو مکہ میں برسوں آپ ﷺ کے درپے آزار رہے، حتیٰ کہ قتل کی تدبیریں کیں اور آپ کو اپنا محبوب وطن اور حرم اقدس اور اللہ کا گھر چھوڑنے پر مجبور کیا، یہی نہیں متعدد بار بھاری لاؤ لشکر لے کر مدینہ کو تباہ و برباد کرنے کے لیے پہنچے اور ابھی دو سال پہلے آپ کو اور آپ کے کثیر صحابہ کو عمرہ تک نہیں کرنے دیا تھا۔ آج یہ دریتیم اپنے دس ہزار جاں نثاروں کے ساتھ اسی شہر میں جہاں سے اس کو نکالا گیا تھا کھڑا ہے۔ سرداران قریش سے پوچھتا ہے کہ تم مجھ سے کس برتاؤ یا فیصلے کے منتظر ہو تو کہتے ہیں "اخ کریم و ابن اخ کریم" کرم کرنے والے بھائی اور کرم کرنے والے بھائی کے فرزند سے اسی کی امید ہے۔ جو اس کے شایان شان ہے۔ ارشاد نبوی ہوتا ہے "اذھبوا فانتم الطلقاء جاؤ آج تم سب آزاد ہو۔"

یہ شان کریمی اور رحمۃ اللعالمینی تو تھی ہی، لیکن ساتھ ہی ایک انتہائی اعلیٰ درجہ کی حکیمانہ سیاست بھی تھی، کیونکہ غلبہ و تسلط اور کشت و خون سے ہی دشمن کو زیر کر لینا فتح نہیں ہے، بلکہ "جو دلوں کو فتح کر لے وہی ہے فاتح زمانہ" محمد عربی روحی فداہ نے دل ہی فتح کیے تھے۔ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم۔

لے ۰ اس کو غزوۂ حنین واوطاس کے نام سے بھی یاد کیا جاتا ہے۔ حنین واوطاس پہلو بہ پہلو دو مقامات طائف و مکہ کے مابین اور طائف سے قریب تھے، جہاں قبیلہ ہوازن آباد تھا۔ اس لئے اس کو غزوہ ہوازن بھی کہا جاتا ہے۔ قرآن مجید میں اس کو حنین کے نام سے ہی یاد کیا گیا ہے۔ ملاحظہ ہو سورۃ توبہ آیت ۲۵۔

Marfat.com

آپ کی سیاسی بصیرت ومہارت کا ایک اور منظر ہم غزوہ (ا) حنین یا غزوہ ہوازن کے مال غنیمت کی تقسیم کے وقت دیکھتے ہیں، اس غزوہ میں آپ کو بہت مال ومتاع اور غنیمت میں اونٹ و بکریاں وغیرہ ملیں اور ہوازن کے کافی بچے اور عورتیں بھی گرفتار ہوئیں۔ (ا) ہوازن کے بعض سردار حضور ﷺ کے پاس فریاد لے کر آئے کہ ہمارا مال اور عورتیں اور بچے واپس کر دیں، آپ ﷺ نے فرمایا کہ میرے اور بنی عبدالمطلب کے پاس جو تمہاری عورتیں اور بچے قید ہیں وہ تو میں نے آزاد کیں لیکن جو سپاہیوں میں تقسیم ہو چکی ہے ان پر میرا اختیار نہیں۔ میں صرف سفارش کر سکتا ہوں۔

آپ نے ان کو اس مصیبت سے چھٹانے کے لیے جو طریقہ بتایا، وہ ایک طرف رحمدلی اور انسان دوستی کا شاہکار ہے اور دوسری طرف جمہوری سیاست کا مظہر۔ آپ نے ان لوگوں سے کہا کہ نماز ظہر کے بعد تم اپنی مصیبت بیان کرنا اور کہنا کہ ہم چاہتے ہیں کہ رسول اللہ ہماری سفارش مسلمانوں سے کر دیں اور مسلمان رسول اللہ سے، تا کہ ہمارے بچے اور عورتیں ہم کو واپس مل جائیں۔

انہوں نے ایسا ہی کیا جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بتایا تھا، اس پر آپ نے سب صحابہ کے سامنے کہا کہ میرے پاس اور عبدالمطلب کی اولاد (یعنی آپ کے قرابتی) کے پاس ان لوگوں کی جو عورتیں اور بچے ہیں وہ میں نے آزاد کئے اس پر مہاجرین نے کہا جو ہمارے پاس ہیں وہ ہم نے چھوڑے اور انصار نے کہا جو ہمارے پاس ہیں وہ ہم نے آزاد کئے۔

اس طرح بغیر کسی دباؤ اور فوجی حکم کے آپ نے انتہائی حکیمانہ اور جمہوری طریقہ سے اور برضا ورغبت ہوازن کی قیدی عورتوں اور بچوں کو آزاد کرا دیا، یہ شان رحمت ہی نہ تھی بلکہ ایک کامیاب سیاست بھی اور امت کے لیے ایک اسوۂ حسنہ بھی تھا۔

اور اسی موقع پر تقسیم غنائم (مال غنیمت) کے وقت جس طرح آپ نے روٹھے ہوئے انصار کو اپنی ماہرانہ سیاست سے راضی کیا ہے وہ تو ایک عجیب ہی کارنامہ سیاست ہے یہ تقسیم غزوہ طائف کے بعد اس کے قریب جعرانہ کے مقام پر ہوئی۔

ا۔ کتب سیرت میں چھ ہزار قیدی ۲۴ ہزار اونٹ ۴۰ ہزار بکریوں اور ۴ ہزار چھٹانک چاندی کا ذکر ہے۔

Marfat.com

حضورﷺ نے مال غنیمت جو ہزار ہا اونٹ اور بکریوں اور چاندی پر مشتمل تھا حساب سے تمام سپاہیوں میں تقسیم کیا، مہاجرین اور فتح مکہ کے بعد ہونے والے نئے مسلمانوں کو جن میں کافی سرداران قریش تھے اور انہیں میں ابوسفیانؓ و معاویہؓ بھی تھے، بہت زیادہ دیا ہر شخص کے حصہ میں بارہ اونٹ اور ۱۲۰ بکریاں آئیں لیکن حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان نومسلم سرداروں کو جو فتح مکہ کے موقع پر اسلام لائے اور غزوہ حنین و طائف میں مسلمانوں کے ساتھ شریک تھے اور جن کو ''طلقاء'' کہا جاتا ہے ان کو ان کی تالیف قلب کے لیے بہت زیادہ جانور اور چاندی دی، ابوسفیانؓ کو چالیس اوقیہ (چھٹانک کے برابر) چاندی اور ایک سو اونٹ دیئے تو انہوں نے اپنے بیٹے معاویہؓ و یزید کا بھی ذکر کیا، آپ نے حکم کیا کہ ان کو بھی اتنا ہی دے دو۔ اسی طرح اور بہت سوں کو بھی آپ نے سو اونٹ مرحمت فرمائے۔

اس روز رسول اکرمﷺ کی شان کریمی اپنی انتہائی بلندیوں پر تھی اور پھر آپ اس مال و متاع کے ذریعے ان نومسلموں کو اسلام کا گرویدہ بنانا چاہتے تھے جو اسلام کا غلبہ دیکھ کر مسلمان ہوئے تھے۔ انصار جو اس نکتہ کو نہ پا سکے۔ اس تقسیم سے کسی قدر رنجیدہ ہوئے اور انہیں اپنی حرمان نصیبی کا احساس ہوا۔ حضورﷺ کو پتہ چلا تو آپ نے حضرت سعد بن عبادہؓ انصاری کو حکم دیا کہ سب انصار کو ایک جگہ جمع کیا جائے اور وہاں انصار کے سوا کوئی نہ ہو۔

پھر حضورﷺ وہاں تشریف لے گئے اور پوچھا کہ کیا یہ صحیح ہے کہ تم لوگ مجھ سے ناخوش ہو گئے ہو، اس پر انصار نے جواب دیا کہ ہمارے سمجھدار اور سنجیدہ لوگوں نے تو کوئی شکایت نہیں کہ مگر ہاں جوانوں کو یہ شکایت ہے کہ حضورﷺ نے قریش کو ایسے بڑے بڑے انعامات دیئے اور ہمیں کچھ نہیں، جبکہ ہماری تلواروں سے ابھی قریش کے خون کے قطرے گرے ہیں۔

اس کے بعد آنحضرتﷺ نے جو تقریر فرمائی اس کے مقابلہ میں دنیا کے قدیم و جدید کسی سیاست داں کی تقریر اپنے اختصار، دلآویزی اور اثر انگیزی میں مقابلہ نہیں کر سکتی، کار نبوت میں کار سیاست کی وہ بے مثال جلوہ گری تھی کہ انسانی تاریخ ایسا دوسرا کوئی منظر پیش نہیں کر سکتی۔

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''اے انصار کیا یہ سچ نہیں ہے کہ تم پہلے گمراہ تھے، اللہ نے میرے ذریعے سے تم کو ہدایت دی؟ تم منتشر اور پراگندہ تھے، اللہ نے میرے ذریعے سے تم

Marfat.com

میں اتفاق پیدا کیا؟ تم مفلس تھے، اللہ نے میرے ذریعے سے تم کو دولت مند کیا؟''

جب آپ یہ فرمار ہے تھے تو ہر فقرے پر انصار کہتے جاتے تھے کہ ''اللہ اور اس کے رسول ﷺ کا احسان سب سے بڑھ کر ہے۔'' آپ نے انصار سے فرمایا کہ جواب کیوں نہیں دیتے؟ انہوں نے کہا کہ ہم اس کے سوا کیا جواب دیں کہ اللہ اور اس کے رسول کا ہم پر بڑا فضل و احسان ہے۔

آپ نے فرمایا: ''نہیں تم یہ جواب دے سکتے ہو کہ محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) آپ کو جب لوگوں نے جھٹلایا تو ہم نے آپ کی تصدیق کی، آپ کو جب لوگوں نے چھوڑ دیا تو ہم نے پناہ دی آپ مفلس آئے تھے ہم نے ہر طرح سے مدد کی۔''

یہ کہہ کر آپ نے فرمایا: ''تم یہ جواب دیتے جاؤ اور میں کہتا جاؤں گا کہ تم سچ کہتے ہو۔''

اس کے بعد وہ جملہ فرمایا جو جان خطابت ہے، جس سے انصار کے دلوں کے تار جھنجھنا اٹھے، چشم زدن میں شکایتوں کے بادل چھٹ گئے اور نفوس کی کایا پلٹ ہوگئی۔

آپ ﷺ نے فرمایا: ''لیکن اے انصار! کیا تم کو یہ پسند نہیں کہ لوگ اونٹ اور بکریاں لے کر جائیں اور تم رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو لے کر اپنے گھر آؤ۔''

اس پر انصار بے اختیار چیخ اٹھے کہ ''ہم کو صرف رسول ﷺ اللہ درکار ہیں۔'' اکثر کا یہ حال کہ آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے، گال اور داڑھیاں آنسوؤں سے تر ہو گئیں، آپ نے انصار کو سمجھایا کہ مکہ کے یہ لوگ نیا نیا اسلام لائے ہیں، میں نے ان کو جو کچھ دیا وہ حق کی بنا پر نہیں بلکہ تالیف قلوب کے لیے دیا ہے۔

اس تقریر میں آپ نے یہ بھی فرمایا کہ ''اگر ہجرت نہ ہوتی تو میں انصار کا ایک فرد ہوتا، اگر انصار ایک وادی کی طرف چلیں اور دوسرے لوگ دوسری وادی کی طرف تو میں انصار کے ساتھ جاؤں گا۔ انصار میرے شعار (اندرونی کپڑے) ہیں اور دوسرے لوگ دثار (بیرونی کپڑے) ہیں۔(۱) اے اللہ تو انصار پر رحم فرما، ان کی اولاد پر اور اولاد کی اولاد پر رحم فرما۔(۲)

۱۔ یہ ایک عربی انداز تمثیل ہے، بالفاظ دیگر انصار تو میری جان ہیں اور دوسرے پوست۔

۲۔ آنحضرت ﷺ کی تقریر کے الفاظ اس واقعہ کی مختلف روایات کے ساتھ، بخاری باب غزوۃ الطائف میں موجود ہیں۔ (بولاق مصر ایڈیشن۔ ج ۵۔ ص ۱۹۸-۲۰۱) اور دوسری عربی و اردو کتب سیرت میں بھی۔

Marfat.com

یہ تھی حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیاست اور یہ تھی آپ کی سیاسی خطابت وحکمت، کہ ایک طرف تو نومسلم سرداران مکہ کی تالیف قلب کرکے ان کو اسلام کا گرویدہ بنالیا، قبیلہ ہوازن کے مفتوحین کے ۶ ہزار قیدی (عورتیں بچے) آزار کر دیئے جو بعد کو سب مسلمان ہو گئے اور انصار جن کے اسلام پر حضور ﷺ کو پورا بھروسہ تھا ان کی ساری شکایتیں دور کر دیں۔ان کو ایثار میں اور پختہ کر دیا(۱) اور ان کے دل موہ لئے۔

خدا پرست، حکیمانہ اور بے لوث سیاست کا یہ وہ انداز ہے جس کی ہم کو اپنی موجودہ ملحدانہ، غرض مندانہ، منتقمانہ سیاسی فضا میں سخت ضرورت ہے۔ جس میں ہمارے دکھوں کا علاج اور معاشرہ کا مداوا ہے اور سعادت دارین کی ضمانت بھی۔

کاش کہ ہم اس اسوۂ حسنہ کو اپنا سکیں۔

لے سورۃ الحشر کی آیت ۹ انصار کے ایثار کے بارے میں پہلے اتر چکی تھی۔

Marfat.com

Marfat.com

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے خطوط

بنام

فرماں روایانِ عالم

Marfat.com

Marfat.com

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خطوط بنام فرماں روایانِ عالم

بسم الله الرحمن الرحيم

من محمد عبدالله و رسوله، الى هرقل عظيم الروم

سلام علی من اتبع الهدى. اما بعد. فانى ادعوك بدعاية الاسلام، اسلم تسلم. واسلم يؤتك الله اجرك مرتين ، فان توليت فعليك اثم الارسيين و يا اهل الكتاب تعالوا الى كلمة سواء بيننا وبينكم ، الا نعبد الا الله ولا نشرك به شيئاً ، ولا يتخذ بعضنا بعضا اربابا من دون الله ، فان تولوا فقولوا اشهد وا بانا مسلمون.

نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا خط ہرقل کے نام

بسم الله الرحمن الرحيم

محمد اللہ کے بندے اور اس کے رسول کی طرف سے سردار روم کے نام۔

سلام ہو اس پر جس نے ہدایت کا اتباع کیا، اما بعد، میں تجھ کو اسلام کی دعوت دیتا ہوں، اسلام لے آ، تو سلامت رہے گا، اور اسلام لے آ۔ اللہ تجھ کو دو مرتبہ اجر دے گا۔ اگر تو نے روگردانی کی تو تجھ پر تیرے محکومین کا گناہ ہوگا۔ ''اور اہل کتاب کلمہ حق کی طرف آؤ جو ہمارے اور تمہارے مابین ہے کہ ہم اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہیں کرتے ہیں اور کسی اور اس کے ساتھ شریک نہیں کرتے ہیں اور ہم میں سے بعض دوسرے بعض کو اللہ کے سوا معبود نہیں بناتے پھر بھی اگر تم روگردانی کرو تو کہہ دو۔ گواہی دو کہ ہم مسلمان ہیں۔''

مہر نبی کا نشان

Marfat.com

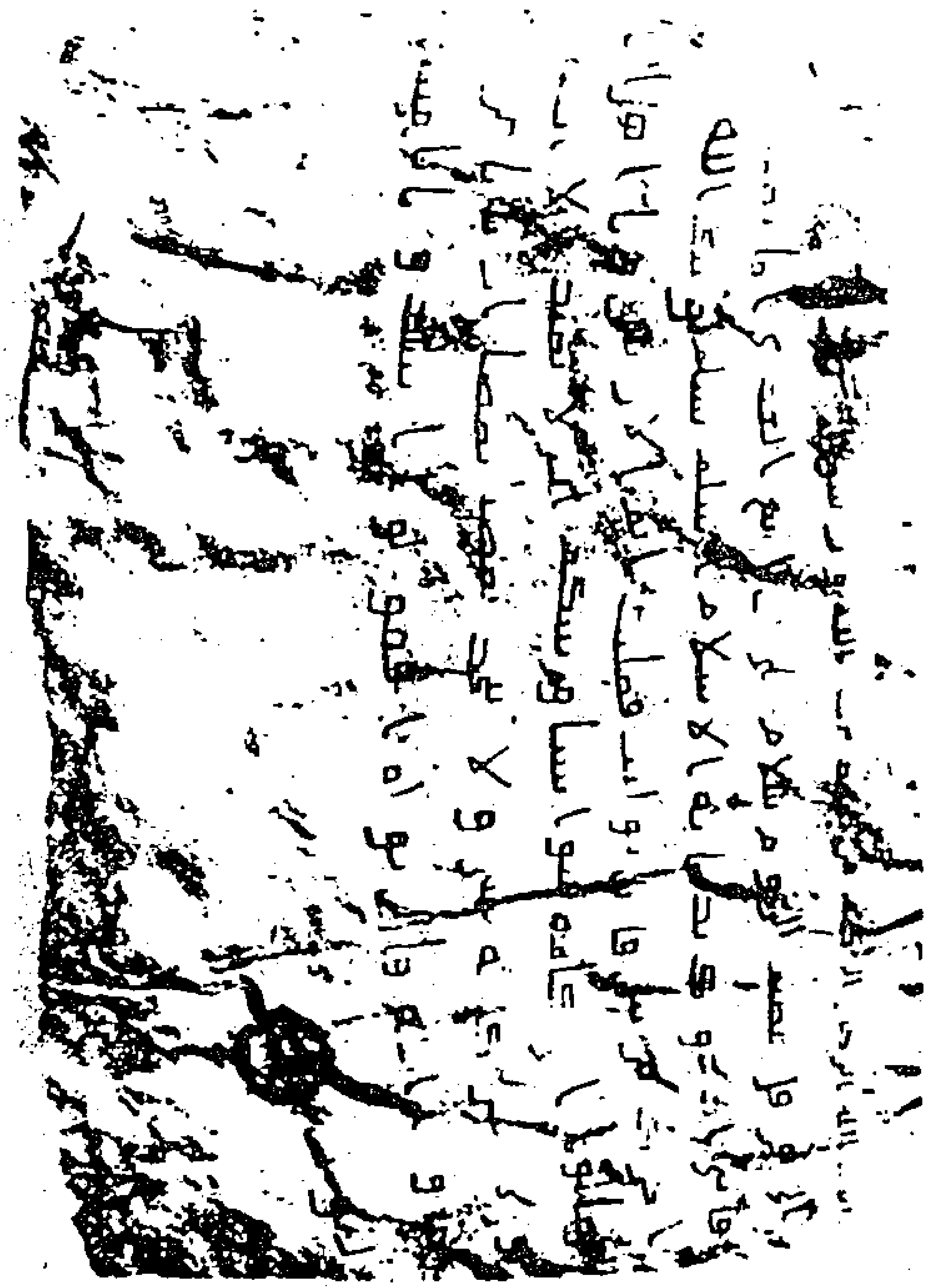

نبی کریم ﷺ کا خط ہرقل کے نام

Marfat.com

بسم الله الرحمن الرحيم

من محمد رسول الله الی کسری عظیم فارس.

سلام علی من اتبع الهدی، وآمن بالله ورسوله ، وشهد ان لا اله الا الله وحده لا شریك له، وان محمدا عبده ورسوله.

وادعوك بدعاء الله فانی انا رسول الله الی الناس کافة ، لانذر من کان حیا و یحق القول علی الکافرین ، فاسلم تسلم، فان ابیت فان اثم المجوس علیك.

کسریٰ کے نام

بسم اللہ الرحمن الرحیم

محمد رسول اللہ کی طرف سے کسریٰ سردار فارس کے نام۔

سلام ہو اس پر جس نے ہدایت کا اتباع کیا اور اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لایا اور گواہی دی کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، وہ ایک ہے اس کا کوئی شریک نہیں اور یہ کہ محمد اس کے بندے اور اس کے رسول ہیں۔ میں تجھ کو اللہ کی طرف بلاتا ہوں کہ میں اللہ کا رسول ہوں تمام انسانوں کے لیے۔ تاکہ میں ہر زندہ کو خبردار کروں اور کافروں پر عذاب الٰہی حق ہو جائے۔ لہٰذا تو اسلام لے آ۔ تاکہ سلامت رہے، اگر تو نے انکار کیا تو تجھ پر (تیری قوم) آتش پرستوں کا گناہ ہوگا۔

مہر نبی کا نشان

Marfat.com

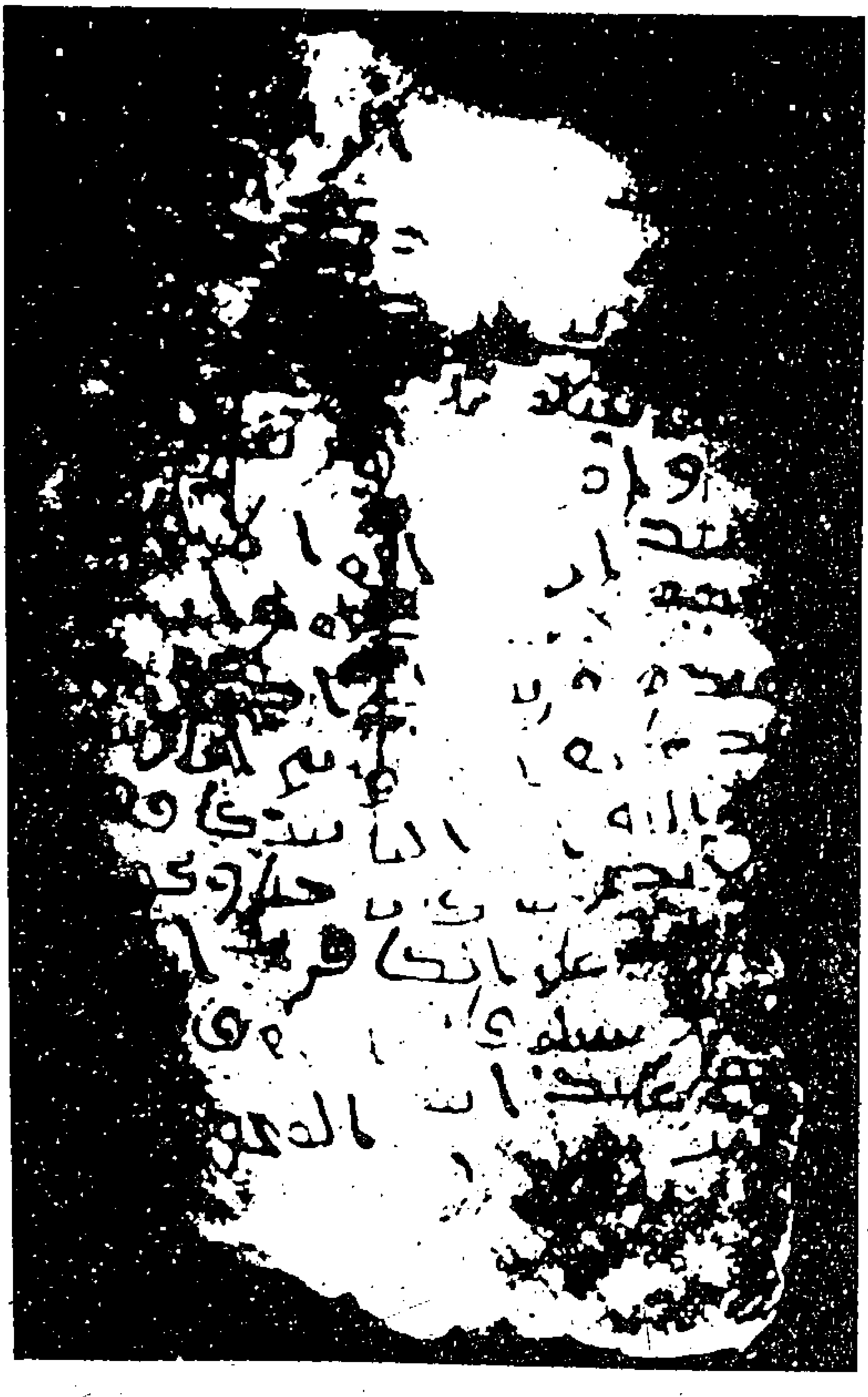

كتابه صلى الله عليه وسلم الى كسرى، وثيقة (٥٣)

Marfat.com

بسم الله الرحمن الرحیم

من محمد رسول الله الى النجاشي عظيم الحبشة . سلام على من اتبع الهدى. اما بعد . فاني احمد اليك الله الذى لا اله الا هو الملك القدوس السلام المؤمن المهيمن و اشهد ان عيسى بن مريم روح الله و كلمة القاها الى مريم البتول الطيبة الحصينة فحملت بعيسى من روحه و نفخه كما خلق آدم بيده. واني ادعوك الى الله وحده لا شريك له والموالاة على طاعته و ان تتبعني و توقن بالذى جاء نی فاني رسول الله . واني ادعوك و جنودك الى الله عز و جل وقد بلغت و نصحت فاقبلو (كذا) نصيحتي. والسلام

على من اتبع (كذا بائين) الهدى.

نجاشی بادشاہ حبشہ کے نام

بسم الله الرحمن الرحیم

محمد رسول اللہ کی طرف سے نجاشی سردار حبشہ کے نام۔ سلام ہو اس پر جس نے ہدایت کا اتباع کیا۔ اما بعد میں تمہارے سامنے اللہ کی تعریف کرتا ہوں جس کے سوا کوئی خدا نہیں وہی حقیقی بادشاہ، ذات پاک، سلامتی والا اور امن بخشنے والا، ہر شے پر نگران ہے۔ اور میں گواہی دیتا ہوں کہ عیسیٰ بن مریم روح اللہ۔ اور اس کا کلمہ تھے جس کو اللہ نے مریم بتول کے نفس میں ڈالا۔ جو پاکیزہ صفات اور عفت مآب تھیں، ان کو اس کی روح اور پھونک کے ذریعے عیسیٰ کا حمل ہوا، جیسے آدم کو اس نے اپنے ہاتھ سے پیدا کیا اور میں تجھ کو اللہ وحدہ لاشریک لہ کی طرف دعوت دیتا ہوں اور اس کی اطاعت میں تسلیم ورضا کی طرف، اور یہ کہ تو میرا اتباع کرے اور جو کچھ میرے لیے (اللہ کی طرف سے) آیا ہے اس پر یقین کرے کہ میں اللہ کا رسول ہوں اور میں تجھ کو اور تیرے لشکریوں کو اللہ کی طرف بلاتا ہوں۔ میں نے (پیغام) پہنچا دیا، اور نصیحت کر دی، پس میری نصیحت قبول کرو اور سلام ہو، اس پر جس نے ہدایت کا اتباع کیا۔

مہر نبی کا نشان

Marfat.com

كتابه صلى الله عليه وسلم الى النجاشى

Marfat.com

بسم الله الرحمن الرحيم

من محمد عبدالله و رسوله، الى المقوقس عظيم .

سلام على من اتبع الهدى. اما بعد. فانی ادعوك بدعاية الاسلام، اسلم تسلم. و ایؤتك الله اجرك مرتین ، فان تولیت فعلیك اثم القبط. یا اهل الکتاب تعالوا الى كلمة سواء بيننا وبينكم ، الا نعبد الا الله ولا نشرك به شيئا، ولا يتخذ بعضنا بعضا اربابا من دون الله ، فان تولوا فقولوا اشهدوا بانا مسلمون.

مقوقس سردار اقباط کے نام

بسم الله الرحمن الرحيم

محمد اللہ کے بندے اور اس کے رسول کی طرف سے مقوقس سردار اقباط کے نام۔

سلام ہو اس پر جس نے ہدایت کا اتباع کیا، اما بعد: میں تجھ کو اسلام کی دعوت دیتا ہوں، اسلام لے آ۔ تو سلامت رہے گا۔ اللہ تجھ کو دو مرتبہ اجر دے گا۔ اگر تو روگردانی کرے گا تو تجھ پر اقباط کا گناہ ہوگا۔ ''اے اہل کتاب کلمہ حق کی طرف آ جاؤ جو ہمارے اور تمہارے مابین مشترک ہے، یہ کہ ہم اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہیں کرتے ہیں اور نہ اس کے ساتھ کسی کو شریک کرتے ہیں اور ہم میں سے بعض دوسرے بعض کو اللہ کے سوا معبود نہیں بناتے اگر تم روگردانی کرتے ہو تو کہہ دو۔ گواہی دو کہ ہم مسلمان ہیں۔

مہر نبی کا نشان

Marfat.com

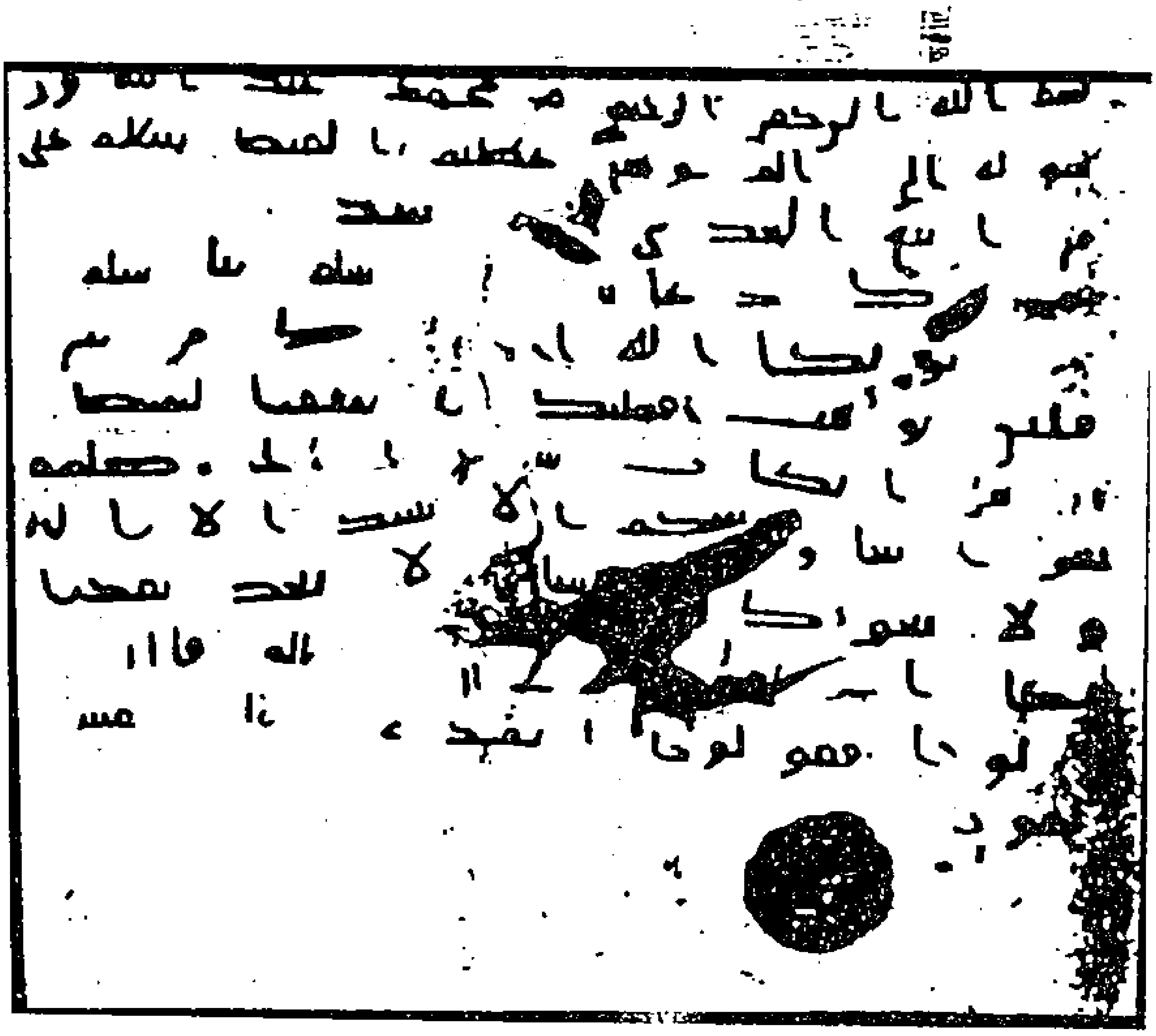

كتابه عليه السلام الى المقوقس، وثيقة (٣٨).

Marfat.com

بسم الله الرحمن الرحیم

من محمد رسول الله الی المنذر بن ساوٰی.

سلام علیك فانی احمد الله الیك الذی لا اله غیره، واشهد ان لا اله الا الله، وان محمدا عبده ورسوله.

اما بعد :فانی اذکرك الله عزوجل ، فانه من ینصح فانما ینصح لنفسه ، وانه من یطع رسلی و یتبع امرهم فقد اطاعنی و من نصح لهم فقد نصح لی. وان رسلی قد اثنوا علیك خیرا. وانی قد شفعتك فی قومك ، فاترك للمسلمین ما اسلموا علیه. وعفوت عن عملك . ومن اقام علی یهودیة او مجوسیة فعلیه الجزیة.

منذر بن ساویٰ حاکم بحرین کے نام (۱)

بسم الله الرحمن الرحیم

محمد رسول اللہ کی طرف سے منذر بن ساویٰ کے نام۔

تجھ پر سلام ہو، میں تیرے سامنے اللہ کی تعریف کرتا ہوں کہ اس کے سوا کوئی معبود نہیں اور گواہی دیتا ہوں کہ اس کے سوا کوئی خدا نہیں اور محمد اس کے بندے اور اللہ کے رسول ہیں۔

اما بعد: میں تجھ کو اللہ عزوجل کی یاد دلاتا ہوں، کہ جو کوئی خیر خواہی چاہتا ہے وہ اپنے لیے خیر خواہی چاہتا ہے اور یہ کہ جو کوئی میرے نامہ بروں کی فرماں برداری کرے گا۔ اور ان کے احکام کا اتباع کرے گا وہ گویا میرا اتباع کرے گا اور جو ان کے ساتھ خیر خواہی کرے گا، گویا اس نے میرے ساتھ خیر خواہی کی، میرے سفراء نے تیری تعریف کی ہے اور میں تجھ کو تیری قوم کا سفارشی قرار دیتا ہوں، لہٰذا اسلام لانے والوں کے لیے وہ سب کچھ ان کے قبضہ میں رہنے دے جو اسلام لاتے وقت ان کے پاس تھا اور جرم کرنے والوں کو میں نے معاف کیا۔ تو بھی ان سے یہ معافی قبول کر۔ اور جب تک تو ٹھیک رہے گا ہم تجھ کو تیرے منصب سے معزول نہیں کریں گے اور جو کوئی اپنی یہودیت اور مجوسیت (آتش پرستی) پر قائم رہے گا تو اس پر جزیہ ہے۔

مہر نبی کا نشان

۱؎ بحرین سے اس زمانہ میں خلیج فارس میں واقع جزیرۂ عرب کا ساحلی علاقہ مراد ہے۔

Marfat.com

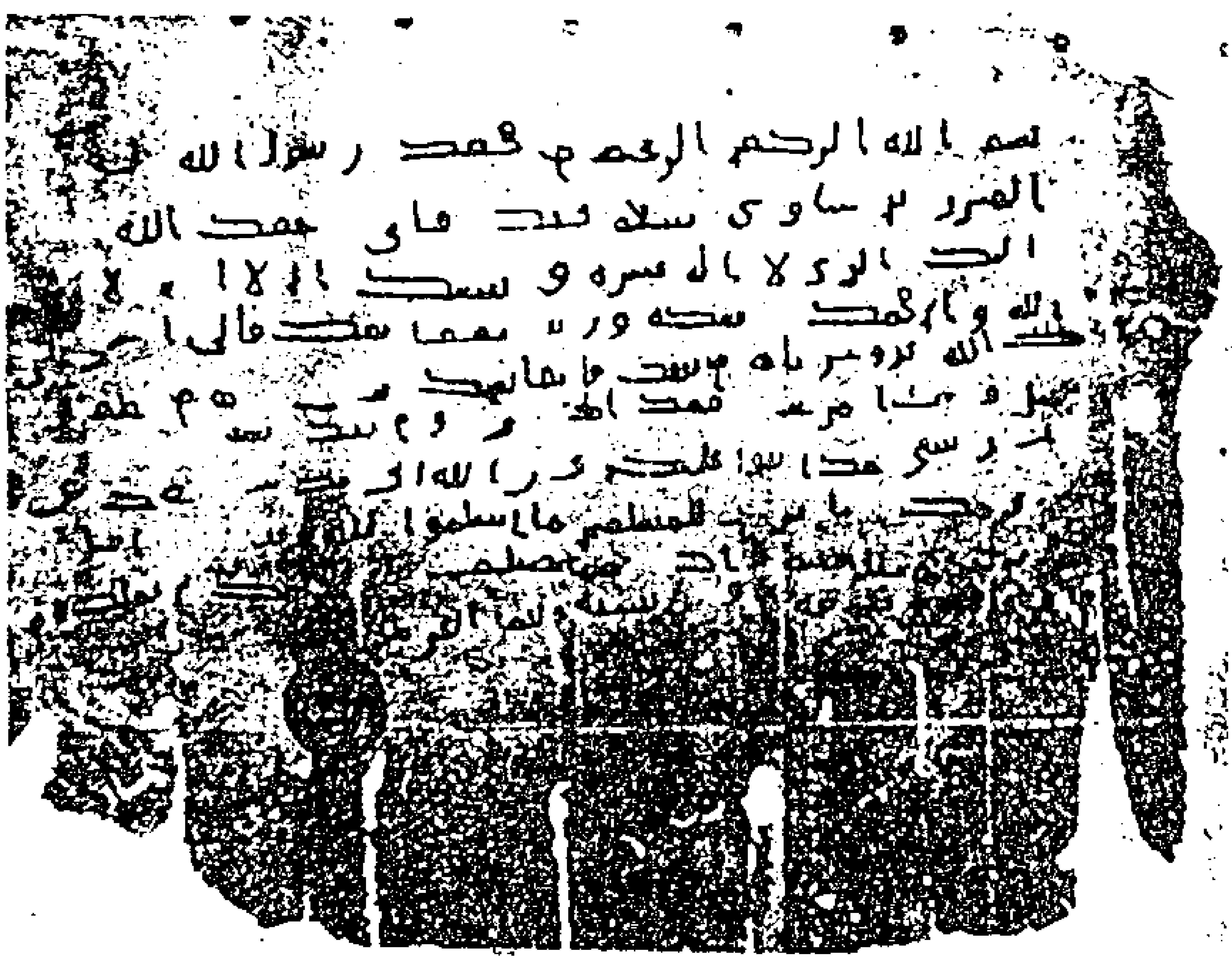
بسم الله الرحمن الرحيم محمد رسول الله

Marfat.com

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے جدامجد حضرت اسماعیل علیہ السلام
اور
آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بارے میں تورات میں وارد بشارتیں ☆

سامرہ (فلسطین) کے باشندوں کے پاس جو تورات ہے وہ اس تورات سے مختلف ہے جو تمام یہودیوں کے پاس ہے۔ یہ اختلاف تواریخ یہودی عیدوں اور انبیاء کے ذکر کے بارے میں ہے اور عیسائیوں کے پاس جو توراۃ ہے اور جو یونانیوں کی طرف منسوب ہے اس میں سنین کی تواریخ کے بارے میں عبرانی توراۃ پر ایک ہزار چار سو سے کچھ زائد اضافے ہیں۔

ان سب اختلافات سے ان کی توراۃ میں تحریف و تبدیل ثابت ہوتی ہے کیونکہ اللہ کی طرف سے کسی تعارض اور تناقض کا جواز ممکن نہیں۔ پھر وہ کس طرح اپنی روایات سے استدلال کرتے ہیں جب کہ ان کی روایات کی نقل کا یہ عالم ہے۔

میں نے تمہارے لیے اس بات کی وضاحت اس لیے کی ہے کہ تم ان کے اس قول سے مایوس نہ ہو کہ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا توراۃ میں ذکر نہیں۔"

☆ چوتھی صدی ہجری کے عرب مؤرخ مطہر ابن طاہر کی کتاب "لبدء والتاریخ" کے پانچویں جزو میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے جدامجد حضرت اسماعیل علیہ السلام کے بارے میں وہ عبارات اصلی عبرانی الفاظ میں منقول ہیں جو عبرانی توراۃ میں آئی ہیں اور جن کی توراۃ کے دوسرے نسخوں میں جو یونانی زبان میں لکھے گئے یا اہل سامرہ کے پاس سریانی زبان میں وارد شدہ ان عبارتوں میں تحریف و تبدیل کی گئی ہے۔ ہم اس عظیم مورخ فلسفی اور دینی عالم کے توراۃ کی تحریف کے بارے میں خیالات پیش کرتے ہوئے مذکورہ بالا عبرانی عبارات کا ترجمہ پیش کرتے ہیں۔ جن کا عکس مقابل کے صفحات میں دیا گیا ہے۔ یہ کتاب ایک فرنچ مستشرق کلیمنٹ ہوار نے چھ اجزاء میں پیرس سے ۱۸۹۹ء تا ۱۹۰۷ء شائع کی۔

Marfat.com

اللہ تعالیٰ ابراہیمؑ سے کہتا ہے:

(۱) ''میں نے تیری دعا اسماعیل کے بارے میں سن لی، ہاں میں نے اس کو برکت مرحمت فرمائی۔''

اللہ عزوجل فرماتا ہے:

(۲) ''میں نے ان کی تعداد بڑھائی اور ان میں بہت زیادہ اضافہ کیا یہاں تک کہ ان کو کثرت کی وجہ سے شمار نہیں کیا جاسکتا۔''

اللہ عزوجل فرماتا ہے!

(۳) ''بارہ بادشاہ اس کی ولدیت میں ہوں گے اور میں اس کو بہت بڑی امت کے لیے ظاہر کروں گا۔''

اللہ عزوجل ابراہیمؑ سے فرماتا ہے!

''میں نے اسماعیل کے بارے میں تمہاری دعا کو قبول کیا ان پر اپنی برکت نازل کی اور ان کو بہت زیادہ برکت وعظمت دی۔ وہ بارہ شرفا کو جنم دیں گے اور ان کو بہت بڑی امت کے لیے بناؤں گا۔''

اللہ عزوجل فرماتا ہے:

(۴) ''اللہ تعالیٰ کے حکم سے طور سیناء سے اور جبل سعیر سے ان کے لیے آگ نمودار ہوگی۔''

اللہ عزوجل فرماتا ہے!

(۵) ''جبل فاران سے نور چمکا اور قدس کی ٹیلوں سے وہ آئے گا۔''

اللہ عزوجل فرماتا ہے!

مصنف نے توراۃ کی روایات کی نقل کے بعد لکھا ہے۔ ''(سعیر) فلسطین کا پہاڑ ہے۔ جو روم (بیزنطہ) کی سرحد سے شروع ہوتا ہے اور فاران توراۃ کی روایت کے مطابق مکہ کا سلسلہ کوہ ہے۔ وہ روایت یہ ہے کہ ابراہیم علیہ السلام نے حضرت ہاجرہ اور اسماعیل علیہ السلام کو فاران میں ٹھہرایا۔''

وفی ایدی السامرة توراة مخالفة للتورية التی فی ایدی سائر الیهود فی التواریخ والاعیاد و ذکر الانبیاء و عند النصاری تورية منسوبة الی الیونانیة فیها زیادة فی تورایخ السنین علی التورية العبرانیة الف و اربع مائة سنة ونیف و هذا

Marfat.com

کلّه یدلّ علی تحریفهم و تبدیلهم اذ لیس یجوز و جود التضادّ فیها من عنداللّه فکیف یحتجون بالنقل و هذا سبیل نقلهم و اِنّما بیّنتُ لك هذا لئلا یُفْشِلك قولهم لیس لمحمّد فی التوریة ذِکْرٌ وهذا موضع ذکره بالعبریة ثم نعجم تحتها بحروف العبریّة ثم نُعبّر عنها بلفظها.

۱ـ ולישמעאל שמעתיך הנה ברכתי אתו

ول ی ش م ع ل ش م ع ت ی خ ہ ن ہ ب ر خ ت ی اوث و

الفاظ العبریّةُ مُؤدّاة بحروف العربّیة

و یشموعیل شمعتیخو هنّه برختی اء ثوا

یقول الله تعالیٰ لا ابرهیم سمعتُ دُعاك فی اسماعیل هاه بارکتُ اِیّاہ

۲ـ v° 161 f°! وہ[ف]ری ث ی اوث و وہ رب ث ی اوث و ب م اذ م اذ

وہ(ف)ری ث ی اوث و وہ رب ث ی اوث و ب م اذ م اذ

الفاظ العبرقیة مؤداة بحروف العربیّة

و هفرثی اوثوا و هربثی اوثوا بمآذ مآذ

یقو ل الله عز و جل و کثرت عدده وانمیته جدا جدا حتی لا تعد کثرته

۳ـ שנים־עשר נשיאם יוליד ונתתיו לגוי גדול

ش ن ی م ع س ر ن س ی ا ی م ی ول ی د ث ث ی و ل غ وی ج دول

الفاظ العبریة مؤداة بحروف العربیة

شنیم عوسور نسیایم ولید و نیث ثو لغوی کودول

بقول الله عز وجل اثنا عشر ملکا یولده و اظهره لامة عظیمة ، و هذا الفصل فی تخریجات اهل الاسلام بلفظ العربیة بقول الله عز و جل لا برهیم و قد اجبت دعاك ف اسماعیل وبارکت علیه و بارکته وعظّمته جدا جدا و سَیلد اثنی عشر شریفا واجعله لامة عظیمة.

Marfat.com

۴۔ ויאמר אדני מסיני בא וזרח משעיר למו

وی ام ر ادن ی م س ی ن ا ب ا وزرح م س ع ی ر ل م و

الفاظ العبرية مؤداة بحروف العربية

و يومار ادونى مسينى با وزرح مسعير لموا

يقول الله عز و جل بامر الله من طور سيناء و يطلع من ساعير لهم نيرانا

۵۔ הופיע מהר פארן ואתה מרבבת קדש

ہ وف ی ع م ہ ر ف اران وات ہ م رب ب وث ق دش

الفاظ العبرية مؤداة بحروف العربية

هوفيع مهار فران و اثا مربوث قدس

يقول الله عز و جل اشرق من جبال فاران وياتي من ربوات القدس.

یہ مسئلہ مسلمانوں کی روایات یا استنباطات میں عربی الفاظ میں اس طرح مذکور ہے۔

اللہ سیناء کی طرف سے آیا اور سعیر سے چمکا اور جبل فاران سے اس کا ''ظہور ہوا۔''

روایت ہے کہ سیناء سے اللہ کے آنے کے معنی موسیٰ پر توراۃ اتارنا ہے اور کا سعیر سے چمکنا عیسیٰ پر انجیل اتارنا ہے اور جبل فاران سے اللہ کا ظہور محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر قرآن اتارنا ہے۔

توراۃ اور انجیل میں کتنے ہی دلائل حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آپ کے صحابہ کرام کے متعلق اور ان کی ہجرت گاہوں اور وادیوں کے متعلق موجود ہیں۔ یہاں تک کہ ان کی آوازوں اور ان کی قرات اور نماز میں ان کی ہیئت اور ان کے جہاد کا ذکر موجود ہے، لیکن اللہ تعالیٰ جس کی روشنی عطا نہیں فرمائے، اس کو روشنی کہاں سے مل سکتی ہے۔

یہ جاننا چاہیے کہ ان کے حروف عجمی ہیں ان کا تلفظ ان کو عربی میں بدلے بغیر ممکن نہیں جیسے وہ حرف جو ''ق'' اور ''ک'' کے بیچ میں ہیں اور وہ حرف جو ''ب'' اور ''ف'' کے بیچ میں ہے (۱) پھر ان کے پڑھنے کے انداز میں ایسا مد اور امالہ ہے کہ سننے والا واو یا ''یاء'' سنتا ہے، لیکن یہ دونوں لکھے نہیں جاتے۔''

---

۱ مصنف کا مطلب گ اور پ ہیں۔ البدء والتاریخ ص ۳۰۔۳۳، پیرس ۱۹۰۷ء

Marfat.com

طبری پر شیعیت کا الزام۔ تجزیہ و تردید

امام ابو جعفر محمد بن جریر الطبری ہماری تاریخ کی ایسی نابغۂ روزگار شخصیت ہیں جن کو بیک وقت تفسیر، حدیث، فقہ اور تاریخ میں ایک انتہائی امتیازی مقام حاصل تھا، مگر اس دور میں ان کی شہرت دینی حلقوں میں بحیثیت عظیم مفسر اور عالم علمی حلقوں میں بحیثیت عظیم ترین اسلامی مورخ کے ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جس طرح مغربی دنیا بلکہ ساری دنیا میں پانچویں صدی قبل مسیح یا ڈھائی ہزار سال قبل کے یونانی مورخ ہیروڈوٹس Herodotus کو تحریر کردہ تاریخ کا ''باوا آدم'' کہا جاتا ہے (جس کی کتاب ''تواریخ'' مشہور و مطبوع ہے) اس طرح طبری بھی عربی و اسلامی تاریخ کے ابوالتاریخ یا تاریخ کے ''باوا آدم'' سمجھے جاتے ہیں۔ جن کی دس جلدوں میں (دارالمعارف، قاہرہ کا نیا تحقیق شدہ ایڈیشن) ضخیم کتاب ''تاریخ الرسل والملوک'' (یہ تاریخ الامم والملوک کے نام بھی معروف ہے) یا مختصراً تاریخ طبری عربی زبان کی مستند ترین، قدیم ترین اور عظیم ترین تاریخ سمجھی جاتی ہے۔

یہ تاریخ ابتدائے آفرینش سے شروع ہو کر ۳۰۲ھ پر ختم ہوتی ہے، یعنی اس میں مصنف کی وفات سے آٹھ سال قبل تک کے حالات مذکور ہیں کہ طبری کی وفات ۳۱۰ھ میں ہوئی۔ یہاں نہ تو مجھے اسلامی تاریخ و ثقافت کی اس مایۂ ناز شخصیت کی سوانح عمری لکھنا مقصود ہے اور نہ ان کی تاریخ کا تعارف و مقام بتانا مدنظر ہے۔ بلکہ اس مقالہ میں، میں اس جلیل القدر امام تفسیر و حدیث و فقہ و تاریخ پر شیعیت کے الزام و افتراء کی اصل حقیقت بیان کر کے اس بہتان کی تردید کرنا چاہتا ہوں جو بڑے شد و مد سے پاکستان میں دہرایا جانے لگا ہے اور جس کی وجہ کم علمی، تعصب اور گروہ بندی ہے۔ ایک صاحب جو یزید کی تعریف میں ایک دو کتابیں لکھ کر مشہور ہوئے بے تکان طبری کو (جنہیں اہل سنت ان کے علم و فضل کی وجہ سے امام طبری کے نام سے یاد کرتے ہیں) اپنی کتابوں میں شیعہ کہے چلے جاتے ہیں۔ ان صاحب نے اردو داں قارئین کو بڑا دھوکہ دیا ہے اور ریت کے

Marfat.com

محل تعمیر کئے ہیں اور بڑی بے دردی سے ناقص اور تراشیدہ حوالے پیش کئے ہیں وہ شہرت اور ''مارکیٹ'' کے متلاشی تھے سو وہ ان کو مل گیا تھا۔ ''بدنام اگر ہوں گے تو کیا نام نہ ہوگا'' مگر افسوس کہ وہ عوام میں ایک غلط بات پھیلا گئے۔

مزید افسوس ناک بات یہ ہے کہ کچھ دوسرے اہل سنت کے حلقے میں جنہوں نے مولانا مودودی مرحوم کی کتاب ''خلافت وملوکیت'' پر تنقید کرتے ہوئے امام طبری کو شیعہ گردانا ضروری سمجھا۔ یہ غالباً چوتھائی صدی قبل کی بات ہے کہ میں نے کسی ایسے ہی عالم کی تحریر کے رد میں، لیبیا سے ایک مختصر مضمون اپنے مرحوم دوست ماہر القادری صاحب ایڈیٹر ''فاران'' کو بھیجا تھا جو اس وقت ''فاران'' میں چھپا تھا۔

اب طویل عرصہ عرب ممالک میں قیام اور درس وتدریس کے بعد واپسی پر اردو کی کچھ کتابیں پڑھنے اور بعض حضرات سے ملنے پر پتہ چلا کہ یہ غلط فہمی اب تک موجود ہے اور افسوس تو یہ ہے کہ وہ عام پڑھے لکھے لوگ جو ''طبری'' کا صحیح تلفظ بھی نہیں کر سکتے وہ انتہائی دریدہ دہنی سے کہتے ہیں کہ ''طبری شیعہ تھا'' (یہ وہ نقاد ہیں جو ''ط'' کو زیر کے ساتھ اور ''ب'' پر جزم تلفظ کرتے ہیں، جب کہ صحیح طبری ہے یعنی ''ط'' پر زبر اور ''ب'' پر بھی زبر کہ یہ طبرستان کے ساتھ منسوب ہے) اس نادانی وجرأت پر سخت افسوس ہوتا ہے۔ درحقیقت اس میں قصور ان بعض نام نہاد محققین کا ہے جنہوں نے اس ناپاک اتہام کو پھیلایا یا طبقہ علماء میں سے بعض ان حضرات کا جنہوں نے کسی ایک پرانی عربی کتاب میں کوئی جملہ اس ضمن میں دیکھ لیا اور بس اس کو بنیاد بنا ڈالا اور موضوع پر سیر حاصل بحث کرنا ضروری نہ سمجھا۔ غالباً ایسی ہی کسی صورت کے پیش نظر علامہ اقبال نے یہ حقیقت پسندانہ شعر کہا تھا:

شیر مردوں سے ہوا بیشۂ تحقیق تہی　　　رہ گئے صوفی وملا کے غلام اے ساقی

خلافت معاویہ ویزید کے مصنف علامہ مرحوم کے زمانہ میں ہوتے تو وہ شاید کہتے:

رہ گئے صوفی ومسٹر کے غلام اے ساقی

''مقام حیرت ہے کہ وہ لوگ جنہوں نے تاریخ طبری میں دوسری صدی ہجری کے مشہور

Marfat.com

مصنف ابومخنف (۱) لوط بن یحییٰ کی روایات یا یاقوت الرومی الحموی کی نقل کردہ ایک آدھ روایت کے سبب یا کسی بھی اور روایت کی بنا پر امام طبری کو شیعی گردانا۔ انہوں نے مشہور حافظ حدیث (۲) اور مورخ ابوبکر الخطیب البغدادی المتوفی ۴۶۳ھ کا جو اہل سنت کے امام شمار کیے جاتے ہیں۔ طبری کے بارے میں وہ بیان نہیں پڑھا جو خود یاقوت نے امام طبری کی منقبت میں دوسرے اقوال کے ساتھ پیش کیا ہے جو یہ ہے:

و کان احد ائمة العلماء یحکم بقوله و یرجع الی رایه لمعرفته و فضله، وکان قد جمع من العلوم مالم یشارکه فیه احد من اهل عصره. و کان حافظا لکتاب الله عزوجل، عارفا بالقرآن، بصیرا بالمعانی، فقیها باحکام القرآن، عالما بالسنن و طرقها و صحیحها و سقیمها و ناسخها و منسوخها، عارفا باقوال الصحابة و التابعین و من بعدهم من الخالفین و مسائل الحلال والحرام، عارفا بایام الناس واخبارهم، وله الکتاب المشهور فی تاریخ الامم والملوك وکتاب تفسیر القرآن لم یصنف بمثله احد و کتاب سماه تهذیب الآثار، لم ارسواه فی معناه لم یتمه وله فی اصول الفقه و فروعه کتب کثیرة، واختیار من اقاویل الفقهاء وتفرد بمسائل. حفظت عنه. (۳)

۱۔ کوئی شک نہیں کہ ابومخنف الازدی الغامدی الکوفی متوفی ۱۵۷ھ کا شمار امامی شیعہ میں ہوتا ہے مگر اس نے پہلی صدی ہجری کے تاریخی واقعات اور فتوحات پر ۳۲ مختلف رسالے لکھے ہیں جن میں سے اکثر ناپید ہیں مگر ابومخنف کی روایات پر ابن سعد، بلاذری، ابن الاثیر اور حافظ ابن کثیر وغیرہ نے بھی اعتماد کیا ہے اور وہ قدیم شیعوں کے اس زمرہ میں آتا ہے جن میں بقول ابن قتیبہ (کتاب المعارف ص ۲۶۸) طاؤس، اعمش، وکیع، سفیان الثوری، فضل بن دکین (استاد امام بخاری) وغیرہ شامل ہیں۔ یہ وہ شیعہ ہیں جن کو حافظ ابن حجر فتح الباری کے مقدمہ میں ذکر کرتے ہیں جن سے امام بخاری نے روایت کی ہے اور جن کو شاہ عبدالعزیز نے تحفۂ اثناعشریہ میں اصلی شیعہ کے نام سے ذکر کرتے ہوئے مستند مانا ہے۔ (ملاحظہ ہو ص ۴۰ اردو) تبرا کرنے والے شیعہ رافضی کہلاتے ہیں۔

۲۔ اہل علم جانتے ہیں کہ حافظ حدیث اسے کہتے ہیں جس کو ایک لاکھ حدیثیں تفصیلی اسناد کے ساتھ یاد ہوں۔

۳۔ تاریخ بغداد از خطیب بغدادی ج ۲ ص ۱۶۳۔ یاقوت معجم الادباء ج ۶ ص ۴۲۴۔

Marfat.com

ترجمہ: وہ ائمہ علماء میں سے ایک تھے ان کے قول کے مطابق فیصلے کئے جاتے تھے اور ان کے علم وفضل کے سبب ان کی آراء پر عمل کیا جاتا تھا، وہ اتنے علوم میں جامع کمالات تھے کہ ان کا کوئی ہم عصر ان کے مانند نہ تھا وہ کتاب اللہ عزوجل کے حافظ تھے، اس کے معانی پر گہری نظر رکھتے تھے، احکام القرآن کے فقیہ تھے، اس کے ساتھ وہ علم حدیث کے بھی شناور تھے، احادیث نبوی کی اسناد، ان کی صحت وسقم اور ناسخ ومنسوخ کا علم ان کو حاصل تھا۔ وہ صحابہ تابعین اور ان کے بعد کے فقہاء کی احکام (شریعت) میں اختلافی آراء اور حلال وحرام کے مسائل سے بخوبی واقف تھے۔ اسی طرح ان کو تاریخی امور اور لوگوں کے حالات کا بھی گہرا علم حاصل تھا اقوام وسلاطین کی تاریخ (تاریخ الامم والملوک) پر ان کی کتاب مشہور ہے، تفسیر پر انہوں نے جیسی کتاب لکھی ہے ایسی کسی نے نہیں لکھی۔ (حدیث میں) ان کی ایک کتاب تہذیب الآثار (۱) ہے، میں نے اس موضوع پر ایسی کتاب نہیں دیکھی، وہ اس کی تکمیل نہ کر سکے۔ پھر اصول فقہ اور فروع فقہ میں ان کی بہت سی کتابیں ہیں۔ فقہاء کے اقوال میں سے وہ (آزادانہ) انتخاب کرتے تھے اور بہت سے مسائل میں اپنی منفرد رائے رکھتے تھے، جن کا علم لوگوں کو ہے۔"

خطیب بغدادی کے اس بیان سے میری اس بات کی تائید ہوتی ہے جو میں نے شروع میں کہی تھی کہ امام طبری تفسیر، حدیث، تاریخ اور فقہ وغیرہ کے ایک انتہائی بلند پایہ اور مستند عالم تھے اور یہی سب کچھ اہل سنت و جماعت کی اسماء الرجال کے مشہور کتب تذکرۃ الحفاظ، میزان الاعتدال، لسان المیزان، ابن الاثیر کی غایۃ فی طبقات القراء السبکی کی طبقات الشافعیہ الکبریٰ وغیرہ میں لکھا ہے (۲) بلکہ امام نووی نے تو اپنی کتاب تہذیب الاسماء واللغات میں ان کو ترمذی ونسائی کے طبقہ میں شمار کیا ہے۔ (۳)

اس تمہید کے بعد اور اس سے قبل کہ میں اصل موضوع سے بحث کروں مختصراً یہ بتانا ضروری ہے کہ امام طبری کی ولادت صوبہ طبرستان (شمالی ایران) کے شہر آمل میں ۲۲۴ھ میں ہوئی سات

۱۔ اس کتاب کی تفصیل آگے آئے گی۔

۲۔ ان سب اور دیگر کتب رجال کے حوالوں کے لئے ملاحظہ ہو۔ زرکلی کی الاعلام ج ۶۔ ص ۲۹۴۔

۳۔ مقدمہ تاریخ الطبری، بقلم محمد ابوالفضل ابراہیم، دار المعارف، قاہرہ ایڈیشن ج ۱ ص ۱۲۔

Marfat.com

سال کی عمر میں انہوں نے قرآن کریم حفظ کرلیا۔ ان کے والد صاحب ثروت و متقی شخص تھے۔ عربی زبان و بلاغت وغیرہ کی تعلیم کے بعد بارہ سال کی عمر میں ان کا پہلا سفر ''رے''(۱) کا ہو۔ اس کے بعد یہ سلسلہ سفر دراز ہوتا چلا گیا اور انہوں نے بصرہ بغداد، مصر، حجاز وغیرہ کے طویل سفر کئے اور پہلے علم حدیث میں مہارت حاصل کی، ایران، عراق اور مصر میں مشہور و معروف اساتذہ حدیث سے علم حدیث حاصل کیا، پھر بغداد اور مصر میں قرآنی علوم حاصل کئے، بغداد کو اپنا مستقر بنایا اور درس و تدریس اور تصنیف و تالیف میں مشغول رہے۔

تصنیف و تالیف میں تو ان کو خداداد فطری ملکہ حاصل تھا۔ ان کے قدیم سوانح نگاروں نے بتایا ہے کہ وہ روزانہ چالیس ورق یعنی ۸۰ صفحے لکھا کرتے تھے، حافظہ بلا کا پایا تھا۔ قدیم مصنفین میں الندیم نے ''الفہرست'' میں اور پھر یاقوت نے معجم الادباء اور السبکی نے طبقات الشافعیۃ میں ان کی کتابوں کا تفصیلی ذکر کیا ہے، تاریخ طبری کے محقق الاستاد محمد ابو الفضل ابراہیم نے تاریخ طبری کے فاضلانہ اور تفصیلی مقدمہ میں ان کتابوں کی تعداد ان کے ناموں اور موضوعات کی شرح کے ساتھ ۲۶ بتائی ہے۔ ان میں سے تفسیر، تاریخ، حدیث اور فقہ پر بعض کتابیں تین تین اور چار چار ہزار صفحات کی ہیں۔

امام طبری کے حالات میں ہمارا قدیم ترین ماخذ ابن الندیم (یا نئی تحقیقات کے مطابق الندیم) کی کتاب الفہرست ہے، جو اسلامی علوم و ثقافت کی عباسی عہد میں تصنیف کردہ ایک بے نظیر کتاب ہے۔ الندیم نے امام طبری کے حالات قدر تفصیل سے ذکر کئے ہیں، اس کے بیانات سے ہمیں دو اہم باتوں کا پتا چلا ہے۔

ایک تو یہ کہ وہ امام ابوحنیفہ، امام مالک، امام شافعی اور داؤد بن علی الظاہری وغیرہ کی طرح ایک مجتہد فقیہ اور صاحب مذہب تھے، اس نے امام طبری کا ذکر مورخین کے ضمن میں نہیں بلکہ اپنی کتاب کے چھٹے مقالہ میں جو فقہاء و محدثین کے بارے میں ہے اس کے فن (۷) میں علیحدہ سے امام طبری اور ان کے اصحاب اور شاگردوں کے حالات لکھے ہیں۔ بالکل اسی طرح جس طرح امام

ل وسطی ایران کا وہ قدیم اسلامی شہر جس کی طرف بہت سے علماء ''رازی'' کے نام سے معروف ہیں یہ طہران کے قریب ہے اور اب شاہ عبدالعظیم کے نام سے موسوم ہے۔

Marfat.com

مالک، امام شافعی اور داؤد ظاہری کا علیحدہ علیحدہ ذکر چار فنون یا فصول میں کیا ہے۔ بالفاظ دیگر اس کے نزدیک وہ اس مرتبہ کے آدمی تھے اور حقیقت یہ ہے کہ ان کے مستقل فقہی مذہب تقریباً ایک سو سال تک قائم رہا۔ پھر جس امام اوزاعی، امام اللیث بن سعد اور عبدالرحمٰن بن ابی لیلیٰ وغیرہ کے فقہی مذاہب ختم ہو گئے اسی طرح امام طبری کا مذہب بھی ختم ہو گیا، لیکن چونکہ ان پر امام شافعی کی آراء و نظریات کا کافی اثر تھا، اس لیے ابواسحٰق الشیرازی اور السبکی نے اپنی اپنی طبقات الشافعیۃ میں ان کا ذکر کیا ہے۔

دوسری اہم بات یہ ہے کہ محمد بن اسحٰق الندیم نے اسی چھٹے مقالہ کا پانچواں فن (یا فصل کہیے) شیعہ فقہاء و محدثین کے لیے مخصوص کر کے شیعہ علماء کے حالات لکھے ہیں اور یہاں امام طبری کا ذکر نہیں کیا، جس سے ثابت ہوتا ہے کہ طبری شیعہ نہ تھے۔ یاد رہے کہ کتاب الفہرست امام طبری کی وفات کے صرف ۶۷ سال بعد لکھی گئی تھی۔

اس کے بعد پانچویں صدی ہجری کے مشہور محدث و مورخ حافظ ابوبکر الخطیب البغدادی نے ان کو ائمہ اہل سنت میں شمار کیا ہے جن کا ایک اقتباس اوپر دیا گیا ہے۔ الخطیب البغدادی نے امام طبری کے حالات سات صفحوں میں لکھے ہیں۔

اور اس کے بعد طبری کے مفصل ترین سوانح حیات ساتویں صدی ہجری کے یاقوت الرومی الحموی کی کتاب معجم الادباء کی چھٹی جلد (مارگولیتھ ایڈیشن، مصر) میں ہیں اور چالیس صفحات پر پھیلے ہوئے ہیں، یاقوت امام طبری کے حالات میں سب سے اہم ماخذ ہیں جس کی وجہ یہ ہے کہ نسبتاً متاخر ہونے کے باوجود یاقوت کے پیش نظر دو ایسی کتابیں تھیں جو امام طبری کے دو شاگردوں ابوبکر احمد بن کامل (متوفی ۳۵۰ھ) اور عبدالعزیز بن محمد الطبری نے اپنے استاد کی سیرت پر لکھی تھیں۔

امام طبری کے عقائد کے بارے میں ان دونوں حضرات کے بیانات جو یاقوت نے تفصیل سے نقل کیے ہیں نہایت اہم ہیں۔ ان سے معلوم ہوتا ہے کہ امام طبری پر شیعیت کا الزام محض ایک بہتان ہے۔

عبدالعزیز بن محمد طبری کا بیان ہے:۔

"کان ابو جعفر یذهب فی جل مذاهبه الی ما علیه الجماعة

Marfat.com

من السلف ، و طريق اهل العلم المتمسكين بالسنن، شديدا
عـليه مخالفتهم ماضيا على منها جهم، لاتاخذه فى ذلك ولا
فى شىء لومة لائم. (۱)

(ابوجعفر (الطبری) اپنی آراء وافکار میں عامۃ السلف کے طریقہ پر تھے۔ ان کا وہی مسلک تھا جو متبعین سنت کا تھا اوران سلف صالحین کی مخالفت ان پر سخت گراں تھی وہ ان کی راہ پر قائم تھے اوراپنے اس مسلک میں یا کسی اور دینی امر میں ان کو کسی ناقد کی تنقید کی پروانہ تھی)۔

آگے چل کر یہی مصنف (عبدالعزیز بن محمد الطبری) مسئلہ امامت کے بارے میں امام طبری کے عقائد کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

و كان ابو جعفر يذهب فى الامامة الى امامة ابى بكر و عمر
و عثمان و على رضى الله عنهم وما عليه اصحاب الحديث
فـي التـفـضـيـل ، و كـانـه يـكفر من خالفه فى كل مذهب ان
كـانت ادلة العقول تدفع، كالقول فى القدر، و قول من كفر
اصـحـاب رسـول الـلـه صـلـى الـلـه عليه وسلم من الروافض
والـخوارج، ولا يقبل اخبارهم ولا شهاداتهم، و ذكر ذلك فى
كتـابه فى الشهادات وفى الرسالة، وفى اول ذيل المذيل. (۲)

(اورابوجعفر الطبری امامت یعنی خلافت کے مسئلہ میں حضرت ابوبکروعمروعثمان وعلی رضی اللہ عنھم کوخلیفہ مانتے تھے اوران کی تفصیل یا درجات کے قائل تھے جواہل حدیث کا مسلک ہےاوروہ ہراس انسان کوکافر سمجھتے تھے جوان کی مخالفت کرےاورجس کوعقلی دلائل ردکرتے تھے جیسے یہ قول کہ اللہ کی طرف سے چیزیں مقدر نہیں۔یاان روافض وخوارج کا قول جوصحابہ کرام کی تکفیر کرتے تھے وہ ان کی روایات اوران کی گواہیوں کوقبول نہیں کرتے تھے اورانہوں نے اس سب کا ذکر اپنی کتابوں الشہادات الرسالۃ اورذیل المذیل (۳) کےشروع میں کیا ہے)۔

---

۱ یاقوت: معجم الادباء۔ج ٦۔ص ۴۵۳۔(طبعۃ ہندیہ،مصر ۱۹۳۰ء۔

۲ ایضاً،ج ٦،ص ۴۵۴

۳ امام طبری کی ان کتابوں کا ذکر مقدمہ تاریخ طبری میں بقلم محمد ابوالفضل ابراہیم دیکھا جاسکتا ہے۔

Marfat.com

طبری کے دوسرے شاگرد ابوبکر احمد بن کامل نے جن کا ذکر اوپر ہوا، اپنے استاد کی سوانح عمری سے متعلق اپنی کتاب میں بہت تفصیلی معلومات بہم پہنچائی ہیں، وہ امام طبری کی ایک کتاب ''مراتب العلماء'' کا ذکر کرتے ہیں اور بتاتے ہیں کہ اس کتاب میں انہوں نے سب سے پہلے علمائے مدینہ کے ذکر میں ابوبکر، عمر اور عثمان رضی اللہ عنھم کا ذکر کیا ہے اور پھر جو ان کے بعد ہیں ان کا اور اس کے بعد علمائے مکہ المکرمہ اور پھر علمائے کوفہ و بصرہ کا حال لکھا ہے۔(۱)

خطیب بغدادی، محمد بن اسحاق الندیم (ابن الندیم) اور یاقوت الرومی کی ارشاد الاریب المعروف بمعجم الادباء میں واردان شہادات اور علمائے سنت کے صریحی اقوال کے بعد، خود امام طبری کی تصنیفات سے جن میں سے بعض مطبوع ہیں ان پر شیعیت کے الزام کی تردید ہوتی ہے۔

اس ذیل میں سب سے پہلی بات یہ ہے کہ انہوں نے علم حدیث میں ایک بے نظیر کتاب ''تہذیب الآثار'' لکھی ہے جس کی تعریف میں خطیب بغدادی کا قول اوپر ذکر ہو چکا ہے۔ یہ کتاب ناپید تھی لیکن چند سال قبل اس کی ریاض، سعودی عرب کی یونیورسٹی، جامعۃ الامام محمد بن سعود الاسلامیۃ کی طرف سے چار جلدیں مشہور مصری محقق مرحوم محمود احمد شاکر کی تحقیق سے چھپ چکی ہیں۔ علماء متقدمین کے اقوال کے مطابق اس کتاب کو مسانید صحابہ کی ترتیب سے مدون کیا گیا تھا، اس میں مسند ابی بکرؓ، مسند عمرؓ، مسند علیؓ مسند ابن عباسؓ شامل تھیں، ان علماء کے اقوال کے مطابق امام طبری احادیث کے اس مجموعہ کی تمام جلدوں کو مکمل نہیں کر سکے تھے، لیکن جو مل سکی ہیں اور چھپ گئی ہیں وہ مسند عمرؓ مسند علیؓ اور مسند عبداللہؓ بن عباس ہیں جو ۱۹۸۲ء اور ۱۹۸۳ء میں چھپی ہیں۔

اب بتایا جائے دنیا میں وہ کونسا شیعہ پیدا ہوا ہے جس نے حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ سے روایت کردہ احادیث نبویہ جمع کی ہیں، شیعہ تو خواہ وہ غالی ہوں خواہ امامی ان حضرات شیخین پر لعن طعن کرتے اور تبرا بھیجتے رہے ہیں، بلکہ چار پانچ صحابہ کو چھوڑ کر باقی سب کو کافر قرار دیتے ہیں پھر طبری جنھوں نے ان شیخین کی مرویات جمع کی ہیں وہ کس طرح شیعہ کہلائے جا سکتے ہیں، اس لیے ان پر شیعیت کا الزام نہ صرف ظالمانہ بلکہ انتہائی احمقانہ بھی ہے۔

۱۔ یاقوت۔ معجم الادباء، ۶/۴۴۹۔

Marfat.com

صرف یہی نہیں ان کے حالات زندگی سے متعلق مستند قدیم کتب اور جدید ابحاث میں مذکور ہے کہ انہوں نے بغداد سے اپنے قدیم وطن طبرستان (۱) کا سفر کیا تو دیکھا کہ وہاں رافضیت کا زور ہے اور صحابہ کرامؓ پر لعن طعن اور تبرا کرایا جاتا ہے، تو انہوں نے حضرت ابوبکرؓ و حضرت عمرؓ اور دوسرے صحابہ کے فضائل میں ایک کتاب تالیف کی۔ اس پر طبرستان کے لوگ ان کی جان کے درپے ہو گئے اور وہ بمشکل وہاں سے اپنی جان بچا کر بغداد واپس آ سکے (۲) ابن عساکر نے اس "کتاب الفضائل" کی بہت تعریف کی ہے۔ (۳)

اب ان متعدد قومی شہادتوں اور ان کی اپنی بعض تصنیفات کے ذکر کے بعد جن سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ اہل سنت والجماعت کے ایک بلند پایہ اور جلیل القدر عالم و مؤرخ تھے، ان پر شیعیت کا یہ الزام باطل آخر کس طرح اور کیوں لگایا گیا؟

حقیقت یہ ہے کہ اس کا اشارہ ہمیں یاقوت کی ارشاد الاریب المعروف بمعجم الادباء میں ہی ملتا ہے اور یاقوت کا بیان ہی حافظ ابن کثیر نے تقریباً ایک صدی بعد البدایۃ والنہایۃ میں لکھا ہے جس کا آگے ذکر آتا ہے۔

یاقوت نے امام طبری کی سوانح حیات لکھتے ہوئے شروع میں ان کی وفات کے ذکر کے ساتھ یہ جملہ نقل کیا ہے۔

"قال غير الخطيب و دفن ليلا خوفا من العامة لانه متهم بالتشيع و اما الخطيب فانه قال ولم يؤذن به احد (۴)"

۱۔ طبرستان کے صوبہ میں تیسری صدی ہجری کے اواخر میں یعنی جب طبری بغداد میں تھے۔ ایک شیعہ حکومت سلطنت علویہ طبریہ کے نام سے قائم ہو چکی تھی۔

۲۔ یاقوت، معجم الادباء ۶/۴۵۶۔ یہاں مزید دلچسپ اور افسوسناک تفاصیل درج ہیں۔

۳۔ مقدمہ تاریخ الطبری، بقلم ابوالفضل ابراہیم۔ ص ۱۹۔ مذکورہ سابق ایڈیشن۔

۴۔ معجم الادباء ۶/۴۲۳ اس کے بعد یاقوت نے جو جملہ خطیب سے نقل کیا ہے "واجتمع على جنازته من لايحصى عددهم" (ان کے جنازہ پر اتنے لوگ جمع ہوئے کہ ان کی گنتی نہیں کی جا سکتی) تو درحقیقت خطیب کی تاریخ بغداد میں لفظ جنازہ کا ذکر نہیں بلکہ "واجتمع عليه" کی عبارت ہے اور اس کے بعد ہے، وصلى على قبره عدة شهور ليلا و نهار (ان پر لوگ جمع ہوئے اور ان کی قبر پر کئی ماہ تک دن رات نماز جنازہ پڑھی گئی)۔ تاریخ بغداد ۲/۱۶۶۔

Marfat.com

(خطیب کے علاوہ لوگوں نے کہا ہے کہ وہ عوام کے خوف سے رات کو دفن کئے گئے کہ ان پر تشیع کا اتہام لگایا جاتا تھا لیکن خطیب نے کہا ہے کہ ان کی موت کا اعلان نہیں کیا گیا)

ابن کثیر نے بھی یہ بات قدرے تفصیل کے ساتھ لکھی ہے:

و دفن فی داره لان بعض عوام الحنابلة ور عاعهم منعوا من دفنـه نهـارا، ونسبـوه الى الـرفـض، و من الجهلة من رماه بـالالـحاد و حاشا من ذلك، بل كان احد ائمة الاسلام علما و عملا بكتاب الله وسنة رسوله. (۱)

(وہ اپنے گھر میں دفن کئے گئے کیونکہ بعض عوام اور شر پسند حنبلیوں نے ان کو دن میں دفن کرنے سے منع کیا اور ان کو رافضیت کی طرف منسوب کیا اور بعض جہلاء نے تو ان پر الحاد کا الزام لگایا۔ وہ ان سب سے بری تھے بلکہ اپنے علم اور کتاب وسنت پر اپنے عمل کی وجہ سے ائمہ سلام میں سے تھے)

غالباً ابن الجوزی الحنبلی (متوفی ۵۹۷ھ) وہ پہلے مصنف ہیں جنہوں نے اپنی ضخیم تاریخ المنتظم (۲) میں ایک معاصر مورخ ثابت ابن سنان (۳) کے حوالہ سے ان باتوں کا ذکر کیا ہے کہ عوام نے ان پر رافضیت کا الزام لگایا اور پھر الحاد کا اتہام چسپاں کیا، ان کی موت پر ہنگامہ کیا اور ان کو دن میں دفن ہونے نہیں دیا۔ (۴)

یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ ابن الجوزی کثیر التصنیفات تھے، لیکن ان تصنیفات میں کثرت اغلاط کی نشاندہی بعد کے مشہور حنبلی مصنفین ابن رجب اور امام ذہبی نے کی ہے اور وجہ

۱۔ البدایہ والنہایہ۔ ۱۱/۱۴۶۔

۲۔ المنتظم، دس جلدوں میں ہے، اس کی آخری پانچ جلدیں، دائرۃ المعارف العثمانیہ حیدرآباد سے چھپ چکی ہیں۔ جلد اول کا دوسرا حصہ عباسی عہد کے سو سال ۱۳۲ سے ۲۳۲ھ سے متعلق جامعۃ الامام ریاض کے ایک ڈاکٹریٹ کے طالب عوض سیمری نے ایڈٹ کیا ہے۔ راقم السطور اس کا ممتحن تھا ۱۹۸۵ء۔

۳۔ ثابت بن سنان بن ثابت بن قرۃ الحرانی الصابی (متوفی ۳۶۵ھ) عباسی خلفاء کے دربار کا مشہور طبیب مؤرخ تھا۔ اس کی تاریخ جو ۲۹۵ھ سے شروع ہوتی ہے ابھی تک نہیں چھپی ہے۔

۴۔ امام طبری کی اختلاف الفقہاء مطبوعہ ۱۹۰۲ء پر فریڈرک کرن کا مقدمہ۔ ص ۱۰۔

Marfat.com

یہی لکھی ہے کہ وہ چونکہ بہت زیادہ کتابیں لکھتے تھے اس لیے ان کو اپنی تصنیفات میں تحقیق وتدقیق کا موقع نہیں ملتا تھا۔ اس لیے ان کی کتابوں میں بہت سے اوہام اور غلط باتیں ہیں اور اس کے علاوہ ایک وقت میں کئی تصانیف لکھتے تھے اور دوسرے مصنفین کی علمی حیثیت وتحقیق کے درجہ پر غور کئے بغیر ان سے نقل کرتے تھے۔ ان کا خود یہ قول ہے ''انا مرتب و لست بمصنف'' (میں مرتب ہوں مصنف نہیں)۔

بہرحال قدیم تذکرہ نگاروں کے بیانات سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ بغداد کے وہ حنبلی عوام جن کو ''حشویہ'' کے نام سے بھی یاد کیا گیا، وہ امام طبری کو پسند نہیں کرتے تھے اور اسی طرح داؤد بن علی الظاہری (ظاہریہ مذہب کے بانی) کے ساتھ بھی طبری کا شدید علمی اختلاف ہوا تھا اور ان کے متبعین بھی طبری کو پسند نہیں کرتے تھے اور انہیں دو گروہوں نے طبری کے خلاف شیعیت کا بے بنیاد اور جھوٹا الزام لگایا۔

اب سوال یہ ہے کہ وہ کیا اسباب تھے جن کی بناء پر ظاہر پرست حنبلی اور ان کے ہمنوا ظاہری مذہب کے متبع امام طبری سے مخاصمت رکھتے تھے، اس سے قبل کہ ان سوالات کا جواب دیا جائے۔ یہ ضروری ہے کہ اس مشہور علمی قضیہ یا فتنہ کو یاد کیا جائے جو تاریخ میں مسئلہ خلق قرآن کے نام سے مشہور ہے۔ عباسی خلفاء المامون المعتصم اور الواثق کے زمانہ میں معتزلہ کا یہ نیا بدعتی عقیدہ کہ قرآن ''مخلوق'' ہے، بزور شمشیر خلافت عباسیہ کے طول وعرض میں لوگوں پر فرض کیا گیا۔ علماء بغداد میں سے دو تین ہی لوگوں نے اس کی مخالفت کی جن کو قید وبند کی مصیبتیں برداشت کرنا پڑیں ان میں سرفہرست امام احمد بن حنبل کا نام ہے جنہوں نے کوڑوں اور جیل کی قید تنہائی کو برداشت کیا اور قرآن کریم کے بارے میں اس نئے عقیدہ کو قبول نہیں کیا، کیونکہ کتاب وسنت میں اس کا کوئی جواز نہیں اور نہ صحابہ وتابعین وغیرہ سلف وصالحین نے یہ بات کہی تھی وہ کہتے تھے کہ قرآن اللہ تعالیٰ کا کلام ہے اور بس۔

خلیفہ متوکل عباسی کے عہد خلافت (۲۳۲۔۲۴۷ھ) کے اوائل میں امام احمد بن حنبل کی قربانی اور ثبات و پامردی نے رنگ دکھایا کہ متوکل نے معتزلہ کے اس گمراہانہ عقیدہ کو باطل قرار دے دیا۔ امام احمد کو انتہائی تکریم کے ساتھ جیل سے آزاد کیا اور ان کے متبعین کو عزت واکرام سے

Marfat.com

نوازا۔ امام صاحب کی وفات (۲۴۱ھ) کے بعد بغداد میں حنابلہ میں تعصب کی روح سرایت کر گئی اور ان کا پلہ بھاری ہو گیا۔ معتزلہ کی عقل اور فسطائیت کے برخلاف وہ اپنی ظاہر پرستی سے لوگوں کو جانچنے لگے۔ یہ دینی عقائد کے بارے میں معتزلہ کی فکری بے راہ روی کے خلاف ایک ردعمل تھا۔ جو ہر ردعمل کی طرح اپنی حدود سے تجاوز کر گیا۔ جس کی ضرب نہ صرف معتزلہ پر پڑی بلکہ طبری جیسے امام اہل سنت بھی اس کا نشانہ بنے۔ سوسائٹی پر تقریباً بیس سالہ معتزلہ کے فکری جبر کے بعد فریق مخالف یعنی حنابلہ کو حکومت کی سرپرستی حاصل ہوئی تھی۔ جس کا انہوں نے بعض اوقات ناجائز فائدہ اٹھایا۔

بہر حال امام طبری کو شیعہ قرار دینے کے اسباب مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔ انہوں نے اپنی ایک عظیم کتاب اختلاف الفقہاء میں امام ابوحنیفہ، امام مالک، امام شافعی، امام اوزاعی، ابوثور وغیرہ کے فقہی اختلافات کا ذکر کیا ہے اور اس میں کہیں امام احمد بن حنبل کے فقہی اقوال واختلافات کا ذکر نہیں، اس کی وجہ سے حنبلی علمائے بغداد اور عوام ان سے سخت ناراض تھے۔

۲۔ کچھ حنبلی علماء نے ایک بار طبری کے گھر کے پاس مسجد میں جمعہ کے روز ملاقات کی، ان کے ساتھ حنبلی عوام کا ایک گروہ بھی تھا۔ ان لوگوں نے امام طبری سے دو سوال کئے۔ امام احمد کے بارے میں ان کی کیا رائے ہے؟ اور **حدیث الجلوس علی العرش** (یعنی مجاہد سے مروی وہ حدیث جس میں ''مقام محمود (۱) کی تفسیر بیان کی گئی ہے کہ قیامت کے روز اللہ تعالیٰ رسول اللہ ﷺ کو اپنے ساتھ عرش پر بٹھائے گا) کے بارے میں کیا کہتے ہیں۔

۱۔ مقام محمود کی مشہور ومقبول تفسیر مقام شفاعت ہے۔ مجاہد کا بھی ایک ایسا قول مروی ہے (ملاحظہ ہو، تفسیر قرطبی ۱۰/۳۱۱، تفسیر ابن کثیر ۳/۵۵، ۵۸، سیوطی نے درمنثور میں اس کی تفسیر میں حدیث جلوس النبی مع اللہ علی العرش کی روایتیں نقل کی ہیں۔ جو صحاح ستہ یا دوسری مستند کتب حدیث میں نہیں بلکہ دیلمی، طبرانی وغیرہ جیسے کتب حدیث میں ہیں جن میں ضعیف اور منکر وموضوع حدیثوں کی بھرمار ہے بہرحال اصح الروایات مقام شفاعت لواء الحمد کی ہے۔

Marfat.com

امام طبری ایک حق گو، نڈر اور متقی عالم تھے۔ انہوں نے جواباً کہا کہ امام احمد کے فقہی اختلافات کی کوئی قیمت نہیں کہ میں نے ان کے ایسے اقوال نہیں دیکھے اور نہ ان کے شاگردوں میں ایسے لوگ ہیں جو لائق اعتماد ہوں اور جہاں تک حدیث "الجلوس علی العرش" کا تعلق ہے تو یہ محال ہے، ساتھ ہی انہوں نے یہ شعر پڑھا:

سبحان من لیس له انیس ولا له فی عرشه جلیس

ترجمہ: "اللہ کی ذات پاک ہے اس کا کوئی مونس نہیں اور نہ کوئی عرش پر اس کے ساتھ بیٹھنے والا ہے۔"

اس پر ان حنبلیوں نے امام طبری پر اپنی دواتیں پھینک کر مارنا شروع کر دیں، جس کی وجہ سے آپ بھاگ کر اپنے گھر میں چھپ گئے تو ان کے دروازہ پر سخت پتھراؤ کیا، یہاں تک کہ کوتوال بغداد "نازوک" کو سپاہیوں کے ایک دستہ کے ساتھ آنا پڑا۔ جس نے یہ فتنہ رفع کیا اور سارا دن امام طبری کے دروازہ پر پہرہ دیا۔ پتھر ہٹوائے اور مذکورہ بالا شعر جو ان کے دروازہ پر کندہ تھا اس کو مٹوایا۔ لیکن حنابلہ نے اس جگہ چار ایسے شعر لکھ دیئے جس سے ان کی عقیدہ مذکورہ کی تائید ہوتی تھی۔(۱)

۳۔ انہی حنابلہ نے امام طبری کے خلاف یہ بھی مشہور کر دیا تھا کہ وہ وضو میں پاؤں دھونا واجب خیال نہیں کرتے بلکہ قدموں پر مسح کو کافی سمجھتے ہیں جو شیعہ حضرات کا مسلک ہے۔
ابن الجوزی نے المنتظم (غیر مطبوعہ جلد) میں اس الزام کا ذکر کیا ہے۔(۲)

۴۔ ایک حنبلی محدث ابوبکر (۳) بن ابی داؤد نے امام طبری کے خلاف نصر الحاجب کو ایک درخواست دی۔ جس میں ان پر الزام لگایا کہ وہ جہمی (۴) ہیں اور کچھ ایسے بھی الزام لگائے جس میں شیعیت کی طرف ان کو منسوب کیا گیا۔

۱۔ یاقوت: معجم الادباء ۶/۴۳۶

۲۔ مقدمہ کتاب اختلاف الفقہاء بقلم فریڈرک کرن۔ ص ۱۰

۳۔ یہ مشہور محدث ابوداؤد کے فرزند تھے خود بھی محدث تھے اور حنبلی۔ مگر ان کی شخصیت مختلف فیہ تھی۔ ملاحظہ ہو تاریخ بغداد، خطیب بغداد ۹/۴۶۷۔

۴۔ جہم بن صفوان کی طرف منسوب ایک قدیم فرقہ جہمیہ کہلاتا ہے ان کو معطلہ بھی کہا جاتا ہے۔ یہ صفات خداوندی کی اس طرح تاویلات کرتے ہیں کہ ان سے ان صفات کی نفی ہوتی ہے۔

Marfat.com

بقول ابن جوزی امام طبری نے ان جھوٹے اتہامات سے ناراض ہوکر ان کو ایک کمینہ گروہ (عصابۃ خسیسۃ) قرار دیا۔(۱)

۵۔ ان پر شیعیت کا الزام لگانے کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ انہوں نے حدیث غدیر خم کے اثبات میں ایک کتاب لکھی تھی اور بقول ابن عساکر یہ انہی ابوبکر بن ابی داؤد کے رد میں تھی جو اس حدیث کی صحت کے منکر تھے۔

۶۔ شیعیت کے الزام کا سبب ایک مشہور شیعی ادیب و شاعر ابوبکر بن محمد بن العباس الخوارزمی کا یہ دعویٰ بھی تھا کہ وہ ان امام طبری کا بھانجا ہے، اس کا یہ دعویٰ اور اشعار یاقوت نے معجم البلدان کے مادہ (آمل) میں نقل کئے ہیں:

بآمل مولدی و بنو جریر فاخوالی و یحکی المرء خالہ

فھا انا رافضی من تراث وغیری رافضی من کلالہ

اب ان الزامات اور ان کے اسباب کا تجزیہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان میں سے اکثر لغو اور بے بنیاد ہیں جن کا ہم ترتیب وار جواب دیں گے، مگر اس سے قبل ایک اہم تاریخی حقیقت کی طرف اشارہ کرنا ضروری ہے۔ جس کا موضوع زیر بحث سے گہرا تعلق ہے وہ یہ کہ خلیفہ متوکل جس طرح معتزلہ کا مخالف تھا، اس طرح یا اس سے کچھ زائد شیعی عقائد رکھنے والوں کا بھی مخالف تھا۔ یہ صورت حال متوکل کے بعد عباسی خلفاء کے عہود میں کچھ عرصہ تک قائم رہی، لہٰذا اس دور میں کسی کو بدنام و مطعون کرنے کے لیے اتنا کہنا کافی تھا کہ یہ شیعی ہے بالکل اس طرح جیسے ہمارے موجودہ دور میں جن ممالک میں اشتراکی انقلاب خواہ فوجی ہو خواہ سیاسی آیا وہاں اپنے مخالفین کو بدنام و مطعون کرنے کے لیے یہ الزام آسان رہا ہے کہ ان کو استعماری یا سامراجی کہہ دیا جائے یا کسی متدین انسان کو رجعی کہہ دیا جائے یا جیسے آج کل امریکہ کی طرف سے صحیح الفکر اور باعمل مسلمانوں کو بنیاد پرست کی گالی دی جاتی ہے۔

بلکہ دور کیوں جایئے آج بھی گروہی تعصبات کی وجہ سے ہمارے ملک میں ان لوگوں کو بھی بعض کی زبان و قلم سے شیعہ کہہ دیا جاتا ہے جو پہلے تین خلفائے راشدین کی درجہ بدرجہ تعظیم و توقیر

۱۔ مقدمۂ کتاب اختلاف الفقہاء، ص ۱۰، ۱۱

Marfat.com

کے ساتھ حضرت علیؓ کے بلند مقام کے معترف ہیں اور ان کو اموی خلفاء یا ملوک کے مقابلہ میں زیادہ متقی اور مستحق خلافت سمجھتے ہیں۔

کچھ اسی قسم کا ماحول بغداد میں بھی متوکل کے عہد سے قائم ہو گیا تھا اور ذاتی فکری مخالفین سے مخاصمت میں اس بہتان تراشی سے کام لیا جاتا تھا اس کا پرچم بعض متعصب اور تنگ نظر حنابلہ اور فرقہ ظاہریہ کے افراد اٹھائے ہوئے تھے۔ اس تعصب بے جا کا اعتراف بعد کے بعض منصف اور جلیل القدر حنبلی تذکرہ نگاروں نے خود کیا ہے، جیسا کہ ہم آگے چل کر دیکھیں گے۔

اب مذکورہ بالا ان اسباب کا جن کو امام طبری پر شیعیت کے افتراء کی بنیاد بنایا گیا ہے۔ ترتیب وار تجزیہ اور تردید پیش کرتے ہیں۔

۱۔ جہاں تک اپنی کتاب ''اختلاف الفقہاء'' میں امام طبری کے اس فعل کا تعلق ہے کہ انہوں نے اس میں احمد بن حنبل کے اختلافی اقوال کا دوسرے مشہور و معروف ائمہ مذاہب کے ساتھ ذکر نہیں کیا تو یہ ثابت ہے، اور اس کتاب کے مطبوعہ حصہ سے واضح ہے، اس سے کوئی انکار نہیں کر سکتا اور خود طبری کے بیان سے جو ہمارے فقرہ نمبر (۲) میں ہے ثابت ہے کہ وہ امام احمد کو فقیہ نہیں سمجھتے تھے، یا یوں کہیے کہ اس پایہ کا فقیہ نہیں سمجھتے تھے جو امام ابوحنیفہ، امام مالک، امام شافعی وغیرہ کا ہے۔

اور حقیقت یہ ہے کہ حنابلہ اور ظاہریہ کی امام طبری سے ناراضگی کا سبب یہی ایک مسئلہ تھا اور اسی کی بنیاد پر انہوں نے طبری پر شیعیت کا بہتان لگایا، بلکہ امام طبری کے ایک صریحی جواب کے بعد ان کے خلاف ایک فتنہ برپا کیا۔

اگر اس موضوع پر ٹھنڈے دل سے غور کیا جائے تو یہ بات واضح نظر آئے گی کہ امام احمد بن حنبل بنیادی طور پر ایک محدث تھے اور نہایت بلند پایہ اور وسیع العلم محدث، ساتھ ہی ساتھ وہ فن جرح و تعدیل میں بھی ایک اعلیٰ مقام رکھتے تھے۔ ان کا کارنامہ کوئی فقہی مسائل کی کتاب نہیں بلکہ حدیث نبوی کا وہ عظیم ترین مجموعہ ہے جو مسند امام احمد بن حنبل کے نام سے یاد کیا جاتا ہے اور جس میں تقریباً تیس ہزار احادیث ہیں اور متعدد بار چھپ چکا ہے۔

بہر حال اس بنا پر اگر امام طبری نے ان کو فقہائے کبار میں شامل نہیں کیا تو کونسا جرم کیا؟ یہ بات اپنی جگہ صحیح ہے کہ امام احمد بن حنبل کے بھی بہت سے فقہی اقوال ہیں، مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ انہوں نے اجتہاد و استنباط کے وسائل یعنی قیاس، استحسان استصلاح کو اس کثرت سے استعمال

Marfat.com

نہیں کیا ہے، جس طرح دوسرے ائمہ مذاہب نے کیا، بیشک انہوں نے ''استصحاب اور سدالذرائع'' کے دو اصولوں کو اپنے اجتہادات کی بنیاد بنایا۔ مگر اس میں توسع امام احمد کے تلامذہ اور تلامذۂ تلامذہ کے ہاتھوں ظہور پذیر ہوا اور اس کے بعد حنبلی مذہب واقعی ایک فقہی مذہب ہو گیا۔

امام طبری نے اپنی مذکورہ کتاب میں فقہائے مذاہب کا جو اعلیٰ معیار قائم کیا تھا، اس پر امام احمد پورے نہیں اترتے تھے، اس لیے طبری نے ان کے اقوال کو اہمیت نہیں دی، بس یہی حنابلہ کی ناراضگی اور عداوت کے لیے کافی تھا۔

۲۔ اس پر امام طبری کی ایک صراحت نے آگ پر تیل کا کام کیا۔ جو ہمارے مذکورہ سابق فقرہ میں موجود ہے وہ ایک حق گو، نڈر اور متقی عالم تھے اور انہوں نے صفائی سے امام احمد کے بارے میں اپنا نقطۂ نظر حنابلہ کے ایک سوال کے جواب میں بیان کر دیا جو آپ پڑھ چکے ہیں اور مزید یہ ہے کہ انہوں نے اس حدیث کا بھی انکار کر دیا جس کو حنابلہ صحیح سمجھتے تھے اور اسی طرح داؤد بن علی ظاہری کے متبعین بھی جن کا احادیث کے بارے میں معیار تحقیق اتنا بلند نہ تھا جتنا امام بخاری، امام مسلم اور دوسرے ائمہ حدیث کا۔

اس پر بغداد کے حنابلہ چراغ پا ہو گئے اور انہوں نے تشدد کی وہ راہ اختیار کی جس کا ذکر گزرا۔ یہی نہیں انہوں نے طبری کے خلاف ایک فتنہ کھڑا کر دیا اور ان کی تدفین میں مزاحمت کی۔

لیکن یہ بات غلط ہے کہ ان کی تدفین، خوف کی وجہ سے رات کو ہوئی اس بارے میں خطیب بغدادی کا بیان زیادہ صحیح ہے جو انہوں نے معاصر شہادتوں کے حوالوں سے نقل کیا ہے کہ ان کی وفات کا اعلان نہیں کیا گیا، پھر بھی ان کے جنازہ پر بے شمار لوگ جمع ہو گئے اور ان کی قبر پر کئی ماہ تک لوگوں نے دن رات نماز جنازہ پڑھی (۱) اور کہتے ہیں علماء و ادباء نے ان کی تعزیت میں مرثیے لکھ کر عقیدت کے پھول ان پر نچھاور کیے۔ خطیب بغدادی نے ابن درید کا ایک طویل مرثیہ اور ابن الاعرابی کے ایک طویل مرثیہ کے کچھ اشعار نقل کیے ہیں۔ (۲)

شیخ الاسلام ذہبی نے مذکورہ بالا فتنہ کا اشارہ کیے بغیر اپنی عظیم و ضخیم ترین کتاب سیر اعلام النبلاء میں مختصراً ذکر کرتے ہوئے اس باب میں حنابلہ کی زیادتی کا اعتراف کیا ہے۔ وہ رقم طراز ہیں:

۱۔ تاریخ بغداد ۲/۱۶۶

۲۔ ایضاً۔ ص ۱۶۷-۱۶۸

Marfat.com

و کان ممن لا تاخذه فی الله لومة لائم، مع عظیم ما یلحقه من الاذی و الشناعات من جاهل و حاسد و ملحد، فاما اهل الدین والعلم، ففیر منکرین علمه و زهده فی الدنیا ورفضه لها. (۱)

''اور وہ ان لوگوں میں سے تھے جن کو حق بات پر ملامت کرنے والوں کی ملامت کی پروانہ تھی، اگر چہ اس کی وجہ سے ان کو جاہلوں، حاسدوں اور ملحدین کی طرف سے بڑی اذیت و بدنامی برداشت کرنا پڑی۔ جہاں تک اہل دین وعلم کا تعلق ہے وہ ان کے علم، زہد فی الدنیا اور اس سے ابتعاد کے منکر نہیں۔''

اس کے بعد ذہبی آگے چل کر لکھتے ہیں:

" وکان ابن جریر من رجال الکمال وشنع علیه بیسیر تشیع ، وما رأینا الا الخیر، و بعضهم ینقل عنه انه کان یجیز مسح الرجلین و لم تر ذلك فی کتبه."

''اور ابن جریر (الطبری) اہل کمال میں سے تھے۔ ان پر قدرے تشیع کا الزام لگایا گیا، لیکن ہم نے ان کو خیر ہی کا حامل دیکھا، بعض لوگ یہ نقل کرتے ہیں کہ وہ قدموں پر مسح کے قائل تھے، مگر ہم نے ان کی کتابوں میں یہ نہیں دیکھا۔''

حشویہ حنابلہ نے اسی طرح کا ایک فتنہ سلطان العلماء العز بن عبدالسلام (متوفی ۶۶۰ھ) شافعی کے خلاف دمشق میں کھڑا کیا تھا اور سلطان دمشق الملک الاشرف کے کان ان کے خلاف بھرے تھے جس پر اس سلطان نے ان کو حبس خانہ (House Arrest) کی سزا دی تھی، جو بعد کو ایک حق شناس وحق گو حنفی عالم کے توسط اور ان کی سلطان العلماء کے موقف کی تائید کی وجہ سے ختم ہوئی۔ الملک الاشراف نے ان سے معذرت کی اور نصیحت طلب کی۔ (۲)

۱۔ سیر اعلام النبلاء ۱۴/۲۷۴

۲۔ اس واقعہ کی تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو، راقم السطور کی کتاب العز بن عبدالسلام۔ ص ۱۲۲-۱۳۵ (عربی) دار الفکر دمشق ۱۹۶۰ء

Marfat.com

اسی طرح کا ایک فتنہ امام بخاریؒ کے خلاف ان حشویہ حنابلہ کی طرف سے نیشاپور میں کھڑا کیا گیا تھا اور ان کو یہ شہر چھوڑ کر واپس اپنے وطن بخارا جانا پڑا تھا اور وہاں بھی ان کو چین سے نہیں بیٹھنے دیا گیا۔ ان کو سمرقند کا رخ کرنا پڑا اور حالت سفر میں ان کی وفات ہوئی۔

اور آج بھی ہمارے ملک میں ایسے لوگ ہیں جو محض گروہی تعصب میں ایسے لوگوں کو شیعہ بلکہ سبائی کہنے سے نہیں چوکتے جو اپنی فکر میں امام ابوحنیفہ، امام ابن تیمیہ، شاہ ولی اللہ صاحبؒ، سید احمد شہید رائے بریلوی وغیرہ کے متبعین میں سے ہیں۔

۳۔ یہ تیسرا الزام کہ امام طبری وضو میں پاؤں پر مسح کو کافی سمجھتے تھے، باطل اور لغو ہے اور اس کو سبب بنا کر ان کو شیعہ گردانا ایک ظالمانہ اور شرانگیز فعل ہے اس اتہام کا ذکر کرتے ہوئے حافظ حدیث برزالی (متوفی ۷۳۹ھ) کہتے ہیں:

والذی عول علیہ کلامہ فی التفسیر انہ یوجب غسل القدمین و یوجب مع غسل دلکھما و لکنہ عبر عن الدلک بالمسح فلم یفھم کثیر من مرادہ جیدا و من فھم مرادہ نقلوا عنہ انہ یوجب الجمع بین الغسل و المسح وھو الدلک. واللہ اعلم. (۱)

(طبری کی) تفسیر میں جو معتمد علیہ قول ہے وہ پاؤں دھونے کی فرضیت کا ہے اور وہ ان کو دھونے کے ساتھ ساتھ ملنا بھی فرض قرار دیتے ہیں، لیکن انہوں نے لفظ ''دلک'' (ملنا) کے لیے لفظ ''مسح'' کا استعمال کیا ہے اس لیے بہت سے لوگ ان کا صحیح مطلب نہیں سمجھ سکے اور جن لوگوں نے سمجھا، کہا کہ وہ پاؤں دھونے اور مسح یعنی ملنے دونوں کو فرض سمجھتے تھے، واللہ اعلم۔

اس موقع پر برزالی نے یہ بھی لکھا ہے کہ بعض لوگ کہتے ہیں ابن جریر (الطبری) دو ہیں۔ ان میں سے ایک شیعی ہے اور وضو میں پاؤں پر مسح کرنے کا قول اس کا ہے اور ابوجعفر کی اس قول سے براءت ثابت کرتے ہیں۔ (۲)

۱۔ ابن کثیر، البدایہ والنہایہ ۱۱/۱۴۷، امام طبری کی کتاب اختلاف الفقہاء کے مقدمہ ص ۱۲ پر اس کے محقق نے بھی برزالی کا یہ قول نقل کیا ہے برزالی کی یہ کتاب راقم السطور کے علم کے مطابق ہنوز غیر مطبوع ہے۔

۲۔ اختلاف الفقہاء مقدمہ بقلم فریدرک کرن ص ۱۲-۳۱۔ اس دوسرے ابن جریر طبری کا ذکر آگے آئے گا۔

Marfat.com

امام طبری نے اپنی تفسیر ''جامع البیان'' (جلد ٦) میں آیت وضو کی تفسیر کرتے ہوئے ''القول فی قوله تعالی (وارجلکم الی الکعبین)'' کے عنوان کے تحت اس مسئلہ پر کافی تفصیل سے بحث کی ہے اور موضوع سے متعلق تمام احادیث نبویہ پر کلام کیا ہے (ا) یہاں نہ تو گنجائش ہے اور نہ اس کا محل کہ اس کو پیش کیا جائے، اس کو پڑھنے اور غور کرنے سے صاف عیاں ہوتا ہے کہ وہ وضو میں پاؤں دھونے کے قائل تھے مگر بعض لوگوں کو ان کی طویل بحث غور سے پڑھنے یا سنی سنائی باتوں پر اعتماد کرنے یہ غلط فہمی ہوئی ہے کہ وہ وضو میں پاؤں پر مسح کو کافی سمجھتے تھے جو شیعہ حضرات کا مسلک ہے۔

وہ حضرت اوسؓ کی اس حدیث پر بحث کرتے ہوئے جس میں وارد ہے کہ حضور ﷺ کا یہ وضو ''حدث'' (٢) سے نہ تھا کیونکہ اس کی کوئی دلیل نہیں ہے کہ آنحضرت ﷺ اس وقت وضو سے نہ تھے اس کے بعد وہ انتہائی اہم اور معقول و منطقی بات کہتے ہیں:

اذ کان غیر جائز ان تکون فرائض الله و سنن رسوله صلی الله علیه وسلم متنا فیة متعارضة، و قدصح عنه صلی الله علیه وسلم الامر بعموم غسل القدمین فی الوضوء بالماء بالنقل المستفیض القاطع عذر من انتهی الیه وبلغه، واذا کان ذلک عنه صحیحا فغیر جائز ان یکون صحیحا عنه اباحة ترك غسل بعض ما قد اوجب فرضا غسله فی حال واحدة و وقت واحد. لان ذلك ایجاب فرض و ابطاله فی حال و احدة و ذلك عن احکام الله و احکام رسوله منتف. (٣)

(کیونکہ یہ جائز نہیں کہ اللہ کے فرائض اور اس کے رسول کی سنتیں متعارض و متنافی (ایک

ا۔ تفسیر طبری ٦/١٢٦-١٣٥۔ طبع دار الفکر، بیروت۔

٢۔ یعنی آپ کا وضو ٹوٹا نہ تھا بلکہ آپ نے وضو پر وضو فرمایا تھا جو جائز ہے اسی لئے قدم مبارک نہیں دھوئے اور نعل مبارک پہنے ہوئے ان پر مسح فرمایا۔

٣۔ تفسیر طبری ٦/١٣٥۔

Marfat.com

دوسرے کی نفی کنندہ) ہوں اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ ثابت ہے کہ آپ ﷺ نے وضو میں دونوں قدموں کو عام پانی سے دھونے کا حکم فرمایا ہے جو آپ ﷺ سے منقول مشہور روایات سے پایہ ثبوت کو پہنچ چکا ہے اور یہ ایسا حکم ہے کہ جس کو اس کا علم ہوا ہو اور اس تک یہ پہنچا ہو اس کے پاس اس کو قبول کرنے کے سوا کوئی چارہ کار باقی نہیں رہتا ہے، اب جب کہ یہ (حکم) آنحضرت ﷺ سے ثابت ہے تو یہ کسی طرح صحیح نہیں ہوسکتا کہ جس کا دھونا فرض قرار دیا گیا ہو ایک ہی حالت اور ایک ہی وقت میں اس کا نہ دھونا بھی جائز ہو، کیونکہ اس کا مطلب ہوگا کہ ایک ہی حالت میں ایک بات فرض کی گئی اور اس کو باطل بھی ٹھہرا دیا گیا ایسی (متناقض) بات اللہ اور اس کے رسول کے احکام میں نہیں ہوسکتی)۔

بالفاظ دیگر امام کا مطلب یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے یہ ثابت ہے کہ وضو میں پاؤں کا دھونا فرض ہے۔ اب اگر قرآن کریم کی آیت وضو میں (وارجلکم) کو لام کے زیر کے ساتھ پڑھ کر یہ سمجھا جائے کہ اس کا مطلب مسح کرنا ہے تو اس سے قرآن وسنت میں تعارض و تناقض کی صورت پیدا ہوگی جو کسی طرح جائز نہیں، اس لیے پاؤں دھونا ہی صحیح ہے، اسی طرح سنت نبوی میں بھی تعارض و تناقض صحیح نہیں۔ اس لیے جب آنحضرت ﷺ سے وضو میں پاؤں دھونے کا حکم ثابت ہے تو یہ صحیح نہیں ہوسکتا کہ آپ نے اس کے ترک کرنے کو بھی جائز کہا ہو۔ زخم و بیماری کے عذر یا خفین (چرمی جرابیں) پہنے ہوئے ہونے کی حالت میں مسئلہ جدا ہے۔

اس صریح و مدلل بیان کے بعد امام طبری پر یہ الزام تراشنا کہ انہوں نے وضو میں پاؤں دھونے کے بجائے ان پر مسح جائز سمجھا ہے کسی طرح درست نہیں اس لیے شیخ الاسلام ذہبی نے جیسا کہ اوپر گزرا، کہا ہے کہ یہ کہنا غلط بات ہے کہ طبری وضو میں قدموں پر مسح کے قائل تھے اور یہ تصریح کی ہے کہ "ہم نے ان کی کسی کتاب میں یہ نہیں دیکھا۔"(۱)

اور اسی لیے حافظ ابن کثیر نے بھی اس کی تردید کی ہے اور مزید کہا ہے کہ جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ طبری بیک وقت پاؤں دھونے اور مسح کرنے دونوں باتوں کے قائل تھے وہ درحقیقت ان کا مطلب سمجھ نہیں سکتے۔ درحقیقت یہاں مسح سے ان کا مطلب "ملنے" (دلک) کا ہے کہ پاؤں زمین ومٹی سے قریب ہوتے ہیں اس لیے ان کو مسح کرنا یعنی مل کر دھونا چاہیے اور اس کے بعد وہ کہتے ہیں:

---

۱ سیر اعلام النبلاء ۱۴/ ۲۷۷۔

Marfat.com

ثم تاملت كلامه ايضا فاذاهو يحاول الجمع بين القرء تين (۱)

فی قوله (وارجلکم) خفضا علی المسح وهو الدلك و نصبا

علی الغسل فاوجبهما اخذا بالجمع بين هذه وهذه الخ. (۲)

(پھر میں نے ان کی بات پر غور کیا تو پتہ چلا کہ وہ قرآنی لفظ (وارجلکم) کی لام پر زیر کے ساتھ قراءت کو مسح یعنی ملنے پر اور لام پر زبر کے ساتھ قراءت کو دھونے پر محمول کرتے ہیں اس طرح ان دونوں قراءتوں کو جمع کرتے ہوئے انہوں نے ملنے اور دھونے کو واجب قرار دیا ہے۔)

زمخشری نے اس آیت کی تفسیر میں جو کچھ ذکر کیا ہے اس میں ایک نقطۂ نظر صحابہ کے عمل سے ایسا پیش کیا ہے جس سے طبری کے اس مذکورہ مفہوم کی تائید ہوتی ہے۔ (۳)

مگر افسوس کہ قرطبی نے اپنی تفسیر میں طبری کا نقطۂ نظر صحیح پیش نہیں کیا ہے، بلکہ افسوس صد افسوس کہ انہوں نے قاضی ابوبکر بن العربی کا ایک ایسا غلط قول طبری کے نقطۂ نظر کے بارے میں نقل کر دیا ہے۔ جس سے بڑی غلط فہمی پیدا ہوئی ہے جو یہ ہے۔

"اتفقت العلماء علی وجوب غسلهما وما علمت من رد

ذلك سوی الطبری من فقهاء المسلمين و الرافضة من

غيرهم." (۴)

(علماء کا دونوں (پاؤں) دھونے پر اتفاق ہے۔ فقہاء مسلمین میں سے طبری کے سوا میں کسی کو نہیں جانتا جس نے اس کو رد کیا ہو)۔

۱۔ صحابہ و تابعین سے ان دو قراءتوں کے لئے ملاحظہ ہو، احکام القرآن، جصاص ۱/۳۴۸۔ تفسیر قرطبی ۶/۹۱-۹۲

۲۔ تفسیر ابن کثیر میں اس موضوع پر کئی صفحات میں تفصیل سے بحث کی گئی ہے اور قرطبی کے برعکس اس میں امام طبری کا مسلک صحیح طور پر پیش کیا ہے جو اہل سنت کا مسلک ہے۔

۳۔ الکشاف: ۱/۵۹۸

۴۔ تفسیر قرطبی: ۶/۹۱۔ ان قاضی ابوبکر بن العربی کی زبان سے تو تہافت الفلاسفہ اور احیاء علوم دین کے مصنف اور ان کے استاذ امام غزالی بھی محفوظ نہ رہ سکے کہ موصوف نے مشہور حکم یہ صادر فرمایا ہے کہ غزالی فلسفیوں کی کتابوں کے پیٹ میں داخل ہوئے اور پھر اس سے نکل نہ سکے۔

Marfat.com

اس مسئلہ میں خود امام طبری کے تفصیلی قول کو سامنے رکھتے ہوئے جو ہم پہلے پیش کر چکے ہیں۔ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ابوبکر ابن العربی نے کیسی غلط بات کہی ہے، بلکہ اس امام اہل سنت کے خلاف کیسا بہتان گھڑا ہے۔ جس نے بھی ان کی کتاب العواصم من القواصم پڑھی ہے، وہ جانتا ہے کہ یہ کیسے عاجلانہ اور غیر مدلل احکام لوگوں کے بارے میں دیتے رہے ہیں ان کے برخلاف خطیب بغدادی، ذہبی، ابن کثیر وغیرہ محدثین اور وسیع النظر ذمہ دار علماء ہیں جنہوں نے امام طبری کی کتابوں کو غور سے پڑھا ہے اور پھر صحیح رائے قائم کی ہے اور اس میں یہ ہے کہ وہ وضو میں قدموں پر مسح کو نہیں بلکہ ان کو دھونا ضروری سمجھتے تھے اور خود ان کے اپنے بیان سے یہ ثابت ہو چکا ہے۔

اس لیے اس مسئلہ کو ان کی شیعیت کی دلیل قرار دینا ایک بے بنیاد اور مہمل بات ہے۔

یہاں ایک مخصوص حنبلی محدث کا مسئلہ ہے یعنی ابوبکر بن ابی داؤد جنہوں نے عباسی خلیفہ کے حاجب نصر القشوری کو ایک درخواست دی جس میں امام طبری پر نہ صرف شیعیت بلکہ جہمیت (۱) کا الزام لگایا گیا۔

طبری پر شیعیت کے اتہام کے سلسلہ کی یہ نہایت اہم کڑی ہے۔ امام طبری سے اس شخصی اختلاف کا ذکر سب سے پہلے ایک حنبلی عالم ابن الجوزی نے ہی کیا ہے (۲) یہ ابوبکر عبداللہ مشہور محدث ابوداؤد کے فرزند خود محدث اور حنبلی المذہب تھے (ان کی وفات ۳۱۶ھ) اور متعدد کتابوں کے مصنف، افسوس کہ انہوں نے فکری اختلاف میں حکومت وقت کا سہارا لیا جیسے کہ بعض سیاسی علماء ہمارے زمانہ میں کرتے ہیں، امام طبری حکومت سے بلکہ خلیفہ اور وزیر تک سے دور رہتے۔ اور ان کے انعامات بھی قبول نہیں کرتے تھے، یہ حقیقت ہے کہ ان کو اس باطل اتہام سے تکلیف ہوئی اور انہوں نے ان حنابلہ کے بارے میں حاجب خلافت عباسیہ نصر القشوری کو جواباً لکھا کہ:

''اسلام میں ان حشویہ حنابلہ جیسا کوئی کمینہ گروہ نہیں۔''

۱۔ جہم بن صفوان، متوفی ۱۲۸ھ کے متبعین کو جہمی اور ان کے عقائدی مذہب کو جہمیہ کہا جاتا ہے، جہم بعض صفات خداوندی کا منکر تھا جیسے علیم بصیر وغیرہ، اس کے مذہب کو اس لئے تعطیل اور ماننے والوں کو معطلہ بھی کہا جاتا ہے۔ یہ مشبہہ یا مجسمہ کے بالکل برعکس ایک گمراہ فرقہ تھا۔

۲۔ مقدمہ اختلاف الفقہاء۔ ص ۱۰

Marfat.com

بہرحال اس واقعہ سے اس بات کی تصدیق ہوتی ہے کہ امام طبری اور حنابلہ کے ایک بڑے گروہ کے آپس کے تعلقات کشیدہ تھے اور یہ کشیدگی آخر تک قائم رہی۔ شیخ الاسلام امام ذہبی نے بھی مختصراً اس واقعہ کی طرف اشارہ کیا ہے اور انہوں نے اس موقع پر حق پسندی کا اظہار کرتے ہوئے حنابلہ کی زیادتی کا ذکر کیا ہے حالانکہ وہ خود بھی حنبلی تھے ان کا بیان ہے۔

و قد وقع بين ابن جرير و بين ابن ابى داؤد و كان كل منهما لا ينصف الآخر، و كانت الحنابلة حزب ابى بكر بن ابى داؤد فكثروا شغبوا على ابن جرير و ناله اذى و لزم بيته. (۱)

(ابن جریر (طبری) اور ابن ابی داؤد کے درمیان اختلاف تھا اور دونوں میں سے کوئی دوسرے کے ساتھ انصاف نہیں کرتا تھا، حنبلی ابوبکر بن ابی داؤد کی پارٹی میں تھے۔ ان کی تعداد زیادہ ہوگئی اور انہوں نے ابن جریر (طبری) کے خلاف غنڈہ گردی کی۔ ان کو اذیت پہنچی اور وہ اپنے گھر کے اندر ہی رہنے لگے)۔

اس میں اس پتھراؤ کی طرف اشارہ ہے جس کا ذکر ہو چکا ہے بلکہ ان مختصر جملوں میں امام طبری کے خلاف حنبلیوں کی الزام تراشیوں اور ریشہ دوانیوں کی ساری داستان آ گئی ہے اور اسی میں شیعیت کا الزام بھی ہے جس کا استعمال اس زمانہ میں جیسا کہ اوپر ذکر کیا جا چکا ہے، آسان اور کارگر تھا مگر ہم دیکھ سکتے ہیں کہ ایک انتہائی مشہور اور بلند پایہ حنبلی عالم امام ذہبی نے اس کی تردید کی ہے۔

۴۔ جہاں تک جہمیت (صفات خداوندی کا انکار) کا تعلق ہے یہ بھی ایک انتہائی ناروا اور بے بنیاد بہتان تراشی تھی طبری نے اپنی حدیث کی بے نظیر کتاب ''تہذیب الآثار'' میں جہمیت پر تنقید کی ہے اور ایمان کے معنی پر بحث کرتے ہوئے اہل سنت یا سلف کے مذہب کو صحیح و برحق کہا ہے۔ (۲)

۱۔ سیر اعلام النبلاء، ۱۴، /۲۷۷۔

۲۔ تہذیب الآثار (مسند عبداللہ بن عباس) ج ۲۔ ص ۶۶۰، ۶۸۸۔

Marfat.com

یہاں یہ بات یاد رکھنے کی ضرورت ہے کہ جیسا کہ ذکر ہوا طبری نے حنابلہ کی اس حدیث کا انکار کیا جس کے بموجب قیامت کے روز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اللہ تعالیٰ کے ساتھ عرش پر بیٹھیں گے (نعوذ باللہ) کیونکہ اس سے تجسیم ثابت ہوئی ہے اور اپنا وہ مشہور شعر کہا:

سبحان من لیس له انیس ولا له فی عرشه جلیس

امام طبری کا یہی وہ نقطۂ نظر ہے جس کی بنا پر ابوبکر بن ابی داؤد نے زیادتی کرتے ہوئے ان کو جہمی (منکر صفات خداوندی) بنا ڈالا۔ حالانکہ جمہور اہل سنت کا یہی عقیدہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لیے ''مقام محمود'' سے مراد مقام شفاعت اور لواء الحمد ہے نہ یہ کہ جیسے بادشاہ کے ساتھ وزیر کی نشست ہوتی ہے کہ حنابلہ کا ایک گروہ ہر دور میں بہت ظاہر پرست اور لکیر کا فقیر رہا ہے اسی کو قدیم سے عربی میں حشویہ (بھرتی والے) کہا گیا ہے اور انہوں نے امام طبری کے خلاف فتنہ کھڑا کیا تھا۔ جس کی حقیقت کو لوگ ہمارے دور میں نہیں پہنچ سکے۔

حافظ ذہبی نے طبری کے معاصر مشہور محدث ابن خزیمہ (مصنف صحیح ابن خزیمہ) کی زبانی ان کی تعریف کرتے ہوئے موصوف کے یہ الفاظ لکھے ہیں ''ولقد ظلمته الحنابلة'' (۱) (حنبلیوں نے ان پر ظلم کیا) امام ذہبی نے چونکہ ان الفاظ کو نقل کرتے ہوئے ان کی کوئی تردید نہیں کی ہے اس لیے ثابت ہوتا ہے کہ وہ بھی امام طبری پر حنابلہ کے ظلم کے معترف تھے اور سب سے بڑا ظلم یہی تھا کہ انہوں نے طبری کو شیعہ مشہور کر دیا تھا اور ان کے لیے جھوٹے الزامات گھڑے تھے۔

حافظ ابن کثیر نے ایک اور عالم کو بھی طبری کے خلاف الزام تراشی اور فتنہ انگیزی کا مرتکب بتایا ہے، یہ تھے ابوبکر بن داؤد بن علی یعنی داؤد بن علی الظاہری کے بیٹے۔ وہ طبری کی وفات پر حنابلہ کے عوام اور شر پسندوں کی شر انگیزی کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں:

وانما تقلدوا ذلك عن ابی بكر محمد (۲) بن داؤد الفقيه الظاهری حيث كان يتكلم فيه و يرميه بالعظائم و بالرفض. (۳)

۱۔ سیر اعلام النبلا ۱۴/۲۷۳، ذہبی نے اس کتاب میں ۱۶ صفحات میں طبری کے حالات لکھے ہیں (۲۶۷-۲۸۲)

۲۔ یہ محمد بن داؤد الظاہری فقیہ ہونے کے ساتھ شاعر اور ادیب تھے اور اخلاقی بندشوں سے بڑی حد تک آزاد تھے۔ ۲۹۷ھ میں انتقال ہوا (البدایہ والنہایہ از ابن کثیر ۱۰/۱۱۰)

۳۔ البدایہ والنہایہ ۱۰/۱۴۶

Marfat.com

(اور انہوں نے یہ سب کچھ ابوبکر محمد بن داؤد فقیہ ظاہری کی تقلید میں کیا جو ان (طبری) پر بڑی بے ہودہ باتوں اور رفض کا الزام لگاتا تھا)۔

یاقوت نے بھی اس ابوبکر محمد بن داؤد الظاہری کی طبری سے عداوت کا ذکر کیا ہے اور وجہ بتائی ہے کہ امام طبری نے داؤد الظاہری کی ایک کتاب کا رد ''الرد علی ذی الاسفار'' کے نام سے لکھا۔ جو ایک مناظرہ کے نتیجہ میں تھا۔ داؤد الظاہری کے متبعین اور ان کے بیٹے ابوبکر محمد اس پر کافی ناراض تھے اور اس کے جواب میں انہی ابوبکر نے طبری کی کتاب کا رد لکھا اور اس میں انہوں نے امام طبری پر لعن طعن کیا۔ داؤد ظاہری کے متبعین پہلے ہی مناظرہ کی مجلس میں طبری کے خلاف برے الفاظ استعمال کر چکے تھے، طبری نے اس کے بعد کوئی جواب نہیں دیا، بلکہ ایک موقع پر انہوں نے ابوبکر بن داؤد الظاہری کے ساتھ انتہائی خوش اخلاقی کا مظاہرہ کیا اور ان کے والد کی تعریف کی (۱) جو وفات پا چکے تھے۔

بہرحال ابوبکر عبداللہ بن ابی داؤد الحنبلی اور ابوبکر محمد بن داؤد الظاہری وہ دو حضرات تھے جنہوں نے ذاتی اختلافات کی بنا پر امام طبری کے خلاف شیعیت اور جہمیت کا بہتان گھڑا تھا اور ایک فتنہ برپا کیا تھا۔ بالکل اس طرح جیسے ہمارے یہاں بعض مذہبی گروہ اور تنگ نظر سیاسی علمائے حق کے خلاف کرتے ہیں۔

۵۔ ان پر شیعیت کا بہتان لگانے کے لیے ایک بہانہ یہ ڈھونڈا گیا کہ انہوں نے حدیث غدیر خم کے اثبات میں ایک کتاب تصنیف کی تھی۔

انہوں نے یہ کتاب ضرور لکھی تھی لیکن یہ ایک محدثانہ اور علمی کوشش تھی، اس میں شیعی نقطۂ نظر اختیار نہیں کیا گیا۔ یعنی اس غدیر خم (۲) کے مقام پر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اس ارشاد گرامی ''من کنت مولاہ فعلی مولاہ'' (۳) سے حضرت علیؑ کی ولایت کا وہ مطلب نہیں نکالا تھا جو شیعوں نے نکالا ہے۔

۱۔ تفصیل کے لیے دیکھیے یاقوت ۶/۴۵۰-۴۵۲

۲۔ مدینہ کے قریب یہ ایک مقام ہے یہاں رسول اللہ ﷺ نے حجۃ الوداع سے واپسی پر مختصر قیام کیا تھا اور یہ حدیث ارشاد فرمائی تھی۔

۳۔ حدیث کے پورے الفاظ یہ ہیں: من کنت مولاہ فعلی مولاہ. اللھم وال (بقیہ

Marfat.com

اور صحیح صورت واقعہ یہ ہے کہ جیسا کہ ابن عساکر نے لکھا ہے کہ ابوبکر بن ابی داؤد السجستانی نے حدیث غدیر خم پر انکارانہ کلام کیا تو طبری نے کتاب الفضائل لکھی جس میں پہلے ابوبکرؓ وعمرؓ و عثمانؓ کے فضائل بیان کئے اور پھر حدیث غدیر خم کو صحیح قرار دیتے ہوئے دلائل پیش کئے اور حضرت علیؓ کے فضائل بیان کئے اور وہ کتاب پوری نہ کر سکے۔

اس حدیث پر شیعہ حضرات نے رائی پر پہاڑ جمانے کی قدیم سے کوشش کی ہے بلکہ اس میں غلط اضافے بھی کئے ہیں جیسے یہ الفاظ ''انه خليفة من بعدى'' (وہ یعنی علیؓ میرے بعد خلیفہ ہوں گے) یہ سب غلط ہے اور اسی کی بنا پر بہت سے اہل سنت بھی اس حدیث کے بارے میں شکوک میں مبتلا رہے اور ہیں، امام ابن تیمیہ نے بھی بعض صحیح احادیث کو عجلت میں ضعیف قرار دے دینے کے اپنے مسلک کے مطابق اس کی تمام اسناد پر تحقیقی نظر نہ ڈالنے کے سبب اس کو ضعیف قرار دیا، میں بھی پہلے اسی بنا پر اس حدیث کو ضعیف سمجھتا تھا، لیکن شیخ ناصر الدین البانی کی اس حدیث پر انتہائی مدققانہ اور تفصیلی بحث کے بعد اس کو صحیح سمجھتا ہوں۔

اور اب امام طبری پر لکھتے ہوئے مجھے مشہور محدث برزالی کا یہ قول ملا کہ امام طبری نے اس حدیث پر دو جلدوں میں بحث کی ہے (مقدمۂ اختلاف الفقہاء، طبری ص ۱۲) پھر شیخ الاسلام ذہبی حنبلی کا یہ قول ملا جس سے ایک طرف طبری کی تائید ہوتی ہے اور دوسری طرف اس حدیث کے بارے میں ان کی اپنی رائے بھی معلوم ہوتی ہے، ان کا قول ہے:

قلت وجمع طرق حديث غدير خم فى اربعة اجزاء رايت شطره، فبهرنى سعة رواياته و جزمت بوقوع ذلك.

(سیر اعلام النبلاء ۱۴/ ۲۷۷، بیروت ۱۹۸۳ء)

(میں کہتا ہوں کہ انہوں (طبری) نے حدیث غدیر خم کی اسناد چار اجزاء میں جمع کی ہیں اس کا کچھ حصہ میں نے دیکھا اس پر ان کی روایت کی وسعت نے مجھے چکا چوند کر دیا اور مجھے یقین ہو گیا کہ غدیر خم کا واقعہ پیش آیا)۔

من والاه وعاد من عاداه ﷺ۔ یہ ابو ہریرہ، عبداللہ بن عباس، زید بن ارقم وغیرہ دس صحابہ سے مروی ہے۔ شیعہ نے اس میں کچھ اضافہ بھی کیا ہے۔ یہ حدیث مسند امام احمد، مستدرک الحاکم اور صحیح ابن حبان وغیرہ میں موجود ہے۔ دمشق کے سلفی محدث شیخ ناصر الدین البانی نے اس پر اپنی کتاب ''الاحادیث الصحیحۃ ج ۴ میں سیر حاصل بحث کر کے اس کو صحیح قرار دیا ہے۔ ص ۳۳۰-۳۴۴۔

Marfat.com

لہٰذا اس حدیث کی تائید پر ان کو شیعہ قرار نہیں دیا جاسکتا ہے۔

۶۔ جہاں تک اس چھٹے مہمل سبب کا تعلق ہے تو یاقوت نے خود ہی اس شیعی شاعر ابو بکر خوارزمی کے مذکورہ دو اشعار معجم البلدان کے مادہ (آمل) میں نقل کر کے لکھ دیا ہے:

وکذب ، لم یکن ابو جعفر رحمه الله رافضیا وانما حسدته الحنابلة فرموه بذلك فاغتنمها الخوارزمی و کان سبابا رافضیا، مجاهرا بذلك متبجحابه. (۱)

(اس نے جھوٹ کہا ابو جعفرؒ (محمد بن جریر طبری) رافضی نہ تھے بلکہ حنبلیوں نے ان سے حسد کیا اور اوران پر رافضیت کا بہتان لگایا، خوارزمی نے اس سے ناجائز فائدہ اٹھایا وہ سب وشتم کرنے والا ایک رافضی تھا اور یہ علی الاعلان کرتا تھا اور اس پر اتراتا تھا)۔

اور بہت ممکن ہے کہ یہ اشعار اس دوسرے طبری شیعی فقیہ و مورخ کے بارے میں ہوں جس کا نام اور کنیت باپ کے نام تک اہل سنت کے امام اور تاریخ الامم والملوک (تاریخ طبری) کے نام اور کنیت پر ہے، لیکن دادا کے نام میں اختلاف ہے اس شیعی مورخ کا نام تھا ابو جعفر محمد بن جریر بن رستم الطبری، جب کہ ہمارے مشہور مفسر و مورخ کا پورا نام تھا ابو جعفر محمد بن جریر بن یزید الطبری اس کی کچھ تفصیل آگے آئے گی۔

اب جب کہ ہم ان سارے اسباب اور الزامات کی دلائل و براہین کی روشنی میں تردید کر چکے ہیں جو امام طبری کو شیعہ قرار دینے کے لیے گھڑے گئے اور خود حنبلی علمائے محققین کے بیانات سے یہ ثابت کر چکے ہیں کہ شیعیت کا یہ الزام اس معاصرانہ چشمک اور ذاتی عداوت کی بنا پر بعض حنبلی علماء نے لگایا تھا اور اپنے متبعین کو امام طبری کے خلاف بھڑکا کر وہ مفسدانہ کارروائی کی تھی جس کو آج کل کی زبان میں ہم دھونس اور غنڈہ گردی کہہ سکتے ہیں اور جس پر بعض مذہبی گروہ آج کل بھی عمل پیرا ہیں، ایک اہم بات ایک دوسرے شیعی طبری کے بارے میں کرنا باقی ہے۔

غیر محققین اور سادہ لوح لوگوں کو ایک بڑی غلط فہمی اس سے بھی ہوتی ہے کہ اس چوتھی صدی ہجری میں جس کے اوائل میں امام طبری کا انتقال ہوا۔ ایک اور طبری بھی مشہور ہوا۔ جس کا وطن بھی

۱؎ یاقوت معجم البلدان ۱/۵۷ طبع بیروت ۱۹۷۹ء

Marfat.com

طبرستان کا شہر آمل تھا اور اس کا نام بھی پوری طرح امام طبری کے نام پر تھا جو ابو جعفر محمد بن جریر بن یزید بن کثیر بن غالب ہے، جب کہ شیعی طبری کا نام محمد بن جریر بن رستم ہے، اس کا ذکر شیعہ تذکروں ''الذریعۃ الی تصانیف الشیعہ'' اور عاملی کی ''اعیان الشیعہ میں'' ہے، سنی تذکرہ نگاروں میں سے امام ذہبی کی سیر اعلام النبلاء جلد نمبر ۱۴ میں اس کا انتہائی مختصر ذکر ہے اور ابن حجر کی لسان المیزان (۱) میں بھی اس کا تذکرہ ہے مگر اس کا مفصل ذکر ابن اسفندیار کی تاریخ طبرستان (فارسی) میں ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کی وفات چوتھی صدی ہجری کے ربع آخر میں ہوئی۔ وہ بنیادی طور پر ایک شیعی فقیہ کی حیثیت سے مشہور تھا۔ اس لیے پروفیسر فواد سیزکین نے اپنی کتاب تاریخ التراث العربی میں اس کو شیعہ فقہاء کے زمرہ میں ذکر کیا ہے۔

اس شیعی مصنف کی دو کتابیں امامت کے موضوع پر نجف میں چھپ چکی ہیں یعنی کتاب ''المسترشد فی امامۃ علی بن ابی طالب'' اور ''دلائل الامامۃ'' المسترشد کو بعض لوگوں نے غلطی سے امام طبری کی تصنیف بتایا ہے۔

شاہ عبدالعزیز صاحب نے تحفۂ اثناء عشریہ میں اس شیعی طبری پر گفتگو کی ہے اور اثناء عشریہ کے ''باون واں دھوکہ'' کے تحت لکھا ہے کہ ''بعد کے شیعہ اس محمد بن جریر بن رستم طبری کی کتاب سے جو اس نے مذمت صحابہ میں لکھی ہے۔ بعض اقوال نقل کر کے کہہ دیتے ہیں کہ تاریخ طبری میں یوں لکھا ہے یا اس کی کتاب ایضاح الرشید سے جو امامت کے بارے میں ہے کتاب کا نام لیے بغیر کوئی حوالہ درج کر دیتے ہیں اور اس عدم وضاحت سے مقصد ناظرین کو یہ دھوکہ دینا ہوتا ہے کہ یہ حوالہ محمد بن جریر طبری شافعی کا ہے جو تاریخ کی بہت مشہور کتاب اور اصح التواریخ سمجھی جاتی ہے۔ (۲)

۱۔ الذریعہ ۸/۲۴۱۔ اعیان الشیعہ ۴۴/ ۱۳۹۔۱۴۰۔ لسان المیزان ۵/۱۰۳ سیر اعلام النبلا ۱۴/۲۸۲، معجم المولفین، عمر رضا کحالہ۔ ۹/ ۱۴۷، تاریخ التراث العربی، فواد سیزکین ۲/۲۶۰۔ فواد سیزکین نے کحالہ کا تعاقب کرتے ہوئے ان کی مذکورہ تاریخ میلاد و وفات کو غلط بتایا ہے، لیکن خود پروفیسر نے اغلب الظن کے الفاظ کے ساتھ اس کی وفات چوتھی صدی ہجری کے ربع اول میں بتائی ہے جو صحیح نہیں، سیزکین کے حوالوں میں ابن اسفندیار کی تاریخ طبرستان کا ذکر نہیں۔

۲۔ تحفۂ اثناء عشریہ (اردو ترجمہ) ص ۱۲۶

Marfat.com

شاہ عبدالعزیز صاحب اس کے بعد تحریر فرماتے ہیں:

''اسی طبری کی ایک تاریخ کبیر بھی ہے، اس دھوکہ میں پڑ کر نقل در نقل کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے اور اس نقل کو صحیح سمجھنے والے بحر ضلالت کے بھنور میں پھنس کر غوطے کھاتے رہتے ہیں۔''

وہ یہ تصریح بھی کرتے ہیں کہ'' تاریخ کبیر اب نادرالوجود ہے اس کا اصل بہت کم دستیاب ہے جو نسخہ ملتا ہے وہ اس کا اختصار ہے اور اختصار بھی ساحلی نامی شیعہ کا تحریف کردہ ہے۔(۱)

شاہ عبدالعزیزؒ کی یہ کتاب اپنے موضوع پر ایک انتہائی وقیع اور بے نظیر کتاب ہے۔ اس میں شیعہ مصنفین کی کتابوں کے بارے میں جو معلومات ہیں وہ ان کی دقت نظر اور وسعت علمی کی دلیل ہیں۔ مگر اس شیعی طبری (محمد بن جریر بن رستم) کی اس تاریخ کا ذکر معروف و متداول تذکروں میں کہیں نہیں۔

میں اس بحث کو اب امام طبری کی کتاب تہذیب الآثار سے ان کے دو اہم اقوال پیش کر کے ختم کرتا ہوں جن سے ان پر شیعیت کے بہتان کا فریب کھل کر سامنے آتا ہے، وہ تہذیب الآثار کی چوتھی جلد مسند علی بن ابی طالب میں حسن البصری کے اس قول:

"فقد افرط اقوام فی حب اقوام فهلكوا، و افرط اقوام فی بغض اقوام فهلكوا" (۲) کی شرح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

وافرطت الغالية من الرافضة فی حب علی رحمة الله عليه حتی قال بعضهم، هو المهم و قال بعضم هو نبی مبعوث و قال آخرون فيه اقوالا عجيبة. (۳)

(غالی رافضیوں نے حضرت علی رحمۃ اللہ علیہ کی محبت میں افراط سے کام لیا، حتی کہ ان میں بعض نے کہا کہ وہ ان کے خدا ہیں، اور بعض نے کہا کہ وہ نبی مرسل ہیں اور دوسروں نے ان کے بارے میں عجیب عجیب باتیں کہی ہیں)۔

۱۔ تحفۂ اثناعشریہ (اردو ترجمہ) ص ۱۲۶

۲۔ تہذیب الآثار۔ مسند علیؓ۔ ص ۲۸۷ (یعنی بعض لوگوں نے کچھ لوگوں کی محبت میں افراط سے کام لیا اور وہ ہلاکت سے دوچار ہوئے اور بعض لوگوں سے بغض میں افراط سے کام لیا اور نتیجتاً وہ ہلاک ہوئے۔

۳۔ ایضاً۔ ص ۲۸۷

Marfat.com

کوئی شیعہ اس طرح کی بات ہرگز نہیں کر سکتا، یہ اس بات کی کھلی دلیل ہے کہ وہ شیعہ نہ تھے۔

یہی نہیں طبری نے اسی تہذیب الآثار کی ایک دوسری جلد بہ عنوان مسند عمرؓ میں حضرت معاویہؓ سے روایتیں کی ہیں جو آپس کی تعریف کی ممانعت کے بارے میں ہیں۔(۱)

کیا آج تک کوئی ایسا شیعہ ہوا ہے جو حضرت معاویہؓ سے مروی احادیث کو اپنی کتابوں میں جگہ دے اور اس کی توثیق کرے۔ شیعہ تو حضرت معاویہؓ سے خصوصی بغض رکھتے، بلکہ ان کو کافر گردانتے ہیں پھر حضرت معاویہ کی حدیثیں روایت کرنے والے مفسر و مورخ و محدث طبری کس طرح شیعہ ہو سکتے ہیں۔ ''ایں خیال است و محال است و جنوں''

اس سے بھی بڑھ کر بات تو شیخ الاسلام ذہبی نے لکھی ہے جو ان کے امام اہل سنت ہونے پر دلالت کرتی ہے وہ رقم طراز ہیں کہ ایک بار ابن صالح الاعلم کے ساتھ طبری کی گفتگو ہو رہی تھی اور حضرت علیؓ کا ذکر آیا اس پر امام طبری نے اپنے مخاطب سے پوچھا۔

من قال ان ابابکر و عمر لیسا با مامی ھدی، ایش ھو؟

قال مبتدع ،فقال ابن جریر انکارا علیہ:مبتدع مبتدع:ھذا یقتل.

''جو یہ کہے کہ ابوبکرؓ و عمرؓ امام ہدایت نہیں ہیں اس کو کیا کہا جائے گا، ابن صالح نے کہا، بدعتی، اس پر ابن جریر الطبری نے اپنی ناپسندیدگی اور تعجب کا اظہار کرتے ہوئے کہا، بدعتی، بدعتی۔ ایسے آدمی کو تو قتل کر دینا چاہیے۔''

آخر میں عرض ہے کہ طبری ہماری اسلامی تاریخ کے ابتدائی تین سو سالہ عہد کے امین ہیں۔ انہوں نے انتہائی تفصیل کے ساتھ سیرت نبوی سے لے کر ۳۰۲ھ تک کے واقعات اپنی تاریخ میں قلم بند کر دیئے ہیں اور اس میں محدثین کے طریقہ پر حوالوں سے کام لیا ہے یعنی واقعہ کو سند سے بیان کیا ہے یا پھر دوسری صدی ہجری کی کتابوں سے واقعات نقل کئے ہیں جیسے محمد بن اسحٰق، موسیٰ بن عقبہ، ابو معشر نجیح السندی، واقدی، ابوالحسن المدائنی، سیف، عمر بن شبہ وغیرہ وغیرہ۔ ان مصنفین کے رسائل یا مختلف تاریخی موضوعات پر چھوٹی کتابیں ضائع ہو گئی ہیں، طبری نے بڑی خدمت

۱۔ مسند عمر۔ ص ۸۲-۸۳

Marfat.com

انجام دی کہ ان کے نوشتوں کو اپنی ضخیم کتاب میں محفوظ کر لیا اور اس طرح اسلامی تاریخ کا تسلسل قائم رہا۔

ان کے ہم عصر مورخین میں ان سے زیادہ سن رسیدہ بلاذری، یعقوبی اور ابوحنیفہ الدینوری اور ان تینوں سے قبل خلیفہ بن خیاط (استاد امام بخاریؒ) کی کتابیں اور ان کے چھوٹے معاصر مسعودی کی کتب تواریخ مطبوعہ شکل میں موجود ہیں، مگر جس ذمہ داری اور توسیع و جامیت کے ساتھ واقعات کو طبری نے پیش کیا ہے اور کسی نے پیش نہیں کیا۔

اگرچہ شاہ عبدالعزیز دہلوی اور بعض دوسرے مصنفین نے تاریخ طبری کو ''اصح التواریخ'' کہا ہے، مگر محققین کی نظر میں طبری کا اصل کارنامہ اس کتاب میں یہ ہے کہ انہوں نے حوادث وواقعات کا ایک زبردست ذخیرہ جمع کر دیا ہے جس سے بعد کے تمام مورخین نے فائدہ اٹھایا اور سیکڑوں کتابیں طبری کی تاریخ سے فائدہ اٹھاتے ہوئے لکھی گئیں۔ یہ درحقیقت بعد کے مورخین اور ہم سب کے لیے ایک عظیم خام مواد ہے۔ جس کے تجزیہ تنقید اور تحقیق و تصحیح کا کام ہمارا فرض ہے۔

طبری نے کہیں دعویٰ نہیں کیا کہ جو واقعات انہوں نے اس کتاب میں بیان کئے ہیں وہ سب اصول روایت کی حیثیت سے صحیح ہیں، بلکہ انہوں نے تو مقدمہ کتاب میں صفائی سے یہ کہہ دیا ہے کہ ''میں نے اپنی رائے کا دخل دیئے بغیر اس میں روایات وواقعات جمع کر دیے ہیں اور بہت کم امور کے سوا میں نے واقعات کی توجیہ میں دلائل عقل واستنباط سے کام نہیں لیا ہے، اس لیے اگر کسی کو ہماری اس کتاب میں کوئی بات نامناسب اور غلط نظر آئے تو اس کی ذمہ داری ہم پر نہیں بلکہ ان پر ہے جنہوں نے اس کو روایت کیا ہے۔ (۱)

مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ بعض لوگ ان کو شیعہ قرار دے کر اس عظیم کتاب کے بارے میں شکوک وشبہات پیدا کریں۔ جس میں اسلامی تاریخ کا سب سے بڑا سرمایہ موجود ہے اور جس کو ایک ہزار سال سے تمام مورخین نے قابل اعتماد سمجھا ہے۔

---

۱ تاریخ طبری۔ ۱/۸۔ مذکورہ سابق ایڈیشن

Marfat.com

کتابیات

وہ کتب جن سے اس مقالے کی تیاری میں مدد لی گئی اور ان کا حوالہ دیا گیا۔

۱۔ اختلاف الفقہاء — طبری ابوجعفر محمد بن جریر

۲۔ تاریخ الامم و الملوک (تاریخ الطبریؒ) — ۔۔۔

۳۔ تہذیب الآثار ۱۴ اجزاء (مسند عمر، مسند علی، مسند عبداللہ بن عباس) — ۔۔۔

۴۔ تفسیر طبری جزء ۶ — ۔۔۔

۵۔ فہرست ابن الندیم — فلوگل کا جرمن ایڈیشن ۱۸۵۸ء اور رضا متجدد کا طہرانی ایڈیشن ۱۹۷۱ء۔ بعنوان فہرست الندیم

۶۔ تاریخ بغداد ج ۲، ج ۹ — ابوبکر خطیب بغدادی

۷۔ معجم الادباء ج ۶ — یاقوت الحموی الرومی مطبعۃ ہندیہ، القاہرہ

۸۔ تذکرۃ الحفاظ — ذہبی

۹۔ سیر اعلام النبلاء ج ۱۴ — ذہبی

۱۰۔ تفسیر قرطبی — قرطبی

۱۱۔ تفسیر ابن کثیر — ابن کثیر

۱۲۔ تفسیر (الکشاف) — الزمخشری

۱۳۔ تفسیر سیوطی (الدر المنثور) — جلال الدین السیوطی

۱۴۔ تاریخ التراث العربی — فواد سیزگین (عربی ترجمہ ۱، ۲ قاہرہ ایڈیشن)

Marfat.com

۱۵۔ طبرستان فی القرآن الثالث البحری (غیر مطبوع مقالہ ایم فل) — از سعد القصیبی جامعۃ امام محمد بن سعود الاسلامیہ الریاض ۱۹۸۵ء زیر نگرانی ڈاکٹر سید رضوان علی ندوی

۱۶۔ البدایۃ والنہایۃ۔ج ۱۰ — ابن کثیر

۱۷۔ احکام القرآن — ابی بکر الجصاص الرازی

۱۸۔ لسان العرب — ابن منظور الافریقی

۱۹۔ الطبقات الشافعیہ — السبکی

۲۰ الاعلام۔۱۰ اجزاء — الزرکلی

۲۱۔ معجم المولفین — کحالۃ

Marfat.com

امام شافعیؒ کی ابتدائی زندگی۔ حقائق واوہام

عبدالقادر حسن صاحب نے ۱۸ اور ۱۹ اپریل ۹۵ء کی جنگ کی اشاعت میں اپنے دو طویل کالموں میں امام شافعیؒ کی ابتدائی زندگی کو اپنا موضوع سخن بنایا ہے۔ کالم کی ابتداء میں انہوں نے معذرت خواہانہ انداز میں لکھا ہے کہ ''دراصل ایسے ہی موضوعات ہیں جن کے بارے میں ہمیں لکھنا چاہیے۔ ماضی کے ان چراغوں میں مستقبل کی روشنی ہے، یہی چراغ جلیں گے تو روشنی ہوگی۔'' یہی نہیں انہوں نے اپنے اس کالم ''یہ تھے امام شافعیؒ'' کو اپنے ''سیاسی قصے کہانیوں کا کفارہ'' شمار کیا ہے۔ نہ معلوم یہ ان کی کسر نفسی ہے یا حقیقی احساس کہ وہ قومی وسیاسی امور پر کالم نویسی کو ایک گناہ سمجھتے ہیں۔ میرے ناقص خیال میں یہ ان کا حد سے بڑھا ہوا جذبۂ تورع ہے، ورنہ قومی و سیاسی امور پر ان کی اور دوسرے صحافی حضرات کی حق پسندانہ اور صداقت شعار کالم نویسی سے قوم کی ذہنی نشوونما اور رہنمائی ہوتی ہے اور نیت درست ہو، منافقت وچاپلوسی کا اس میں دخل نہ ہو تو ایسے کالم بھی کار ثواب ہیں۔

بہر حال جب عبدالقادر حسن جیسے کہنہ مشق صحافی نے ایک ایسے سنجیدہ اور تاریخی موضوع پر قلم اٹھایا تو ان کا میرے ناقص خیال میں فرض تھا کہ وہ اس کے لیے لاہور کے ایک ہفتہ وار رسالہ ''آئین'' پر اکتفا نہ کرتے، بلکہ اس موضوع پر کوئی مستند کتاب پڑھ لیتے، یہاں فارسی کی وہ مثل یاد آتی ہے ''ہر کسے را بہر کارے ساختند'' صحافی حضرات کا اپنا ایک میدان ہے اور ان کا ذریعہ معلومات مختلف ذرائع ابلاغ، اخبارات ورسائل یا ریڈیو، ٹیلی ویژن ہوتا ہے، جب کہ علماء و مورخین کو اپنی تحریروں کے لیے کتابوں کا سہارا لینا پڑتا ہے اور یہ مآخذ جتنے قدیم ومستند یا جتنے تحقیقی ہوتے ہیں اتنی ہی ان کی تحریریں وقیع اور مفید ہوتی ہیں۔

مذکورۂ بالا کالم کے حوالے سے جس کا ماخذ ہفتہ وار ''آئین'' میں شائع شدہ ایک مضمون ہے، میں نہیں کہہ سکتا کہ خود اس مضمون کے مآخذ کیا ہیں، مگر افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ اس

Marfat.com

میں پیش کردہ بہت سی معلومات درست نہیں اور اس سے قارئین غلط تصورات قائم کر سکتے ہیں، اس لیے ضروری سمجھا گیا کہ اس میں موجود بعض اغلاط کی نشاندہی کر دی جائے کہ یہ ایک علمی فریضہ ہے۔

امام شافعیؒ کی ابتدائی زندگی کا جو نقشہ عبدالقادر حسن صاحب کے ان دو کالموں میں ان کے ایک شاگرد ربیع بن سلیمان کی تحریر سے پیش کیا گیا ہے، اس میں حالات کی صحیح تصویر نہیں۔ ربیع بن سلیمان المرادی کے علاوہ ان کے اور بھی بہت سے قریبی شاگرد تھے جیسے عبداللہ بن الزبیر الحمیدی، حسن الکرابیسی اور الزعفرانی وغیرہ جن سے امام موصوف نے اپنے بعض حالات زندگی بیان کئے اور جو امام شافعی کی متعدد قدیم عربی سوانح حیات اور دوسرے اسماء الرجال و ادب کے اہم قدیم مآخذ میں موجود ہیں، اور پھر انہی ربیع بن سلیمان سے بعض دوسری روایات ہیں جو عبدالقادر حسن صاحب کی یا بالفاظ دیگر ''آئین'' میں پیش کردہ روایات سے مختلف ہیں، اور زیادہ قرین قیاس ہیں کہ دوسری روایات سے ان کی تائید ہوتی ہے۔

ہمیں یہاں امام شافعی کی ابتدائی زندگی کے صحیح حالات تفصیل سے پیش کرنا مقصود نہیں، صرف ان ہی افکار کی تصحیح مقصود ہے جو مذکورہ کالم میں پیش کئے گئے ہیں، اس ذیل میں ان کے ایک عظیم شاگرد و مشہور محدث الحمیدی کی ایک روایت بہت مفید ہوگی، جس میں امام شافعیؒ نے ان کو اپنی ابتدائی زندگی کی باتیں بتائیں اور جس سے بعض ان باتوں کی تردید ہوتی ہے جو مذکورہ کالم کی ابتداء میں کہی گئی ہیں۔ امام شافعی کہتے ہیں:

''میں نے اپنی ماں کی گود میں یتیم کی حیثیت سے پرورش پائی، ان کے پاس اتنے پیسے نہ تھے کہ وہ مدرس کو کچھ دے سکتیں۔ مکتب کا مدرس اس بات پر راضی ہو گیا تھا کہ جب وہ مکتب سے جائے تو میں اس کی جگہ پر بچوں کی نگرانی مکتب میں کروں، جب میں نے قرآن ختم کر لیا، تو میں مسجد میں جانے لگا، جہاں میں علماء کے حلقہ ہائے درس میں بیٹھتا تھا۔ حدیث اور فقہی مسائل حفظ کرتا تھا۔ ہمارا گھر مکہ میں تھا، وادی خیف (منیٰ) کے قریب میں شانے کی چوڑی ہڈی لیتا تھا اور اس پر حدیث یا مسئلہ لکھ لیتا تھا اور ہمارے گھر میں ایک بڑا مٹکا تھا میں اس میں یہ ڈال دیا کرتا تھا، یہاں تک کہ وہ ان ہڈیوں سے بھر گیا۔'' (آداب الشافعی و مناقبہ، ابن ابی حاتم الرازی، وفات

Marfat.com

۳۲۳ھ، ص۲۴) اس سے ملتی جلتی ہی ایک دوسری روایت امام شافعی کے ایک دوسرے شاگرد زبیر بن سلیمان قریشی کی زبانی اس قدیم اور مستند عربی کتاب کے صفحہ ۲۵ پر ہے، اس میں ہے کہ دو بڑے مٹکے ایسی مکتوب ہڈیوں سے بھر گئے، وہ حکومتی محکمہ سے تحریر شدہ پرانے کاغذات بھی حاصل کرتے تھے اور ان کی پشت پر احادیث وغیرہ لکھتے تھے۔

امام شافعی کا حافظہ انتہائی قوی تھا، انہوں نے سات سال کی عمر میں قرآن حفظ کر لیا تھا، ان کے اپنے ہی ایک قول میں ہے جو اس مذکورہ کتاب اور دوسرے اہم مستند ماخذ میں ہے کہ مجھے بچپن سے دو چیزوں کا شوق تھا: تیر اندازی اور طلبِ علم۔ تیر اندازی کا تو یہ عالم ہوا کہ میں دس نشانوں میں دس ہی کو صحیح نشانہ بناتا تھا اور علم کا حال تم کو بہتر معلوم ہوگا۔ (صفحہ ۳۰)

پھر امام شافعی کے جس شاگرد یعنی ربیع بن سلیمان کی زبانی عبدالقادر حسن صاحب نے ان کی ابتدائی زندگی کے بعض نقوش پیش کئے ہیں، انہی ربیع بن سلیمان کی ایک طویل روایت میں (جو امام صاحب کے ایک دوسرے قدیم سوانح نگار الآبری کی کتاب سے یاقوت رومی نے اپنی عظیم کتاب ''معجم الادباء'' جلد ۶ میں نقل کی ہے) امام شافعیؒ کہتے ہیں کہ ''پھر (یعنی ابتدائی تعلیم کے بعد) میں مکہ سے نکل کر صحرا میں چلا گیا، جہاں میں قبیلہ ہذیل کے ساتھ سترہ سال تک رہا۔ یہ بدو قبیلہ جہاں اپنی صحرانوردی میں جاتا تھا میں بھی اس کے ساتھ جاتا تھا اور جہاں وہ ٹھہر جاتا تھا وہاں میں بھی ٹھہرا رہتا تھا۔ اس کے بعد میں مکہ واپس ہوا اور وہاں اشعار، ادبی حکایات اور قصے اور عربوں کی قدیم لڑائیوں کے واقعات بیان کرنے لگا۔ اسی دوران میرے زبیری چچازادوں میں سے ایک صاحب کی مجھ سے ملاقات ہوئی۔ انہوں نے کہا مجھے بڑا افسوس ہے کہ تمہاری اس زبان دانی، فصاحت اور ذکاوت کے ساتھ تم کو فقہ کا علم نہ ہو جس سے تم اپنے معاصرین میں ایک امتیازی مقام حاصل کر سکتے ہو۔ میں نے پوچھا مجھے کس کے پاس جانا چاہیے؟ تو انہوں نے بتایا کہ امام مالک کے پاس۔'' (یہ زبیری عزیز مدینہ کے رہنے والے تھے) امام شافعیؒ کہتے ہیں کہ ''یہ بات میرے دل کو لگی۔ میں نے مکہ میں ایک شخص سے امام مالک کی کتاب مستعار حاصل کی اور نو دن میں اس کو اچھی طرح سے حفظ کر لیا۔''

اب ہم عبدالقادر حسن صاحب کے بیان کردہ قصہ کو دیکھتے ہیں تو اس میں نظر آتا ہے کہ امام

Marfat.com

شافعی چودہ سال کی عمر میں مدینہ کی طرف روانہ ہوئے اور راستے میں کسی بزرگ نے غیبی طور پر یا فراست سے معلوم کرلیا کہ یہ مکی اور قریشی ہیں اور ان کو ہدایت کی وہ مدینہ میں امام مالک کے پاس علم حاصل کرنے جائیں۔ ان کی بڑی خاطر مدارت کی اور ان کو بھورے رنگ کا ایک اونٹ سواری کے لیے پیش کیا اور پھر مدینہ میں چودہ سال کے اس نوجوان کی امام مالک نے جس تواضع سے پذیرائی کی وہ ایک علیحدہ قصہ ہے۔ مگر اس ضمن میں قابل ذکر و لائق تعجب بات یہ ہے کہ امام شافعی امام مالک کے درس حدیث میں پہلی بار شریک ہو کر ایک تنکے کی مدد سے لعاب دہن سے اپنی ہتھیلی پر پچیس حدیثیں لکھ لیتے ہیں اور پھر وہ سب امام مالک کو درس کے بعد سنا دیتے ہیں۔

ہم نے قدیم عربی مآخذ سے امام شافعی کے جو مستند اقوال ان کی ابتدائی زندگی سے متعلق پیش کیے ہیں۔ ان کی روشنی میں جناب عبدالقادر حسن کے پیش کردہ قصے کو دیکھیں تو یہ ایک افسانہ معلوم ہوتا ہے، جس کی تفصیل یہ ہے کہ جب امام شافعی نے سات سال کی عمر میں قرآن مجید مکہ میں حفظ کرلیا تو اس کے بعد کچھ عرصہ (سال دو سال) مسجد میں علماء کے حلقہ درس اور حدیث نویسی میں صرف کیے اور پھر اس کے بعد سترہ سال انہوں نے قبیلہ ہذیل کے ساتھ صحرا میں گزار کر فصیح و بلیغ زبان اور شعر و ادب کا حصول کیا اور پھر مکہ واپس آئے اور اپنے ایک عزیز کے مشورے پر مدینہ گئے، تو ان کی عمر اس وقت چودہ سال کیسے ہوسکتی ہے؟ ان کی عمر تو اس وقت چوبیس پچیس سال ہونا چاہیے۔

کوئی شک نہیں کہ بیہقی کی مناقب الشافعی میں امام شافعی کا ایک قول نقل کیا گیا ہے کہ میں امام مالک کے پاس (مدینہ) آیا تو میری عمر تیرہ سال تھی لیکن عظیم مورخ امام ذہبی نے اپنی ضخیم ترین کتاب سیر اعلام النبلاء (جلد ۱۰۔ ص ۱۲) میں اس قول کو نقل کرتے ہوئے اس کی تصحیح کی ہے کہ ”ظاہر بات یہ ہے کہ ان کی عمر اس وقت تیئیس سال تھی۔“ راوی کی غلطی سے عربی کا ثلاث و عشرین یعنی ۲۳، ثلاث عشرۃ ہو گیا۔

پھر یہ ایک تسلیم شدہ حقیقت ہے کہ امام شافعیؒ ایک اعلیٰ درجہ کے زبان داں اور ادیب و شاعر تھے، اور وہ اس لیے کہ انہوں نے اپنی جوانی کا ایک بڑا حصہ ایک مشہور عربی قبیلے میں گزارا تھا، جو اپنی فصاحت و بلاغت اور شعر گوئی و ادبی روایات میں تمام جزیرہ عرب میں مشہور تھا یعنی

Marfat.com

قبیلۂ ہذیل، اور امام شافعیؒ کے حالات میں برابر یہ بات ذکر کی گئی ہے کہ مشہور عرب زباں داں اور ادیب اصمعی نے قبیلہ ہذیل کا شعری ادب امام شافعیؒ ہی سے بغداد میں حاصل کیا۔ اس لیے یہ بات درست نہیں کہ چودہ یا تیرہ سال کی عمر میں وہ مدینہ منورہ امام مالک سے علم حاصل کرنے گئے بلکہ ان کی عمر اس وقت ۲۳ یا ۲۴ سال کے لگ بھگ تھی۔

اوپر جو مستند روایت پیش کی گئی، اس سے یہ بات واضح ہوگئی کہ امام شافعیؒ، امام مالک کی حدیث کی کتاب موطا اچھی طرح مکہ میں حفظ کر کے مدینہ گئے تھے، اس لیے تنکے اور لعاب دہن سے امام صاحب کی احادیث ہتھیلی پر لکھنے کی بات بھی افسانوی ہے، اس لیے کہ تنکے اور لعاب دہن سے لکھا ہوا تو باقی نہیں رہتا پھر اس کا کیا فائدہ؟ مزید یہ کہ انہی ربیع سلیمان سے مذکورہ کتاب ''آداب الشافعی ومناقبہ'' میں امام شافعی کا قول منقول ہے کہ ''میں امام مالک سے جب ملنے آیا تو اس سے پہلے موطا اچھی طرح حفظ کر چکا تھا۔'' اور وہ چاہتے تھے کہ قدیم طریقہ کے مطابق خود امام مالک سے یہ کتاب سنیں، امام صاحب نے بار بار ان کے جواب میں کہا کہ تم مدینہ میں کسی اور سے میری یہ کتاب سن لو، اور پھر آخر امام شافعی کے اصرار پر وہ اس بات کے لیے راضی ہو گئے کہ امام شافعی یہ کتاب پڑھیں اور وہ سنیں۔ امام صاحب کو امام شافعی کی لغوی وادبی قابلیت کے سبب ان کی خواندگی پسند آئی، حتیٰ کہ امام شافعی نے پوری کتاب مختلف مجلسوں میں پڑھی اور اس طرح علم اصول حدیث کے مطابق اب وہ اس کتاب کی روایت کے مجاز ہو گئے۔

یہ وہ بات ہے جو متعدد قدیم مستند عربی مآخذ میں درج ہے اور خود امام شافعی کی زبانی، اب اس کی روشنی میں یہ بات کہاں تک درست ہو سکتی ہے کہ تہجد کی نماز کے لیے امام مالک لوٹا لے کر امام شافعی کو اٹھانے اور وضو کروانے آئے، اور پھر طلوع آفتاب کے بعد امام مالک نے ان کے ہاتھ میں خود موطا دی کہ پڑھ کر سنائیں، اور پھر آٹھ ماہ میں امام شافعی نے مدینہ میں موطا حفظ کر لی۔

جس کسی نے بھی یہ قصہ گھڑا ہے، اس نے اس میں امام شافعیؒ کے مرتبہ کو پیروں اور بزرگوں کی طرح بڑھا چڑھا کر پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ ''پیران نمی پرند مریداں می پرانند'' کے مصداق، لیکن ساتھ ہی اس نے اپنی حماقت سے امام شافعی کو اتنا کند ذہن بنا دیا کہ وہ اس متوسط حجم کی کتاب کو آٹھ ماہ میں حفظ کر سکے۔ ہم اوپر خود ان کا اپنا قول درج کر چکے ہیں کہ انہوں

Marfat.com

نے نو دن میں اس کو اچھی طرح حفظ کر لیا تھا اور ان کی مشہور قوت حافظہ کے مطابق یہی بات درست ہے۔

اس کے بعد امام شافعی کے کوفہ جانے اور اس میں امام مالک کی مالی امداد، اور پھر کوفہ جانا اور وہاں قاضی ابو یوسف اور امام محمد بن حسن (شاگرد امام ابوحنیفہؒ) سے ملنے کی باتیں بھی افسانوی رنگ کی ہیں اور ان سے امام شافعی کی عظمت دکھانا مقصود ہے۔ یہ سب سراسر غلط ہے، کیونکہ امام شافعی مدینہ سے کوفہ نہیں بلکہ یمن گئے تھے، اور امام مالک کی وفات کے بعد، امام شافعی کے حالات میں ابن ابی حاتم کی مذکورہ کتاب کے بعد قدیم تر اور ضخیم ترین کتاب ابوالحسن محمد بن الحسین الآبری کی کتاب میں مشہور ادیب و مصنف یاقوت الرومی نے اپنی مذکورہ کتاب معجم الادباء (جلد ٦) میں یہ روایات ایک مربوط انداز میں نقل کی ہیں۔ اسی میں امام شافعی کے مدینہ امام مالک کے پاس جانے کا قصہ بھی ہے اور اس میں امام شافعی کہتے ہیں: ''میرا پھر مدینہ میں قیام رہا حتیٰ کہ امام مالک فوت ہو گئے، پھر میں وہاں سے یمن چلا گیا۔'' یمن میں امام شافعی بحیثیت قاضی اور شہر نجران کے حاکم رہے اور پھر وہیں سے کوفہ نہیں بلکہ بغداد گئے۔

امام مالک کوئی ایسی معمولی شخصیت اور بے مال و زر انسان نہ تھے کہ وہ بقول جناب عبدالقادر حسن امام شافعی سے ان کو سفر کوفہ کے وقت پیسے دیتے ہوئے یہ کہیں کہ ان کے پاس سو دینار ہدیہ کے آ گئے تھے اور وہ اس میں سے پچاس دینار ان کو دے رہے ہیں۔ امام مالک اس سے بہت قبل یعنی ہارون الرشید کے دادا ابو جعفر منصور کے عہد خلافت میں اس مقام اور شہرت کے عالم تھے کہ اس خلیفہ نے ان سے کہا کہ وہ چاہتا ہے کہ موصوف کی کتاب موطا کو پوری خلافت عباسیہ کا قانون بنا دے، لیکن انہوں نے اس کو علمی دیانت اور دوسرے علماء و مجتہدین عصر کے احترام میں پسند نہیں کیا۔ ابو جعفر اور دوسرے عباسی خلفاء ان کا بہت احترام کرتے اور ان کو باقاعدہ ہدایت دیتے رہتے۔

عبدالقادر حسن صاحب نے قاضی ابو یوسف کا ذکر کرتے ہوئے اپنی طرف سے بریکٹ میں ان کو کتاب ''الاموال'' کا مصنف قرار دیا ہے۔ یہ درست نہیں، قاضی ابو یوسف نے اس نام سے کوئی کتاب نہیں لکھی۔ ان کی کتاب کا نام ''کتاب الخراج'' ہے۔ جو ایک متداول کتاب ہے

Marfat.com

اور اردو میں ترجمہ بھی بہت پہلے ہو چکا ہے۔ کتاب ''الاموال'' ابوعبیدہ القاسم بن سلام کی تصنیف ہے، جو امام شافعی کے شاگرد تھے۔

محترم کالم نویس نے امام ابوحنیفہؒ کی ایک کتاب ''الاوسط'' کا بھی ذکر کیا ہے، جو ان کے بقول امام محمدؒ نے امام شافعی کو پڑھنے کے لیے دی۔ یہ بڑی عجیب معلومات ہیں، حقیقت یہ ہے کہ امام ابوحنیفہ نے اس نام سے کوئی کتاب نہیں لکھی ان کی صرف ایک کتاب ''الآثار'' یا مسند ابوحنیفہ کے نام سے معروف ہے، اور ایک دوسری کتاب یا رسالہ ''الفقہ الاکبر'' کے نام سے مشہور ہے جو عقائد میں ہے اور اس کی نسبت امام ابوحنیفہ کی طرف اب مشکوک قرار دی جاتی ہے۔

یہ بات بھی غلط ہے کہ امام محمدؒ نے اپنی آدھی دولت امام شافعی کو دے دی۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ وہ بہت صاحب ثروت آدمی تھے اور انہوں نے امام شافعی کی مالی مدد کی تھی۔

بغداد میں جس طرح امام شافعیؒ کے خلیفہ ہارون الرشید سے ملنے کا واقعہ بیان کیا گیا ہے اور یہ کہ ہارون الرشید نے ان کو منصب قاضی القضاۃ پیش کیا اور ان کے انکار پر خلیفہ رو پڑا، اس کا ذکر بھی مستند تذکروں میں نہیں اور نہ یہ کوئی قرین قیاس بات ہے، اس کے بالکل برخلاف امام شافعی کی مستند اور قدیم سوانح حیات میں امام شافعی کے ہارون الرشید سے ملنے کا قصہ کسی اور ہی انداز میں ہے اور وہ یوں ہے کہ وہ جب یمن کے شہر نجران (آج کل سعودی عرب میں ہے) میں قاضی تھے تو وہاں علوی خاندان کے کچھ لیڈروں نے عباسی خلافت کے خلاف ایک سازشی منصوبہ بنایا تھا، یہ علوی امام شافعی سے بھی بعض وجوہ سے ناراض تھے۔ ہارون الرشید کو جب اس سازش کی خبر ملی تو اس نے حکم صادر کیا کہ اس سازشیوں کو بغداد میں حاضر کیا جائے، امام شافعی بھی ان کے ساتھ پکڑے گئے اور اس طرح پہلی مرتبہ وہ بغداد پہنچے۔ جہاں نو علوی سازشیوں کو تو قتل کر دیا گیا لیکن امام شافعی کو امام محمد بن حسن کی سفارش یا پھر ایک روایت کے مطابق ان کی اپنی پیش کردہ صفائی کی بنا پر معاف کر دیا گیا اور ہارون الرشید نے ان کو پانچ ہزار دینار بھی عنایت کیے (اس کی تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو کتاب آداب شافعی ومناقبہ اور معجم الادباء کی مذکورہ جلد)۔

امام شافعی کی امام محمد سے پہلی ملاقات بھی اسی موقع پر بغداد میں ہوئی، کیونکہ امام محمد بن حسن الشیبانی کا دربار خلافت میں بہت اعلیٰ مقام تھا کہ قاضی ابو یوسف کا ۱۸۳ھ میں انتقال ہو چکا

Marfat.com

تھا اور اب امام محمدؒ ہی ہارون الرشید کی صحبت میں رہا کرتے تھے۔ جب امام شافعی بغداد پہنچے تو ان کو حکم ہوا کہ وہ قصر خلافت میں حاضری دیتے رہیں (خلیفہ سے ملاقات سے قبل) جہاں اعیان وعلماء بغداد حاضری دیتے تھے۔ امام شافعی کہتے ہیں کہ میں نے خود محسوس کیا کہ مجھے ان حضرات میں سے بعض سے ملتے رہنا چاہیے اور امام محمد بن حسن کا ان میں بلند مرتبہ تھا، اور علمی طور پر یہ بہترین بات تھی، سو میں نے ان کی صحبت اختیار کی، ان کی کتابوں کو اپنے لیے نقل کیا۔ آداب الشافعی و مناقبہ (صفحہ ۳۲) ساتھ ہی اس کے بعد وہ فوراً کہتے ہیں کہ ''میں نے امام محمد بن حسن کی کتابوں سے اتنا علم حاصل کیا جتنا ایک اونٹ پر لادا ہوا کتابوں کا بوجھ ہوتا ہے۔'' بالفاظ دیگر انہوں نے امام محمد سے اس سے زیادہ علم حاصل کیا جتنا انہوں نے امام مالک سے کیا تھا۔

یہاں اس امر کا اظہار بھی ضروری ہے کہ جیسا کہ امام ذہبی نے سیر اعلام النبلاء میں تصریح کی ہے (جس میں امام شافعی کے حالات ۹۸ صفحات میں درج ہیں) یہ سن ۱۸۴ھ کا واقعہ ہے (جلد ۱۰ صفحہ ۵۰) حافظ ابن کثیر نے البدایۃ والنہایۃ (جلد ۱۰ صفحہ ۱۸۲) میں امام شافعی کے تذکرے میں بھی یہی بات کہی ہے۔ اس موقع پر انہوں نے ایک اہم بات یہ بھی کہی ہے کہ ''عبداللہ بن محمد البلوی کذاب نے اپنے امام شافعی کے سفرنامے میں یہ بات جو لکھی ہے کہ امام شافعی کی ملاقات قاضی ابو یوسف سے ہوئی یہ غلط ہے، کیونکہ امام شافعی ان کی وفات کے بعد پہلی مرتبہ ۱۸۴ھ میں بغداد آئے تھے۔

سو اسی طرح عبدالقادر حسن صاحب نے ''آئین'' کے حوالے سے امام شافعی کے کوفہ کے سفر اور وہاں قاضی ابو یوسف سے ان کی ملاقات کا جو ذکر کیا ہے وہ سراسر غلط ہے۔ ساتھ ہی حافظ ابن کثیر کی اس تصریح سے پتہ چلتا ہے کہ ہفتہ وار ''آئین'' کے مضمون نگار صاحب نے امام شافعی کے سفروں سے متعلق جو مضمون لکھا ہے وہ اس کذاب مصنف البلوی کی کتاب ''رحلۃ الشافعی'' پر مبنی ہے جو جھوٹ کا پلندہ ہے۔ اب واضح ہو گیا کہ نہ تو امام شافعی چودہ سال کی عمر میں کوفہ گئے نہ ان کی قاضی ابو یوسف سے ملاقات ہوئی، بلکہ وہ ۳۴ سال کی عمر میں پہلی بار بغداد گئے، ایک سیاسی قضیہ میں، اور وہاں پہلی بار ان کی امام محمدؒ سے ملاقات ہوئی اور امام شافعی نے ان سے بہت علم حاصل کیا۔

Marfat.com

اس کے بعد عبدالقادر حسن صاحب کے دوسرے کالم ہی میں امام شافعی کے بغداد میں تین سال رہنے اور امام مالک کی روایت کا حال سن کر دوبارہ مدینہ جانے کا قصہ ہے اور یہ کہ راستے میں ان کو امام احمد بن حنبل، سفیان بن عیینہ اور اوزاعی وغیرہ ملے اور ایک دولت مند آدمی نے بغداد میں ان کو چالیس ہزار دینار دیئے جو انہوں نے ان سب ائمہ دین میں بانٹ دیئے اور ان کے پاس صرف دس دینار رہ گئے۔ یہ سب بے سروپا افسانوی باتیں ہیں جو اسی مصنف بلوی کی طبع زاد ہیں اور جن کو آئین کے مضمون نگار صاحب نے نقل کیا ہے اور ان سے عبدالقادر حسن صاحب نے استفادہ کیا۔

اس جھوٹ کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ امام اوزاعی بغداد میں نہیں بلکہ بیروت میں رہتے تھے اور اس سے بڑھ کر یہ کہ سن ۱۵۷ھ میں یعنی جب امام شافعی کی عمر صرف سات سال تھی وفات پا چکے تھے، جب کہ سفیان بن عیینہ مکہ مکرمہ میں رہتے تھے اور امام شافعی سے عمر میں ۴۳ سال بڑے تھے کہ ان کی پیدائش ۱۰۷ھ کی ہے جب کہ امام شافعی ۱۵۰ھ میں پیدا ہوئے۔

اس قصہ کی سب سے بیہودہ اور جھوٹی بات یہ ہے کہ عبدالقادر حسن صاحب کی تحریر کے مطابق امام مالک اب بڑی شان وشوکت سے رہنے لگے تھے۔ مسجد نبوی میں ان کے لیے لوہے کی ایک کرسی رکھی ہوئی تھی اور اس پر قیمتی ریشمی مسند، امام مالک عطر میں ڈوبے ہوئے مسجد نبوی میں آئے، لوگ ان کے احترام میں کھڑے ہو گئے، اس حلقہ میں اور تو کوئی امام مالک کے علمی سوالوں کا جواب نہ دے سکا۔ (دیکھئے اس سے امام مالک کی کس درجہ تحقیر ہوتی ہے) صرف امام شافعی ہی نے جوابات دیئے، جو چپکے سے یہ جوابات ایک دوسرے طالب علم کو بتاتے رہے اور وہ یہ جوابات دیتا رہا، پھر جب اس نوجوان نے امام مالک کے استفسار پر بتایا کہ درحقیقت یہ عمدہ جوابات کوئی اور دے رہا ہے تو امام مالک نے امام شافعی کو اپنے قریب بلایا پھر بھی وہ ان کو پہچانے نہیں، بلکہ غور سے دیکھ کر پوچھا کہ تم شافعی ہو؟'' جب امام شافعی نے اثبات میں جواب دیا تو انہوں نے شافعی کو کھینچ کر سینہ سے لگایا اور ان کے لیے اپنی کرسی چھوڑ دی۔ شافعی امام مالک کی کرسی پر براجمان ہو گئے اور کالم نگار کے بقول ''انہوں نے اس مجلس درس میں چار سو سوالات حاضرین سے کیے جن کا کوئی ایک بھی جواب نہ دے سکا۔''

Marfat.com

اب آپ غور کیجئے کہ یہ کیسی بے سروپا باتیں ہیں۔ امام مالک صرف تین سال بعد اپنے اس عزیز شاگرد (شافعی) کی صورت بھی بھول گئے اور ان کے قریب آنے پر نہ پہچان سکے اور ان کو پوچھنا پڑا کہ کیا تم شافعی ہو؟ امام مالک اتنے غبی اور کمزور حافظہ تو نہ تھے، پھر یہ کہ ''امام شافعی'' جھٹ سے اپنے عظیم استاد کی کرسی پر براجمان ہو گئے اور انہوں نے صرف ایک مجلس درس میں اکٹھے چار سو سوالات بھی طلبہ سے کر ڈالے، جن میں سے ایک سوال کا بھی کوئی جواب نہ دے سکا۔ سچ ہے کہ جھوٹ کے پاؤں نہیں ہوتے، کیا یہ ممکن ہے کہ ایک مجلس درس میں چار سو سوالات کر ڈالے جائیں؟ اور کیا امام مالک کے سارے طلبہ اتنے جاہل اور نالائق تھے کہ ان میں سے کوئی کسی ایک سوال کا جواب بھی نہ دے سکا؟

امام شافعی کی تعریف میں پہاڑ کھڑا کرنے کے لیے راوی نے کیسی بے سروپا باتیں کہی ہیں۔ افسوس اس بات کا ہے کہ عبدالقادر حسن صاحب نے خوش عقیدگی میں اس سب کو نقل کیا اور اس میں بدیہی دروغ بیانی کو محسوس نہ کیا۔

یہی نہیں اس راوی کی امام مالک کی شان میں گستاخی کی حد ہے کہ وہ کہتا ہے کہ نماز مغرب کے بعد جب امام مالک امام شافعی کو اپنے گھر لے گئے تو انہوں نے دیکھا کہ وہاں پرانے گھر کے بجائے اب نئی عالیشان عمارت کھڑی ہے، جس پر امام شافعی رونے لگے، کیونکہ ان کو خیال ہوا کہ امام مالک ''نعوذ باللہ اب دنیا پرست ہو گئے'' اور امام مالک کے استفسار پر انہوں نے واقعی اپنے اس اندیشہ کا اظہار بھی کر دیا، جس پر امام مالک نے معذرت خواہانہ انداز میں ان کو بتایا کہ یہ اس پیسے سے بنائی گئی ہے جو ان کے پاس بطور ہدیہ مصر و خراسان وغیرہ سے آتا رہتا ہے اور ہدیہ وتحفہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بھی لے لیا کرتے تھے۔ اس کے بعد امام مالک نے ان کو اپنے پاس جمع شدہ تین سو خلعت اور اپنی پانچ ہزار دینار کی پونجی میں سے آدھی رقم دی اور ان کے دروازے پر جو بیسیوں مصری اور خراسانی گھوڑے خچر وغیرہ بندھے تھے وہ سب امام شافعی کو ہدیہ کر دیئے۔

سبحان اللہ! راوی کا کیا زور بیان ہے اور دروغ بیانی کا کیا طوفان، مگر افسوس اس کا ہے کہ ہفتہ وار ''آئین'' کے مضمون نگار صاحب اور ان سے عبدالقادر حسن صاحب نے بے کم و کاست یہ سب دروغ نقل کر دیا ہے اور اس سب ملبسہٴ دروغ کو امام شافعی کی قدر و منزلت کی علامت کے

Marfat.com

طور پر پیش کیا گیا ہے۔ان دونوں صاحبان کو یہ احساس تک نہیں ہوا کہ اس سے امام مالک کی کتنی تنقیص ہوتی ہے۔

اب سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ امام مالک تو تب ہی وفات پا چکے تھے جب پہلی بار شافعی ۲۴ سال کی عمر میں ان سے موطا پڑھ کر فارغ ہوئے تھے اور جیسا کہ ہم نے اوپر مستند حوالے سے لکھا ہے کہ امام شافعی ان کی وفات کے بعد ہی مدینہ سے کوفہ نہیں بلکہ یمن گئے تھے قاضی ہو کر۔ یہ سن ۱۷۹ھ کی بات ہے۔

دوسری بات یہ کہ امام مالک کی قدر و منزلت امام شافعی کی پیدائش سے پہلے ہی بہت زیادہ تھی، اور عباسی خلفاء ان کا بڑا احترام کرتے تھے کہ وہ مدینہ منورہ کے اپنے دور کے سب سے بڑے عالم تھے اور حدیث کی پہلی عظیم کتاب موطا کے مصنف تھے۔عباسی خلافت میں امام ابو حنیفہ (وفات ۱۵۰ھ) کے بعد سب سے بلند مقام ان کا تھا اور وہ پہلے ہی ایک اچھی پر وقار زندگی گزارتے تھے۔

اس پورے قصہ کا اولین راوی یعنی البلوی الشافعی امام شافعی کی محبت میں نہ صرف اندھا بلکہ گاؤدی بھی تھا کہ اس نے تواریخ کا بھی کچھ لحاظ نہ رکھا اور اس میں امام مالک کو بعض حیثیتوں سے مطعون کیا۔اس کا سبب درحقیقت یہ ہے کہ امام شافعی سن ۱۹۵ھ سے ۱۹۷ھ تک دو سال برابر بغداد میں اور پھر سہ بارہ ۱۹۸ھ میں وہاں چند ماہ رہنے کے بعد احناف کے علم سے بہت متاثر ہوئے تھے۔ان کا عراق میں اپنا ایک اجتہادی مذہب قائم ہو گیا تھا۔امام احمد بن حنبل ان کے سب سے نمایاں شاگرد تھے۔امام مالک اور امام محمد بن الحسن (شاگرد امام ابو حنیفہ) کی آراء و اجتہادات سے متاثر ہو کر انہوں نے ایک نئے فقہی مذہب کی بنیاد ڈالی تھی جس میں حدیث و قیاس کا ایک حسین امتزاج تھا، پھر بغداد سے وہ ۱۹۹ھ میں مصر چلے گئے اور یہاں انہوں نے نئے معاشرہ میں دوسرے ائمہ علم کی آراء (خاص طور پر فقیہ مصر اللیث بن سعد جو ان کی آمد سے قبل وفات پا چکے تھے) اور مصری ماحول سے متاثر ہو کر اپنے نئے فقہی مذہب کی بنیاد ڈالی اور اپنے بہت سے ان فتاویٰ سے رجوع کر لیا جو انہوں نے عراق میں دیئے تھے۔یہاں انہوں نے اپنی بعض آراء و فتاویٰ میں امام مالک پر تنقید کی جس سے مصر کے مالکی بہت ناراض ہوئے اور

Marfat.com

انہوں نے امام شافعی کی مذمت وہجو میں بعض قصائد کہے اور اس کے جواب کے طور پر البلوی نے امام شافعی کی ابتدائی زندگی کے بارے میں ''رحلۃ الشافعی'' لکھی، جس میں امام مالک کی تنقیص کرتے ہوئے امام شافعی کی ابتدائی زندگی کو بہت بڑھا چڑھا کر پیش کیا گیا جس کے دروغ کی نشان دہی ہم نے اس مضمون میں کردی ہے۔

اس میں قصور عبدالقادر حسن صاحب کا نہیں ہے بلکہ آئین کے مضمون نگار صاحب کا ہے۔ جنہوں نے امام شافعی کی زندگی پر کسی قدیم وجدید مستند کتاب پڑھے بغیر ایک ایسا مضمون لکھ مارا جس میں بے سروپا باتیں ہیں اور تاریخی حقائق ان کی تردید کرتے ہیں۔ خود عبدالقادر حسن صاحب بھی اگر ایسے موضوعات ہی کو اہم سمجھتے ہیں اور ان کے الفاظ میں ''ماضی کے انہی چراغوں میں مستقبل کی روشنی ہے'' تو ان کو ایسے موضوعات کا مواد آئین جیسے ہفتہ وار رسالوں سے نہیں بلکہ مستند کتابوں سے حاصل کرنا چاہیے اور ایسی کتابیں اردو میں بھی بہت سی ہیں، خود امام شافعی کی ضخیم سوانح عمری مصر کے عصر حاضر کے عظیم فقیہ اور مورخ فقہ شیخ ابوزہرہ کے قلم سے موجود ہے، جس کا اردو ترجمہ بھی ہو چکا ہے، اسی طرح امام ابوحنیفہ اور امام مالک و امام احمد بن حنبل کی سیر حاصل سوانح حیات انہی ابوزہرہ کے قلم سے ہیں۔

آخر میں عرض ہے کہ امام شافعی ایک انتہائی بلند پایہ فقیہ، محدث، مایہ ناز مصنف، امام مذہب، ادیب وشاعر، زاہد ومتورع اور کشادہ دست وسخی شخصیت تھے۔ اگرچہ تاریخی طور پر امام ابوحنیفہ اور امام مالک کے بعد تیسرے نمبر کے امام مذہب ہیں مگر شافعی مذہب کے متبعین کی کثرت کے اعتبار سے یہ امام ابوحنیفہ کے بعد دوسرے درجہ کے امام ہیں اور لائق صد احترام، مگر یہ وہ نہیں تھے جو محترم عبدالقادر حسن کے مضمون ''یہ تھے امام شافعی'' میں پیش کیے گئے ہیں۔ عبدالقادر حسن اور دوسرے صحافی حضرات سے شیخ سعدی کے الفاظ میں یہی درخواست ہے۔

یا مکن با پیلباناں دوستی — یا بنا کن خانہ درخورد پیل

مقصد یہ ہے کہ یا تو ایسے سنجیدہ علمی موضوعات پر قلم نہ اٹھائیں یا اس کا شوق ہے تو وسعت علمی پیدا کریں۔

Marfat.com

سید عبداللہ شاہ غازیؒ ☆ اور تاریخ

''تکبیر'' کے شمارہ نمبر ۱۷ مورخہ ۲۷ اپریل ۱۹۹۵ء میں فاروق عادل صاحب نے ایک بزرگ عبداللہ شاہ غازی کے بارے میں جو خصوصی مضمون شائع کیا ہے اس نے مجھے حیرت و استعجاب میں ڈال دیا۔

خصوصی رپورٹ کے عنوان میں ان ''حضرات'' کو ''پہلی صدی کا بزرگ'' قرار دیا گیا ہے، پھر رپورٹ کی ابتدا ہی میں ان عبداللہ شاہ غازی کو حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی پانچویں پشت میں ''ساداتِ قبیلہ'' کا چشم و چراغ بتایا گیا ہے۔

۱۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ سادات کوئی قبیلہ نہیں، یہ تو احتراماً اہل بیت اور ان کی ذریت کے لیے استعمال ہوتا ہے اور اس کی اصل یہ ہے کہ صحیح حدیث کے مطابق حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی مسجد کے منبر سے سیدنا حسنؓ کو گود میں لے کر فرمایا تھا "ابنی ھذا سید" (میرا یہ بیٹا سید ہے) ایسے ہی الفاظ ایک دوسرے موقع پر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سیدنا حسینؓ کے لیے بھی فرمائے تھے، اس لیے ان دونوں سبط رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اولاد ذریت بھی اس لقب سے سرفراز ہوئی، اور خاص طور پر غیر عرب ممالک میں حسنی و حسینی نسب کے بجائے سید استعمال ہونے لگا۔ جہاں تک قبیلہ کا تعلق ہے تو یہ بنی ہاشم کا قبیلہ کہلاتا ہے۔

۲۔ دوسری بات یہ کہ حضرت علیؓ کی پانچویں پشت میں کسی کا نام عبداللہ شاہ غازی تاریخ میں مذکور نہیں، جن صاحب یعنی محمد النفس الزکیہ (ذ سے ذکیہ غلط لکھا گیا ہے، ان کا نام محمد تھا، نفس زکیہ یعنی پاک نفس، لقب تھا) کو ان کا والد قرار دیا گیا ہے، اس قرینہ سے پتا چلتا ہے کہ مضمون نگار کا مقصد عبداللہ الاشتر سے ہے، جو ان محمد النفس الزکیہ کے فرزند تھے، اور قدیم معتبر عربی تواریخ طبری، ابن اثیر وغیرہ کے مطابق ان کے والد نے عباسی خلیفہ ابوجعفر منصور کے خلاف

☆ کراچی کے علاقے کلفٹن میں ساحل سمندر سے قریب ایک قدیمی مزار میں مدفون بزرگ۔

Marfat.com

اپنی مسلح تحریک یا بغاوت سے کچھ عرصہ ہی قبل ان کو بصرہ اپنے بھائی ابراہیم کے پاس بھیج دیا تھا جہاں سے وہ گھوڑوں کی تجارت کے بہانے سندھ پہنچے جو اس وقت عباسی خلافت کا ایک صوبہ تھا، لیکن یہاں گورنر ایک ایسا شخص تھا جس کو اہل بیت سے محبت تھی، یعنی عمر بن حفص ملقب بہ ''ہزار مرد'' جس نے ان کو خلیفہ کے حکم کے برخلاف گرفتار کر کے بغداد بھیجنے کے بجائے دریائے سندھ کے پار ''کچھ'' کے علاقہ میں ایک ہندو راجہ کے یہاں بھیج دیا، ان کے ساتھ چار سوان کے متبعین بھی تھے۔

لیکن بعد کو ابوجعفر منصور نے جب عمر بن حفص کو معزول کر کے ایک دوسرے گورنر ہشام بن عمرو التغلبی کو بھیجا تو اس نے یا تو راجہ پر چڑھائی کی یا ایک دوسری روایت کے مطابق جب یہ حضرت عبداللہ الاشتر اپنے چند ساتھیوں کے ساتھ دریائے سندھ کے مشرقی کنارے کے قریب شکار کر رہے تھے تو اس نئے گورنر کے فوجیوں کے ساتھ ایک معرکہ میں وہ شہید ہو گئے۔

مگر اس موقع کی مناسبت سے عربی کی مذکورہ مستند تواریخ، تاریخ طبری، و تاریخ ابن کثیر (ابن خلدون کا حوالہ بے کار ہے، وہ بہت بعد کا مورخ ہے اور انہی دونوں مورخین سے نقل کرتا ہے) میں سن ۱۵۱ھ کے احوال میں ہے کہ ان کی شہادت کے بعد عبداللہ الاشتر کے رفقاء نے ان کی لاش کو دریائے سندھ میں بہا دیا تا کہ وہ دشمنوں کے ہاتھ نہ لگ سکے اور ان کا سر کاٹ کر اور ان کو بغداد بھیج کر اس کی بے حرمتی نہ کی جائے۔

ساتھ ہی ان ہی تواریخ میں یہ بھی ہے کہ ان کی شہادت کے بعد ان کی ایک کنیز اور ان کے چھوٹے بچے کو جو اس کنیز کے بطن سے تھا سندھ کے گورنر نے حاصل کر کے ابوجعفر منصور کے پاس بغداد بھیج دیا، اور اس نے ان دونوں کو مدینہ منورہ اس حکم نامہ کے ساتھ بھیج دیا کہ ان کا نسب صحیح ہے اور یہ بچہ یعنی محمد بن عبداللہ الاشتر حسنی سادات میں شمار کیا جائے۔

اس کے بعد تاریخ خاموش ہے، ہاں مشہور علامہ و محقق ابن حزم نے اپنی کتاب جمہرۃ الانساب میں ذکر کیا ہے کہ ان محمد بن عبداللہ الاشتر سے کافی اولاد و احفاد ہوئے اور بغداد میں ایک محلہ ''حی بنی الاشتر'' کے نام سے مشہور تھا جہاں جا کر یہ آباد ہو گئے تھے۔

اب فاروق عادل صاحب نے جس کتاب سے یہ سب کچھ نقل کیا ہے اس نے اس عبداللہ

Marfat.com

الاشتر کو عبداللہ شاہ غازی بنادیا، یہی نہیں بلکہ اس ساحل سمندر پر جو آج کل کلفٹن کہلاتا ہے ان کو دفن بھی کر دیا، حالانکہ کسی عربی تاریخ میں ان عبداللہ الاشتر کی سمندر کے کنارے تدفین کا ذکر نہیں بلکہ وہی ہے، جو ہم نے اوپر لکھا ہے۔

پھر سب سے بڑی بات یہ کہ اس صدی کی ابتدا میں برصغیر کے ایک مایۂ ناز مورخ مولانا سید عبدالحئیؒ حسنی (مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہ کے والد) نے جو خود انہی حضرت عبداللہ الاشتر کی اولاد سے ہیں اپنی ضخیم عربی تاریخ نزہتہ الخواطر (جلد اص ۲۶۔۲۸) میں نہ تو کہیں ان کو عبداللہ شاہ غازی کے نام سے یاد کیا ہے اور نہ یہ لکھا ہے کہ عبداللہ الاشتر فرزند محمد النفس الزکیہ اپنی شہادت کے بعد ساحل سمندر پر دفن کیے گئے بلکہ اسی کو درست مانا ہے جو قدیم عربی تواریخ میں ہے کہ ان کی لاش کو دریائے سندھ میں بہا دیا گیا۔

نہ معلوم فاروق عادل صاحب نے کس تحقیق کی بنا پر لکھا ہے کہ یہ حضرت کراچی میں ساحل سمندر پر دفن ہوئے اور یہی عبداللہ شاہ غازی ہیں۔

۳۔ اس کے بعد انہوں نے یہ بھی تحریر کیا ہے کہ ان کا مزار صدیوں سے مرجع خلائق ہے اور اس اہم انکشاف کے لیے کوئی حوالہ ضروری نہیں سمجھا، جب کہ حقیقت یہ ہے کہ تقریباً تین سو سال تک سندھ میں عربوں کی حکومت قائم رہی یا تو یہ عباسی خلافت کے تحت ایک صوبہ رہا یا پھر بعد کو یہاں منصورہ کے شہر میں (جو محمد بن قاسم کے بیٹے عمرو نے اموی عہد میں آباد کیا تھا) ایک مستقل یا نیم مستقل عرب حکومت رہی، چوتھی صدی ہجری میں سندھ میں متعدد عرب مورخ اور جغرافیہ نویس جیسے مسعودی، اصطخری اور ابن حوقل وغیرہ آئے اور یہاں کے حالات اور شہروں کا تفصیلی ذکر کیا، لیکن کسی نے یہ نہیں لکھا ہے کہ یہاں عبداللہ الاشتر کی قبر بھی ہے، یہ کسی طرح ممکن نہ تھا کہ اگر یہاں عبداللہ الاشتر کی قبر مرجع خلائق ہوتی تو ایسی اہم عرب شخصیت کا وہ ذکر نہیں کرتے۔

اس لیے کلفٹن میں مدفون عبداللہ شاہ غازی بعد کے کوئی اور صاحب ہیں، ان کو محمد النفس الزکیہ کا فرزند کہنا تاریخ کے ساتھ ناانصافی ہے۔

۴۔ ایک اور فاش تاریخی غلطی یہ ہے کہ ان عبداللہ الاشتر (نام نہاد عبداللہ شاہ غازی) فرزند محمد النفس الزکیہ ابن عبداللہ المحض ابن حسن المثنی ابن سیدنا حسنؓ سن ۹۳ھ میں پیدا ہوئے، تو سات سال

Marfat.com

کی عمر میں ان کے کوئی بیٹا کیسے پیدا ہو سکتا ہے، محمد النفس الزکیہ کے ان صاحبزادے یعنی عبداللہ الاشتر کی صحیح تاریخ پیدائش ۱۲۸ھ ہے، وہ سن ۱۴۵ھ میں سندھ پہنچے تھے اور سن ۱۵۱ھ میں شہید ہو گئے۔

۵۔ مضمون میں یہ بھی ہے کہ سندھ میں انہوں نے بڑے پیمانے پر اسلام کی تبلیغ کی، یہ بھی خوش عقیدگی ہے جس کی تاریخ سے کوئی تائید نہیں ہوتی، کیونکہ وہ تو ایک سیاسی پناہ گزیں تھے اور سندھ کے گورنر نے ان پر رحم کھا کر ان کو ''کچھ'' کے علاقہ میں بھیج دیا تھا جو ایک ہندو راجہ کے زیر نگیں تھا۔

جن عربی تواریخ کا ہم نے اوپر حوالہ دیا ہے، ان کے علاوہ مولانا ابوظفر ندوی نے اپنی مشہور کتاب تاریخ سندھ میں بھی یہی کچھ لکھا ہے۔

۶۔ اپنی اسی رپورٹ کی ابتدا میں فاروق عادل صاحب نے یہ بھی لکھا ہے کہ ''سیدنا حاجی ترابی سندھ میں آنے والے قدیم ترین مسلمان بزرگ سمجھے جاتے ہیں، لیکن عبداللہ شاہ غازی ان سے قبل یہاں پہنچے کیونکہ حاجی ترابی کی تاریخ وفات (سال وفات کہنا زیادہ درست تھا) ۱۷۱ھ ہے۔''

یہ بھی ایک نئی شخصیت ہیں، ان کا ذکر کسی معروف تذکرہ میں نہیں ملتا اور اس ضمن میں سب سے مستند کتاب وہی مولانا عبدالحی حسنی صاحب مرحوم کی ''نزہۃ الخواطر'' ہے، جس میں انتہائی تفصیل سے ان سب شخصیات کا ذکر ہے جو محمد بن قاسم الثقفی کے بعد سندھ میں آئیں۔

یوں بھی حاجی ترابی کوئی عربی نام نہیں ہے، نہ معلوم کس نام کو بگاڑ کر حاجی ترابی کر دیا گیا ہے، سندھ میں موضع گھارو کے قریب حاجی ترابی نام کے ایک بزرگ مدفون ہیں، لیکن ان کی وفات لوح مزار کے مطابق ۷۸۱ھ ہے، نہ کی ۱۷۱ھ (بحوالہ، صنادید سندھ تصنیف مولوی محمد شفیع، لاہور) اور یہی درست ہے، اس طرح وہ سندھ میں آنے والے قدیم ترین مسلمان بزرگ نہیں تھے۔ البتہ عربی تواریخ میں ایک محدث الربیع بن صبیح السعدی کا ذکر ملتا ہے، جو عباسی خلیفہ المہدی بن منصور کے زمانہ میں ایک سمندری غزوہ میں دیبل کی طرف آئے تھے، لیکن ان کا جہاز اسی دیبل کے قریب (یعنی کراچی کے سمندر میں) طوفان کی نذر ہو گیا تھا اور وہ بھی ڈوب کر ہلاک ہو گئے تھے۔ یہ سن ۱۶۰ھ کی بات ہے، بعض نے لکھا ہے کہ وہ سندھ میں فوت ہوئے، لیکن پہلی بات زیادہ مستند ہے، یہ حاجی ترابی نہیں ہو سکتے، کیونکہ ان کی تاریخ وفات مضمون نگار نے ۱۷۱ھ بتائی ہے۔

Marfat.com

قارئین کی دلچسپی کے لیے یہ عرض کردوں کی سندھ میں کراچی سے کسی قدر قریب قدیم دیبل (موجود کھنڈرات بھنبھور) میں جو سب سے پہلے عرب غازی شہید ہوئے وہ عبیداللہ بن نبہان اور ان کے بعد بدیل بن طہفہ البجلی (۱) تھے، یہ یکے بعد دیگرے دو مہمات میں دیبل آئے تھے اور دونوں کو شکست ہوئی تھی کیونکہ ان حملوں کی پوری تیاری نہیں کی گئی تھی اور اسلامی فتوحات کی قدیم ترین کتاب یعنی البلاذری کی فتوح البلدان کے مطابق یہ دونوں مجاہدین دیبل میں دفن ہوئے، محمد بن قاسم الثقفی بدیل کے بعد ہی سندھ آیا۔

اب یہ مذکورہ عبداللہ شاہ غازی اور حاجی ترابی سے بہت پہلے کی شخصیات ہیں، لیکن ان کی قبروں کا کوئی پتہ نہیں، کہ مسلمان اس زمانہ میں بزرگ پرست اور قبر پرست نہیں تھے، اسلام کے شیدائی اور مجاہدین تھے، غزنوی فتوحات کے بعد پانچویں صدی ہجری سے جو بزرگ یا علماء برصغیر آئے اور یہاں انہوں نے اسلام کی تبلیغ کی ان کا اور ان کی قبروں کا تاریخ میں ذکر ہے، جیسے سید علی ہجویری (داتا گنج) یا شیخ معین الدین اجمیری وغیرہ۔

ہوسکتا ہے کہ یہ دیبل پر پہلا حملہ کرنے والے تابعی مجاہد عبیداللہ بن نبہان کی قبر ہو، اور بعد کو ان کو عبداللہ کردیا گیا ہو۔

ایک دوسرا احتمال یہ ہے کہ یہ عبداللہ بن عیاش تابعی کی قبر ہو کیونکہ امام ذہبی نے اپنی عظیم ضخیم کتاب ''تاریخ الاسلام ووفیات المشاہیر والاعلام'' میں ان کے ''ہند'' (یعنی سندھ) میں سن ۴۸ھ میں شہید ہونے کا ذکر کیا ہے، اور مختلف عربی تواریخ سے ثابت ہے کہ حضرت علیؓ کے عہد خلافت میں جب ایک مجاہد الحارث بن مرۃ العبدی نے حضرت علیؓ کی اجازت سے مجاہدین کی ایک جماعت کے ساتھ پہلی بار مکران میں فتوحات کا سلسلہ سن ۳۹ھ کے اوائل میں شروع کیا تو ان کو قیقان (گنڈاوا، شمال غربی بلوچستان) میں بڑی کامیابی حاصل ہوئی، ان کو وہاں بہت مال غنیمت اور قیدی ہاتھ آئے، تقریباً تین سال تک وہ اس پر قابض رہے، پھر سن ۴۲ھ میں ایک

۱؎ یہ دونوں مجاہدین جو تابعی ہیں محمد بن قاسم سے ماقبل یعنی سن ۹۲ھ میں دیبل آئے اور شہید ہوئے۔ ان دونوں کا ذکر بلاذری کے سوا کسی تاریخ میں نہیں ملتا اور بلاذری نے سندھ کی فتح کا حال دوسری صدی ہجری کے ایک مشہور وکثیر التصانیف مؤرخ ابوالحسن المدائنی کی کتاب ''فتوح الہند'' سے نقل کیا ہے۔ المدائنی کی وفات سے ۲۲۵ھ ہے اور اس کی کتاب مفقود ہے۔

Marfat.com

دوسرے معرکہ میں وہ اوران کے بہت سے مجاہد ساتھی شہید ہوئے اور قیقان و مکران ان کے ہاتھ سے نکل گیا۔

حضرت معاویہؓ کے عہد میں جب دوبارہ مکران کی فتح کا سلسلہ سن ۴۶ھ میں شروع ہوا، تو پہلے کمانڈر عبداللہ بن سوار العبدی کو ابتدا میں فتح ہوئی، لیکن پھر وہ بھی دوسرے معرکہ میں قیقان (گنڈاوا) میں سن ۴۷ھ میں شہید ہوئے۔ اس کے بعد اس علاقہ کے لیے ایک دوسرے سپہ سالار سنان بن سلمہ بن المحبق الھذلی مقرر ہوئے، جن کے زمانے یعنی ۴۸ھ میں مکران صحیح معنوں میں فتح ہوا، انہی سنان بن سلمہ کو مکران کی گورنری کے زمانے میں دریائے سندھ کے دہانے پر آباد جنگجو قوم ''مید'' پر بھی حملہ کیا گیا، ہمارا خیال ہے کہ اسی حملے میں عبداللہ بن عیاش جو ایک مجاہد صحابی عیاش بن ابی ربیعہ المخزومی کے بیٹے تھے، اور مدینہ منورہ کے باشندے تھے، شہید ہوئے، اور ان کی قبر یہاں دشمن کے علاقہ میں اسی طرح بنادی گئی، جس طرح حضرت ابوایوب انصاریؓ کی قبر قسطنطنیہ کی دیوار کے سائے میں سن ۴۹ھ کے ناکام حملے میں ان کی شہادت کے بعد بنادی گئی تھی اور وہ محفوظ رہی۔ اگرچہ قسطنطنیہ بہت بعد کو فتح ہوا۔

ان عبداللہ بن عیاش کا ذکر صحابہ کرام اور تابعین کے سوانح حیات سے متعلق قدیم ترین کتاب یعنی ابن سعد کی کتاب الطبقات الکبیر کی جلد پنجم کے صفحہ ۲۸ (بیروت ایڈیشن) پر ہے۔ جس میں مذکور ہے کہ ان کے والد اور والدہ دونوں مکہ سے حبشہ ہجرت کر گئے تھے، اور وہیں ان کی پیدائش ہوئی، پھر اپنے والدین کے ساتھ مکہ واپس آ گئے تھے۔ ان کا شمار تابعین کے طبقہ اول میں ہوتا ہے۔ ابن سعد کے بقول انہوں نے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے حدیث بھی روایت کی ہے۔

تاریخ طبری میں بھی ان کا ذکر سن ۳۵ھ کے حوادث اور حضرت عثمانؓ کی شہادت کے ضمن میں آیا ہے، اور ان کی حضرت عثمانؓ سے اس وقت ایک ملاقات کا بھی ذکر ہے، جس دوران باغیوں نے خلیفہ ثالث کو اپنے گھر میں محصور کر رکھا تھا۔

ان کے مزید تفصیلی حالات معلوم نہ ہو سکے، لیکن اگر عظیم مورخ اسلام امام ذہبی کا بیان صحیح ہے، (اور اس میں شک کی کوئی معقول وجہ بھی نہیں) تو عبداللہ بن عیاش وہ پہلے تابعی تھے جو سندھ

Marfat.com

کی سرزمین میں شہید ہوئے، اوران کا پاک خون رنگ لایا، اور ٹھیک ۴۵ سال بعد وہ علاقہ دیبل بھی فتح ہوا جہاں وہ شہید ہوئے تھے، یقیناً آج کا ساحل کلفٹن سوا تیرہ سو سال قبل دیبل کا ہی علاقہ ہوگا جہاں عبداللہ شاہ غازیؒ کے نام سے ان کا مزار ہے۔ بیشک یہ ایک غازی یعنی مجاہد تھے۔

Marfat.com

گجرات کے بزرگ شاہ دولہ اور تاریخ

تکبیر کے شمارہ نمبر ۱۶ مورخہ ۲۰ اپریل ۱۹۹۴ء میں ایک خصوصی رپورٹ یا مضمون شاہ دولہ کا مزار جہاں انسانوں کے بچے چوہے بنائے جاتے ہیں۔ ''نصر اللہ غلزئی صاحب کے قلم سے اشاعت پذیر ہوا ہے۔''

اس میں صاحب مضمون نے ایک گھناؤنے اور مجرمانہ عمل کی، جو اس مزار پر ہوتا ہے، بڑی محنت سے نشان دہی کی ہے اور اس کی تفاصیل بتائی ہیں، انتہائی افسوس کی بات ہے کہ ایک بزرگ کے مزار پر اس طرح کی ایذا رسانی کو ایک تجارتی کاروبار بنالیا جائے، حکومت کا کام ہے کہ ایسے گھناؤنے اور مجرمانہ اعمال سے اس مزار کو پاک کرے۔ خاص طور پر اب جب کہ یہ ایوب خان کے عہد سے وزارت اوقاف کے تحت ہے اس لیے اہالی گجرات اور اس کے علماء و مشائخ کا فرض ہے کہ وہ اس سلسلہ میں حکومت سے تعاون کریں۔

حقیقت یہ ہے کہ ضعیف الاعتقادی اور خرافات پرستی بزرگوں کے مزارات پر اس قسم کی غلط کاریوں کو جنم دیتی ہے، اور اسلام تو ایک ایسا دین ہے جس نے ایک محکم اور زندہ عقیدۂ توحید کی بہت شدت سے دعوت دی ہے اور خرافات پسندی کی انتہائی مذمت اور اس کی بیخ کنی کی ہے، لیکن افسوس کی بات ہے کہ ایک طرف عوام الناس کی جہالت اور دوسری طرف بعض مجاورین قبور کی دنیا پرستی کی وجہ سے ایسی خرافات پسندیوں کو فروغ ملتا رہا ہے۔

بہرحال ہم مضمون نگار یا رپورٹر صاحب کی اس کاوش کے تو بہت قدردان ہیں جو انہوں نے انسانی بچوں کے چوہے بنانے کے گھناؤنے عمل کی نشان دہی کے سلسلہ میں کی ہے لیکن انہوں نے شاہ دولہ کی شخصیت پر تاریخ کے حوالے سے جو کچھ لکھا ہے، افسوس کہ وہ اپنے اندر بڑا تضاد رکھتا ہے اور تاریخی حیثیت سے محل نظر اور انتہائی مشکوک ہے۔ نہ معلوم اس ضمن میں ان کے مآخذ کیا ہیں، علمی نقطۂ نظر سے اتنا کہنا کافی نہیں ہے کہ ''تازہ ترین تحقیق میں بتایا گیا ہے'' یا

Marfat.com

"محققین کا یہ بیان" ہے، آخر یہ اصحاب تحقیق کون ہیں؟ ان کا کیا علمی مقام ہے؟ خود ان کے اپنے مآخذ کیا ہیں؟ کیا یہ اس مزار کے سجادہ نشین تو نہیں؟ یا شاہ دولہ کے معتقدین تو نہیں؟

بہر حال شاہ دولہ کی شخصیت، نسب اور شاہان وقت سے ان کے تعلق، ان کے علمی مقام اور انجینئرنگ میں مہارت وغیرہ سے متعلق، مضمون کی ابتدا میں جو معلومات ہیں، ان سب کے بارے میں، ذہن میں بڑے سوالات پیدا ہوتے ہیں اور مستند و متداول صوفیاء و علماء کے تذکروں اور متعلقہ تاریخی کتب سے ان معلومات کی تصدیق نہیں ہوتی، بلکہ ان میں بہت سی باتیں بے سروپا معلوم ہوتی ہیں۔ علمی غیرت اور قارئین کے خیال سے ہم نے ان پہلوؤں پر روشنی ڈالنا ضروری سمجھا۔

ا۔ اردو زبان میں صوفیاء کے تذکروں کی کوئی کمی نہیں، علماء کے تذکرے بھی ہیں اگرچہ کم لیکن ان میں جو مشہور و متداول تذکرے عربی، فارسی اور اردو میں ہیں، ان میں کہیں شاہ دولہ کا ذکر نہیں، مضمون میں شاہ دولہ کو جس درجہ کا صوفی، عالم اور ماہر تعمیرات بتایا گیا ہے اس کا تو تقاضا تھا کہ یہ تذکرے ان کے ذکر سے خالی نہ ہوتے۔ ان میں سرفہرست شہزادہ دارالشکوہ کا تذکرہ صوفیاء، "سفینۃ الاولیاء" ہے، دارالشکوہ خود صوفی المشرب اور شاہ دولہ کا معاصر ہے۔ مگر یہ کتاب جس میں شاہ دولہ سے کمتر درجہ کے بیسیوں صوفیائے ہند کا ذکر ہے ان کے سوانح سے خالی ہے۔ مضمون میں بتایا گیا ہے کہ شاہ دولہ کی ملاقات جہانگیر و شاہ جہاں سے ہوئی تھی۔ اس درجہ کے صوفی کا ذکر شاہ جہاں کا بیٹا دارالشکوہ نہ کرے یہ قرین قیاس نہیں۔

فارسی میں مولوی رحمان علی کا تذکرہ علمائے ہند" جو انیسویں صدی کے آخری عشرے میں طبع ہوا اور جس کو مرحوم محمد ایوب قادری نے اسی نام سے ترجمہ کیا، اور جو پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی کراچی کی طرف سے شائع ہوا ہے اس میں بھی ان شاہ دولہ کا کوئی ذکر نہیں، یاد رہے کہ مضمون میں ان کو ایک عالم اور مصنف بھی بتایا گیا ہے جنہوں نے عربی میں ایک کتاب تصنیف کی، اگر وہ اس درجہ کے عالم ہوتے کہ عربی زبان میں کتاب تصنیف کر سکتے تو یہ تذکرہ ان کے ذکر سے خالی نہ ہوتا۔

پھر عربی زبان میں مولانا سید عبدالحیی حسنی (والد مولانا سید ابوالحسن علی ندوی) مصنف گل

Marfat.com

رعنا کی جو ضخیم کتاب ۸ جلدوں میں علماء، صوفیاء، سلاطین، وزراء، فلاسفہ وغیرہ کی سوانح عمریوں پر مشتمل ''نزھۃ الخواطر'' کے نام سے ہے، اس میں کہیں ان شاہ دولہ کا ذکر نہیں، جب کہ اسی کتاب میں بہت سی ایسی شخصیات کا ذکر ہے، جو زیر نظر مضمون میں بیان کردہ شاہ دولہ کے مقام سے کہیں کمتر درجہ کی تھیں۔

اس سب کے پیش نظر گمان ہوتا ہے کہ مذکورہ بالا مضمون یا خصوصی رپورٹ میں شاہ دولہ کے ذکر میں بہت مبالغہ سے کام لیا گیا ہے۔

۲۔ پھر سب سے اہم بات یہ کہ اس مضمون میں شاہ دولہ کے جہانگیر، شاہ جہاں اور اورنگزیب تین انتہائی مشہور مغلیہ بادشاہوں سے ملنے کا تذکرہ ہے، ان تینوں بادشاہوں کے عہود کی مفصل اور مستند سرکاری تواریخ ہیں اور جہانگیر نے تو خود اپنی سوانح عمری بلکہ روزنامچہ ''تزک جہانگیری'' کے نام سے لکھا ہے، جو فارسی میں مطبوع ہے اور اس کا انگریزی ترجمہ بھی۔ اس نے کہیں یہ نہیں لکھا ہے کہ شاہدرہ میں ہرن کے شکار کے موقع پر ایک ایسے ہرن کو دیکھا کہ جس کے سینگوں پر (مضمون میں سر ہے) آہنی کلاہ تھی اور یہ سن کر کہ وہ شاہ دولہ کا ہرن ہے اس نے ان بزرگ کو اپنے پاس شاہدرہ بلایا اور ان کی ملاقات نہ صرف جہانگیر بلکہ نور جہاں سے بھی ہوئی۔

جہانگیر نے تزک جہانگیری میں کافی تفصیل سے اپنی مختلف شکاری مہمات کا ذکر کیا ہے، لیکن نہ تو اس میں کہیں ایسے ہرن کے شکار کا ذکر ہے، نہ شاہدرہ میں شکار کا، اور نہ شاہ دولہ سے ملاقات کا مطلقاً کوئی ذکر ہے، نہ معلوم یہ روایت کس نے اور کب گھڑی ہے؟

۳۔ جہاں تک شاہ جہاں سے ان بزرگ شاہ دولہ کی ملاقات کا مسئلہ ہے تو اس مغلیہ شہنشاہ کے عہد کی مختلف تواریخ ہیں، ان میں ایک کافی مفصل معاصر مورخ صالح کنبوہ کی تاریخ ''عمل صالح'' معروف بہ ''شاہ جہاں نامہ'' ہے اس کے آخر میں شاہ جہاں کے عہد کے بزرگوں اور علماء وغیرہ کے حالات بھی ہیں۔ اس تاریخ میں بھی شاہ دولہ کا کہیں ذکر نہیں، فارسی کی اس تاریخ کا اردو ترجمہ ڈاکٹر ناظر حسن زیدی کے قلم سے دو جلدوں میں موجود ہے۔

اور دلچسپ بات یہ ہے کہ مضمون میں تحریر کیا گیا ہے کہ شاہ جہاں جب دہلی سے کشمیر جارہا تھا تو نالہ ڈیک میں طغیانی کی وجہ سے اس پر پل بنانا بے حد دشوار ہوا۔ حکام کو بتایا گیا کہ شاہ دولہ

Marfat.com

ہی یہ پل تعمیر کر سکتے ہیں اور واقعی "انھوں نے تمام انسانی و غیر انسانی رکاوٹوں کو دور کر کے یہ پل تعمیر کرایا۔"

اگر شاہ دولہ ایک صوفی بزرگ ہونے کے علاوہ اس درجہ کے ماہر تعمیرات بھی تھے تو کیا یہ تصور کیا جا سکتا ہے کہ شاہ جہاں کا سرکاری مورخ اس بات کا ذکر نہ کرتا۔ ڈاکٹر محمد عبداللہ چغتائی انھوں نے اپنی کتاب "تاج محل" میں شاہ جہاں کے عہد کے مختلف ماہرین تعمیرات کا ذکر کیا ہے، اس میں بھی ان شاہ دولہ کا ذکر نہیں۔

۴۔ تیسرے بادشاہ اورنگزیب کے حوالے سے مضمون میں کہا گیا ہے کہ "شاہ جہاں کے آخری ایام میں اورنگزیب کا ادھر (یعنی پنجاب) سے گزر ہوا تو یہ جاننے کے لیے کہ برصغیر کا نیا بادشاہ کون ہوگا؟ وہ شاہ دولہ کی خدمت میں حاضر ہوئے، جس پر شاہ دولہ نے ان کو بادشاہت کی مبارک باد دی اور پھر اورنگزیب برصغیر ہند کا بادشاہ بن گیا۔"

اب یہ ایک ایسا اہم واقعہ ہے کہ اگر واقعی یہ ظہور پذیر ہوا ہوتا تو اورنگزیب کا سرکاری مورخ مستعد خان ساقی "مآثر عالمگیری" میں اس کا ذکر ضرور کرتا۔ لیکن عہد عالمگیری کی یہ تاریخ بھی شاہ دولہ کے ذکر سے خالی ہے۔ تو پھر آخر یہ واقعہ کہاں سے لیا گیا ہے؟ یا یہ محض افسانہ طرازی ہے؟

۵۔ حقیقت یہ ہے کہ جیسا کہ ہم نے ذکر کیا صوفیاء و علماء کے تذکرے اور معاصر کتب تواریخ جن کا تعلق براہ راست ان مذکورہ تین بادشاہوں سے ہے، شاہ دولہ کے ذکر سے خالی ہیں۔ عالمگیری عہد میں تحریر شدہ ایک غیر سرکاری تاریخ جو بٹالہ کے ایک ہندو مورخ سبحان رائے کے قلم سے ہے یعنی "خلاصۃ التواریخ" صرف اس میں شاہ دولہ کا ذکر ضمناً گجرات (پنجاب) کے ذکر میں کیا گیا ہے (اردو ترجمہ خلاصۃ التواریخ بقلم ڈاکٹر ناظر حسن زیدی، ص ۱۱۶)

سبحان رائے نے شاہ دولہ کے متعلق دو پیراگرافس میں جو کچھ لکھا ہے اس کا ذکر ہم بعد میں کریں گے، لیکن اس نے کہیں اشارتاً بھی جہانگیر، شاہ جہاں اور عالمگیر سے ان بزرگ کی ملاقات کا ذکر نہیں کیا، اور نہ اس مخصوص ہرن کا ذکر کیا ہے جس کے سر پر شاہ دولہ نے آہنی خول چڑھا رکھا تھا، اور جس کی بنا پر بعد میں ان کے مزار پر انسانی چوہے بنانے کا گھناؤنا کاروبار کیا گیا۔

۶۔ اس مضمون کے داخلی تضاد کا عالم یہ ہے کہ مضمون کی ابتدا ہی میں یہ جملہ شاہ دولہ کے ذکر

Marfat.com

میں ہے کہ وہ ''ایک بڑے نیک بزرگ ہوگزرے ہیں'' پھراسی صفحہ ۳۳ پر کالم ۳ میں ہے۔'' شاہ دولہ کا تصوف میں کیا مقام ہے، اس بارے میں کوئی واضح بات سامنے نہیں آئی۔'' جب تصوف میں ان کے مقام کا کوئی پتہ نہیں تو وہ ایک بڑے نیک بزرگ کس طرح ہوگئے؟ ایسے نیک بزرگ تو ہمارے آگے پیچھے بہت ہوتے ہیں، لیکن جس طرح کا مزار ان شاہ دولہ کا ہے، وہ تو بڑے صوفیاء ہی کا ہوسکتا ہے۔

۷۔ ان کے خاندان اور نسب کے بارے میں بھی مضمون میں متضاد باتیں ہیں۔

ا۔ وہ برصغیر کے حکمراں لودھی خاندان سے تھے۔

۲۔ وہ گجرات کے گوجر خاندان سے تھے۔

۳۔ تازہ ترین تحقیق یہ ہے کہ وہ ''اصلاً ونسلاً سید تھے۔'' (یہ تازہ ترین تحقیق کن صاحب کی اور کن مآخذ کی بنیاد پر ہے اس کا کوئی ذکر مضمون میں نہیں)۔ صاحب مضمون کی بیان کردہ اس آخری روایت سے جسے تحقیق کے نام سے پیش کیا گیا ہے۔ یہی مترشح ہوتا ہے کہ وہ اس کو صحیح سمجھتے ہیں۔ شاید ہی کسی مشہور صاحب مزار بزرگ کے خاندان کے بارے میں ایسا اختلاف دیکھنے میں آئے جو شاہ دولہ کے بارے میں غلزئی صاحب نے بیان کیا ہے اور ان کو ہندو گوجر سے ایک دم ''سید'' بنا دیا گیا ہے۔

اس ذیل میں شاہ دولہ کا معاصر پنجابی مورخ سبحان رائے کچھ اور ہی کہتا ہے، اس کا بیان ہے کہ ''شاہ دولہ نوجوانی میں کھمابدھرہ سیالکوٹی کے غلام تھے، فقراء سے بالخصوص حضرت میاں سید باہ سے بڑی ارادت تھی، مدتوں ان کی خدمت کرتے رہے، جب میاں سید باہ کی رحلت کا وقت آیا تو شاہ دولہ پر نظر کیمیا ڈالی، اسی وقت ہی ان پر عجیب کیفیت طاری ہوئی، شبستان ضمیر نور معرفت سے جگمگا اٹھا، تب یہ سیالکوٹ سے نکل گجرات پہنچے۔''

اب اس معاصر مورخ کے بیان کا مقابلہ آپ ان تفصیلات سے کریں جو مضمون نگار صاحب نے شاہ دولہ کے بچپن و جوانی کے حالات میں پیش کی ہیں، تو آپ کو واضح فرق نظر آئے گا، بلکہ اس میں یہ بے سر وپا روایت بھی نظر آئے گی کہ انہوں نے نو سال کی عمر میں اپنی ماں کے انتقال کے بعد سیالکوٹ جا کر ایک ہندو مہتہ کی ملازمت اختیار کر لی، جہاں ان کو اس نے اپنے

Marfat.com

توشہ خانے کا انتظام سپرد کر دیا اور اس بچہ یا نوجوان نے اپنی فیاضی سے کام لیتے ہوئے اس کا سارا توشہ خانہ ہی خیرات کر دیا، مہتہ نے ان پر چوری کا الزام لگا کر انہیں قید کر دیا، پھر ان کے اس بیان کی بناء پر کہ "اگر ان کو توشہ خانہ لے جایا گیا تو وہ چھپا ہوا مال نکال دیں گے" ان کو توشہ خانہ لے جایا گیا، جہاں انہوں نے ایک غلام سے خنجر لے کر اپنے پیٹ میں گھونپ لیا، پھر ان کا علاج کرایا گیا، وہ تین ماہ بعد درست ہو گئے، ان کو آزاد کر دیا گیا۔

اس روایت کے خوش عقیدہ لیکن احمق مصنف نے یہ بھی نہیں سوچا کہ شاہ دولہ آخر ایک غیر انسان کے سارے مال (توشہ خانہ) کو خیرات کر دینے کا کیا حق رکھتے تھے؟ یہ کہاں کی فیاضی ہے؟ یہ تو امانت میں خیانت ہے۔ پھر جب خیانت نہیں ہے، تو وہ اپنے پیٹ میں چھرا کیوں گھونپتے ہیں؟ پھر انہوں نے جھوٹ بھی بولا کہ وہ توشہ خانہ میں جا کر مال برآمد کر دیں گے، جہاں کوئی مال نہ تھا اور افسوس کی بات ہے کہ غلزئی صاحب اس بے سروپا روایت کو تکبیر کے موقر قارئین کے لیے پیش کر رہے، جو سب کے سب صوفی نہیں، بلکہ اکثر صاحب علم و دانش روشن خیال لوگ ہیں۔

پھر یہ بھی کم ہی سننے میں آیا ہے کہ کوئی سید زادہ کسی ہندو بنئے کا غلام رہا ہو۔ اس لیے سجان رائے اور دوسری روایت کے پیش نظر یہی بات صحیح معلوم ہوتی ہے کہ وہ سیالکوٹ کے کسی گوجر خاندان سے تھے اور وہاں ایک سید بزرگ میاں سید باہ (مضمون میں ان کا نام شاہ سیدن سرمست لکھا ہے) کے مرید ہو گئے، اور ان بزرگ کی رحلت کے وقت ان کی "نظر کیمیا" کی بدولت ہی شاہ دولہ کو "معرفت" نصیب ہوئی۔ ہمارے خیال میں اس سید بزرگ سے تعلق کی بنا پر ہی بعد کو شاہ دولہ کے معتقدین نے ان کو سید بنا دیا۔

اب پھر مضمون کی باقی تفصیلات جو شاہ دولہ کے ان بزرگ سے تعلق کے بارے میں ہیں، ان کا مقابلہ آپ سجان رائے کے بیان سے کریں تو آپ کو نظر آئے گا کہ وہ یہ نہیں کہتا ہے کہ شاہ دولہ کے یہ پیر ان سے بھیک منگوایا کرتے تھے۔ جیسا کہ مضمون میں ہے کہ "شاہ دولہ جو بھیک مانگ کر لاتے وہ اپنے (ان) پیر کے سامنے رکھ دیتے، کچھ وہ کھا لیتے، باقی منگو (ایک دوسرا مرید) کو دے دیتے، جو بچتا شاہ دولہ کے حصہ میں آتا۔"

یہ کیا پیری اور بزرگی ہے کہ اپنے مرید سے بھیک منگوا رہے ہیں، خود بھی بھیک کھا رہے ہیں

Marfat.com

اور اپنے دونوں مریدوں کو بھی کھلا رہے ہیں۔ بھیک کو تو اسلام نے بہت بری بات کہا ہے، پھر یہی اس توکل کے بھی خلاف ہے جو صوفیوں اور بزرگوں کا اہم سرمایہ حیات ہوتا ہے۔ پھر سید لوگوں پر تو صدقہ حرام ہوتا ہے، یہ تو معاذ اللہ آج کل کے کوئی بازاری فقیر معلوم ہوتے ہیں، یا فقیروں کے ٹھیکیدار جو بچوں اور مجبور نوجوانوں سے بھیک منگوا کر حرام کھاتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اس تمام روایت کا مصنف کوئی بڑا ہی گاؤں معتقد معلوم ہوتا ہے، جس کو صحیح طور پر اپنے پیر کو اڑانے کا سلیقہ بھی نہیں (پیراں نمی پرند مریداں می پرانند)۔

یہی حال اس روایت کے باقی حصہ کا ہے جو شاہ دولہ کی جوانی اور ان کی بزرگی کے اظہار کے متعلق ہے، لغو، بے بنیاد اور سادہ لوحی کا شاہکار۔

۸۔ نصر اللہ غلزئی صاحب نے یہ بھی فرمایا ہے کہ "نیز وہ ایک بہت بڑے عالم دین بھی تھے۔" ان حقائق کے پیش نظر جو خود مضمون نگار صاحب نے شاہ دولہ کے بچپن و جوانی میں ایک ہندو کی غلامی، گداگری اور پھر ایک قلعہ کی تعمیر کے دوران چار ٹکے روز کی مزدوری کے بارے میں بیان کیے ہیں یہ بھی ایک عجیب وغریب انکشاف ہے۔ جب ان کا بچپن اور جوانی اس طرح گزری تو علم دین انہوں نے کب، کس طرح اور کس سے حاصل کیا؟ انہوں نے ان سوالات کی طرف توجہ ہی نہ کی، بس کسی معتقد یا مجاور کی کتاب میں یہ لکھا ہوا مل گیا اور اس کو نقل کر دیا۔ اسی لیے کہا گیا ہے "پیراں نمی پرند مریداں می پرانند" (پیر تو آسمانوں میں نہیں اڑتے ہیں، لیکن ان کے مرید مبالغہ آرائی سے ان کو اڑاتے ہیں)۔

معاصر مورخ سجان رائے اس بارے میں خاموش ہے، وہ ان کی بزرگی اور فلاح و بہبود کے کاموں کی بہت تعریف کرتا ہے، ان کو "زبدۃ الاولیاء" (ایک مبالغہ) کہتا اور ان کے مزار کو "زیارت گاہ خاص وعام" قرار دیتا ہے۔ (خلاصہ التواریخ، اردو ترجمہ ص ۱۱۷) اس لیے یہ بات سراسر غلط ہے کہ وہ کوئی بہت بڑے عالم دین اور ایک عربی کتاب کے مصنف تھے، غلزئی صاحب نے یہ نہیں بتایا کہ اس عربی کتاب کا نام کیا تھا، یا وہ کس موضوع پر تھی؟

۹۔ جہاں تک شاہ دولہ کے فلاح و بہبود کے کاموں کا تعلق ہے، یہ بات درست ہے، کم از کم مورخ سجان رائے مصنف خلاصہ التواریخ کے بیان سے اس کی تائید ہوتی ہے۔ لیکن اس ضمن

Marfat.com

میں بھی مضمون میں ان کو ایک ماہر تعمیر انجینئر کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ غلزئی صاحب کے بقول ''وہ قدرتی طور پر تعمیرات بالخصوص پل تعمیر کرنے کے ماہر تھے۔'' اور انہوں نے شاہجہاں کے لیے نالہ ڈیک، پر ایک ایسا پل بنایا جو کوئی دوسرا انسان تعمیر نہیں کر سکتا تھا۔

''اسی طرح سے بند اور پل اور بعض دیگر عمارتیں مساجد اور کنویں وغیرہ سیالکوٹ اور گجرات کے درمیان شاہ دولہ کے نام سے موسوم ہیں۔''

خلاصہ التواریخ کے معاصر مصنف نے بھی یہی کہا ہے، لیکن ایک اہم اختلاف کے ساتھ اور کسی قدر مؤرخانہ تفصیل کے ساتھ۔ اختلاف یہ کہ اس نے خود شاہ دولہ کو ماہر تعمیرات نہیں کہا ہے، نہ یہ کہ انہوں نے خود کوئی پل بنایا، بلکہ یہ کہا ہے کہ انہوں نے گجرات میں دریائے چناب پر مضبوط پل (Dam) بنوا دیا، تاکہ اس دریا کے سیلاب سے اس قصبہ کو جو ضرر پہنچتا تھا اس سے یہ محفوظ رہے، ڈیگ نالہ کے پل کی تعمیر کی مناسبت سے بھی اس نے یہی لکھا ہے کہ ''ایمن آباد سے پانچ کوس لاہور کی جانب شاہراہ پر ایسا مضبوط پل بنوا دیا جو بادشاہ اور امیر بھی نہیں بنوا سکتے'' (ص ۱۱۷) اس نے شاہ دولہ جا بجا مسجدیں، کنویں، پل اور تالاب بنانے کا بھی ذکر کیا ہے اور یہ سب اس پیسہ سے جو نقد و جنس کی صورت میں ان کو نذرانہ کے طور پر ملتا تھا، ساتھ یہ کہ وہ داد و دہش میں بڑے فیاض تھے اور یہی ان کی مقبولیت کا سبب تھا۔

۱۰۔ غلزئی صاحب نے ''شاہ دولہ کے چوہوں'' کی مناسبت سے لکھا ہے۔ ''شاہ دولہ کی زندگی میں ان کی خانقاہ پر چوہوں کی موجودگی کا ٹھوس ثبوت نہیں ملتا۔''

ہمارا کہنا ہے کہ ٹھوس ثبوت تو کیا سرے سے کوئی ثبوت ہی نہیں ہے، ورنہ ان کا مذکورالصدر معاصر مورخ جس کے سامنے شاہ دولہ کی وفات سن ۱۷ جلوس عالمگیری یعنی ۱۰۸۴ھ (۱۶۷۴ء) میں ہوئی اور جو اس کے بعد تیس سال زندہ رہا، وہ ضرور ان نام نہاد چوہوں کا ذکر کرتا، یہ سب بعد کے لالچی مجاوروں کی حرکت معلوم ہوتی ہے اور جس کا ذکر غلزئی صاحب کے حوالے کے مطابق کیپٹن ایلیٹ نے سو برس قبل ''کرانیکل آف گجرات'' میں کیا ہے۔ انتہائی ضروری بات یہ ہے کہ گجرات کے جن محقق کے پاس اس کرانیکل کا نسخہ محفوظ ہے، اس کا ترجمہ کر کے تکبیر اور دوسرے اخبارات و رسائل میں شائع کیا جائے، تاکہ حقیقت حال لوگوں کے سامنے آسکے۔

Marfat.com

ایک اہم قابل ذکر بات یہ ہے کہ مضمون میں شاہ دولہ کی تاریخ وفات مذکور نہیں، جب کہ خلاصہ التواریخ کے دقیقہ رس مصنف سجان رائے نے ان کی تاریخ وفات بھی دی ہے جو ہم نے اوپر ذکر کی۔ امید کہ قارئین کے سامنے اب شاہ دولہ کی صحیح شخصیت آ گئی ہوگی۔ گیارھویں صدی ہجری کے ان بزرگ کا اصل کارنامہ آپ کے رفاہ عام کے کام ہیں۔

آخر میں عرض ہے کہ صحافی حضرات کو علمی و تاریخی موضوعات پر لکھتے ہوئے بڑے احتیاط کی ضرورت ہے، ان کا فرض ہے کہ وہ قارئین کے سامنے غلط معلومات کا انبار لگا کر نا دانستہ طور پر ان کو گمراہ نہ کریں "وفوق کل ذی علم علیم" (القرآن)(ا)

ا۔ یہ مضمون مئی ۹۴ء میں تکبیر کو بھیجا گیا تھا، لیکن افسوس کہ انہوں نے وعدہ کے باوجود اپنے مستقل رپورٹر نصر اللہ غلزئی کے خیال سے شائع نہیں کیا۔

Marfat.com

ٹیپو سلطان شہید حریت وشوکت کا علمبردار

اٹھارھویں صدی عیسوی کا نصف ثانی مسلمانان برصغیر کے لیے ایک بڑا نازک اور المناک دور تھا اورنگ زیب عالم گیر کی ناخلف اولاد کی آپس کی چپقلش، جنگ وجدال اور تعیش پسندی کے سبب برصغیر میں مسلمانوں کی ہوا اکھڑ رہی تھی۔ ان کی خارجی دشمن یعنی ایسٹ انڈیا کمپنی اور داخلی دشمن مرہٹوں نے اس بگڑتی ہوئی صورت حال سے پورا پورا فائدہ اٹھانا شروع کر دیا تھا۔ وہ ان خاندانی جھگڑوں اور خود غرض صوبیداروں کی بغاوتوں میں ایک فریق سے دوسرے فریق کے خلاف مدد کے بہانے اپنا اقتدار و تسلط مضبوط کر رہے تھے۔ ۱۷۵۷ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی یعنی انگریزوں نے بنگال کے بعض غداروں کی مدد سے مشہور جنگ پلاسی میں دہلی کے مغلیہ شہنشاہ پر فتح حاصل کر کے دیوانی یا حصول مال گزاری کے نام سے عملاً پورے بنگال پر قبضہ جما لیا تھا۔ مرہٹہ متعدد بار دہلی کی طرف مارچ کر چکے تھے اور افغانستان سے اگر احمد شاہ ابدالی ۱۷۶۱ء میں دہلی کی مدد کو نہ آتا تو قریب تھا کہ مرہٹہ اس پر پوری طرح قبضہ کر لیتے۔

برصغیر کے مسلمانوں کے اس انتشار و افتراق اور نامساعد و اندوہ گیں حالات میں روشنی کی ایک کرن جنوبی ہند میں مملکت خداداد میسور تھی، جس کو ایک بلند حوصلہ عالی ہمت اور جفاکش وجاں باز حکمران حیدر علی نے برصغیر کی ایک انتہائی خوددار اور طاقتور ریاست بنا دیا تھا۔ یہ حدود مدراس سے لے کر ساحل مالا بار تک پھیلی ہوئی تھی اور شمال میں اس کی سرحدیں ایک طرف مملکت حیدر آباد اور دوسری طرف شمال مغرب میں مرہٹوں کی طاقتور مملکت سے ملتی تھیں۔

اس مملکت خداداد میسور کے بانی حیدر علی کے گھر میں ۱۷۵۱ء میں ایک بیٹا پیدا ہوا جس کا نام ایک بزرگ ٹیپو مستان کے نام پر ٹیپو رکھا گیا جو بعد کو ٹیپو سلطان کے نام سے مشہور ہو کر برصغیر کے مسلمانوں کی آنکھوں کا تارا بنا۔ یہاں یہ بات دلچسپی سے خالی نہ ہوگی کہ ٹیپو سلطان کے آباؤ اجداد جو دراصل بزرگ و مشائخ تھے، پنجاب سے ہجرت کر کے جنوبی ہند میں پہنچے تھے۔ ٹیپو

Marfat.com

کے پرداداکے والد شیخ ولی محمد گلبر گہ آئے تھے اور پھران کی اولاد بیجا پور منتقل ہوگئی تھی۔ ان کا یہاں بڑا احترام تھا۔ ٹیپو سلطان کے دادا فتح محمد بعد کو کرناٹک میں فوجی ملازمت سے منسلک ہو گئے اور اس طرح پاکستان کے پنجاب کا یہ خاندان مشیخت وتصوف سے سیاست وعسکریت کی طرف مائل ہو گیا اور حیدرعلی ولد فتح محمد میسور کی اسلامی مملکت قائم کرنے میں کامیاب ہوا۔

حیدرعلی نے اپنے بیٹے ٹیپو کی بہت اعلیٰ دینی، علمی اور عسکری تربیت کی تھی، وہ بچپن ہی سے اپنے تاریخ ساز والد کے ساتھ مختلف معرکوں میں شریک ہوتا تھا اور اس طرح سے بہادری و جانبازی کے جوہر اس میں بچپن ہی سے کوٹ کوٹ کر بھر دیئے گئے تھے۔ سولہ سترہ سال کی عمر میں اس نے تنہا ایک معرکہ کی کمانڈ کی ۱۷۶۹ء کی پہلی جنگ میسور میں وہ اپنے والد کے ساتھ شریک تھا۔ باپ بیٹے نے انگریزوں کے اس حملہ کو پسپا کر کے ان کو شہر مدراس کی فصیل تک دھکیل دیا تھا۔ مدراس سے ملحقہ ریاست ارکاٹ کو فتح کیا تھا اور انگریزوں کو پہلی بار ایک مسلمان طاقت یعنی مملکت میسور سے طلب صلح کے لیے مجبور کر دیا تھا۔

۷ دسمبر ۱۷۸۲ء کو اپنے والد کی وفات کے بعد ٹیپو اس کا جانشین ہوا۔ وہ اس وقت جنوبی مالابار میں ہندو سرداروں کی ایک بغاوت کو کچلنے گیا ہوا تھا، پایہ تخت سرنگا پٹم میں کچھ غدار سردار اس کے خلاف ہو گئے تھے اور وہ ٹیپو کے چھوٹے بھائی کو حکمران بنانا چاہتے تھے انگریزوں نے مدراس سے نکل کر ٹیپو سلطان کا راستہ روکنا چاہا مگر اس نے دریائے کاویری کے کنارے دو معرکوں میں ان کو شکست دی اور ۲۶ دسمبر ۱۷۸۲ء کو سرنگا پٹم پہنچ کر حکومت کی باگ ڈور سنبھالی۔ اس طرح اس کے دور حکومت کا آغاز فتنہ پروری، سازشوں اور ان کے خلاف اپنوں اور غیروں کی معرکہ آرائی سے ہوا لیکن اس نے اپنے اولوالعزمی، شجاعت، عالی ہمتی اور تدبر سے تمام بغاوتوں کو فرو کیا اور انگریزوں کو جو اس کی حکومت کے درپے تھے، متعدد معرکوں میں شرمناک شکست دی۔

اس عظیم مجاہد کا سترہ سالہ دور حکومت مجاہدانہ زندگی کی ایک طویل داستان ہے جس کا ذکر ایک کالم تو کیا متعدد کالموں میں بھی ممکن نہیں۔ اس کے لیے اس کے معاصر مورخ میر حسین علی کرمانی کی فارسی کتاب نشان حیدری کا مطالعہ کرنا چاہیے جو حیدرعلی اور ٹیپو سلطان کی زندگی اور کارناموں پر ایک مفصل اور مستند کتاب ہے۔ اس کا ترجمہ اردو میں بھی ہو چکا ہے۔

Marfat.com

ٹیپو سلطان صرف انگریزوں سے ہی نہیں بلکہ دوسرے دو پڑوسی دشمنوں سے بھی دوچار تھا، یعنی مرہٹہ اور نظام حیدر آباد۔ اس طرح اس کا مقابلہ بیک وقت تین دشمنوں سے تھا۔ برصغیر اور خاص طور پر جنوبی ہند کی تاریخ کا یہ المیہ تھا کہ جن دو ملکی طاقتوں کو ایک غیر ملکی غاصب طاقت کے ہندوستان سے بے دخل کرنے کے لیے ایک مرد مجاہد کا ساتھ دینا چاہیے تھا وہی اس سامراجی اور صلیبی غیر ملکی دشمن کا ساتھ دے رہی تھیں۔ رقابت وحسد کی آگ نے ان کو اندھا کر دیا تھا اور وہ یہ نہیں دیکھ پا رہے تھے کہ ٹیپو سلطان سے نمٹنے کے بعد انگریز ان کا کیا حشر بنائیں گے اور ان کی بقاء انگریزوں کی غلامی پر ہی منتج ہوگی۔

اسلام کے اس عظیم مجاہد نے ۱۷۶۹ء، ۱۷۸۳ء، ۱۷۸۵ء اور ۱۷۹۰ء میں انگریزوں کو چار بار شکست فاش دی، ۱۷۸۵ء میں اس نے انگریزوں، مرہٹوں اور نظام کے مشترکہ حملے کو پسپا کر کے ان کو شکست سے دوچار کیا تھا۔ اس کے علاوہ سلطان نے اپنے اور اپنے والد کے دور میں مرہٹوں کے چھ حملوں کو پسپا کیا تھا۔ یہ ایسے غیر معمولی کارنامے تھے جن کی نظیر ہم کو اس وقت کی برصغیر کی تاریخ میں نہیں ملتی۔

۱۷۹۰ء میں ٹیپو نے نئے گورنر جنرل کارنوالس کے کمانڈر جنرل میڈوس کو شکست دینے کے بعد خود جنرل کارنوالس کو جس نے حملوں کی قیادت سنبھالی تھی تین چار ماہ کی مختلف لڑائیوں میں ۱۷۹۱ء میں شکست دی اور اس کو پسپائی پر مجبور کیا۔ کارنوالس نے اس معاہدہ کے تحت جو اس نے ٹیپو کے خلاف مرہٹوں اور نظام کے ساتھ کیا تھا۔ اپنی تازہ دم افواج کے ساتھ جو کلکتہ سے بلائی گئی تھیں اور نظام و مرہٹوں کی کثیر افواج کے ساتھ میسور پر تیسرا بڑا حملہ کیا اور فروری ۱۷۹۲ء میں سرنگاپٹم کا محاصرہ کر لیا۔ اس کے لیے اس دفعہ انگریزوں نے کچھ غداران وطن سے بھی کام لیا تھا جو سلطان کی خدمت و ملازمت میں رہ کر انگریزوں کو تمام خبریں پہنچاتے رہے۔ وہ تو بالآخر اپنے کیفر کردار کو پہنچے لیکن ٹیپو سلطان کو طویل محاصرے سے مجبور ہو کر اپنے سے تین گنا بڑی طاقت سے معاہدہ صلح کرنا پڑا۔ جس کے بموجب وہ اپنی تقریباً نصف مملکت سے محروم ہو گیا۔ کچھ شمالی مشرقی علاقہ نظام کو ملا اور کچھ شمالی علاقہ مرہٹوں کو۔ ساحل مالابار کے بیشتر علاقہ پر انگریز قابض ہو گئے ایک کروڑ کے تاوان جنگ میں سے پچاس لاکھ انگریزوں نے ہتھیا لیا اور پچیس پچیس لاکھ نظام اور

Marfat.com

مرہٹوں کو ملا۔ یہ ہے بڑے پیمانہ پر اس ملکی و سیاسی غداری کی مختصر داستان جس نے ایک طرف انگریزوں کے تن تنہا مدمقابل ٹیپو سلطان کو کمزور کیا اور دوسری طرف انگریزوں کے اقتدار کو برصغیر میں مضبوط کیا۔

اس دلدوز معاہدہ کے بعد بھی سلطان نے ہمت نہیں ہاری تھی لیکن اس غیرت مند مجاہد نے اس کے بعد سے چارپائی پر سونا بند کر دیا تھا وہ زمین پر ایک دری بچھا کر سوتا تھا اس نے از سرنو سرنگاپٹم کے قلعہ اور اس کے استحکام کی تعمیر کی۔ فوج میں نوجوانوں کو بھرتی کیا۔ اپنے مالیانہ کو نئی ہدایات کے تحت درست کیا۔ صرف یہی نہیں بلکہ اس نے پہلی بار بین الاقوامی طور پر اپنے کیس کو مضبوط کرنے اور تعاون حاصل کرنے کے لیے اپنے نمائندے ترکی کی خلافت عثمانیہ، فرمارواے کابل زماں خان کے پاس اور پیرس بھیجے مگر افسوس کہ اس کو ان دونوں اسلامی ملکوں کی طرف سے کوئی امداد نہیں ملی، فرانسیسی جو انگریزوں کے خلاف جنوبی ہند میں اس کے پہلے سے حلیف تھے وہ بھی اس وقت نپولین کے مصر پر حملے اور وہاں انگریزوں سے برسرپیکار ہونے کے سبب کوئی امدادی اقدام نہ کر سکے۔

ایسٹ انڈیا کمپنی کا نیا گورنر ویلزلی ٹیپو سلطان کی اس نئی اور دوررس نتائج کی پالیسی سے بہت گھبرایا اور اس نے فیصلہ کیا کہ سلطان کو ہر حال میں ختم کر دیا جائے۔ انگریز اس جانباز و باہمت مجاہد سے کس قدر خوف زدہ تھے اس کا اندازہ ان خطوط سے لگایا جا سکتا ہے جو جنرل سر ٹامس مونرو نے تیسری جنگ میسور ۱۷۹۱ء کے آغاز پر برابر انگلستان بھیجے اور جو اس کی مطبوعہ سوانح عمری میں پائے جاتے ہیں وہ ہندوستان میں انگریزی سلطنت کی توسیع کی اسکیموں کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے۔

"جب تک ٹیپو زندہ ہے اس وقت تک یہ ممکن نہیں، جب تک اس کی طاقت نہ توڑی جائے گی توسیع تو ہی ایک طرف، ہمیں ہر لحظہ اپنے موجودہ مقبوضات کے چھن جانے کا خطرہ لگا رہے گا۔"

سلطان شہید کی اس بین الاقوامی تحریک و کوششوں کے علاوہ ویلزلی اس سے بھی ہراساں تھا کہ نظام اور مرہٹوں کے برخلاف ٹیپو اپنے وسائل کی درستی، مالیہ کی اصلاح اور افواج کی تقویت و تنظیم میں مصروف ہے، وہ ایک جگہ انگلستان کو بھیجے ہوئے ایک مراسلے میں لکھتا ہے۔

"عام بدنظمی کے اس ہنگامہ زار میں سلطان کی طاقت ہر اختلال و نقصان سے محفوظ رہی ہے

Marfat.com

حالانکہ اس کی طاقت کو دبائے رکھنا ہمارے تمام معاہدوں اور متحدہ کارروائیوں کا حقیقی مقصد ومدعا تھا۔"

ویلزلی نے سلطان کو فوجی کارروائی کے ذریعہ تباہ کرنے سے قبل بعض غداران مملکت سے جن میں سرفہرست وزیر میر صادق تھا ساز باز کر رکھی تھی، ۷ فروری ۱۷۹۹ء کو اس کی اور نظام کی متحدہ افواج نے مملکت میسور کی طرف پیش قدمی کی۔ اگرچہ اس موقع پر بعض غدار سرداروں نے دشمن کی نقل وحرکت کو سلطان سے چھپائے رکھا لیکن پھر بھی سلطان کے بعض وفادار سرداروں نے اس کے پرچم کے نیچے جمع ہو کر دشمن کا سخت مقابلہ تقریباً دو ماہ تک مختلف محاذوں پر کیا۔ بمبئی سے انگریزی افواج کی نئی کمک آنے کے بعد سلطان سرنگاپٹم میں مجبوراً قلعہ بند ہو گیا پھر بھی ایک ماہ سے زائد سلطان کی افواج نے دشمن کا مقابلہ کیا، آخر کو دشمن کی مسلسل گولہ باری سے ایک جگہ فصیل میں بڑا شگاف پڑ گیا۔ اس موقع پر بعض غدار اور سازشی محافظوں نے اس مجاہد عظیم کو مشورہ دیا کہ اب بھی موقع ہے اگر سلطان انگریزوں کی تابعداری قبول کر لیں تو ان کی جان اور تخت وتاج محفوظ رہے گا۔ اسی موقع پر اسلام کے اس سرفروش وخوددار مجاہد نے وہ جملہ کہا جو انسانی تاریخ میں یادگار ہے اور تا ابد رہے گا، سلطان شہید نے پوری خود اعتمادی اور تمکنت سے کہا:

"گیدڑ کی صد سالہ زندگی سے شیر کی ایک دن کی زندگی ہزار درجہ بہتر ہے۔"

فصیل میں اس شگاف کے بعد دو دن سے سلطان اپنے محل کے باہر خود اس کی مرمت کی نگرانی کے لیے ایک چھولداری میں مقیم تھا۔ اس نے دوپہر کا کھانا تناول کرتے ہوئے ایک نوالہ ہی منہ میں رکھا تھا کہ اس شگاف کی طرف سے شور اٹھا کہ دشمن ادھر سے قلعہ کے اندر داخل ہو گیا ہے وہ فوراً ہی اپنے تیار گھوڑے پر سوار ہر کو مورچہ کی طرف بھاگا، دشمن کی ایک گولی گھوڑے کو لگی اور گر گیا، سلطان پیدل قلعہ کے بند دروازہ کی طرف لپکا دو گولیاں اس کے لگیں اور وہ گر گیا ایک لالچی گورے سپاہی نے قریب آ کر اس کی زرنگار پٹی اتارنی چاہی سلطان نے اس زخمی حالت میں وار کر کے اس کی ٹانگ پر تلوار سے اک کاری زخم لگایا، للچائے ہوئے گورے نے اپنی گولی سے اس کا کام تمام کر دیا اور اس طرح علامہ اقبال کے الفاظ میں "کارزار دین وسیاست کا یہ آخری اسلامی تیر ٹوٹ گیا۔"

درمیان کارزار ملک و دیں
ترکش مارا خدنگ آخریں

وہ غدار وزیر میر قاسم جو سلطان کو اس حالت میں اکیلا چھوڑ کر قلعہ سے بھاگنا چاہتا تھا اس کو وفا شعار سپاہیوں نے فصیل کے دروازے پر اپنی تلواروں سے بوٹی بوٹی کر ڈالا۔ شاعر اسلام اقبال نے اس غدار پر اس کے دور کے ایک پیشرو کے ساتھ ہمیشہ کے لیے لعنت کی مہر ثبت کر دی۔

جعفر از بنگال و صادق از دکن

ننگ آدم ، ننگ دیں ، ننگ وطن

اس شیر میسور بلکہ شیر اسلام کی وفات پر انگریزوں نے اپنے پایۂ تخت کلکتہ میں چراغاں کیا جشن منایا، چرچ میں عبادت شکرانہ ادا کی، کیونکہ وہ مجاہد عظیم جس سے انگریز عورتیں اپنے بچوں کو ڈراتی تھیں دنیا سے رخصت ہو چکا تھا۔ انگریزوں کے سفلہ پن اور نفرت کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ وہ اپنے کتوں کا نام ٹیپو رکھتے تھے۔ انہوں نے اپنی تاریخ کی کتابوں میں اس سلطان شہید کے خلاف جو کچھ لکھا ہے وہ صریحی جھوٹ اور بہتان ہے، نہ ٹیپو سلطان متعصب تھا اور نہ خون آشام، وہ اپنی رعیت میں ایک ہر دلعزیز حکمران تھا اور ہندو مسلمان یکساں اس سے محبت کرتے تھے۔

ایک ممتاز و بے مثال فوجی قائد و بہادر سپاہی اور کامیاب حکمران ہونے کے ساتھ ساتھ ٹیپو سلطان، ایک سچا دیندار مسلمان تھا، وہ صوم وصلوٰۃ کا پابند تھا، روزانہ بعد نماز فجر ایک گھنٹہ قرآن کی تلاوت کرتا تھا۔ دینی کتب مطالعہ میں رکھتا تھا اس نے گاؤں گاؤں مساجد بنوائیں جن میں حکومت کی طرف سے ائمہ اور خطباء مقرر تھے، علماء کو وظائف ملتے تھے ساتھ ہی ساتھ وہ علم و ادب کا دلدادہ اور ایک انتہائی جدت پسند ایڈمنسٹریٹر بھی تھا، اس نے اپنی وسیع مملکت کو تین بڑے صوبوں میں تقسیم کر کے ان کے فارسی اور ترکی نام رکھے، فوج اور سرکاری دفاتر کے نام اسمائے حسنٰی پر رحمانی، غفاری، قہاری، ستاری وغیرہ رکھے تھے۔ غلامی کو اپنی مملکت میں یکسر منسوخ کر دیا تھا، یعنی امریکہ سے پہلے تنسیخ غلامی کا آغاز ایک اسلامی مملکت میں ہو چکا تھا۔ زمینداروں کی آزادی کو بڑی حد تک کم کر کے اس نے کاشتکاروں کے لیے زندگی کو آسان کر دیا تھا۔ غرض وہ اپنی مملکت کے نظم و نسق کو بہتر سے بہتر بنانے کی طرف ہمیشہ متوجہ رہتا۔ وہ ایک نرم خو اور رحم دل انسان تھا، ہندوؤں کے لیے اس نے مساجد کی طرح مندروں کے لیے حکومت کی اعانت بحال رکھی تھی انہی اسباب کی وجہ سے وہ بہت ہر دلعزیز تھا۔

Marfat.com

اس کے پاس ایک اچھا کتب خانہ تھا اور اپنی مطالعہ شدہ کتابوں پر وہ ایک مہر ثبت کر دیتا تھا۔اس نے فوجی نظم و قواعد و ضوابط اور نقل و حرکت پر ایک کتاب ''فتح المجاہدین'' کے نام سے لکھی تھی جو قلمی صورت میں دنیا کے مختلف کتب خانوں میں محفوظ ہے۔اس نے فرانسیسی ماہرین کے زیر نگرانی آتشیں اسلحہ سازی کے کارخانے قائم کئے اور اس طرح جدید ہتھیاروں کے معاملے میں اس کی ریاست خود کفیل تھی۔

ابوالفتح علی ٹیپو سلطان شہید کا پاکستان پر بھی اتنا ہی حق ہے جتنا ہندوستان کے مسلمانوں پر۔کیونکہ ان کے آباؤ اجداد پاکستان کی سرزمین پنجاب سے جنوبی ہند گئے تھے اور پھر اپنے خون سے آزادی کا جو چراغ روشن کیا تھا اور ملی شعور بیدار کیا تھا آخر کار اس کی ضیاء پاشی سے ۱۴۸ سال بعد پاکستان وجود میں آیا۔امید کی جاتی ہے کہ حکومت پاکستان اور پاکستانی عوام اس عظیم شہید کے شایان شان اس کی یاد منانے کا اہتمام کریں گے۔(۱)

روح ٹیپو کر رہی ہے اس جوان کا انتظار
عظمت اسلام کر دے جو جہاں پر آشکار

۱۔ یہ تقریر ریڈیو پاکستان سے سلطان ٹیپو کے یوم شہادت پر ۴ مئی ۱۹۹۴ء کو نشر کی گئی۔

Marfat.com

امام ابن تیمیہ اور سلطان محمد تغلق

ماہنامہ تہذیب کے شمارہ ستمبر ۹۵ء میں جناب نسیم احمد صاحب باغپتی (علیگ) کا ایک مضمون ''مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کا ایک مایۂ ناز فرزند بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق'' اشاعت پذیر ہوا ہے۔

اس مختصر مضمون میں درحقیقت بابائے اردو کے علمی کارناموں سے کلیۃً صرف نظر کرتے ہوئے ان کے قدیم نسب اور قدیم موروثی وطن اور سات سو سال قبل ان کے مورث اعلیٰ ''ہر کرن چوہان'' کے اسلام قبول کرنے کا ذکر ہے جو عہد تغلق میں ایک عالم قاضی سید عضد الدین کے ہاتھوں مشرف با اسلام ہوئے۔

یہ سب کچھ اپنی جگہ درست ہوگا اور نہ بھی ہو تو اس سے ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب کی علمی شخصیت اور کارناموں پر کوئی اثر نہیں پڑتا اور نہ ہی یہ ہماری اس تحریر کا محرک ہے۔ بلکہ ان قاضی عضد الدین کے ضمن میں جناب نسیم احمد باغپتی (علیگ) نے عہد تغلق میں دمشق کے مشہور عالم شیخ الاسلام ابن تیمیہ اور سلطان غیاث الدین تغلق کے مابین مراسلت اور شام سے امام ابن تیمیہ کی تحریک پر انہی قاضی عضد الدین کی قیادت میں علماء کے ایک وفد کے ہندوستان آنے کی جو باتیں لکھی ہیں وہ بڑی عجیب ہیں اور وہی اس تحریر کا اصل محرک ہیں۔

ضروری معلوم ہوتا ہے کہ متجسس اور طالب حق قاری کے خیال سے جناب باغپتی علیگ صاحب کے افکار، یہاں خود ان کے الفاظ میں پیش کر دیئے جائیں۔ وہ لکھتے ہیں:

''آٹھویں صدی ہجری (چودھویں صدی عیسوی) میں جب کہ پورے عالم اسلام میں شرک و بدعات کا زور تھا، اس دور پر آشوب میں اللہ تعالیٰ نے اصلاح امت کے لیے شیخ اسلام تقی الدین ابن تیمیہ جیسی عظیم شخصیت کو پیدا کیا، جنہوں نے اصلاح امت اور اصلاح معاشرہ کے لیے گراں قدر جدوجہد اور سعی کی اور آپ آٹھویں صدی ہجری میں مسلمانوں کے مجدد تسلیم کیے گئے۔''

Marfat.com

یہ بیان اپنی جگہ بالکل درست اور مسلمہ ہے۔ لیکن اس کے فوراً بعد ہی انہوں نے جو کچھ لکھا ہے وہی ایک عجیب بیان ہے جس کی تاریخ سے کوئی تائید نہیں ہوتی۔ وہ لکھتے ہیں:

''اور اسی سلسلہ میں آپ (ابن تیمیہ) نے غیاث الدین تغلق بانی خاندان تغلق کو بذریعہ خط و کتابت تبلیغ دین کے لیے آمادہ کیا اور بعد از آمادگی اپنے ایک نہایت معتمد ترین ساتھی ''قاضی سید عضد الدین محدث بن عبدالرحمٰن بن شمس الدین کی سربراہی و قیادت میں علماء کرام کی ایک جماعت بھیجی جو احادیث اور تفسیر قرآنی کا ایک بڑا ذخیرہ بھی اپنے ہمراہ لائی۔ جن کے فارسی، سنسکرت، گجراتی، ملتانی، ہندکو، کشمیری، سرائیکی اور دیگر مقامی زبانوں میں تراجم بھی کیے گئے۔''

اس کے بعد مضمون نگار موصوف نے غیاث الدین تغلق کی تبلیغی کوششوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

''اور یہ سارا کام انتہائی سائنٹیفک انداز میں مشنری جذبہ کے تحت امام ابن تیمیہ مجدد اسلام کے ایک معتمد ساتھی اور جید عالم دین قاضی سید عضد الدین محدث بن عبدالرحمٰن کی نگرانی و سرپرستی میں ہوا۔ قاضی سید عضد الدین محدث نے سب سے پہلے شہزادہ محمد بن تغلق کی تعلیم و تربیت کی جس کی وجہ سے اس میں انتہائی روشن خیالی پیدا ہو گئی اور اس وجہ سے شہزادہ نے بھی تبلیغ اسلام کے لیے زبردست کام کیا۔۔۔۔۔ تبلیغ اسلام کا یہ زمانہ پورے دس سال پر محیط ہے یعنی ۷۲۴ھ مطابق ۱۳۲۴ء سے لے کر ۷۳۵ھ مطابق ۱۳۳۵ء کے درمیان قاضی سید عضد الدین محدث عربی کے دست حق پرست پر لاکھوں ہندو قبائل نے اسلام قبول کیا اور اس طرح غیاث الدین تغلق نے تاریخ میں اپنا نام ایک مبلغ اسلام کی حیثیت سے امر کر لیا۔''

ہم نے یہ طویل اقتباسات اس لیے پیش کیے ہیں کہ خود مضمون نگار کے الفاظ میں ان کے بیانات بے کم و کاست قارئین کے سامنے آ جائیں۔ علی گڑھ اولڈ بوائز ایسوسی ایشن ایک موقر ادارہ اور برصغیر کی ایک ایسی مادر علمی کی یاد ہے جس کے بانی سر سید احمد خان مرحوم نے علمی کاوش و تحقیق کا ایک انتہائی اعلیٰ معیار قائم کیا جس پر خود ان کے اپنے متعدد علمی رسائل و مقالات شاہد ہیں اور ان ہی نے حالی و شبلی وغیرہ میں ایسا ذوق علمی پیدا کیا۔ غیرت علمی اور اس موقر ادارہ کے مقام کو پیش نظر رکھتے ہوئے ہم نے ضروری سمجھا کہ باغپتی علیگ صاحب کے ان افکار کا ایک تنقیدی تجزیہ پیش کیا

Marfat.com

جائے تا کہ قارئین کے لیے حقیقت حال واضح ہو سکے۔

مجھے یقین ہے کہ جس راقم الحروف کو مضمون نگار موصوف کے یہ بیانات پڑھ کر اچنبھا ہوا اسی طرح بعض دوسرے قارئین کو بھی ہوا ہوگا اور ان کے ذہن میں متعدد متعلقہ سوالات اٹھے ہوں گے۔ امید ہے کہ ہمارے پیش کردہ تجزیے سے ان بیانات کی تصحیح اور قارئین کی تشفی ہو جائے گی۔

امام ابن تیمیہ پر عربی، اردو، فرنچ اور انگلش میں بے شمار کتابیں لکھی گئی ہیں اور بہت سے ڈاکٹریٹ مقالات بھی لکھے گئے ہیں، اس طرح تغلق عہد کی معاصر تاریخ ضیاء الدین برنی اور ابن بطوطہ کا سفر نامہ بھی ہمارے سامنے موجود ہے، پھر اسی تغلق عہد کے بارے میں ڈاکٹر آغا مہدی حسین کا ڈاکٹریٹ کا مقالہ بھی کتابی صورت میں بعنوان (The Rise and Fall of Muhammad Bin Tughlaq) موجود ہے، جو انہوں نے کافی عرصہ قبل لندن یونیورسٹی میں پیش کیا تھا۔ ان تمام کتابوں اور ایسے ہی دوسرے قدیم و جدید عربی، فارسی اور اردو مآخذ میں کہیں بھی نہ تو امام ابن تیمیہ کی غیاث الدین تغلق سے تبلیغی مسئلہ میں مراسلت کا ذکر ہے اور نہ کہیں "قاضی سید عضد الدین محدث" کی قیادت میں امام ابن تیمیہ کی طرف سے بھیجے گئے کسی وفد علماء کا ذکر پایا جاتا ہے "جو اپنے ساتھ احادیث اور تفاسیر قرآنی کا ایک بڑا ذخیرہ بھی لایا ہے۔" یہی نہیں اس تمام علمی ذخیرہ کا برصغیر کی سات مذکورہ زبانوں میں (جن میں سے بعض بڑی محدود اور مقامی ہیں) بلکہ دیگر مقامی زبانوں میں ترجمہ بھی کیا جائے اور اس کی محمد بن تغلق کے مقرب اور دقیقہ رس مورخ ضیاء الدین برنی کو کانوں کان خبر نہ ہو! اور نہ کہیں ابن بطوطہ اس کا ذکر کرے جو ۷۳۴ھ سے ۷۴۲ھ تک آٹھ سال دہلی میں رہا اور محمد تغلق سے قریب تھا۔ عقل و شعور اس سب کو تسلیم نہیں کرتے۔

یہی نہیں باغپتی صاحب کے بقول ان (نام نہاد) نمائندہ ابن تیمیہ کے زیر سرپرستی ۷۲۴ھ سے ۷۳۵ھ یعنی گیارہ سال تک تبلیغی سرگرمیاں قائم رہیں جن کے نتیجے میں "لاکھوں کی تعداد میں ہندو قبائل مسلمان ہوئے۔" اور اس سب سے ضیاء الدین برنی جیسا درباری اور نکتہ رس مورخ غفلت برتے، یہ بات بھی کسی طرح عقل و شعور میں آنے والی نہیں۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ جناب باغپتی علیگ صاحب نے اپنے اس انتہائی مختصر مضمون کے

Marfat.com

آخر میں اپنے مآخذ کی مختصر فہرست میں تاریخ برنی (یعنی اسی مورخ ضیاء الدین برنی کی تاریخ فیروز شاہی) کا بھی ذکر کیا ہے جو اب ڈاکٹر معین الحق مرحوم کے اردو ترجمے میں ہر جگہ دستیاب ہے۔ نہ معلوم مضمون نگار موصوف نے اس کتاب پر نظر ڈالی ہے یا یوں ہی اس کا ذکر کر دیا ہے، اسی طرح ایک دوسری قدیم فارسی کتاب یعنی فرشتہ کا ذکر بھی انہوں نے اپنے مآخذ میں کیا ہے اس میں بھی ان قاضی سید عضد الدین اور ان کے وفد اور علمی ذخیرے اور اس کے ترجمہ کا کہیں ذکر نہیں۔

اردو کی ایک اہم اور معاصر مایۂ ناز تصنیف یعنی شیخ محمد اکرم کی ''آب کوثر، موج کوثر، اور رود کوثر'' بھی ان کے مآخذ میں ہے۔ ان تین کتابوں سے صرف پہلی یعنی آب کوثر میں تغلق عہد کی علمی اور تبلیغی سرگرمیوں کا ذکر ہے اس میں بھی ان قاضی سید عضد الدین محدث اور ان کے وفد تبلیغ کا سرے سے ذکر نہیں اور پھر سب سے بڑی بات یہ ہے کہ ڈاکٹر آغا مہدی حسین نے اپنی مذکورہ کتاب میں جو محمد بن تغلق پر ہے، اس شامی شخصیت اور ان کی تبلیغی سرگرمیوں کا کوئی اشارہ تک نہیں کیا ہے۔

برصغیر کی سب سے بڑی ثقافتی تاریخ یعنی مولانا حکیم سید عبدالحیٰ صاحب مصنف گل رعنا کی عربی تصنیف نزہتہ الخواطر (۸ جلدیں، حیدر آباد دکن) میں بھی ان قاضی سید عضد الدین صاحب کا اس طرح سے ذکر نہیں جیسا باغپتی صاحب نے پیش کیا ہے۔

کاش کہ جناب نسیم احمد باغپتی صاحب اس عجیب و غریب شامی علماء کے وفد کا ذکر کرتے ہوئے جو ان کے بقول غیاث الدین تغلق کے عہد میں ہندوستان آیا، کتابوں کا بڑا ذخیرہ اپنے ساتھ لایا اور دس سال تک مسلسل تبلیغ اسلام کے فرائض انجام دیتا رہا کسی ایک مستند کتاب کا حوالہ ہی اپنے مضمون میں پیش کر دیتے، یہ کافی نہیں کہ مضمون کے آخر میں چند کتابوں کا ذکر کر دیا جائے اور پھر تلاش و جستجو کے بعد ان مآخذ میں سے متعلقہ کتابوں سے ان کے عجیب و غریب انکشافات کی تائید نہ ہو سکے۔

میرا ذاتی خیال ہے کہ مضمون نگار موصوف کو امام ابن تیمیہ سے گہری عقیدت ہے (اور واقعی ان شیخ الاسلام کا ایسا ہی مقام ہے) اور اسی عقیدت میں انہوں نے تغلق عہد کے حاضر مورخین سے صرف نظر کرتے ہوئے عصر حاضر کی کسی اردو کتاب سے استفادہ کرتے ہوئے امام

Marfat.com

ابن تیمیہ کی عظمت بڑھانے کے لیے وہ سب کچھ تحریر کر دیا ہے جس کے اقتباسات ہم نے اوپر دیے ہیں اور جس کا ان کے مضمون سے کوئی گہرا تعلق بھی نہیں، مگر جیسا کہ ہم نے عرض کیا قدیم معاصر تاریخوں اور جدید تحقیقی کتابوں سے اس کی بالکل تصدیق نہیں ہوتی، اس لیے یہ سب کچھ ایک افسانہ طرازی ہے جس کا تاریخ سے کوئی تعلق نہیں۔ یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ ڈاکٹر آغا مہدی حسین کی مذکورہ تحقیقی کتاب ان کے مآخذ میں شامل نہیں، اور نہ ہی برصغیر کی مایۂ ناز عربی کتاب ''نزہۃ الخواطر'' ان کی نظر سے گزری ہے جس میں غیاث الدین تغلق اور محمد بن تغلق (جلد ۲) کے تفصیلی سوانح حیات مذکور ہیں، اور نہ ہی انہوں نے ایسے اہم موضوع پر لکھتے ہوئے رحلۃ ابن بطوطہ (سیاحت نامہ ابن بطوطہ) کو اپنے مآخذ میں شامل کیا ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ آخر یہ ''قاضی سید عضد الدین محدث'' ہیں کون؟ کیا ایک افسانوی شخصیت ہیں؟ یا ان کا واقعی وجود تھا؟ لیکن اس کی تفصیلات غلط طور پر پیش کی گئی ہیں۔

الحمدللہ کہ راقم الحروف ان قاضی سید عضد الدین کے مختصر حالات معلوم کرنے میں کامیاب ہوا، لیکن وہ ان تمام معلومات سے بالکل مختلف ہیں جن کا ذکر باغپتی علیگ صاحب نے اپنے مضمون میں کیا ہے۔ انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے اوائل کے ممتاز مورخ و مصنف مولانا شبلی کے دوست مولانا سید عبدالحیٔ حسنی نے برصغیر کی شخصیات کی اپنی ضخیم عربی تاریخ ''نزہۃ الخواطر'' (۸ جلدیں، شائع کردہ دائرۃ المعارف العثمانیہ حیدرآباد دکن) کی دوسری جلد (طبع دوم) کے صفحہ ۷۶ پر ان کا ذکر کیا ہے اور سہ سطری انتہائی مختصر سوانح حیات میں صرف یہ لکھا ہے کہ ''مولانا علامہ سید عضد الدین الدہلوی، منطق و فلسفہ کے ممتاز عالم تھے، محمد تغلق نے ان سے پڑھا تھا اور جس دن محمد تغلق ہندوستان کا بادشاہ ہوا اس دن اس نے تاریخ فرشتہ کے مطابق ان کو چالیس لاکھ تنکہ دیے۔'' تاریخ فرشتہ سے رجوع کرنے پر جو میری لائبریری میں ہے یہ عبارت نظر آئی کہ مولانا عضد الدین استاد خود را چہل لک ''در یک روز بخشید'' (صفحہ ۱۳۳ مطبوعہ نول کشور ۱۸۶۴ء) یعنی اپنے استاد مولانا عضد الدین کو سلطان محمد تغلق نے چالیس لاکھ روپیہ ایک روز میں عطا کیے۔

ابن بطوطہ نے بھی اپنے سیاحت نامے میں ان مولانا عضد الدین کا ذکر کیا ہے، لیکن صرف ان علماء کے ضمن میں جن کو تغلق نے اپنی بڑی مالی عنایات سے نوازا۔ اس کے بیان کے

Marfat.com

مطابق محمد تغلق نے مولانا عضد الدین کو دس ہزار درہم دیئے اور یہ کہ اس نے آپ کا پورا نام ''عضد الدین شونکاری لکھا ہے، مزید یہ کہ سلطان نے نہ کبھی ان کو دیکھا اور نہ وہ خود اس کے پاس آئے بلکہ اس نے یہ رقم ان کے شہر ''شونکارہ'' بھجوائی۔

یہاں یہ بات لائق ذکر ہے کہ ابن بطوطہ محمد تغلق کی تخت نشینی سے دس سال بعد ہندوستان آیا تھا، جب کہ فرشتہ کے بیان کے مطابق محمد تغلق نے مذکورۂ سابق رقم اپنی تخت نشینی کے موقع پر دوسرے لوگوں کے ساتھ ان مولانا کو بھی دی تھی جو اس کے استاد تھے۔ اس لیے ان عضد الدین کے بارے میں اس سکے کا رواج ہی نہیں تھا، یقین سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ من جملہ ان باتوں کے ہے جو اس نے دوسروں سے سن کر اپنے سیاحت نامے میں لکھی ہیں، بلکہ مراکش جا کر اس کاتب کو املاء کرائی تھیں جس نے سیاحت نامہ مرتب کیا یعنی ابن جزی، لہٰذا ابن بطوطہ کا بیان اس سلسلہ میں لائق اعتبار نہیں۔

بہر حال اتنا ابن بطوطہ کے بیان سے بھی واضح ہے کہ یہ شیخ عضد الدین نہ تو ابن تیمیہ کے شاگرد تھے اور نہ یہ دمشق سے آئے تھے، نہ انہوں نے یہاں کوئی بہت بڑی تبلیغی مہم چلائی تھی بلکہ منطق و فلسفہ ان کا موضوع تھا اور انہی علوم میں محمد تغلق ان کا شاگرد تھا، جب کہ ابن بطوطہ نے تو ان کے شہر سکونت کا بھی تعین کر دیا ہے، یعنی اس کے الفاظ میں ''شونکارہ'' یہ غالباً چن گڑھ کی عربی شکل ہے۔ راقم الحروف کو اس کے جغرافیائی تعین میں کامیابی نہیں ہو سکی، شاید یہ پنجاب کا کوئی گاؤں رہا ہو جہاں ہندوؤں کا چوہان قبیلہ آباد ہو اور جن میں سے ایک مولوی عبدالحق مرحوم کے مورث اعلیٰ تھے۔

میری نسیم احمد باغپتی صاحب سے گزارش ہے کہ وہ تہذیب کے آئندہ کسی شمارے میں اس مسئلہ پر روشنی ڈالیں کہ ان کی معلومات کا ماخذ کیا ہے جو انہوں نے اپنے زیر بحث مضمون میں ان قاضی سید عضد الدین صاحب کے بارے میں پیش کئے ہیں۔

میری اس تحریر کا اصل مدعا تو یہاں ختم ہو گیا، لیکن میں قارئین کی دلچسپی کے لیے اس مسئلہ پر کچھ روشنی ڈالنا چاہتا ہوں کہ آخر امام ابن تیمیہ اور محمد تغلق کا ان کے افکار و تعلیمات سے تعلق کس طرح بعض اذہان میں پیدا ہوا؟ اور کس طرح اس میں خیال آرائی و مبالغہ آرائی کی گئی۔

Marfat.com

ابن بطوطہ جو تقریباً سات سال تک دہلی میں محمد بن تغلق کے قاضی رہے اور ان کو سلطان کی صحبت حاصل رہی، اپنے سیاحت نامے میں دمشق کے ایک عالم شیخ عبدالعزیز الاردبیلی (عربی سیاحت نامے میں الاردویلی چھپا ہے جو کہ کتاب کی غلطی ہے، اور یہی غلطی اردو ترجمے میں ہے جس کو شیخ اکرام نے آب کوثر صفحہ ۴۱۱ پر نقل کیا ہے) کے دہلی آنے کا ذکر کیا ہے، ابن بطوطہ کے مطابق یہ شیخ عبدالعزیز امام ابن تیمیہ اور ان کے شاگردوں ذہبی، برہان الدین، ابن الفرکاح وغیرہ کے شاگرد تھے۔ یہ اسی زمانے میں آئے جب ابن بطوطہ دہلی میں موجود تھا، وہ اس کا ذکر بالکل نہیں کرتا کہ محمد تغلق نے ان کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کیا تھا بلکہ اس نے ان عالم کا ذکر محمد بن تغلق کی داد و دہش کے ذکر کے ضمن میں کیا ہے کہ "ایک دن انہوں نے سلطان کو حضرت عباسؓ اور ان کے بیٹے کی سخاوت کا ذکر سنایا اور بعض دیگر عباسی خلفاء اور ان کے مناقب بیان کیے۔ سلطان جس کو بنی عباس سے بہت محبت تھی، اتنا خوش ہوا کہ اس نے ان فقیر عالم کے قدم چوم لیے اور اس کے حکم سے سونے کی ایک سینی لائی گئی اور اس نے اس میں اپنے ہاتھ سے دو ہزار تنکے (یہاں سونے کے مراد ہیں یعنی اشرفیاں) رکھے اور ان عالم سے کہا کہ یہ آپ کی نذر ہیں۔" (رحلہ ابن بطوطہ، عربی، مصر جلد ۲، صفحہ ۴۴)۔

یہ قصہ مولانا سید عبدالحئی حسنی صاحب نے بھی نزہتہ الخواطر (عربی) کی دوسری جلد میں ابن بطوطہ کے حوالے سے نقل کیا ہے (انہوں نے الاردویلی کی تصحیح الاردبیلی کر دی ہے)

اس قصے سے یہ کہیں پتا نہیں چلتا کہ ان شیخ عبدالعزیز الاردبیلی (آذربائیجان کے شہر اردبیل کے باشندے) کو امام ابن تیمیہ نے تبلیغ کے لیے دہلی بھیجا تھا۔ بلکہ یہ بھی مشکوک ہے کہ وہ ابن تیمیہ کی حیات میں دہلی آئے تھے یا ان کی وفات کی بعد۔ اغلب گمان یہ ہے کہ وہ امام ابن تیمیہ کی وفات کے بعد یعنی ۷۲۸ھ کے بعد ہی یہاں آئے کہ خود ابن بطوطہ ہندوستان میں سنہ ۷۳۴ھ میں پہنچا تھا۔ نہ کہیں اس کا ذکر ملتا ہے کہ یہ ایک وفد کے ساتھ آئے تھے، کتابیں لائے تھے جن کا یہاں مقامی زبانوں میں ترجمہ کیا گیا۔ نہ ان تبلیغی سرگرمیوں کا کہیں ذکر ملتا ہے۔

لیکن ان شیخ عبدالعزیز الاردبیلی کا ذکر شیخ محمد اکرام صاحب نے آب کوثر (صفحہ ۴۱۱) میں کچھ اس انداز میں کیا ہے جس سے انہوں نے محمد تغلق کو امام ابن تیمیہ کی تحریک سے جوڑ دیا ہے۔

Marfat.com

وہ محمد تغلق کی صوفیاء سے نفرت، ان کی دل آزاری، اور علماء سے اس کے تعلق اور اس کی دینداری اور نماز کے بارے میں اس کی شدت کا ذکر کرتے ہوئے ان شیخ عبدالعزیز الاردبیلی کے بارے میں لکھتے ہیں:

''یہ شیخ عبدالعزیز دمشق میں مشہور قاطع بدعت اور مخالفت تصوف بزرگ علامہ ابن تیمیہ کے شاگرد رہ چکے تھے اور عجب نہیں کہ مشائخ کے خلاف جو کوشش سلطان کر رہا تھا، انہیں شیخ عبدالعزیز کی آمد سے اور تقویت پہنچ گئی ہو، بلکہ ان کوششوں میں شاید علامہ ابن تیمیہ کی اس اصلاحی تحریک کو کچھ دخل ہو جو انہوں نے اس زمانہ میں شام اور مصر میں جاری کر رکھی تھیں اور جس کی خبر مختلف ذرائع سے (مثلاً مولانا علم الدین کی وساطت سے جو کہ مکہ و مدینہ و مصر و شام میں ایک زمانہ رہ کر ہندوستان لوٹے تھے، یا شیخ عبدالعزیز کی آمد سے) پہنچ گئی تھی۔''

افسوس کہ شیخ محمد اکرام صاحب مرحوم نے اپنے اس بیان کے لیے کوئی شہادت پیش نہیں کی ہے اور انگریزی اسلوب کے (Probably) پر اکتفا کرتے ہوئے ایسا اظہار کیا ہے جس سے ابن تیمیہ اور محمد تغلق کے فکری تعلق کا گمان پیدا ہو گیا ہے۔ مگر داخلی اور خارجی شہادتوں سے اس تعلق کی بالکل تائید نہیں ہوتی ہے۔

داخلی منفی شہادت یہ ہے کہ کوئی شک نہیں کہ امام ابن تیمیہ نماز کے بارے میں متشدد تھے لیکن انہوں نے کبھی یہ نہیں لکھا ہے کہ جو لوگ جماعت سے نماز ادا نہیں کریں ان کو قتل کر دیا جائے اور نہ انہوں نے مصر کے سلطان المنصور قلاؤدن کو جو ایک زمانہ میں ان کا بڑا معتقد تھا اس بات پر اکسایا۔ پھر یہ کہ کوئی شک نہیں کہ وہ صوفیہ کے وحدت الوجودی فلسفہ کے مخالف تھے اور ان پیشہ ور صوفیہ کے بھی مخالف تھے جن کے گفتار و کردار میں مطابقت نہیں تھی، جس طرح وہ علمائے سوء کے مخالف تھے لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ انہوں نے اپنے فتاویٰ میں بہت سے ان قدیم صوفیہ کی تعریف و توصیف کی ہے جن کا سنت پر عمل تھا، جیسے الحارث المحاسبی، سہل التستری اور جنید و شیخ عبدالقادر جیلانی وغیرہ پھر خود ان کے شاگرد رشید حافظ ابن القیم کی تحریروں میں ایسے صوفیاء کے افکار کی جھلک بدرجۂ اتم موجود ہے۔ ان کی کتاب مدارج السالکین تو ایک صوفیانہ کتاب معلوم ہوتی ہے۔ امام ابن تیمیہ کی اصلاحی تحریک اس خونخواری کی ہرگز تلقین نہیں کرتی ہے جو محمد تغلق کا طرۂ امتیاز

Marfat.com

تھی اور جس پر محمد تغلق کا درباری مورخ ضیاء الدین برنی اور ابن بطوطہ انگشت بدنداں رہے ہیں۔

پھر یہ کہ برنی کے مطابق محمد تغلق کی فکری ساخت میں اس کے اولین اساتذہ اور مصاحبین سعد الدین منطقی، عبید شاعر، نجم الدین انتشار اور مولانا علم الدین وغیرہ کو بہت دخل تھا۔ ان میں سے کوئی بھی علوم منقول یعنی حدیث وفقہ کا ماہر نہ تھا، جب کہ امام ابن تیمیہ ان ہی علوم میں صاحب کمال تھے اور فلسفہ ومنطق کے بہت بڑے نقاد اور مخالف تھے، لہٰذا محمد تغلق کس طرح ان سے متاثر ہو سکتا تھا۔ پھر اس کا ابتدائی دور ایسا گزرا ہے کہ وہ شک والحاد کی زادیوں میں بھٹکتا رہا جس کا ذکر اس نے اپنی خودنوشت سوانح حیات میں کیا ہے۔ یہاں تک کہ وہ اللہ تعالیٰ کے وجود تک کا بھی منکر ہو گیا تھا۔ ڈاکٹر آغا مہدی حسین نے اپنی کتاب میں اس کے قلمی سوانح حیات سے ایسے اقتباسات پیش کئے ہیں۔ اس کے ان ملحدانہ افکار کی تصدیق ان بعض واقعات سے بھی ہوتی ہے جو سید گیسودراز نے اپنی کتاب جوامع الکلم میں پیش کئے ہیں اور جن کا تعلق رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور خلفائے راشدین ابوبکر وعمر وعثمان وعلی رضی اللہ عنہم سے ہے۔ شیخ محمد اکرام صاحب نے اس کے ان بیہودہ وملحدانہ افکار کا ذکر جوامع الکلم کے حوالے سے آب کوثر میں کیا ہے (صفحہ ۴۰۷ تا ۴۱۰)۔

جہاں تک خارجی منفی شہادت کا تعلق ہے تو محمد تغلق نے ان شیخ عبدالعزیز اردبیلی کا احترام واکرام اس لیے نہیں کیا کہ وہ امام ابن تیمیہ کے شاگرد تھے یا انہوں نے اپنے استاد کی اصلاحی تحریک کا پیغام سلطان کو پہنچایا، بلکہ قدیم وجدید مورخین اس پر متفق ہیں کہ جو ابن تغلق بیرون ملک سے آنے والے اور خاص طور پر عرب علماء کا بہت زیادہ بلکہ حد سے زیادہ احترام کرتا تھا جو معقولیت کی حد سے گیا گزرا تھا اور اب شیخ عبدالعزیز کے پاؤں چومنے کی ہی بات لے لیجئے۔ یا پھر یہ کہ اس نے بغداد سے آنے والے عباسی خلفاء کے خاندان کے ایک فرد کا احترام اس طرح کیا کہ اس کے آگے سجدہ ریز ہو گیا (تاریخ فیروز شاہی، ضیاء الدین برنی، ترجمہ ڈاکٹر معین الحق۔ صفحہ ۷۰۵)۔

امام ابن تیمیہ ہرگز ایسے سجدہ تعظیمی کے قائل نہ تھے، وہ تو اس کو کفر گردانتے تھے، پھر کس طرح ایسے سلطان کا تعلق ان کی اصلاحی تحریک سے جوڑا جا سکتا ہے؟ شیخ اکرام صاحب مرحوم کا استنتاج اس ضمن میں بہت ہی غلط ہے۔

Marfat.com

یہ بھی صاحب آب کوثر نے نہیں بتایا کہ مولانا علم الدین جو درحقیقت منطق وفلسفہ کے ہی ایک ماہر عالم تھے (وہی علوم جن کو امام ابن تیمیہ بے سود اور مضر جانتے تھے) وہ کس زمانے میں مکہ ومدینہ اور مصروشام گئے تھے؟ اور کب وہاں سے امام ابن تیمیہ کی اصلاحی تحریک کی تفصیلات لے کر آئے تھے جو انہوں نے محمد تغلق کے گوش گزار کیں۔ انہوں نے اس سلسلہ میں کوئی حوالہ پیش نہیں کیا ہے۔

ہم پہلے عرض کر چکے ہیں کہ امام ابن تیمیہ کا سن ۷۲۸ھ میں انتقال ہو چکا تھا، ان کی وفات دمشق کے پرانے قلعہ میں ہوئی جہاں وہ محبوس تھے۔ اس وقت محمد تغلق کی حکمرانی کو صرف چار سال ہوئے تھے۔ اگر وہ اس سن کے قریب وہاں (دمشق) گئے تھے تو اس وقت تو امام ابن تیمیہ کی اصلاحی تحریک وہاں بڑی زیر عتاب تھی، اور پھر یہ کہ ان سالوں میں تو محمد تغلق خود اپنی سوانح حیات کے مطابق اللہ تعالیٰ کی ذات ہی پر ایمان کھو چکا تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شان میں بھی گستاخی پر آمادہ تھا، تو وہ کس طرح ابن تیمیہ کے افکار سے متاثر ہو سکتا تھا جن کے لیے اتباع سنت ہی سب سے اہم چیز تھی۔

ان مولانا علم الدین شیرازی کے بارے میں تاریخ فرشتہ (۱/۱۳۳) میں ہے کہ وہ بھی گروہ فلاسفہ میں سے تھے اور یہی مولانا حکیم سید عبدالحئی حسنی صاحب نے نزہتہ الخواطر میں لکھا ہے (۲/۸۴) یہ کسی نے نہیں لکھا ہے کہ وہ طویل عرصہ مکہ ومدینہ اور مصروشام میں رہے تھے اور ابن تیمیہ کی اصلاحی تحریک سے متاثر تھے، رحمان علی کی ''تذکرہ علمائے ہند'' میں تو ان کا ذکر بھی نہیں ہے۔ لہٰذا محض ظن وتخمین کی بنیاد پر آب کوثر کے فاضل مصنف کا ابن تیمیہ کی اصلاحی تحریک سے محمد تغلق کا تعلق جوڑنا کسی طرح درست نہیں، دونوں کے افکار میں زمین آسمان کا فرق ہے۔

خلاصۂ بحث یہ ہے کہ شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ اور محمد تغلق کے تعلق کی داستان خواہ وہ مولانا سید عضد الدین کے واسطہ سے یا کسی اور واسطے سے ہو، تاوقتیکہ مستند تاریخی شواہد پیش نہیں کیے جائیں، ایک افسانہ طرازی ہے۔

تتمہ

اس مضمون کے لکھنے کے بعد مجھے اپنے اوراق میں ایک اہم نوٹ ملا جس کا تعلق امام ابن تیمیہ کے ایک شاگرد اور ہندوستان سے ہے اور جو ایک ایسی کتاب میں ہے جو باغپتی صاحب کے

Marfat.com

ماخذ میں ہے یعنی اکبر شاہ خان نجیب آبادی کی کتاب ''آئینہ حقیقت نما'' اس کتاب میں مصر کے ایک عالم شیخ شمس الدین ابن الحویری الحنفی کا ذکر ہے جو علاؤ الدین خلجی کے عہد میں سن ۷۰۸ھ میں امام ابن تیمیہ کے سبب مصر سے پریشان ہو کر ہندوستان آئے اور اپنے ساتھ حدیث کی ۴۰۰ کتابیں لائے (آئینہ حقیقت نما صفحہ ۴۲) شاید باغپتی صاحب نے ان شمس الدین کو قاضی عضد الدین سے خلط ملط کر دیا ہے۔ انہی شمس الدین مصری اور ان کے حدیث کی چار سو کتابیں لانے کا ذکر برنی نے بھی اپنی تاریخ (اردو ترجمہ صفحہ ۴۳۶) میں کیا ہے، مگر اس نے ان کا نام مولانا شمس الدین ترک لکھا ہے اور چار صفحات میں ان کے حالات کا ذکر کیا ہے، لیکن وہ ان کے ابن تیمیہ سے تعلق کا بالکل ذکر نہیں کرتا۔ وہ کچھ دنوں ملتان میں رہ کر علاؤ الدین خلجی سے ملے بغیر واپس مصر چلے گئے، کیونکہ ان کو ایک طرف تو سلطان کی بد دینی (نماز نہ پڑھنا حتیٰ کہ جمعہ کی نماز بھی نہ پڑھنا) پسند نہیں آئی اور دوسری طرف ہندوستان میں علم حدیث کی بے توقیری کیونکہ وہ ہندوستان میں اور خاص طور پر دہلی میں علم حدیث کو ہی مستحکم کرنے کے ارادے سے آئے تھے۔ انہوں نے ملتان میں قیام کے دوران برنی کے بقول حدیث کی ایک کتاب کی شرح بھی لکھی اور اس کے ساتھ فارسی میں ایک طویل خط لکھ کر ملتان سے سلطان علاؤ الدین کو بھیجا، اس خط میں سلطان کے بعض اقدامات کی تعریف کے ساتھ اس پر دینی امور میں سلطان کے تہاون اور حدیث نبوی ﷺ کے علم کو نظر انداز کرنے پر سخت تنقید تھی، سلطان کے میر منشی نے کتاب تو سلطان کو پہنچا دی اور خوف کی وجہ سے وہ خط نہ پہنچوایا، جب علاؤ الدین کو یہ معلوم ہوا تو وہ سخت ناراض ہوا۔ شیخ شمس الدین ترک کے بارے میں ملتان سے معلوم کیا، مگر وہ برنی کے بقول واپس جا چکے تھے۔

اس طرح یہ ایک ابن تیمیہ سے تعلق رکھنے والے عالم تھے جو ہندوستان آئے تھے، لیکن غیاث الدین تغلق کے عہد میں نہیں بلکہ علاؤ الدین خلجی کے عہد میں اور سن ۷۰۸ھ میں اور یہ حقیقت ہے کہ مشہور مصری مورخ ابن تغری بردی کے بقول (النجوم الزاہرۃ فی ملوک مصر والقاہرۃ، مصر ۸/ ۲۲۷) امام ابن تیمیہ کو اسی سال مصر میں قید کر دیا گیا تھا، اس طرح اکبر شاہ خان نجیب آبادی کا بیان درست ہے۔ لیکن برنی کے بیان سے اس حقیقت کا انکشاف ہوتا ہے کہ وہ علم الحدیث کی غیر مقبولیت کی وجہ سے ملتان ہی سے واپس چلے گئے تھے۔ چونکہ ان کا پورا نام یا پہلا نام (شمس

Marfat.com

الدین پہلا نام نہیں بلکہ عربی ناموں کے اسالیب کے مطابق لقب ہے)ان دونوں مآخذ میں مذکور نہیں اس لیے ان کے بعد کے حالات معلوم نہیں ہو سکے، لیکن ان کا ذکر نہ تو رحمان علی کے تذکرہ علمائے ہند میں ہے اور نہ ہی مولانا حکیم عبدالحیٔ الحسنی کی نزہۃ الخواطر میں۔

کتابیات

۱۔ تاریخ فیروز شاہی از ضیاء الدین برنی اردو ترجمہ از ڈاکٹر سید معین الحق۔

۲۔ رحلۃ ابن بطوطہ (سیاحت نامہ) عربی مصر عربی، مصر۔

۳۔ تاریخ فرشتہ، فارسی۔

۴۔ نزہۃ الخواطر از مولانا حکیم سید عبدالحیٔ الحسنی، عربی جلد دوم۔

۵۔ تذکرہ علمائے ہند، رحمان علی، اردو ترجمہ ڈاکٹر ایوب قادری۔

۶۔ النجوم الزاہرۃ، از ابن تغری بردی، مصر۔

۷۔ الاعلام از الزرکلی، عربی، بیروت۔

۸۔ آب کوثر از محمد اکرام۔

۹۔ آئینۂ حقیقت نما از اکبر شاہ خان نجیب آبادی۔

Marfat.com

مولانا محمد علی جوہر

اور

امت مسلمہ کی قیادت ☆

الحمدلله رب العالمين و الصلاة والسلام على اشرف الانبياء

والمرسلين سيدنا محمد وعلى آله واصحابه اجعمين

ہم سب کو ادارۂ جوہر کا شکر گزار ہونا چاہیے کہ اس نے امت مسلمہ کے اس جوہر تابدار کی یاد تازہ کرنے کے لیے یہ مجلس منعقد کی۔ میں صدر مجلس کا خاص طور پر شکر گزار ہوں کہ انہوں نے خود اپنے وطن میں مجھ جیسے غیر معروف پاکستانی کو دعوت خطاب دی جس نے اپنی عمر کا بیشتر حصہ بحیثیت متعلم و معلم عرب ممالک میں گزارا ہے اور اب کچھ عرصہ قبل ہی پاکستان واپس آیا ہے۔

مولانا محمد علی جوہر رحمۃ اللہ علیہ کی ذات گرامی سے دوگونہ تعلق کی بناء پر میں نے اس دعوت خطاب کو لبیک کہا اور اس محفل میں گفتگو کو اپنی سعادت سمجھا۔

ایک تو یہ کہ میرا پیدائشی تعلق بھی اس شہر سے ہے جہاں مولانا محمد علی نے آنکھیں کھولی تھیں یعنی سابقہ ریاست رام پور اور دوسرے یہ کہ مجھے بیت المقدس میں مرحوم کی قبر کی زیارت کا شرف حاصل ہوا۔ اب تو ایک پاکستانی کے لیے یہ ناممکن بات ہے کیونکہ ۱۹۶۷ء کی عرب اسرائیل جنگ کے بعد سے شہر القدس پر جہاں بیت المقدس واقع ہے اسرائیل کا قبضہ ہے لیکن مجھے یہ سعادت تقریباً ۳۴ سال قبل ۱۹۵۶ء میں حاصل ہوئی تھی جب میں دمشق میں دوران تعلیم دمشق یونیورسٹی کے طلبہ اور اساتذہ کے ایک وفد کے ساتھ اردن گیا تھا اس وقت فلسطین کا یہ سارا علاقہ جس کو عربی میں اب ''الضفۃ الغربیۃ'' یا ویسٹ بینک کے نام سے یاد کیا جاتا ہے مملکت اردن کا ایک حصہ تھا، مسجد اقصیٰ اور قبۃ الصخرۃ (جہاں سے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو معراج ہوئی تھی) کی زیارت کے

☆ ۴ جنوری ۱۹۹۱ء کو یوم جوہر پر موتمر العالم الاسلامی میں منعقدہ تقریب پر کی گئی ایک تقریر۔

Marfat.com

علاوہ اس سفر کے جو دو اہم یادگار واقعے تھے، ان میں ایک مولانا محمد علی مرحوم کی قبر کی زیارت تھی یہ بیت المقدس کے وسیع وعریض احاطہ میں واقع متعدد حجروں میں سے ایک حجرہ میں ہے۔ دوسرا واقعہ شاہ حسین سے ملاقات تھی جو عمان میں ان کے قصر بسمان میں ہوئی، جس میں شامی طلبہ اور اساتذہ کا سارا وفد شامل تھا اور صرف راقم السطور ہی ایک پاکستانی تھا۔

انتہائی افسوس کا مقام ہے کہ ہماری نئی نسل جو پاکستان میں پیدا ہو کر جوان ہوئی ہے اپنے ان محسنین کو بھولتی جا رہی ہے، جن کی جان نثاریوں اور سرفروشیوں سے یہ وطن عزیز ہم سب کو نصیب ہوا ہے۔ یہ احسان فراموشی کی بدترین مثال ہے، ہر منصف مزاج مورخ جانتا ہے کہ پاکستان کو بنانے میں صرف مسلم لیگ کے ان چند سربرآوردہ لیڈروں کا حصہ ہی نہ تھا جنہوں نے ۱۹۴۷ء کے بعد سے یہاں زمام اقتدار سنبھالی اور اب تو لوگ ان کے نام بھی بھول چکے ہیں اور صرف قائداعظم محمد علی جناح اور علامہ اقبال کے دو نام یاد رہ گئے ہیں، لیکن دیدۂ بینا رکھنے والا کوئی بھی انسان اس کو نہیں بھول سکتا کہ تصور پاکستان کی تخلیق میں، ہر چند کہ ۱۹۴۰ء سے پہلے تک ملکی سطح پر پاکستان کا نام موجود نہ تھا، سرسید، حالی، شبلی، مولانا حسرت موہانی، مولانا ظفر علی خان، بہادر یار جنگ وغیرہ کے ساتھ ساتھ مولانا محمد علی جوہر کا کردار بھی انتہائی اہمیت کا حامل تھا۔ شریف الدین پیرزادہ صاحب نے اپنی کتاب Evolution of Pakistan (پاکستان منزل بہ منزل) میں مولانا محمد علی کا ذکر دیگر قارئین کے ساتھ پوری عقیدت مندی کے ساتھ کیا ہے۔ موصوف نے ۱۳ صفحات علامہ اقبال پر تحریر کئے اور اتنے ہی صفحات مولانا محمد علی پر لکھے ہیں۔

مولانا محمد علی مرحوم کی ہمہ گیر شخصیت پر اس انتہائی مختصر وقت میں تفصیل سے کچھ کہنا ممکن نہیں۔ آپ سب حضرات کو ان کے بارے میں انگریز مورخ ایچ جی۔ ویلز کا مقولہ یاد ہوگا کہ ''محمد علی نپولین کا دل،، برک کی زبان اور میکالے کا قلم رکھتے تھے۔'' اس مقولہ میں ان کی جرأت و شجاعت، ان کی خطیبانہ مہارت اور ان کی انگریزی تحریر کی فصاحت و بلاغت کو مختصراً بیان کر دیا گیا ہے۔ ان کے واقعات زندگی سے اس کی بیسیوں مثالیں دی جا سکتی ہیں۔

چند اہم صفات جن کا ذکر اس مغربی مورخ نے نہیں کیا اور جس کا وہ اہل بھی نہ تھا، وہ مولانا محمد علی کا اسلام اور اس کی روایات سے سچا عشق، قوم سے ان کی دردمندی اور اسلام و مسلمانوں کے

Marfat.com

لیےان کا جذبہ جاں نثاری وسرفروشی اور سیاسی آزادی کے لیےان کی تڑپ تھی اور پھراس سب کے ساتھ ان کی درویشانہ روش۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ اس میر کارواں میں وہ تمام صفات بدرجہ اتم موجود تھیں جن کو علامہ اقبال نے ایک قومی رہنما کے لیے ضروری قرار دیا ہے:

نگہ بلند ، سخن دلنواز ، جاں پرسوز
یہی ہے رخت سفر میر کارواں کے لیے

علی گڑھ اور آکسفورڈ کے اس اعلیٰ تعلیم یافتہ انسان کے لیے دنیاوی مال ومتاع اور جاہ و منصب کے دروازے کھلے ہوئے تھے۔ لیکن اس نے ذاتی منفعت اور شخصی اعزاز پر اسلام اور مسلمانوں کی خدمت کو ترجیح دی، بڑودہ کی چند سالہ اعلیٰ ملازمت اور وہ بھی ولی عہد بڑودہ کی دوستانہ پیشکش کی بناء پر، اس کی بے قرار اور دردمند طبیعت کے لیے کہاں سامان تسکین مہیا کرسکتی تھی۔ وہ زروسیم اور جاہ ومنصب کے لیے پیدا نہیں ہوا تھا۔ وہ ایک مرد درویش تھا اور

مرد درویش کا سرمایہ ہے آزادی و مرگ
ہے کسی اور کی خاطر یہ نصاب زروسیم

وہ تو پیدا ہی اس لیے ہوا تھا کہ سوئے ہوئے مسلمانوں کو خواب غفلت سے جگائے، ان کو جھنجوڑے، انگریز آقاؤں کی آنکھ میں آنکھ ڈال کر بات کرنا سکھائے یہ اس وقت کی بات ہے جب برطانیہ عظمیٰ ہی دنیا کی سوپر پاور تھی۔

آپ حضرات کو یاد ہوگا کہ اللہ کے اس شیر نے کراچی کے اپنے مشہور مقدمہ بغاوت میں انگریز جج کو مخاطب کر کے کہا تھا کہ اگر تم نے میرے نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کی شان میں ایک بھی گستاخانہ لفظ کہا تو میرا دینی فریضہ ہوگا کہ اس کمرۂ عدالت میں، میں تمہاری جان لے لوں، شاید علامہ اقبال مرحوم نے اسی اللہ کے شیر کے لیے کہا تھا۔

آئین جواں مرداں حق گوئی و بیباکی　　　اللہ کے شیروں کو آتی نہیں روباہی

مولانا محمد علی مرحوم کی زندگی کا ایک ایک لمحہ اس کی شہادت دیتا ہے کہ انہوں نے کبھی روباہی سے کام نہیں لیا، پورے وثوق کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ حق گوئی و بے باکی ان کی زندگی کا سب سے اہم شعار تھا، اس کے لیے انہوں نے قید وبند کی صعوبتیں برداشت کیں (وہ سات سال

Marfat.com

انگریزوں کی جیل میں رہے) ''کامریڈ'' (انگریزی) اور ''ہمدرد'' کی بندش سے مالی نقصان برداشت کیا، اپنے بعض مصلحت کیش دوستوں کو بھی ناراض کیا۔ مگر حق پسندی و حق گوئی کا جو راستہ انہوں نے اختیار کیا تھا، اس سے سر مو انحراف نہیں کیا۔ آپ انگریزی ادب و سیاست کے اس شناور کے (جس کو ان کی اسلام پسندی اور داڑھی کی وجہ سے مولانا کا لقب مل گیا تھا) لندن کی گول میز کانفرنس ۱۹۳۰ء میں بیماری کی حالت میں کرسی پر بیٹھے ہوئے تقریر کرتے ہوئے وہ الفاظ پڑھیے جو اس نے ایک انگریز وائسرائے کے حق میں کہے تھے۔ اس نے کہا تھا:

''میں اور میرے بھائی پہلے دو شخص تھے جنہیں لارڈ ریڈنگ نے جیل میں بھجوایا، میں اس معاملہ میں ان سے کوئی بغض نہیں رکھتا، نہ مجھے ان سے کوئی شکایت ہے لیکن میں بھی اتنا اختیار چاہتا ہوں، اتنی قوت چاہتا ہوں کہ اگر لارڈ ریڈنگ ہندوستان میں پھر کسی غلطی کے مرتکب ہوں تو میں بھی انہیں جیل بھجوا سکوں۔''

پھر اس موقع پر اس آزادی کے متوالے کے یہ الفاظ سنئے:

''میں اپنے ملک واپس جانا چاہتا ہوں، لیکن صرف اس صورت میں کہ اپنے ساتھ پروانۂ آزادی لے کر جاؤں، بصورت دیگر میں غلام ملک میں واپس نہیں جاؤں گا، اور آپ اگر ہندوستان کی ہمیں آزادی نہیں دے سکتے تو آپ کو یہاں قبر کے لیے مجھے دو گز زمین دینا پڑے گی۔''

اللہ تعالیٰ نے مولانا محمد علی کی یہ آرزو پوری کی، وہ غلام ملک واپس نہ آئے، چھ ہفتہ بعد انہوں نے لندن میں دنیا سے ۴ جنوری ۱۹۳۱ء کو رحلت کی اور اپنی وصیت کے مطابق بیت المقدس میں دفن ہوئے، یعنی مسجد اقصیٰ کا صحن جو کعبہ کے بعد دنیا میں سب سے مقدس مقام ہے۔

بعض لوگ کہتے ہیں کہ مولانا محمد علی نے گاندھی کے ساتھ تعاون کیا ''وہ کانگریس میں شامل رہے ہیں۔'' لیکن یہ معترضین بھول جاتے ہیں کہ قائداعظم محمد علی جناح بھی ۱۹۲۰ء تک کانگریس کے ممبر رہے تھے انہوں نے اپنی سیاسی زندگی کا آغاز ہی کانگریس سے کیا تھا، بلکہ ۱۹۱۳ء اور ۱۹۱۴ء میں لندن کو جانے والے کانگریسی وفد کی قیادت بھی انہوں ہی نے کی تھی، وہ اس وقت

Marfat.com

صرف مسٹر ایم اے جناح تھے اور سب لوگ یہ بھی جانتے ہیں کہ قائداعظم انگریزوں سے آزادی کی خاطر ہندو مسلم اتحاد کے زبردست علمبردار تھے۔ لیکن بعد کو ہندوؤں کی تنگ نظری اور تعصب سے بیزار ہو کر انہوں نے مسلم لیگ میں شمولیت اختیار کی۔ یہی معاملہ مولانا ظفر علی خان اور مولانا حسرت موہانی وغیرہ جیسی مخلص اور قوم کا درد رکھنے والی شخصیات کا ہے۔

یہ بھی یاد رہے کہ اسی سال یعنی ۱۹۱۳ء میں مولانا محمد علی نے آل انڈیا مسلم لیگ کے لندن جانے والے وفد کی قیادت کی تھی تا کہ وہاں مسجد شہید گنج کانپور کے واقعہ کے بارے میں برطانوی عوام اور حکومت کو صحیح حقائق سے آگاہ کر سکیں۔

کانگریس سے تعاون کو مولانا محمد علی (Marriage of convenience) مصلحت آمیز شادی سے تعبیر کرتے تھے، گاندھی کے ساتھ ان کی رفاقت محض ہندوستان کی آزادی کی خاطر تھی، وہ ہندوستان اور متحدہ قومیت کے علمبردار ہرگز نہ تھے، انہوں نے اپنے انگریزی اخبار کامریڈ کے سب سے پہلے شمارے میں لکھا تھا کہ ''ہمارا اس صدائے بازگشت پر کوئی ایمان نہیں کہ ہندوستان متحد یا ایک ہے'' مسئلہ خلافت کے دوران ان کو اس تعاون کا فائدہ ہوا۔ لیکن ان کو بھی رفتہ رفتہ ہندوؤں کی تنگ نظری اور تعصب صاف نظر آنے لگا اور وہ کانگریس سے دور ہوتے گئے مولانا محمد علی کا مسئلہ خلافت کو لے کر اٹھنا ہی اس بات کی قوی دلیل ہے کہ وہ کسی طور بھی متحدہ قومیت کے قائل نہ تھے، بلکہ ہندوستان کے مسلمانوں کو ایک الگ قوم سمجھتے تھے اور یہی مسلم لیگ کا نقطہ نظر تھا۔ جس کو انہوں نے آخر میں پوری طرح اپنا لیا تھا۔

۱۹۲۷ء میں تیس سربرآوردہ مسلمان رہنماؤں کے ایک اجلاس میں جو قائداعظم کی صدارت میں ہوا تھا، دیگر مسلم لیگی رہنماؤں کے ساتھ مولانا محمد علی بھی شریک تھے۔

کانگریس مسلمانوں کو ایک اقلیتی فرقہ کہتی تھی، مولانا محمد علی نے اپنے آخری طویل خط میں جو انہوں نے لندن میں لکھوایا تھا کہا تھا کہ مسلمانوں کو ایک اقلیتی فرقہ کہنا ایک لغو اور فضول بات ہے وہ ایک مستقل قوم ہیں۔ یہ عیاں ہے کہ یہی وہ دوقومی نظریہ ہے جس پر پاکستان کی بنیاد رکھی گئی اور اس طرح مولانا محمد علی بھی تصور پاکستان کے خالقوں میں سے ایک ہیں۔

مولانا محمد علی مرحوم پہلی جنگ عظیم میں جرمنی کے ساتھ ترکی کی شکست کے بعد برصغیر

Marfat.com

میں جس شدت کے ساتھ مسئلہ خلافت کو لے کر اٹھے تھے اور ملک کے کونہ کونہ میں اس مسئلہ پر انہوں نے مسلمانوں کے دلوں میں جو آگ بھڑکا دی تھی اس کی وجہ سے وہ اور مسئلہ خلافت باہم مترادف ہو گئے تھے اس مسئلہ میں کمال اتاترک کے منفی اقدام اور دوسرے مسلمانوں کی سرد مہری سے ان کی بڑی دل شکنی ہوئی تھی۔

مسلمانوں کے اس اسلامی سیاسی نظام سے قلبی اور مخلصانہ لگاؤ کا اندازہ اس واقعہ سے لگایا جا سکتا ہے جو ان کے ایک قریبی رفیق کار اور سیرت نگار (رئیس احمد جعفری مرحوم) نے اپنی کتاب حیات محمد علی جوہر میں لکھا ہے، وہ لکھتے ہیں کہ مولانا محمد علی کو ۱۹۲۶ء میں مکہ مکرمہ کی زیارت کی موقع پر ان کے ایک رفیق نے کعبہ کے پردے سے لپٹ کر روتے ہوئے یہ دعا کرتے سنا کہ بارالٰہی تو مجھے خواہ جہنم میں ہی جھونک دے لیکن ایک بار ان آنکھوں کو پھر عہد خلافت دکھادے۔

مولانا محمد علی ایک مجاہدانہ کردار رکھتے تھے، ان کے اندر مجاہدوں کا سا جوش و خروش اور گرمی و حرارت تھی جو انہوں نے مسلمانوں کے اندر منتقل کی، لیکن انہوں نے تیسری دہائی میں اس کا ادراک کر لیا تھا کہ مسلمانوں کو انگریز اور ہندو دو دشمنوں سے قانونی طور پر نبٹنے کے لیے جو مرحلہ درپیش ہے اس کے لیے قائد اعظم محمد علی جناح سے بہتر کوئی لیڈر نہیں، اس لیے ۱۹۳۰ء میں بحالت مرض ان کی لندن کی گول میز کانفرنس کی روانگی کے وقت جب لوگوں نے ان سے دریافت کیا کہ اب مسلمانوں کی قیادت کون کرے گا تو انہوں نے کہا کہ محمد علی جناح اور صرف محمد علی جناح انہوں نے یہ بھی کہا تھا کہ میری خواہش اور دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کے دل میں یہ بات ڈال دے کہ وہ مسلمانوں کی قیادت کے لیے اپنی زندگی وقف کر دیں۔

اللہ تعالیٰ نے مولانا محمد علی کی خواہش پوری کی، قائد اعظم جو ان دنوں ہندوستانی سیاسی حالات سے دلگیر ہو کر لندن میں مقیم تھے بالآخر مسلمانوں کی مشترکہ خواہش و کوشش کے پیش نظر ہندوستان واپس آئے، امت مسلمہ کے بار قیادت کو سنبھالا اور برصغیر میں اس کے سفینہ کو سلامتی کے کنارے سے لگایا یعنی پاکستان اللہ تعالیٰ کی نصرت و تائید سے قائم کیا۔ مولانا محمد علی مرحوم کی روح کو اپنی قبر میں اس سے یقیناً تسکین ہوئی ہوگی، اللہ تعالیٰ ان پر رحمتوں کی بارش فرمائے اور ہمیں ان کا جیسا جذبۂ جہاد و خلوص نصیب فرمائے۔ آمین۔

Marfat.com

عمران خان کی شادی اور ڈاکٹر اسرار احمد کی بدگمانی
ایک فقہی، تاریخی اور لغوی بحث

انگلستان کے ایک مشہور و ممتاز خاندان کی ایک نومسلم خاتون سے عمران کی شادی آج کل محافل و اخبارات و رسائل کا موضوع سخن ہے۔ اس پر موافق و مخالف تبصرے خواتین و حضرات، دینی و لادینی حلقوں میں ہو رہے ہیں۔ میں نے اس میں کوئی خاص دلچسپی نہیں لی تھی، لیکن ۲۶ مئی ۱۹۹۵ء کا روزنامہ ڈان (میگزین سیکشن) پڑھ کر اور پھر دوسرے روز مجیب الرحمٰن شامی صاحب کا کالم ''یہودی سازش'' (جنگ ۲۷ مئی) دیکھ کر مجھے کچھ تھوڑا بہت اندازہ ہوا اور شامی صاحب کے کالم سے ہی متاثر ہو کر میں نے جنگ کے لیے ایک مضمون لکھا، جس کا تعلق شادی سے زیادہ عمران خان کی بیوی کے نام حائقہ یا حقہ کے بارے میں تھا، بہ عنوان ''عمران خان کی شادی اور لغت کے بکھیڑے'' جنگ کی اشاعت ۲ جون ۱۹۹۵ء میں چھپ چکا ہے اور جس میں اس نام کے معنی سے بحث کی گئی ہے۔

اس دوران مجھے میثاق کا تازہ شمارہ (ماہ جون) دیکھنے کو ملا۔ اس سے معلوم ہوا کہ ڈاکٹر اسرار صاحب نے اس شادی کو اپنے خطاب جمعہ ۱۹ مئی ۱۹۹۵ء کا موضوع بنایا اور ان کے نزدیک یہ شادی ایک یہودی سازش ہے اور سانحہ چرار شریف (مقبوضہ کشمیر) سے کم کوئی حادثہ نہیں۔ موصوف کا یہ خطاب جمعہ ''سانحہ چرار شریف اور حادثہ عمران خان۔ پس منظر اور خدشات'' کے عنوان سے مذکورہ شمارے میں چھپ چکا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ جناب شامی کا کالم اس کے رد میں تھا۔

اپنے اس جمعہ کے خطاب اور اب ایک شائع شدہ مضمون میں موصوف نے نہ صرف اس شادی کو سانحہ چرار شریف (مقبوضہ کشمیر) کے مماثل ایک حادثہ قرار دیا ہے، بلکہ ان کو نومسلم بیوی کے اسلامی نام حائقہ کو بھی یہودی کا اختیار کردہ نام اور ایک یہودی سازش بتایا ہے۔ شاید یہی

Marfat.com

برادرم مجیب الرحمٰن شامی کے کالم کا محرک تھا جس کا مجھے پہلے علم نہ تھا۔

کوئی شک نہیں کہ ڈاکٹر اسرار صاحب ایم بی بی ایس بہت دور کی کوڑی لائے ہیں اور دور کی کوڑی لانے میں تو وہ ماشاء اللہ بہت ماہر ہیں۔ قارئین کو شاید یاد ہو کہ گزشتہ سال ۳۰ اپریل ۹۴ء کو جنگ میں شائع شدہ اپنے مضمون میں انہوں نے یہ انکشاف فرمایا تھا کہ قائداعظم، گاندھی کی طرح متحدہ ہندوستان چاہتے تھے اور یہ کہ قیام پاکستان میں نہ ان کا کوئی رول تھا اور نہ برصغیر کے مسلمانوں کی جدوجہد اور قربانیوں کو اس میں کوئی دخل تھا، بلکہ یہ برطانوی تدبیر تھی اور مسلمانوں کو اللہ کی دین۔ اس پر غیرت مند پاکستانیوں اور محبان قائداعظم کی طرف سے ''جنگ'' کے صفحات پر کافی لے دے ہوئی تھی اور یہ وہ بات ہے جو پانچویں عشرے میں بھارت کی حکومت نے مڈل ایسٹ کے عرب ممالک مصر و شام میں زور سے پھیلائی تھی کہ پاکستان انگریزوں نے بنایا ہے، اور میں وہاں اکثر پڑھنے لکھے حلقوں میں اس کی تردید کرتا تھا۔ اب جناب موصوف نے عمران خان کی شادی کو برسر منبر ایک یہودی سازش قرار دے کر ایک اور بڑا انکشاف کیا ہے۔ اللہ کرے ''زور بیاں'' اور زیادہ۔

اگرچہ عمران خان اور ان کی بیوی روزنامہ جنگ کی ۲۸ اور ۲۹ مئی کی اشاعتوں میں ان اتہامات اور خدشات کا تفصیلی اور مدلل جواب دے چکے ہیں، لیکن فقہی اور تاریخی حیثیت سے کہنے کو ابھی بہت کچھ باقی ہے۔ ہم یہاں مختصراً ڈاکٹر اسرار کے لایعنی فتوے اور ان کے لفظ حائقہ کی لغوی تشریح پر کچھ روشنی ڈالنا ضروری سمجھتے ہیں۔

اولاً موصوف فرماتے ہیں: ''جہاں تک خالص فقہی معاملہ ہے کسی مسلمان کا کسی عیسائی یا یہودی عورت سے شادی کرنا بالکل جائز ہے۔ اگرچہ وہ عیسائی یا یہودی رہے، کوئی اسے حرام نہیں کہتا۔ یہ دوسری بات ہے کہ میں اسے ''اب'' مکروہ کہتا ہوں۔''

نہ معلوم کس احمق نے ڈاکٹر اسرار صاحب ایم بی بی ایس کے کان میں ڈال دیا ہے کہ وہ فتویٰ دینے کے اہل ہیں۔ موصوف کی یہ انا (میں) قابل غور ہے کہ ائمہ مذاہب اور فقہائے امت اگرچہ ہر چند ایسی شادی کو جائز کہیں، لیکن وہ اسے ''اب'' مکروہ کہتے ہیں۔

دوسری بات یہ کہ موصوف نے ایسی شادی کو ایک فقہی معاملہ کہا ہے۔ حالانکہ یہ صریحی

Marfat.com

قرآنی اباحت ہے جس کا ذکر سورۃ المائدہ کی پانچویں آیت میں ہے (پاکدامن مسلمان عورتیں اور اہل کتاب کی پاکدامن عورتیں ادائیگی مہر کے بعد تمہارے لیے جائز ہیں) اصطلاحاً فقہی معاملات ومسائل تو ان کو کہا جاتا ہے جو فقہاء و مجتہدین نے مسلمہ اصول فقہ، اجماع، قیاس اور استحسان و مصالح مرسلہ وغیرہ کی روشنی میں استنباط کیے ہیں یعنی اجتہادی مسائل جن میں ائمہ مذاہب و فقہائے امت کے مابین اختلاف کی گنجائش ہے جب کہ زیر بحث شادی کا جواز تو ایک قرآنی مسئلہ ہے اور اس لیے بہت سے فقہائے متقدمین جیسے حنفی فقیہ، الجصاص، مالکی فقیہ ابو بکر ابن العربی اور شافعی فقیہ الکیا ہراسی وغیرہ نے ''احکام القرآن'' کے نام سے علیحدہ علیحدہ کتابیں لکھی ہیں۔

پھر یہاں تو یہ مسئلہ درپیش ہی نہیں کہ عمران خان کی بیوی شادی سے قبل اسلام قبول کر چکی ہیں ورنہ ہم ان کو بتاتے کہ صحابہ کرام میں سے حضرت حذیفہؓ بن الیمان اور طلحہؓ بن عبید اللہ نے یہودی عورتوں سے شادی کر تھی۔ (ملاحظہ ہو احکام القرآن از جصاص، جلد ۳ صفحہ ۲۴، ۲۵) اور پھر اموی عہد میں بھی جو تابعین کا زمانہ ہے، شام اور اندلس میں ایسا ہوتا رہا۔

اس غیر متعلق بحث میں ڈاکٹر اسرار احمد نے ایک بڑا مغالطہ دینے کی کوشش کی ہے کہ ''جب اس کی اجازت دی گئی تھی اسلام غالب تھا اور یہودی و عیسائی مغلوب تھے'' اور اس لیے ''اب'' ان کی دانست میں یہ مکروہ ہے۔

حیرت کا مقام ہے کہ ان ''مفسر قرآن'' کو یہ یاد نہ رہا کہ سورۃ المائدہ کا نزول کب ہوا تھا، کیونکہ ۶ ھ کے اواخر یا ۷ ھ کے اوائل میں جب کتابیات (یہودی و عیسائی عورتوں) سے شادی کے جواز کا یہ حکم نازل ہوا تھا، اس وقت اسلام بیرونی دنیا تو کیا جزیرۂ عرب میں بھی غالب نہ تھا اور اس کے بہت بعد ۹ ھ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بیزنطینی عیسائی حکومت کی شمال میں پیش قدمی روکنے کے لیے ایک بڑی فوج کے ساتھ غزوہ تبوک کے لیے جانا پڑا تھا اور حضور ﷺ کی وفات کے وقت ایک لشکر حضرت اسامہ بن زیدؓ کی قیادت میں پھر شام کی جنوبی سرحد پر عیسائیوں کے خلاف ایک مہم پر جانے والا تھا، جس کو حضرت ابو بکرؓ نے بعد میں روانہ کیا۔ سو اسلام کا غلبہ اور اہل کتاب کی مغلوبیت ایسی شادی کے جواز کا سبب نہ تھی۔ اب قارئین خود ہی ڈاکٹر اسرار احمد کی قرآن فہمی اور تاریخ دانی کا اندازہ لگا سکتے ہیں جس کی موصوف نے بہت دھوم مچا رکھی ہے۔

Marfat.com

ڈاکٹر صاحب موصوف کو معلوم ہوگا کہ حلال، حرام، مباح، مستحب، مکروہ، شرعی اصطلاحات ہیں، اور کسی مباح چیز کو بغیر کسی دلیل شرعی کے مکروہ کہہ دینا شرعاً درست نہیں۔ اور پھر سب لوگ جانتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ایک زوجہ محترمہ یعنی ام المومنین حضرت صفیہؓ ایک یہودی سردار حیی بن اخطب کی صاحبزادی تھیں، اور یہ سن لیجئے کہ آنحضرت ﷺ نے ایک بار کس محبت بھرے انداز سے ان کی دل جوئی فرمائی۔ طبقات ابن سعد (جلد اول) اور مشہور محدث ومصنف سیرت نبوی ابن سید الناس نے اپنی کتاب ''عیون الاثر فی فنون المغازی والسیر'' میں لکھا ہے کہ ایک بار جب حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ام المومنین حضرت صفیہؓ کے حجرے میں تشریف لائے تو دیکھا کہ وہ رو رہی ہیں۔ حضور ﷺ کے دریافت کرنے پر انہوں نے بتایا کہ حضرت عائشہؓ اور حضرت حفصہؓ نے ان کو طعنہ دیا ہے کہ ہم تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قبیلے سے ہیں اور ان کی بیویاں ہیں، ہم تم سے بہتر ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ ''تم نے ان سے یہ کیوں نہ کہا کہ میرے والد ہارونؑ (حضرت صفیہؓ کا شجرہ ان تک پہنچتا ہے) نبی تھے، میرے چچا موسیٰ نبی تھے اور میرے شوہر محمد ﷺ نبی ہیں۔'' جس سے وہ خوش ہوگئیں۔

یہی نہیں، انہی دونوں مستند کتابوں میں یہ بھی مذکور ہے کہ حضرت صفیہؓ حضرت عمرؓ کے زمانہ میں اس مال سے جو عظیم فتوحات کے نتیجہ میں بیت المال سے دوسری ازواج مطہرات کی طرح ان کو ملتا تھا، اپنے یہودی اقارب کے ساتھ صلہ رحمی فرمائی تھیں۔ مزید یہ کہ انہوں نے اپنی وفات سے قبل وصیت کی تھی کہ ان کے ایک لاکھ درہم کے ترکہ میں سے ایک تہائی ان کے ایک یہودی بھانجے کو دیا جائے جو واقعتاً دیا گیا، ان کا انتقال حضرت معاویہ کے عہد میں ۵۰ھ میں ہوا۔

رسول رحمت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا تو یہ اسوہ ہے اور جناب ڈاکٹر اسرار احمد عمران خان کی بیوی کے پاکستان آنے سے قبل ہی اس شادی کو ایک یہودی سازش کہہ کر اس نومسلم عورت کی دل شکنی کر رہے ہیں اور اس کے اور اس کے خاندان کے متعلق بدگمانیاں پھیلا رہے ہیں۔ کیا ان کو یہ زیب دیتا ہے! کیا ان مفسر قرآن اور مبلغ اسلام کو قرآن کریم کا یہ حکم یاد نہیں کہ ''اے اہل ایمان بہت سی بدگمانیوں سے بچتے رہو۔ کہ بعض بدگمانیاں تو گناہ ہیں۔'' (الحجرات۔۱۲) ان کو تو اس موقع پر خوش ہونا چاہیے تھا اور دعا کرنی چاہیے تھی کہ اللہ تعالیٰ اس کو اسلام پر قائم رکھے اور اس کے

Marfat.com

ماں باپ کو اسلام کی ہدایت دے۔

ثانیاً۔ اس کے بعد ایک ذیلی عنوان ''پس منظر۔ ممکنہ سبب'' کے تحت وہ فرماتے ہیں کہ ''یہ شخص جو ایک مسلم فنڈا مینٹلسٹ کے روپ میں ابھر رہا تھا اس کو گولڈ اسمتھ کے یہودی خاندان نے اچک لیا ہے، جکڑ لیا ہے، تاکہ یہ کرکٹ اسٹار فنڈا مینٹلسٹ بن کر، میدان میں آ کر بارود میں آگ نہ لگا دے، لہٰذا یہودیوں نے اس کو قابو میں لانا ضروری سمجھا۔''

اب تضاد دیکھئے کہ ایک طرف تو ڈاکٹر اسرار احمد عمران خان کو مسلم فنڈا مینٹلسٹ (بنیاد پرست) قرار دیتے ہوئے ان کی تعریف فرما رہے ہیں اور اپنے مضمون کے دوسرے ہی صفحہ میں ان کی شادی کو اک اسکینڈل کا نتیجہ بتا رہے ہیں، اور ان کے الفاظ میں ''جس سے بچنے کے لیے وہ لندن میں شادی کا اعلان ہوتے ہی سراسیمہ ہو کر یہاں سے بھاگا'' (میثاق، جون ۹۵ء۔ صفحہ ۱۴)۔ اس کے بعد موصوف نے اس سکینڈل پر کچھ مزید خامہ فرسائی کی ہے اور یہ سب ظن و تخمین کی باتیں ہیں۔ کوئی ٹھوس ثبوت پیش نہیں کیا گیا۔ کیا ان کی ان باتوں پر ''ان بعض الظن اثم'' (بعض گمان گناہ ہوتے ہیں) کا اطلاق نہیں ہوتا؟

پھر ان امیر تنظیم اسلامی اور تحریک اسلامی خلافت کے داعی کی بدگمانی اور ''اشاعت فاحشہ'' کا یہ عجیب انداز ہ دیکھئے کہ ایک طرف تو وہ فرماتے ہیں: ''جہاں تک میرا اور تحریک خلافت سے وابستہ میرے ساتھیوں کا معاملہ ہے، ہمیں نہ تو ان دو طرفہ سکینڈلز سے کوئی دلچسپی ہے جو اخبارات میں آ رہے ہیں کہ اتنی عورتوں کے دل ٹوٹ گئے، فلاں کا یہ ہو گیا، ہمیں اس سے کوئی دلچسپی نہیں کہ کس کس سے معاشقے رہے۔'' اور دوسری ہی سانس میں فرماتے ہیں بلکہ مسجد جمعہ میں سب کے سامنے اپنے خطاب میں علی اعلان کہتے ہیں: ''جو شخص اس مغربی ماحول میں پلا بڑھا ہو۔ آخر بیالیس برس کی عمر تک کیا وہ تجرد و پارسائی کی زندگی گزارتا رہا ہو گا؟ تو اس کے حوالے سے جو جنسی سکینڈلز اخبارات میں شائع ہو رہے ہیں۔ ممکن ہے ان میں کچھ حقیقت بھی ہو۔''

نماز جمعہ سے قبل اپنے خطاب میں عمران خان کی گزشتہ زندگی کے متعلق باتیں اچھالنے والے یہ مبلغ اسلام اپنے سامعین و قارئین کو کیوں بیوقوف بنا رہے ہیں؟ کیا یہ وہ صورت نہیں کہ یہ کہہ کر ہم کو اس اس سے کوئی دلچسپی نہیں سب کچھ کہہ دیا جائے اور افسوسناک بات یہ ہے کہ سارے

Marfat.com

خدشات اور دعاؤں کے بعد مضمون کے آخری صفحہ پر موصوف اس بہتان و ''اشاعت فاحشہ'' کو پھر دہراتے ہیں اور فرماتے ہیں: ''لیکن عمران خان یہاں سے جس انداز میں سراسیمہ ہو کر بھاگے ہیں۔ یہ پس منظر تو ثابت کر رہا ہے کہ یہ ایک اسکینڈل ہے، جس میں وہ گرفتار ہو گئے ہیں۔''

میں یہ مضمون عمران خان کے دفاع میں نہیں لکھ رہا ہوں، نہ میرا ان سے کوئی تعارف ہے، اور نہ مجھ کو کرکٹ سے کوئی خاص لگاؤ ہے، نہ میں ان کا فین (Fan) ہوں۔ میں نے تو محض احقاق حق اور اسلامی قدروں کے دفاع میں قلم اٹھایا ہے۔

ان نام نہاد سکینڈلز کے بارے میں ''واقعاتی شہادت'' کی دہائی دینے والے مفسر قرآن سے قارئین یہ پوچھنے میں حق بجانب ہیں کہ کیا وہ واقعہ ''افک'' کے ملزمان (حضرت عائشہ صدیقہؓ پر بہتان لگانے والوں) کے بارے میں یہ قرآنی وعید بھول گئے ہیں: ''ان الذین یحبون ان تشیع الفاحشة فی الذین آمنوا لهم عذاب الیم فی الدنیا و الاخرة'' یعنی جو لوگ یہ پسند کرتے ہیں کہ اہل ایمان کے بارے میں فحش باتوں کی اشاعت کی جائے (ان سے بدکاریاں منسوب کی جائیں) ان کے لیے دنیا و آخرت میں دردناک عذاب ہے۔

واقعہ افک میں نازل ہونے والی اس آیت کریمہ کا حکم اصول فقہ کے مطابق عام ہے اور اسلام نے اپنے متبعین کو اس طرح یہ معاشرتی ادب سکھایا ہے کہ کسی کلمہ گو کے بارے میں بدکاری کی باتیں نہ پھیلائی جائیں۔ اس وعید قرآنی کے بالمقابل پارسائی کا یہ کون سا انداز ہے کہ اخبارات میں شائع شدہ جنسی اسکینڈلز کی خبروں کی ایک بڑی مسجد کے منبر سے تشہیر و تائید کی جائے۔ اس سے تبلیغ اسلام کی کون سی خدمت انجام دی جا رہی ہے؟ اخلاق حسنہ کا کون سا درس دیا جا رہا ہے؟ نبی اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تو یہ فرمایا ہے: ''راہ راست کی طرف لوگوں کی رہنمائی کرو، ان کو (اسلام سے) قریب کرو، (نجات و مغفرت کی) خوشخبریاں سناؤ اور ان کے اندر (اسلامی احکام سے) نفرت پیدا نہ کرو۔'' (یہ ایک قدرے طویل صحیح حدیث کا ٹکڑا ہے، جو مختلف الفاظ میں بخاری و مسلم اور دوسری مستند کتب حدیث میں وارد ہے) اور ہمارے یہ محترم مبلغ و مفسر قرآن اپنی ان باتوں سے عمران خان، ان کی بیوی اور کتنے ہی مغربی تعلیم یافتہ نوجوانوں کے دلوں میں اسلام سے نفرت و بیزاری پھیلا رہے ہیں۔

Marfat.com

ثالثاً۔ڈاکٹر اسرار صاحب کے مذکورہ خطاب جمعہ اوراب مضمون کا آخری ذیلی عنوان ہے:
''حائقہ۔۔۔۔۔گھیرے میں لے لینے والی آفت'' اس میں موصوف نے لفظ حائقہ کے عجیب و غریب معنی بتائے ہیں، اور بدگمانی کے گھوڑے سرپٹ دوڑائے ہیں۔ یہی نہیں، میثاق کے ایڈیٹر اورڈاکٹر صاحب کے فرزند عاکف سعید صاحب نے اپنے اداریے میں اس نام کو موضوع بحث بنایا ہے اوراس کے لغوی معنی کے ذیل میں بعض دوسرے حضرات کی آراء بھی پیش کی ہیں، جوڈاکٹر اسراراحمد کے پیش کردہ معنی کی تائید میں ہیں۔

اس سے پہلے کہ میں اس پر کچھ کہوں یہ بتانا ضروری سمجھتا ہوں کہ ڈاکٹر اسرار صاحب کی عربی دانی کی حقیقت تو مجھ پر ان کے ایک مضمون ''پاک بھارت مفاہمت اور مسئلہ کشمیر کا حل'' (روزنامہ جنگ ۲۱،۲۴ مئی ۱۹۹۴ء) میں استعمال شدہ لفظ ''جنت الحمقاء'' سے کھل گئی تھی۔ راقم الحروف نے اپنے مضمون ''ڈاکٹر اسرار احمد، مسئلہ کشمیر اور درس مفاہمت'' (جنگ ۳،۴ جون ۹۴ء) میں اس کی تصحیح کردی تھی کہ صحیح لفظ الحمقیٰ (ح پر زبر اور میم پر جزم) ہے، جس کے معنی ہیں احمقوں کی جنت، جبکہ ''الحمقاء'' (ح پر زبر اور میم پر جزم اور الف کے بعد ہمزہ) عربی میں بیوقوف عورت کو کہتے ہیں اور یہ عربی ترکیب احمق عورت کی جنت کے لیے نہیں بلکہ احمقوں کی جنت کے لیے استعمال ہوتی ہے (اور حمقاء، ح پر پیش اور میم پر زبر یعنی علماء، شرفاء کے وزن پر کوئی لفظ نہیں ہے، کیونکہ عربی زبان میں جمع تکسیر سماعی ہوتی ہیں، یعنی قدیم فصحائے عرب سے جس طرح جس لفظ کی جمع سنی گئی اس طرح وہ جمع کا صیغہ استعمال ہوتا ہے۔ اس میں قیاس کا کوئی دخل نہیں) اور اسی حمقیٰ کے وزن پر بہت سے دوسرے جمع کے صیغے بھی ہیں جو قرآن میں بھی استعمال ہوئے ہیں جیسے مرضیٰ (سورۃ المائدہ میں) اسریٰ (سورۃ انفال میں) الموتیٰ (سورۃ البقرۃ اور دوسری سورتوں میں اسی طرح غرقیٰ، ہلکیٰ، وغیرہ ہیں، جن کے معنی علی الترتیب بیمار لوگ، قیدی لوگ، مردے، غرق شدہ لوگ، ہلاک شدہ لوگ ہیں اور یہ مریض، اسیر، میت، غریق، ہالک، کی جمعیں ہیں۔

اگر ایسی غلطی (جنت الحمقیٰ کو جنت الحمقاء لکھنا) کوئی اردو کا عام ادیب، شاعر، مصنف کرے تو قابل قبول ہوسکتی ہے، لیکن جو مفسر قرآن ہیں اور جن کو عربی دانی کا دعویٰ ہے، ان سے ایسی غلطی قابل قبول نہیں۔ اس لیے ایک ایسا ''عالم وعربی داں'' لفظ ''حائقہ'' کے وہ عجیب وغریب

Marfat.com

معنی لکھے جو میثاق کے مذکورہ شمارے میں ہیں تو اس کی کیا قیمت ہو سکتی ہے:

موصوف نے مذکورہ بالا ذیلی عنوان کے تحت پیالے میں طوفان اٹھانے کی بے کار کوشش کی ہے اور ''حائقہ'' کے معنی گولڈ اسمتھ خاندان کی یہودیت اور طاقت کے مبالغہ آمیز ذکر کے بعد یہ دیئے ہیں ''اوپر سے مسلط ہونے والا عذاب جو گھیرے میں لے لے'' اور پھر اس لفظ کے غلط معنی بتانے کے بعد وہ حسب معمول دور کی کوڑی لانے کی ناکام کوشش کرتے ہیں اور فرماتے ہیں: ''تو یہ حائقہ جو نام رکھا گیا ہے، محض اتفاق نہیں ہے بلکہ ''جادو جو سر چڑھ کر بولے'' کا مصداق ہے۔

(موصوف اپنی تحریروں میں مصداق کا یہ پرانا اور گھسا پٹا لفظ استعمال کرنے کے بہت ہی شوقین ہیں اور اس سے وہ اپنی عربیت کا اظہار کرنا چاہتے ہیں) مزید فرماتے ہیں: ''یا تو یہ بات ہے کہ اب انہیں کوئی اندیشہ نہیں ہے، جو کریں گے کھل کر کریں گے، لہٰذا نام کا انتخاب بھی اسی منصوبہ کا حصہ ہے۔ حائقہ عربی نام ہے جو یقیناً سوچ سمجھ کر رکھا گیا ہوگا۔''

لیجئے نام نہاد ''یہودی سازش'' کا منصوبہ اس طرح مکمل ہوا کہ حائقہ کا نام بھی یہودیوں نے (گولڈ اسمتھ خاندان) ہی رکھا ہے اور یہ نام بھی شادی کے سازشی منصوبے کی طرح بقول ڈاکٹر اسرار احمد اس کا ایک حصہ ہے۔

شاید مبلغ موصوف کو الہام ہو گیا کہ گولڈ اسمتھ خاندان عربی زبان کا بھی بہت ماہر ہے اور انہوں نے اپنی بیٹی کو ایک عذاب کے طور پر عمران خان پر مسلط کیا ہے۔ ڈاکٹر اسرار احمد صاحب امیر تنظیم اسلامی ہوں، مستقبل میں خلیفۃ المسلمین کے منصب کے امیدوار ہوں؟ جو کچھ بھی ہوں، عربی زبان ان کے تابع نہیں، ان کو اس میں تصرف کرنے کا کوئی حق نہیں۔

حائقہ کے جو معنی انہوں نے تحریر فرمائے ہیں: ''گھیرے میں لینے والی آفت'' اور ''اوپر سے مسلط ہونے والا عذاب جو گھیرے میں لے لے۔'' اس کا کسی عربی لغت میں کہیں ذکر نہیں، یہ ان کی اختراع ہے۔ میثاق کے اداریے میں ڈاکٹر اسرار صاحب کے فرزند حافظ عاکف سعید نے اس حائقہ کے نام سے بحث کرتے ہوئے اس کے مذکورہ بالا معنی کو اپنے والد بزرگوار کا ایک انکشاف کہا ہے اور اس معنی کی تائید میں انہوں نے لاہور سے پاکستان کے مشہور شاعر جناب عبدالعزیز خالد کا وہ قول پیش کیا ہے جو نوائے وقت کی ۲۳ مئی کی اشاعت میں ''سرراہے'' کے کالم میں چھپا ہے۔ جس

Marfat.com

میں یہ مشہور شاعر صاحب فرماتے ہیں: ''حاقہ کا مادہ (ح ی ق) ہے اور اس کے معنی ہیں آسمان سے اترنے والا عذاب لہٰذا ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کی یہ بات بالکل درست ہے کہ حاقہ ''بلائے آسمانی'' کو کہا جاتا ہے اور اس کے لیے انہوں نے قرآن سے وہی مثال دی ہے: ''وحاق بهم ما كانوا به يستهزؤن'' یعنی کافروں کو اس عذاب نے گھیر لیا جس کی وہ ہنسی اڑاتے تھے۔

ڈاکٹر اسرار اگر ایک عمدہ اور پیشہ ور خطیب ہیں تو عبدالعزیز خالد صاحب ایک ممتاز شاعر ہیں جو اپنی غزلوں اور نظموں میں بہت ثقیل اور غیر مانوس الفاظ استعمال کرتے ہیں، لیکن ہم کو یہ معلوم نہ تھا کہ وہ عربی زبان کے بھی بڑے ماہر ہیں۔ تو اب یہ دونوں صاحبان اور ان کے ساتھ قارئین اور نوائے وقت کے ''سرراہے'' کے کالم نویس جان لیں کہ کسی عربی لغت میں حاقہ کے وہ معنی نہیں آئے ہیں جو ان صاحب نے بیان کئے ہیں اور اس سے تو یہ دونوں حضرات اتفاق ہی کریں گے کہ قرآن میں کہیں بھی لفظ ''حاقہ'' نہیں آیا ہے اور نہ کسی لغت میں یہ لفظ وارد ہے۔

قرآن کریم میں ایک لفظ ''حاق'' آٹھ سورتوں میں نو بار آیا ہے۔ سورۃ الانعام، سورۂ ہود، سورۃ النحل، سورۃ المومن، سورۃ الزمر وغیرہ میں جو ماضی کا صیغہ ہے اور صرف ایک بار سورۃ فاطر میں ''یحیق'' آیا ہے جو مضارع کا صیغہ ہے، جس سے یہ بات متعین ہوتی ہے کہ عربی کا مصدر جس سے قرآن میں حاق اور یحیق کے دو لفظ استعمال ہوئے ہیں وہ (حیق) ہے اور جس کی طرف عبدالعزیز صاحب نے درست اشارہ کیا ہے۔

لیکن وہ بھول گئے کہ ایک اور مادہ (ح و ق) بھی ہے، اس سے بھی ماضی کا صیغہ (حاق) آتا ہے، لیکن ان دونوں (حیق) و (حوق) کے معانی بہت بڑا فرق ہے اور یہی عربی زبان کی وسعت اور نزاکت ہے اور یہیں ڈاکٹر اسرار صاحب نے ٹھوکر کھائی ہے کہ قرآن میں واقع لفظ (حاق) کو (حوق) سے ماضی سمجھا ہے جس کے متعدد معانی، ملنا جھاڑو دینا وغیرہ کے ساتھ ایک معنی ''گھیرے میں لینے'' کے بھی ہیں اور یہ معنی ایسے لفظ ''حوق (پیش کے ساتھ) سے ماخوذ ہیں جس کو فحش سمجھا جائے گا۔ ڈاکٹر اسرار صاحب اور جناب خالد عبدالعزیز صاحب اس معنی کو اسی مادہ کے تحت لسان العرب اور القاموس المحیط میں دیکھ لیں۔ قرآن مجید کا یہ اعجاز ہے کہ اس نے صرف ایک بار سورۃ الفاطر میں مضارع کا ایک صیغہ (یحیق) استعمال کر کے یہ نشاندہی کر دی کہ اس

Marfat.com

کتاب الٰہی میں جہاں کہیں (حاق) کا لفظ استعمال ہوا ہے وہ ایک فحش لفظ (حوق) سے نہیں بلکہ (حیق) سے ماخوذ ہے۔

پھر یہ کہ تنہا لفظ (حاق) سے اگر وہ مادہ (حوق) سے ماخوذ بھی مان لیا جائے تو اس کے معنی میں ''عذاب اور آفت'' کا اضافہ ڈاکٹر اسرار صاحب کی ایجاد ہے، لغت کی کتاب میں کہیں ایسا نہیں۔ اس صورت میں اس کے معنی صرف وہ ہیں جو حاطہ ''یحوط، حوطاً یا احاط یحیط احاطۃ کے ہوتے ہیں۔ چوتھی صدی ہجری کے ایک مایۂ ناز لغت داں احمد بن فارس متوفی ۳۹۵ھ نے مادہ الفاظ (حوق) اور (حیق) کے فرق کو انتہائی خوبی اور صاف طور پر واضح کیا ہے۔

مادہ (حوق) کے تحت انہوں نے بتایا ہے کہ اس کے ایک معنی قریب قریب وہی ہیں جو (احاط) کے ہیں جب کہ اس کے فوراً بعد مادہ (حیق) کے ضمن میں وہ لکھتے ہیں: ''نزول الشئی بالشئی'' یعنی کسی ایک چیز کی وجہ سے دوسری چیز کا وارد ہونا ترتیب ہونا اور یہاں انہوں نے سورۃ فاطر کی آیت نمبر ۴۳ ''ولا یحیق المکر السیئی الا باھلہ' مثال کے لیے پیش کی ہے۔ یعنی بری چال کا شکار وہی ہوتا ہے جو ایسی چال چلے، یا فارسی کے محاورے میں ''چاہ کن را چاہ درپیش'' ملحوظ خاطر رہے کہ احمد بن فارس ایک بڑے مفسر قرآن بھی ہیں اور ان کی ایک اور کتاب لغت قرآن پر بھی ہے جو غیر مطبوع ہے۔

قرآن کریم میں جہاں کہیں (حاق) کا لفظ آیا ہے وہاں اس کے معنی ہیں کہ جن لوگوں نے عذاب آخرت کو جھٹلایا، اس کا مذاق اڑایا وہ اس میں ضرور گرفتار ہوں گے اور یہی وہ معنی ہیں جو مشہور ماہر لغت ونحو اور ادیب ومفسر قرآن زمخشری اپنی ایک منفرد کتاب ''اساس البلاغۃ'' میں مادہ (حیق) کے تحت لکھے ہیں، وہ لکھتے ہیں: تقول: الماکر لو بال امرہ ذائق، و مکرہ بہ حائق، وھو احمق ھائق ''یعنی تم (اپنی گفتگو میں) کہتے ہو کہ مکار آدمی اپنی چال کا خود ہی مزہ چکھتا ہے اور اپنی مکاری کے چکر میں خود ہی پھنستا ہے اور وہ بڑا بیوقوف اور گاؤدی ہوتا ہے۔

اس سے ملتے جلتے معنی عربی زبان کی انتہائی مستند، مفصل اور محققین کے مابین متداول لغت ''لسان العرب'' میں ہیں جو احمد بن فارس کی کتاب کے تقریباً چار سو سال بعد لکھی گئی اور یہی کچھ معروف متداول لغت القاموس المحیط میں بھی ہے، لیکن مختلف قدیم ماہرین لغت کے حوالوں سے

Marfat.com

اس معنی کو زیادہ وزن دیا گیا ہے جو ''معجم مقاییس اللغۃ'' میں مذکور ہیں اور جس کا ہم نے اوپر اشارہ کیا ہے اور ان ماہرین لغت میں الفراء کو خاص مقام حاصل ہے، جو معانی القرآن کے مصنف ہیں۔ نہ معلوم مذکورہ بالا ماہرین لغت اور ان کی کتابوں میں سے کتنوں کے نام جناب ڈاکٹر اسرار احمد کو معلوم ہیں؟

افسوس کہ جناب عبدالعزیز خالد نے بھی اس دقیق فرق کو ملحوظ نہیں رکھا جو اشتقاق کے ماہر اور قدیم لغت داں احمد بن فارس نے بیان کئے ہیں اور انہوں نے ڈاکٹر اسرار احمد کی تائید میں ''حائقہ'' کے وہ معنی یعنی ''بلائے آسماں'' بتائے جن کی کئی کتاب لغت سے آسمانی والے معنی تو المنجد جیسی عام عربی لغت اور عربی اردو کی لغت مصباح اللغات میں بھی نہیں پائے جاتے۔

ایک اور اہم اور عام فہم بات یہ ہے کہ عرب لغت نویسوں نے انہی لغات میں مختلف مادوں جیسے قرع، وقع، حق، طم، صخ، جاح اور حاض، وغیرہ الفاظ کے ضمن میں ان الفاظ سے ترکیب پانے والے اسماء افعال و اسمائے صفات یعنی القارعة، الواقعة، الحاقة، الطامة، الصاخة، الجائحة، الحائضة کا ذکر بھی کر دیا ہے اور ان کے معنی بھی دیئے ہیں جو عربی دان جانتے ہیں لیکن کسی بھی لغت کی کتاب میں حاق یا حیق یا حوق کے تحت لفظ حائقہ کا ذکر نہیں جس سے معلوم ہوا کہ اس لفظ کا استعمال عربی زبان میں نہیں اور یہ محض ڈاکٹر اسرار صاحب اور عبدالعزیز خالد صاحب کی اختراع ہے۔

لفظ حائقہ سے متعلق اس ساری دقیق لغوی بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ قرآن اور عربی لغات میں کہیں اس لفظ کا وجود نہیں اور اگر ''حاق'' کے صیغہ ماضی سے اس کا اسم فاعل مونث بھی استعمال کیا جائے تو اس میں آفت، بلا، عذاب کا مفہوم عربی لغات کے حوالے سے کہیں نہیں پایا جاتا۔ بات صرف اتنی ہے کہ قرآن میں متعدد مقامات پر عذاب آخرت کے جھٹلانے والوں اور مذاق اڑانے والوں کا جب ذکر کیا گیا ہے تو اس کے نتیجہ میں قیامت کے روز اس عذاب میں گرفتار یا مبتلا ہونے والوں کے لیے (حاق) کا فعل استعمال کیا گیا ہے، مگر خود اس لفظ ''حاق'' کے مادے میں عذاب کا مفہوم شامل نہیں۔ اب اس نام کو یہودیوں کی سازش اور منصوبہ کہنا تو سراسر مضحکہ خیز بات ہے۔

اس کے ساتھ ہی عمران خان کا یہ بیان بھی ریکارڈ پر ہے کہ انہوں نے اپنی بیوی کا نام قرآن میں ایک لفظ دیکھ کر رکھا ہے، یعنی وہ پہلا لفظ جو قرآن کا ایک صفحہ کھولنے پر ان کو نظر آیا، یعنی

Marfat.com

''حاقہ'' انگریزی میں (Haqqa) اور اردو اخبارات میں ''حقہ'' یہ سمجھ میں نہ آسکا کہ یہ بگڑ کر ''حائقہ'' کیسے اور کیوں ہو گیا، جس کا ''حاق'' کے صیغے کے ساتھ ربط کیا جاتا ہے اور ہم نے اپنے ایک شائع شدہ مضمون ''عمران خان کی شادی اور لغت کے بکھیڑے'' (جنگ ۲ جون) میں عمران خان سے درخواست کی تھی کہ وہ اپنی نومسلم بیوی کا نام ''حقہ'' ہی رہنے دیں کہ اس کے معنی حقانیت وصداقت کے ہیں اور ان کی بیوی نے اسلام کی حقانیت وصداقت سے متاثر ہوکر ہی اسلام قبول کیا ہے تو یہ نام زیادہ موزوں ہے اور میرے خیال میں یہ سارے پاکستانیوں کے دل کی آواز ہے۔

آخر میں عرض ہے کہ کسی نومسلم خاتون کا نام بدلنا بھی ضروری نہیں، حضور اکرم ﷺ نے حضرت ماریہ قبطیہ کا نام ماریہ ہی باقی رکھا، یہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے صاحبزادے ابراہیم کی والدہ تھیں۔ عمران خان نے بھی لوگوں کی طرف سے جھگڑا اٹھانے پر اپنی نومسلم بیوی کا نام بالآخر جمائما باقی رکھا۔

Marfat.com

تجزیہ و تنقید

Marfat.com

Marfat.com

سیرت نبوی پر ایک غیر معروف قدیم عربی کتاب

''الدین و الدولۃ'' (تصنیف: علی بن ربن الطبری المتوفی ۲۴۷ھ)

تحقیق و تقدیم: عادل نویہض، دارالافاق، بیروت، ط۱، ۱۳۹۳ھ، ۱۹۷۳ء

سیرت نبوی پر مختلف زبانوں میں بے شمار کتابیں لکھی گئی ہیں، مسلمانوں کے قلم سے بھی اور غیر مسلموں کے قلم سے بھی، ان میں مشہور ترین اور قدیم ترین کتاب مشہور مدنی مورخ محمد بن اسحٰق (وفات ۱۵۱ھ) کی ''المبتدا والمبعث والمغازی (ابتداء، بعثت و غزوات)'' ہے، جس سے بعد کے آنے والے تمام مورخین سیرت نے فائدہ اٹھایا اور اس پر اعتماد کیا ہے۔(۱) سیرت کی اس قدیم ترین کتاب کو عبدالملک بن ہشام نے کسی قدر اختصار کے ساتھ از سر نو ترتیب دیا۔ جو سیرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یا سیرت ابن ہشام کے نام سے مشہور و متداول ہے اور عصر حاضر کے تمام سیرت نگاروں کے لیے یہی بنیادی ماخذ ہے۔

زیر نظر کتاب بھی تقریباً اسی زمانہ یعنی تیسری صدی ہجری کے نصف اول میں لکھی گئی ہے، اس کی خصوصیت یہ ہے کہ یہ ایک عیسائی نومسلم کے قلم سے ہے جو ایک مشہور طبیب تھا اور صحیح روایت کے مطابق عباسی خلیفہ متوکل کے ہاتھ پر اسلام لایا اور اسی خلیفہ کی فرمائش اور اس کی مدد سے مصنف نے یہ کتاب لکھی۔

یہ کہا جا سکتا ہے کہ ایک نومسلم عیسائی کے قلم سے سیرت پر یہ قدیم ترین کتاب ہے۔ کتاب کا پورا نام ''الدین والدولۃ فی اثبات نبوۃ النبی محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم'' ہے۔ یعنی دین و مملکت۔ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نبوت کے اثبات کے بیان میں)

کتاب کی دوسری اہم ترین خصوصیت یہ ہے کہ اس میں نبوت محمدی ﷺ کو تورات و انجیل کے مفصل حوالوں سے ثابت کیا گیا ہے، جو ان بشارتوں پر مشتمل ہیں جو موسیٰ علیہ السلام، داؤد علیہ السلام،

۱۔ ابن اسحٰق کی کتاب کا ایک حصہ جو فاس (مراکش) میں دریافت ہوا تھا ڈاکٹر محمد حمید اللہ صاحب کی تحقیق سے چھپ چکا ہے۔

Marfat.com

اشعیا، میخا، حبقوق، زکریا، ارمیا، حزقیاں، دانیال، عیسیٰ علیہ السلام وغیرہ گیارہ انبیاء بنی اسرائیل نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت کے متعلق دی تھیں، جو ایک بے نظیر علمی کارنامہ ہے۔

زیر نظر کتاب کے تفصیلی جائزے سے پہلے اس کے مصنف کے بارے میں کچھ کہنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔

علی بن ربن طبری علمی حلقوں میں اپنی طبی کتاب ''فردوس الحکمۃ'' کے مصنف کی حیثیت سے مشہور ہے، یہ کتاب ڈاکٹر محمد زبیر صدیقی صاحب نے اپنی تحقیق کے ساتھ شائع کی۔ جو درحقیقت برلن یونیورسٹی سے ان کے ڈاکٹریٹ کے مقالہ کے لیے منظور ہوئی تھی اور برلن میں ۱۹۲۸ء میں چھپی، فردوس الحکمۃ طب کی قدیم ترین کتب میں سے ہے ابن ربن نے کئی سال کی محنت کے بعد اس کی تکمیل ۲۳۵ھ میں کی تھی۔

علی بن ربن طبیب اور فلسفی کی حیثیت سے کافی مشہور تھا قفطی نے اپنی کتاب اخبار الحکماء اور ابن ابی اصیبعۃ نے عیون الانباء فی طبقات الاطباء میں اس کا ذکر کیا ہے۔ محمد بن اسحٰق الندیم (غلط طور پر مشہور ابن الندیم) نے بھی کتاب الفہرست میں اس کا مختصر حال لکھا ہے، ابن خلکان کی وفیات الاعیان اور مسعودی کی مروج الذہب وغیرہ میں بھی اس کا نام ملتا ہے، ان میں سے بعض کتابوں میں اس کے والد کے نام میں اختلاف ہے، کہیں زین لکھا گیا ہے اور کہیں زید اور کہیں ربل اور کہیں علی بن سہل بن ربن یا علی بن سہل بن ربل لکھا گیا ہے، لیکن قدیم ترین ماخذ یعنی تاریخ طبری میں اس کا نام علی بن ربن متعدد بار آیا ہے (۱) اور قفطی اور یاقوت کے یہاں ہے۔ (۲) خیر الدین الزرکلی نے الاعلام (ج ۵) میں اور کتاب الدین والدولۃ کے محقق نے بھی یہی نام اختیار کیا ہے، قدیم وجدید مصنفین میں سے جنہوں نے اس کو علی بن سہل بن ربن لکھا ہے ان سے سہو ہوا ہے ربن بمعنی معلم اور وجیہ، علی کے والد سہل کا لقب تھا۔

علی بن ربن کے تفصیلی حالات، سن پیدائش اور سن وفات اور دوسرے ضروری امور کا ذکر ہم کو قدیم عرب تذکرہ نگاروں کی کتابوں میں نہیں ملتا۔ کہیں کہیں کچھ اشارات ابن ربن کی کتاب

---

۱ ملاحظہ تاریخ طبری، حوادث ۲۲۴ھ، وطبقہ دار المعارف، مصر، ج ۹ ص ۸۵، ۶۸، ۹۰، ۹۶۔

۲ قفطی: اخبار الحکماء، ص ۲۳۱، یاقوت، معجم الادباء۔ ۶/۴۲۹۔

Marfat.com

فردوس الحکمۃ اور ''الدین والدولۃ'' میں ملتے ہیں جن کی مدد سے کتاب الدین والدولۃ کے فاضل محقق الاستاد عادل نویہض نے ۱۹ صفحات کے اپنے مقدمہ کتاب میں علی بن ربن کے کسی قدر تفصیلی حالات مرتب کردیئے ہیں، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ:

۱۔ ان کا نام علی بن سہل بن الطبری ہے ربن اس کے باپ کا لقب تھا۔ جس کے معنی معلم و سردار(۱) کے ہیں اور اسی لقب سے وہ مشہور ہوا۔

۲۔ علی بن ربن الطبری کی ولادت ۱۵۸ھ اور ۱۶۰ھ کے مابین ہوئی۔

۳۔ وہ ۲۴۷ھ میں زندہ تھا اور اس وقت اس کی عمر ۸۷ سال کے قریب تھی اور اس کے بعد وہ زیادہ عرصہ زندہ نہیں رہا (اسی لیے خیر الدین زرکلی نے اس کا سنہ وفات ۲۴۷ھ لکھا ہے)۔

۴۔ طب کے علاوہ فلسفہ و ریاضیات میں کافی مہارت رکھتا تھا اور ساتھ ہی ساتھ اس کو مختلف ادیان کا بھی کافی علم تھا۔ خاص طور پر توراۃ وانجیل کا وہ ماہر تھا اور علم الجدل سے بھی اس کو شغف تھا (کتاب ''الدین والدولۃ'' اس پر شاہد ہے) عربی زبان کے علاوہ وہ سریانی اور یونانی زبانوں سے بھی واقف تھا۔(۲)

۱۔ مقدمہ فردوس الحکمہ بقلم ابن ربن ص ا، برلن ایڈیشن ۱۹۲۸ء

۲۔ ہم اس میں قدیم فارسی زبان کا اضافہ کرسکتے ہیں کیونکہ وہ طبرستان کے حاکم مازیار کا سیکرٹری تھا اور طبرستان میں فارسی بولی جاتی تھی۔

۵۔ ادیان اور جدل (مناظرہ) سے دلچسپی اس کو اپنے والد اور چچا سے وراثت میں ملی تھی۔ جس طرح طب اور فلسفہ کی تعلیم اس کو اپنے والد سہل ربن سے حاصل ہوئی تھی۔

۶۔ وہ طبرستان کے حاکم مازیار بن قارن کے دربار کا کاتب (سیکرٹری تھا) جو ایک بہت اہم منصب تھا، اس کا والد بھی اسی طرح کی خدمت پر مامور رہ چکا تھا۔

۷۔ عباسی خلیفہ المعتصم باللہ نے جب مازیار کی بغاوت وارتداد پر اس کے خلاف فوجی کارروائی کی تو علی بن ربن کو بھی مازیار کے ساتھ گرفتار کرکے اس وقت کے دارالخلافہ

Marfat.com

سامراء لایا گیا اور اس کے بعد سے علی بن ربن اپنی قابلیت کی وجہ سے دربار خلافت سے وابستہ کرلیا گیا۔ یہ ۲۲۴ھ یا ۲۲۵ھ کی بات ہے۔

علی بن ربن کو بعض قدیم و جدید مورخوں نے اسلام لانے سے پہلے یہودی بتایا ہے اور اس کو یہودی مستشرقین نے عصر حاضر میں کافی اچھالا ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ جیسا کہ مشہور اور ثقہ مورخ امام ابوجعفر محمد بن جریر طبری نے متعدد بار اپنی تاریخ میں صراحت کی ہے۔ نصرانی (۱) یعنی عیسائی تھا اور جیسا کہ مذکور ہوا طبرستان کے حاکم مازیار کے دربار سے وابستہ تھا اور اپنے علم و فضل اور ادبی مہارت کی وجہ سے اس اقلیم کے حاکم کے سیکرٹری کے منصب پر فائز تھا۔ بعض یہودی مستشرقین نے تو تعصب کی حد کردی کہ اس کے اسلام کا ہی انکار کر دیا ہے اور اس کو یہودی اطباء اور عربی ادب کے یہودی ادباء میں شمار کیا ہے۔ (۲)

ابن ربن کو یہودی سمجھنے کی غلطی سب سے پہلے وزیر و عالم جمال الدین القفطی نے اپنی کتاب ''اخبار العلماء باخبار الحکماء'' میں کی، اس کے بعد مصنفین بغیر تحقیق اس کو لے اڑے۔ ان کو ''ربن کے لفظ سے دھوکہ ہوا کہ یہ ''ربی'' کی ایک شکل ہے جو یہودی عالموں کے لیے استعمال ہوتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ خود ربن کے بیان سے صاف طور پر عیاں ہے کہ وہ اسلام لانے سے قبل عیسائی تھا وہ کہتا ہے ''ومازلت وانا نصرانی اقول'' (میں جب تک عیسائی تھا یہ کہتا رہا (۳)) اور اس نے یہ بھی بتا دیا ہے کہ طب و فلسفہ میں مہارت کے سبب اور خدا پرستی کی وجہ سے اس کے باپ کا لقب ''ربن'' پڑ گیا تھا، جس کے معنی سردار و معظم کے ہیں۔ (۴)

۹۔ علی بن ربن عباسی خلیفہ المتوکل (۲۳۲۔۲۴۷ھ) کے ہاتھ پر اسلام لایا، جیسا کہ خود اس کے اپنے بیان سے مترشح ہوتا ہے جو کتاب کے آخر میں ہے۔

۱۔ تاریخ طبری، حوالہ جات سابقہ

۲۔ ملاحظہ ہو ''الدین والدولۃ'' پر عادل نویہض کا مقدمہ، ص ۷

۳۔ کتاب الدین والدولۃ، از علی بن ربن، ص ۹۸

۴۔ فردوس الحکمۃ، مقدمہ مصنف ص ۱

Marfat.com

"وللہ الشکر علی ما ھدانی، ثم لعبدہ و خلیفتہ المتوکل علی اللہ امیر المؤمنین اطال اللہ بقاءہ علی ماند بنی لہ، واجترنی و غیری من اھل الذمۃ الیہ ترغیبا منہ و ترھیبا..."

(اللہ تعالیٰ نے مجھے ہدایت دی اس پر اس کا شکر ہے، پھر اس کے بندے اور خلیفہ جعفر المتوکل علی اللہ امیر المومنین کا، جنہوں نے مجھے اس (اسلام) کی طرف دعوت دی اور مجھ کو اور میرے علاوہ دوسرے ذمیوں کو ترغیت وترہیب کے ذریعہ اس کی طرف مائل کیا)۔

اس لیے محمد بن اسحٰق الندیم کا الفہرست میں یہ کہنا درست نہیں کہ وہ خلیفہ المعتصم کے ہاتھ پر اسلام لایا کیونکہ معتصم اور اس کے بعد الواثق کے عہد میں ہم کو علی بن ربن کا ذکر کسی کام کے سلسلہ میں نہیں ملتا۔ المتوکل کے ہاتھ پر اسلام لانے کے بعد اس نے یہ بےنظیر کتاب لکھی جس کے بعد وہ اس کے ندیموں میں شامل ہوگیا تھا۔ جیسا کہ صاحب الفہرست کا بیان ہے۔(۱)

۱۰۔ فردوس الحکمۃ اور الدین والدولۃ کے علاوہ الندیم، قفطی اور ابن ابی اصیبعہ وغیرہ نے علی بن ربن کی نو اور کتابوں کا ذکر کیا ہے، جن میں سے چار ادویہ، حفظان صحت اور اغذیہ وغیرہ کے بارے میں ہیں، ایک آداب ملوک کے بارے میں (تحفۃ الملوک) ایک دوسری ایرانی، یونانی اور عربی ادبی امثال وحکایات پر ہے اور ایک عیسائیوں کے رد میں ہے (کتاب الرد علی اصناف النصاری)۔ جس کا ذکر ابن ربن نے اسی الدین والدولۃ میں کیا ہے کچھ دوسری کتب کتاب کے مقدمہ مذکورہ میں دیکھی جا سکتی ہیں۔

کتاب:

مصنف کی زندگی کے اس خاکہ کے بعد خود نفس کتاب کی اہمیت اور اس کے مندرجات کے بارے میں جو اہم ترین بات ہے، وہ یہ ہے کہ:

۱۔ یہ کتاب جیسا کہ پہلے اشارہ کیا گیا، خود عباسی خلیفہ المتوکل کی فرمائش اور اس کی مدد سے لکھی گئی، جہاں تک المتوکل کی مدد کا تعلق ہے، اس کے بارے میں مصنف، کتاب کے متعدد اور خاتمہ میں صراحت کے ساتھ اس کا ذکر کرتا ہے:

۱۔ کتاب الفہرست، تہران ایڈیشن، ص ۳۵۴

Marfat.com

ولم ادع لا هل الذمة حجة ولا مسألة صعبة ، ولا علاقة الا حكيت بتوفيق الله و عونه و بر كه خليفة جعفر الامام المتوكل على الله امير المومنين اطال الله بقاء وبما اهتديت به و استفدت عنه و سمعت من الفاظه. (۱)

(میں نے ذمیوں (یعنی یہود ونصاریٰ) کی کوئی دلیل، کوئی مشکل مسئلہ، کوئی الجھن ذکر کئے بغیر نہیں چھوڑی ہے۔ پھر میں نے ان کو اللہ کی توفیق و مدد اور اس کی خلیفہ جعفر امام المتوکل علی اللہ امیر المومنین اطال اللہ بقاہ کی برکت اور ان کی رہنمائی میں ان سے استفادہ کر کے اور ان کے الفاظ سے ایک ایک کر کے حل کر دیا ہے)۔

اس طرح کے الفاظ مصنف نے صفحہ ۱۹۵ پر بھی لکھے ہیں بلکہ اس میں (استملیت) یعنی میں نے درخواست کر کے خلیفہ کے الفاظ لکھے۔

متوکل کے بارے میں سب لوگ یہ جانتے ہیں کہ وہ سلیم العقیدہ خلیفہ تھا، اور اسی نے امام احمد بن حنبل کو خلیفہ سابق الواثق کی جیل سے نکالا، ان کی انتہائی عزت و تکریم کی، اس مسئلہ کو ختم کیا جس کی مخالفت کی وجہ سے ان کو قید میں ڈالا گیا تھا، یعنی خلق قرآن کا مسئلہ جو خلیفہ مامون کے آخری زمانہ سے معتزلہ کی ایماو تائید پر بزور شمشیر نافذ کیا گیا تھا۔ ساتھ ہی متوکل اسلام کا سرگرم داعی تھا، وہ چاہتا تھا کہ اس کی قلمرو میں اسلام پھیلے، خاص طور پر ان اہل ذمہ میں (عیسائیوں اور یہودیوں میں) جو عراق میں بکثرت آباد تھے اور خلیفہ مامون کے عہد سے ان کو بڑی آزادی گفتار و نفوذ ملا ہوا تھا کہ وہ یونانی اور سریانی کتابوں کے ترجمہ میں بڑے سرگرم تھے اور اس سے عراق کی مسلمان سوسائٹی میں فکری انحراف و الحاد پھیل رہا تھا، متوکل نے اپنی دینی حمیت و حکمت عملی سے کام لیتے ہوئے بہت سے ممتاز ذمیوں کو مسلمان کر لیا تھا جن میں یہ خاندانی طبیب و فلسفی ابن ربن بھی تھا، نہ صرف یہ بلکہ اس نے اسی عیسائی نو مسلم عالم سے اسلام کی حقانیت اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی نبوت کی صداقت پر ایک ایسی کتاب لکھوائی جس کی وہی لکھ سکتا تھا جس کی توراۃ و انجیل پر گہری و عملی نظر ہو اور خود آیات قرآنی و احادیث سے اس کی مدد کی۔

ا۔ الدین والدولۃ، ص ۳۵-۳٦

Marfat.com

کوئی شک نہیں کہ عقیدہ اہل سنت کی قرآن کے بارے میں تجدید واحیاء کے بعد یہ عمل متوکل کی زندگی کا ایک سنہرا باب ہے اور کیا عجب ہے کہ یہی اس کی مغفرت کا سامان بن جائے۔ یاد رہے کہ تیسری صدی ہجری کے نصف اول میں یونانی، ایرانی اور ہندی فلسفہ وعلوم کے عربی میں ترجمہ کے بعد عراق میں بلکہ خود مرکز خلافت میں شک والحاد کی آندھیاں بڑے زور سے چل رہی تھیں، جس کا سد باب قوت سے نہیں فکری عمل ہی سے کیا جا سکتا تھا اور زیر نظر کتاب اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔

۲۔ کتاب مصنف کے طویل مقدمہ (۲۰ صفحات) اختتامی فصل اور خاتمہ کے علاوہ دس ابواب پر مشتمل ہے، یہ مختصر کتاب ۲۱۰ صفحات میں ہے، ۲۹ صفحات پر مختلف انواع کے انڈکس اور مآخذ وغیرہ مذکور ہیں۔

۳۔ مصنف اس جملہ سے کتاب شروع کرتا ہے:

"قال علی بن ربن مولی"(۱) امیر المومنین (علی بن ربن غلام امیر المومنین کہتا ہے) پھر وہ اپنے اس مقدمہ میں مختلف آیات قرآنی بیان کرتے ہوئے سورۃ آل عمران کی آیت نمبر ۶۴ تحریر کرتا ہے جس میں اہل کتاب کو دعوت دی گئی ہے کہ "آؤ ہم اس کلمہ حق کا اتباع کریں جو ہمارے اور تمہارے مابین مشترک ہے کہ ہم اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کریں اور نہ اس کے ساتھ کس کو شریک کریں اور نہ ہم میں سے بعض، بعض کو اللہ کے سوا پروردگار بنائیں"۔۔۔۔الخ اور اس کے بعد ہی سورۃ توبہ کی آیت ۱۰۹ کا ذکر کرتا ہے جس میں عقیدۂ توحید کو ایک ایسی عمارت سے تشبیہ دی گئی ہے جس کی بنیاد تقویٰ اور رضائے الٰہی پر رکھی گئی ہے، جب کہ دوسرے باطل ادیان کی بنیاد ایک ایسے غار کے دہانے پر رکھی گئی جو بس گرنے والا ہی ہے۔

اس آیت کریمہ کے فوراً بعد مصنف کہتا ہے:

۱۔ یہاں مولیٰ کے لفظ سے بھی اس بات کی تائید ہوتی ہے کہ وہ متوکل کے ہاتھ پر اسلام لایا، مولیٰ کا لفظ ایک طرح سے نو مسلموں کے اپنے سابق آقاؤں یا سرپرستوں سے تعلق وارتباط کے لئے استعمال ہوتا تھا، اصطلاحاً جسے "مولیٰ الجوار" کہتے ہیں۔ زرخرید غلام مراد نہیں اس معنی میں برامکہ بھی مولیٰ تھے۔

Marfat.com

"فالی ھذا کان دعاؤہ علیہ اسس بنیان دعوتہ، و بہ افتتح شرائع دینہ و شرائط حقہ الذی کفرت بہ مشرکو العرب وحملۃ الکتاب ، فانھم کتموا اسمہ و حرفوا رسمہ الموجود فی کتب انبیائھم علیھم السلام مما أنا مظھرہ ومبیح سرہ و کاشف سرہ، حتی یراہ القاری عیانا و یزداد بالاسلام قوۃ و سرورا"

(سواس کی طرف ان (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی دعوت تھی اور اس پر انہوں نے اپنی تحریک کی بنیاد رکھی تھی اور اس سے ہی اپنے دین کے قوانین اور اپنے حق کی شروط کی ابتدا کی تھی جس کا عرب کے مشرکین اور اہل کتاب نے انکار کیا کہ انہوں نے (اہل کتاب) نے آپ (رسول ﷺ) کا نام چھپایا اس کی اس کتابت میں تحریف کی جو ان کے انبیاء کی کتابوں میں موجود ہے، جس کو میں ظاہر کرنے والا ہوں اور اس کے راز افشا کرنے والا ہوں اور اس پر ڈالے ہوئے پردہ کو چاک کرنے والا ہوں تا کہ قاری اس کو واضح طور پر دیکھ سکے اور اسلام کے ساتھ اس کی قوت اور سرخوشی میں اضافہ ہو)۔

۴۔ پھر وہ اپنے اس نفیس مقدمہ میں روایت اور اجماع عام اور تاریخی روایات کی صحت پر تفصیل سے بحث کرتا ہے اور کتاب کے دس ابواب کے عناوین بیان کرتا ہے آخر کے تین ابواب انتہائی اہم ہیں جو یہ ہیں۔

الف: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مبلغین (صحابہ) جنہوں نے آپ ﷺ سے روایات کیں، نیک اور انسانوں میں سب سے زیادہ پاکیزہ نفوس اشخاص تھے کہ ان جیسے افراد کے بارے میں جھوٹ اور غلط بیانی کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا ہے۔

ب:۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خاتم النبیین ہیں اگر آپ مبعوث نہیں کئے جاتے تو آپ کے اور حضرت اسماعیل علیہ السلام کے بارے میں انبیاء سابقین کی پیش گوئیاں باطل ٹھہرتیں۔

ج: انبیاء علیہم السلام نے آنحضرت ﷺ کے ظہور سے کافی زمانہ پہلے آپ کی آمد، نبوت

Marfat.com

آپ کے شہر، آپ کی نقل و حرکت اور اقوام و فرماں روایان عالم کے آپ کے امت کے زیر نگیں ہونے کی پیش گوئی کی ہے۔

۵۔ ابتدائی سات ابواب کا تعلق آنحضرت ﷺ کی دعوت توحید، آپ کے اخلاق حمیدہ آپ کی سنتوں اور قوانین، آپ کے معجزات آنحضرت ﷺ کی اپنے زمانہ میں ثابت شدہ پیش گوئیوں اور آپ کی ان پیش گوئیوں کے بارے میں ہے جو حوادث عالم سے متعلق تھیں اور بعد کو صحیح ثابت ہوئیں چھٹا باب قرآن کے نبوت کا ایک معجزہ ہونے کے بارے میں ہے اور ساتواں باب اس بارے میں کہ دوسری اقوام پر آپ کا غلبہ ایک واضح معجزہ ہے۔

پھر وہ اپنا مقصد تصنیف بیان کرتے ہوئے کہتا ہے کہ "یہ سب میں اس لیے پیش کر رہا ہوں کہ اللہ تعالیٰ اس کے ذریعہ ان لوگوں کو اندھیرے سے نکالے جو ظالمانہ سرکشی اور بد بختانہ گمراہی میں مبتلا ہیں۔

٦۔ یہاں وہ خاص طور پر عیسائیوں کے اسلام پر جن اعتراضات کا ذکر کرتا اور ان کا جواب اپنی اس کتاب میں دینا چاہتا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس کے ذریعہ عیسائیوں کو ان کی گمراہی سے نکالنا اور ان کو اسلام کی دعوت دینا چاہتا ہے۔

وہ اعتراضات یہ ہیں:

ا۔ ہم نے (عیسائیوں نے) کہیں یہ نہیں لکھا کہ انبیاء سابقین نے آنحضرت ﷺ کی آمد کی پیش گوئی کی ہو۔

۲۔ ہم کو (آنحضرت ﷺ کے) کسی معجزہ اور پیش گوئی کا ذکر نہیں ملتا۔

۳۔ عیسیٰ علیہ السلام نے ہم کو خبر دی ہے کہ ان کے بعد کوئی نبی نہ ہوگا۔

مصنف نے ان اعتراضات کا اپنی کتاب میں مفصل اور مدلل جواب دیا ہے۔ یہاں یہ ملحوظ رہے کہ اس وقت تک یورپ نے عیسائیت کو قبول نہیں کیا تھا، بلکہ یہ شام، فلسطین، ایشیائے کوچک، مصر اور عراق اور کسی حد تک ایران میں محدود تھی اور توراۃ و انجیل، سریانی، عبرانی اور عربی زبانوں میں

Marfat.com

پائی جاتی تھی اور مصنف ان زبانوں سے بخوبی واقف تھا، لہٰذا اس کے حوالے قابلِ اعتبار ہیں۔

۷۔ وہ ایک اہم قدیم عیسائی کتاب فراکسس کی ''حوارییں کے مکاتیب'' کے حوالہ سے بتایا ہے کہ ترکی میں واقع انطاکیہ کے عیسائی مرکز کلیسا میں پانچ اہم عیسائی شخصیات تھیں جن کو عیسائی انبیاء (Apostles) کہتے ہیں اور برناباس، شمعون، لوقیوس، مانایل (Manuel) اور ساول (شاول) کے نام سے یاد کرتے ہیں۔(۱) یہ لوگ فلسطین سے انطاکیہ گئے تھے اور اسی فراکسیس کی کتاب میں مذکور ہے کہ یہ لوگ وہاں یہود اور شیلا کے گھر میں ٹھہرے تھے جو خود انبیاء کہلاتے تھے، لہٰذا ان کا یہ دعویٰ کہ عیسیٰ علیہ السلام کے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا۔ ایک قول باطل ہے جس کا پوچ ہونا ظاہر ہے اور یہ بھی واضح ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام کے بعد ایسے لوگ تھے جن کو عیسائی خود انبیاء و رسل کہتے ہیں جیسے ''پولس'' (Paul)(۲)

۸۔ لائق مصنف نے کتاب کے چھٹے باب میں جو معجزہ قرآن سے متعلق ہے، قرآن کریم سے توراۃ و انجیل کی بعض کتاب و آیات کا قرآنی آیات سے مختصر تقابل کرتے ہوئے تحریف شدہ ان دونوں آسمانی کتابوں کی بعض مضحکہ خیز اور انبیائے بنی اسرائیل سے متعلق انتہائی مکروہ و بیہودہ روایات کا ذکر کیا ہے جو حزقیال اور ہو

۱۔ بائبل سوسائٹی لاہور کی شائع کردہ بائبل کے حصہ انجیل مقدس کے صفحہ ۱۲۱ پر یہ پانچوں نام درج ہیں اور انطاکیہ کی یہ روایت بھی ہے مانایل کا نام ہنانیل درج ہے۔ انگریزی میں ایمانویل ہے جس کے نام پر کیمبرج یونیورسٹی کا ایک مشہور کالج ہے۔

۲۔ یہ وہی سینٹ پال ہے جو رومن (Roman) یہودی تھا، پہلے عیسائیت کا دشمن تھا، پھر فلسطین و دمشق میں رہا اور عیسیٰ علیہ السلام کے تقریباً نصف صدی بعد عیسائیت کا مبلغ بن گیا، اسی نے عیسائیت میں تثلیث کو فروغ دیا اور ایشائے کوچک اور روما کی یورپی مملکات میں عیسائیت پھیلائی۔ رومن حکومت کی طرف سے اس کو سزائے موت دی گئی۔ اردو کی مذکورہ انجیل میں اس کے ۱۴ خطوط ہیں جس میں ہر خط کے شروع میں اس کے نام کے ساتھ پولس رسول لکھا ہوا ہے، حقیقت جس کتاب کو عیسائی انجیل مقدس کہتے ہیں اس کا تقریباً آدھا حصہ انہیں نام نہاد رسولوں کے خطوط ہیں اور ان میں بھی بیشتر حصہ پولس رسول (St. Paul) کے خطوط کا ہے۔

Marfat.com

شاع النبی سے متعلق ہیں (۱)۔ جب کہ قرآن کریم میں اس طرح کی کوئی بات نہیں، اور توراۃ میں جس خدا کا تصور پیش کیا گیا ہے وہ نعوذ باللہ انتہائی ظالم و جابر خونخوار ہستی ہے اس کے برخلاف قرآن کریم اللہ کی مغفرت اور رحمت کی آیات سے بھرا ہوا ہے۔

۹۔ ساتویں باب میں مصنف نے غلبۂ اسلام کو عقلی دلائل کے ساتھ ثابت کرتے ہوئے ان اعتراضات کا جواب دیا ہے جو اس سلسلہ میں کیے جاتے ہیں اور دوسری شریعتوں کے ساتھ اس کا تقابل کیا ہے۔

۱۰۔ آٹھویں باب میں ابن ربن نے اولین مبلغین اسلام یعنی صحابۂ کرام کا ذکر کرتے ہوئے اس کو رسول اکرم ﷺ کی نبوت اور اسلام کی حقانیت کی دلیل کے طور پر پیش کیا ہے۔ اس میں اس نے سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ، سیدنا عمر رضی اللہ عنہ، سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے زہد و فضائل کو بالترتیب بیان کیا ہے۔ ساتھ ہی حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ اور عمر بن عبدالعزیز رضی اللہ عنہ اور اموی و عباسی عہد کے دوسرے بعض صالحین وزہاد و متقین کا ذکر کیا ہے، یہاں بھی مصنف نے بائبل میں مذکور بعض شخصیات سے ان کا تقابل کیا ہے اور بائبل کی روایات کے تہافت کو ثابت کیا ہے۔

ساتھ ہی اس نے آخر میں یہ اہم نتیجہ اخذ کیا ہے کہ صحابۂ کرام کی روایات کو قبول کرنا عقلی طور پر واجب ٹھہرتا ہے کتاب کے بقیہ ابواب کی طرح یہ باب بھی کافی مفید اور معلومات افزا ہے۔

۱۱۔ کتاب کا نواں اور دسواں باب درحقیقت اس کے اہم ترین ابواب ہیں اور مصنف کی توراۃ وانجیل اور یہود و نصاریٰ کی کتب سے کماحقہ واقفیت پر دلالت کرتے ہیں۔ نویں باب میں اس نے حضرت اسماعیل سے متعلق توراۃ میں وارد بشارتوں کا ذکر کیا ہے۔ باب کا عنوان ہے: ''اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ظہور نہ ہوتا تو دیگر انبیاءؑ کی نبوتیں بھی باطل قرار پاتیں۔''

۱۔ الدین والدولہ۔ ص ۱۰۲، ۱۰۳

Marfat.com

یہاں اس نے اپنے زمانہ کے ایک یہودی ''جرمقانی خبیث'' کی تردید میں عقلی اور توراۃ سے نقل کردہ روایتی دلائل دیئے ہیں جرمقانی اس کا منکر تھا کہ حضرت اسماعیل علیہ السلام، حضرت ابراہیم علیہ السلام کے فرزند تھے، مصنف نے حضرت اسماعیل جدرسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نبوت کے بارے میں توراۃ سے چار پیش گوئیاں بیان کی ہیں اور ان کو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آپ کی امت کے وجود پر شواہد قرار دیا ہے جس کا کوئی جاہل یا غبی ہی انکار کرسکتا ہے۔

۱۲۔ کتاب کا دسواں باب اپنے موضوع یعنی نبوت محمدی کے اثبات میں سب سے اہم باب ہے یہاں مولف نے توراۃ انجیل کے حوالوں کے ساتھ حضرت موسیٰ علیہ السلام و داؤد علیہ السلام کی بشارتوں سے لے کر دوسرے دس انبیاء بنی اسرائیل یعنی (۱) شعیاء (۲) ہوشاع (۳) میخا (۴) حبقوق (۵) صفنیا (۶) زکریا (۷) ارمیا (۸) حزقیال (۹) دانیال (۱) اور مسیح علیہ السلام کی آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت کے بارے میں پیش گوئیوں کا تفصیلی ذکر کیا ہے۔

ان میں زبور میں داؤد علیہ السلام کی پیش گوئیاں سب سے زائد ہیں۔ کتاب کا یہ باب سب سے زیادہ مفصل یعنی ۵۲ صفحات پر مشتمل ہے اور کتاب کا تقریباً چوتھائی حصہ ہے۔

اس باب کا آخری حصہ ان بشارتوں کے ذکر کے بعد ''مہاجرین و انصار، شریعت محمدی ﷺ اور سنت نبوی کے منکرین کے رد اور بعض دوسرے ان اعتراضات سے متعلق ہے جو یہود و نصاریٰ اسلام اور ذات نبوی ﷺ پر کرتے تھے۔

کوئی شک نہیں کہ اس دسویں باب میں سب سے اہم اور صریح بشارتیں وہ ہیں جو کتاب بنی اشعیا سے منقول ہیں۔ مصنف کے بقول اس کی پانچویں فصل میں مذکور ہے کہ ہمارا ایک بیٹا پیدا ہوگا ایک فرزند ہم کو دیا جائے گا اس کا اقتدار (سلطان) اس کے شانہ پر ہوگا۔ مصنف سلطان کا مطلب نبوت کہتا ہے کہ اور کہتا ہے کہ یہ سریانی کتابوں میں ہے۔ جس کی تفسیر مارقوس (مارک) نے

۱۔ ان انبیائے بنی اسرائیل کے نام بائبل سوسائٹی لاہور کی طرف سے شائع کردہ اردو بائبل (کتاب مقدس) یعنی توراۃ میں اس طرح مذکور ہیں۔ یسعیاہ، یرمیاہ، عزقی ایل، دانی ایل، ہوسیع، میکاہ، حبقوق، صفنیاہ، زکریا۔

Marfat.com

لکھی ہے لیکن عبرانی زبان میں جو توراۃ ہے اس میں ہے ''اس کے شانہ پر علامت نبوت ہے''(۱)
اور یہ وہی ہے جس کو مسلمان ''خاتم نبوت'' (مہر نبوت) کہتے ہیں۔

علی بن ربن نے توراۃ کی کتاب اشعیا کی فصول ۱۱، ۱۲، ۲۴ میں رسول اکرم ﷺ کے نام مبارک محمد کے وجود ہونے کی تصریح کی ہے (۲) مگر سریانی اور عبرانی زبانوں میں جو توراۃ ابن ربن کے پیش نظر تھی، اس کے ابواب اور موجودہ کتاب مقدس (بائبل) کے ابواب یا فصول (Books) میں کافی اختلاف ہے، ہم کافی تلاش کے بعد صرف ایک حوالہ کو موجودہ بائبل میں تلاش کرنے میں کامیاب ہوئے جس کا ذکر گزشتہ ایک فٹ نوٹ میں ہوا ہے۔

۱۳۔ اس طرح مصنف کے قول کے مطابق اور اس کے پیش کردہ کتاب حبقوق (توراۃ) کے اقتباس میں دو مرتبہ محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا نام آیا ہے۔(۳)

اردو کی بائبل (کتاب مقدس، شمارہ نمبر ۹۳) کی کتاب حبقوق میں وہ عبارت موجود ہے جس کا ذکر ابن ربن نے کیا ہے (ص ۱۶۹۔۱۷۰) لیکن وہاں پہلی بار ''محمد'' کی جگہ ''سلاہ'' ترجمہ ہے اور اس طرح دوسری مرتبہ (۴) بھی ''سلاہ'' لکھا ہوا ہے، یہ ''سلاہ'' کیا لفظ اور کس کا نام ہے؟ پتا نہیں، بظاہر یہ صلیبی یورپی اقوام کی تحریف معلوم ہوتی ہے یا پھر یہود کی جو اپنی عداوت اسلام میں مشہور ہیں۔

ہم امید کرتے ہیں کہ وہ علماء و دانشور جن کو تقابل ادیان سے لگاؤ ہے اور توراۃ کے بارے میں وہ تازہ یورپی معلومات رکھتے ہیں جو عبرانی توراۃ کے انکشاف اور اشاعت کے بعد برسر عام آئے ہیں وہ علی بن ربن کے پیش کردہ حقائق کا مطالعہ کریں گے اور اپنی آراء سے مطلع فرمائیں گے۔

۱۔ الدین والدولۃ ص ۱۴۶، بائبل اردو (کتاب مقدس) کے باب آیت ۶ صفحہ ۶۶۷ پر یہ پیش گوئی موجود ہے اور وہاں یہ الفاظ ہیں۔ سلطنت اس کے کاندھوں پر ہوگی۔ یہ وہی سریانی توراۃ کا ترجمہ یونانی ہے اس سے انگریزی میں اور اس سے اردو میں ہے۔ خیال رہے کہ عبرانی توراۃ اصل ہے جس کا یورپین عیسائی ذکر نہیں کرتے۔

۲۔ الدین والدولۃ، ص ۱۵۳، ۱۶۶۔

۳۔ الدین والدولۃ، ص ۱۶۹، ۱۷۰

۴۔ بائبل (کتاب مقدس) لاہور۔ ۱۹۸۹ء، ایڈیشن، ص ۸۷۷۔۸۷۸۔

Marfat.com

ڈاکٹر ملک غلام مرتضیٰ صاحب کی کتاب
''خطبات حرم'' کا تنقیدی جائزہ

ڈاکٹر ملک غلام مرتضیٰ صاحب ملک کی ایک جانی پہچانی شخصیت ہیں۔اس جان پہچان میں ٹیلی ویژن کو بہت دخل ہے۔وہ پی ٹی وی اور خاص طور پر این ٹی ایم کے دینی پروگرام میں مسلسل عوام کے روبرو ہوتے اور پابندی سے تفسیر قرآن پیش کرتے ہیں۔دل نواز شخصیت رکھتے ہیں اور پر کشش انداز بیان،جس کی وجہ سے عوام وخواص دونوں میں کافی مقبول ہیں۔

ایک سال قبل،ان کے بعض نیاز مندوں کے ساتھ راقم سطور کو بھی ان سے ملنے کا موقع ملا۔موصوف نے اس موقع پر ہم چار پانچ آدمیوں کو اپنی کتاب ''خطبات حرم'' پیش کی۔حال ہی میں مجھے اس کو پڑھنے کا موقع ملا اور موصوف سے اس کتاب کے ذریعہ سے تفصیلی شناسائی ہوئی۔مصنف کے فرزند،محمد زید ملک صاحب نے اپنے والد کا تفصیلی تعارف کتاب کے شروع میں پیش کر دیا ہے۔جن لوگوں نے یہ کتاب نہیں پڑھی ہے،ان کے لیے یہ تعارف باعث دلچسپی ہوگا۔

''موصوف گورنمنٹ کالج لاہور سے فلسفہ میں ایم اے ہیں (۱۹۶۲ء)۔اس کے بعد انہوں نے ۱۹۶۶ء میں سی ایس پی کا امتحان پاس کیا۔گورنمنٹ کی آڈٹ اینڈ اکاؤنٹس میں خدمات انجام دیں۔اس ملازمت کے دوران دینی تعلیم حاصل کی اور عربی میں ایم۔اے کیا (۱۹۷۰ء) اور پھر نو سال بعد ۱۹۷۹ء میں اسلامی فلسفہ میں پی ایچ ڈی کیا اور اس کے بعد سے ان کا میدان عمل بدل گیا اور گورنمنٹ سول سروس کے بجائے وہ سعودی عرب میں مدینہ منورہ کی اسلامک یونیورسٹی میں شعبہ ترجمہ کے سربراہ اور علوم اسلامیہ کے اسسٹنٹ پروفیسر ہو گئے۔''

یہاں تعارف نگار نے یہ نہیں بتایا کہ وہ اس دوران میں ریاض الیکٹرک کارپوریشن میں کئی سال،بحیثیت آڈیٹنگ اکاونٹنٹ،ملازمت کرتے رہے۔یہ ملازمت،غالباً ۱۹۷۴ء تا ۱۹۷۹ء تک جاری رہی اور اسی دوران ہی انہوں نے پی ایچ ڈی کی ڈگری لی۔

Marfat.com

بہرحال، مدینہ منورہ کی اسلامک یونیورسٹی میں ۱۹۷۹ء سے ۱۹۸۵ء تک خدمت انجام دینے کے بعد دو سال تک کنگ فیصل یونیورسٹی، الدمام کے تابع صوبۂ الاحساء میں قائم ایک کالج میں تدریسی خدمات انجام دیتے رہے۔ (میرا ذاتی خیال ہے کہ وہاں انگریزی پڑھاتے رہے ہوں گے)۔

کتاب میں پیش کردہ تفصیلی تعارف سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ملک غلام مرتضیٰ صاحب نے ایم۔اے کی تعلیم کے دوران ہی میں روحانی تربیت کے مراحل بھی طے کئے۔ یہ تربیت انہوں نے مولانا سید ابوبکر غزنوی سے ان کا مرید ہو کر حاصل کی اور اسی صوفیانہ تربیت کا فیض ہے کہ ان کی تقریر، گفتگو اور درس قرآن، روحانی اور واعظانہ انداز بیان سے معمور ہوتے اور اپنے قارئین و ناظرین کو بڑا مسحور کر لیتے ہیں۔

جب وہ سعودی عرب میں تھے اور مدینہ منورہ کی اسلامک یونیورسٹی میں خدمات انجام دے رہے تھے۔ ان دنوں میں بھی وہاں ریاض کی امام محمد بن سعود اسلامک یونیورسٹی میں اسلامی تاریخ وتمدن کا پروفیسر تھا (۱۹۷۹۔۱۹۸۷ء) حج کے موقع پر ٹی۔ وی میں جو خصوصی پروگرام ہوتے تھے، ان میں کبھی کبھار سات آٹھ منٹ کی تقریر ڈاکٹر ملک غلام مرتضیٰ صاحب کی بھی سنا کرتا تھا، یہ تقریریں انگریزی اور اردو دونوں میں ہوتی تھیں۔ مگر ذاتی ملاقات ان سے گزشتہ سال لاہور میں ہوئی۔

موصوف کی زیر بحث کتاب میں ان کا تفصیلی، علمی اور عملی تعارف پڑھ کر کسی قدر حیرت ہوئی کہ وہ کس طرح ایک سول سرونٹ کی لائن اور اکاؤنٹس کے موضوع سے ہٹ کر ایک مذہبی اسکالر اور مصنف ہو گئے، حتیٰ کہ ۱۹۹۰ء میں جب ان کی زیر نظر کتاب چھپی ہے، تو اس وقت یہ بقول فرزند خود رابطہ عالم اسلامی کی قائم کردہ اسلامک اکیڈمی برائے سائنس اینڈ ٹیکنالوجی پشاور کے وائس پریزیڈنٹ اور شریعت فیکلٹی کے ڈین تھے۔ ان کا یہ قلب ماہیت دیکھ کر مجھے ایک دوسرے مذہبی لیڈر اور مصنف یاد آ گئے، جو ملک میں اور بیرون ملک بہت سرگرم عمل اور مشہور ہیں، یعنی ڈاکٹر اسرار احمد صاحب (ایم بی ایس) جنہیں میں بہت دنوں تک اپنے لیبیا میں قیام کے دوران میں (پی ایچ ڈی) سمجھتا رہا۔ فرق یہ ہے کہ مؤخر الذکر باقاعدہ بیعت لیتے ہیں اور اس کے

Marfat.com

بغیر ان کے نزدیک اسلام نامکمل ہے۔ ساتھ ہی موصوف مخصوص سیاسی و انقلابی رجحانات بھی رکھتے ہیں، اور آج کل نظام خلافت قائم کرنے کے درپے ہیں، جب کہ ڈاکٹر ملک غلام مرتضٰی صاحب نے اپنے دامن کو سیاست سے پاک رکھا ہے، اور یہ ان کا موضوع سخن بھی نہیں۔ مگر دونوں حضرات میں قدر مشترک یہ ہے کہ اپنی اولین اعلیٰ تعلیم اور پیشہ ورانہ خدمات کے بعد عربی اور اسلامی علوم میں اعلیٰ یونیورسٹی ڈگریاں حاصل کیں اور پھر اپنا میدان عمل یکسر بدل ڈالا اور اس مذہبی راہ سے اب مقبول خواص و عام ہیں۔

مصنف کے بارے میں اس تعارفی اور ضروری تمہید کے بعد جس کتاب کا میں جائزہ لینا چاہتا ہوں، بلکہ اس پر اپنے کو مجبور پاتا ہوں، وہ ڈاکٹر ملک غلام مرتضٰی صاحب کی نشری تقاریر، مقالات اور لیکچرز کا وہ مجموعہ ہے جو ''خطبات حرم'' کے نام سے ملک سنٹر پبلشرز اینڈ بک سیلرز گلبرگ لاہور سے شائع ہوا ہے۔ کتاب میں سن اشاعت مذکور نہیں، مگر تعارفی مقدمہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۹۹۰ء میں اشاعت پذیر ہوئی۔ جب موصوف سے ایک سال قبل میری ملاقات ہوئی تو وہ لاہور میں اپنا ایک ابتدائی تعلیمی ادارہ چلا رہے تھے جس کے لیے سابق حکومت نے ایک بھاری گرانٹ دی تھی۔

اب جہاں تک موصوف کی کتاب ''خطبات حرم'' کا تعلق ہے تو اس کے موضوعات عام قارئین کے لیے انتہائی ضروری اور مفید ہیں۔ انداز بیان دل آویز، دل نشین اور پر اثر ہے۔ اس میں ان کو صوفیانہ شخصیت کی دل نوازی کا عکس نمایاں ہے۔ یقیناً اس سے بہت سے لوگوں کو مذہبی اور روحانی فوائد حاصل ہوں گے، مگر افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ ڈاکٹر ملک غلام مرتضٰی صاحب نے ان تقاریر و مقالات و لیکچرز وغیرہ کی تیاری میں مطلوبہ بحث و تحقیق سے کام نہیں لیا۔ جس کی وجہ سے کتاب میں بعض بڑی فاش اغلاط رہ گئی ہیں۔ اندیشہ ہے کہ یہ اغلاط قارئین کے اذہان میں مصنف کی شہرت و مقبولیت کی وجہ سے جاگزیں ہو جائیں گی۔ اس لیے ان تنقیدی جائزہ کے ذریعہ سے ان اغلاط کی نشاندہی اور ان کی تصحیح کی کوشش کی گئی ہے۔ اس سے مصنف کی تنقیص مقصود نہیں۔ امید کی جاتی ہے کہ اس تنقیدی جائزہ کے بعد وہ اپنی آئندہ تصانیف میں زیادہ تحقیق و کاوش سے کام لیں گے اور کتاب کی آئندہ اشاعت میں ان اغلاط کی تصحیح کا التزام کریں گے۔

Marfat.com

کتاب کے پہلے حصے میں جو نشری تقاریر پر مشتمل ہے۔ پہلی تقریر شاہ ولی اللہ صاحب کی مشہور کتاب ''حجۃ اللہ البالغہ'' پر ہے۔ شاہ صاحب کی تعارف میں موصوف فرماتے ہیں:

''اسلامی تاریخ میں شاہ ولی اللہ صاحب وہ شخصیت ہیں جو سب سے پہلے مترجم قرآن ہیں۔'' (ص۔۱)

ڈاکٹر ملک غلام مرتضٰی صاحب کی یہ بات کسی طرح درست نہیں۔ یہ بات اگرچہ عامۃ الناس میں مشہور ہے مگر ایک اسلامی محقق کو کسی طرح زیب نہیں دیتا کہ وہ ایسی بات کہیں جو حقیقت کے برخلاف ہے۔ خاص طور پر جب انہوں نے شاہ ولی اللہ صاحب کے فلسفیانہ و مابعد الطبیعاتی فکر پر پی ایچ ڈی کا مقالہ لکھا ہے۔ شاہ صاحب کا فارسی ترجمہ قرآن موسوم بہ ''فتح الرحمٰن'' کسی طرح بھی فارسی میں پہلا ترجمہ نہیں تھا۔ اس سے بہت پہلے بلکہ صدیوں پہلے فارسی میں قرآن کے متعدد تراجم موجود ہیں۔ جن میں ہمارے علم کے مطابق ابوبکر عتیق سورآبادی کا ترجمہ و تفسیر قرآن قدیم ترین ہے۔ یہ غیر معروف ہے مگر ہماری نظر سے اس کی ایک جلد کراچی کے خانۂ فرہنگ ایران میں گزری ہے۔ یہ تفسیر سلجوقی عہد میں ۴۷۰ھ اور ۴۸۰ھ کے مابین لکھ گئی۔ یہ تفسیر و ترجمہ آٹھ جلدوں میں تھا۔ اس کی ایک جلد (پانچویں اور چھٹی جلد کا کچھ حصہ) عکسی صورت میں ایران سے چند سال قبل شائع ہو چکی ہے۔ یہ وہ جلد ہے جو لندن کے انڈیا آفس کی لائبریری میں موجود تھی اور ۵۲۳ھ کی کتابت شدہ ہے۔

اس غیر معروف ترجمہ و تفسیر کے علاوہ اور بھی بہت سے تراجم و تفاسیر ہیں جو اس موضوع پر اردو کی کتابوں میں مذکور ہیں جن میں السید شریف الجرجانی (وفات ۸۱۶ھ) کا ترجمہ قابل ذکر ہے جو ترجمان القرآن کے نام سے مشہور ہے۔ جس کے بارے میں مولانا عبدالحق حقانی مصنف ''تفسیر حقانی'' (اردو) نے لکھا ہے کہ یہ شیخ سعدی کے نام کے حوالے سے مشہور و مطبوع ہے۔ پھر وہ ترجمہ و تفسیر ہے، جو ایران و برصغیر میں پانچ سو سال سے معروف و متداول ہے اور متعدد بار ایران و ہندوستان میں طبع ہو چکا ہے، یعنی ''تفسیر حسینی'' جو حسین واعظ کاشفی (وفات ۹۱۰ھ) کی تصنیف ہے۔ یہ ترجمہ و تفسیر ۸۹۷ھ میں مکمل ہوا۔

نویں صدی ہجری کے اس مشہور و متداول کی ایرانی ترجمہ و تفسیر فارسی کے بعد اور شاہ ولی اللہ

Marfat.com

صاحب سے دو سو سال قبل سندھ کے ایک عالم مخدوم لطف المعروف بہ مخدوم نوح (وفات ۹۹۸ھ) نے فارسی میں قرآن کریم کا ترجمہ کیا۔ یہ ترجمہ برصغیر میں غالباً پہلا ترجمہ قرآن ہے اور مولانا غلام مصطفیٰ قاسمی صاحب کی تحقیق کے ساتھ سندھی ادبی بورڈ، جام شورو، حیدر آباد سے ۱۴۰۲ھ میں شائع ہو چکا ہے۔

ان کے علاوہ اور بھی متعدد قدیم فارسی تراجم ہیں جن کی تفصیل کی یہاں گنجائش نہیں۔ پھر سب سے بڑی بات یہ کہ شاہ ولی اللہ صاحب نے خود اپنے ترجمہ ''فتح الرحمٰن'' کے دیباچہ میں اپنے ترجمہ سے قبل کے فارسی تراجم کا ذکر کیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں:

''پہلے ترجموں پر غور کیا، تاکہ جس ترجمہ کو معیار کے مطابق پایا جائے اس کی ترویج کی جائے اور یہ ترجمہ حتی الامکان اہل زمانہ کے ذوق کے مناسب ہو، مگر ان ترجموں میں یا تو بے کیف طوالت ہے یا خلل انداز تقصیر و اجمال ہے۔''

سو شاہ صاحب کے اپنے اس صریح قول کی موجودگی میں یہ کہنا کہ وہ پہلے مترجم قرآن ہیں، ایک انتہائی غلط اور غیر ذمہ دارانہ بات ہے۔

فاضل مصنف کا یہ کہنا بھی درست نہیں کہ ''شاہ صاحب پہلے مفکر ہیں جنہوں نے مزدور، کسان، بلکہ ہر قسم کے محنت کش طبقہ کے حق میں بھرپور آواز ہ بلند کیا۔'' (ص ۴) حقیقت یہ ہے کہ شاہ ولی اللہ صاحب سے ایک ہزار سال قبل ہارون الرشید کے عہد میں عباسی خلافت کے مشہور قاضی القضاۃ (چیف جسٹس) قاضی ابو یوسف نے اپنی کتاب ''الخراج'' میں غیر مسلم (ذمی) کسانوں پر خراج (ٹیکس) کی وصولی میں ظلم کے خلاف آواز بلند کی اور خلیفۂ وقت کو متنبہ کیا کہ وہ ان غریب عوام پر یہ ظلم بند کرائے، ورنہ قیامت کے روز اس سے باز پرس ہوگی۔ ڈاکٹر ملک غلام مرتضیٰ صاحب کی نظر سے غالباً یہ کتاب نہیں گزری، ورنہ وہ ایسا نہ لکھتے۔

حیرت کا مقام ہے کہ فاضل مصنف نے جو بعض عربی رسائل کے مصنف بھی ہیں، ابو سفیان رضی اللہ عنہ کی بیوی ہند کا نام اردو زبان کے عام مصنفین کی طرح ''ہندہ'' لکھا ہے (ص ۱۱) جو ایک مہمل لفظ ہے۔ تمام عربی تواریخ میں اس کا نام ''ہند'' ہی مذکور ہے۔

صفحہ ۲۳ پر ایک حدیث لکھی ہے: ''لیس المؤمن طعان ولا لعان'' یہ بالکل غلط عربی

Marfat.com

ہے۔صحیح حدیث یوں ہے:''لیس المومن بطعان و لا لعان ''(ترمذی)اور یہی صحیح عربی ہے۔

صفحہ ۳۳ پر ایک حدیث لکھی ہے:''الغیبة اشد من الزنا ''(غیبت زنا سے زیادہ بڑا گناہ ہے) یہ حدیث نہ تو عقلاً درست ہے اور نہ نقلاً۔اس حدیث کے بارے میں ساتویں صدی ہجری کے مشہور محدث ومصنف امام صنعانی صاحب''مشارق الانوار'' کا قول ہے کہ وہ موضوع ہے۔ (کشف الخفاء للشیخ اسماعیل العجلونی، ج ۲،ص ۸۱)امام صنعانی نے موضوع احادیث پر ایک کتاب ''موضوعات'' کے نام سے تصنیف فرمائی تھی۔اسی سے یہ قول منقول ہے۔پھر زنا تو اتنا بڑا جرم ہے کہ اس پر شریعت میں رجم کی سزا مقرر ہے اور قرآن کے مطابق ایک زانی شخص زانیہ عورت کے علاوہ کسی سے شادی نہیں کرسکتا، جب کہ غیبت کرنے والے کے لیے نہ کوئی ایسی سزا ہے اور نہ کوئی ایسا حکم۔کوئی شک نہیں کہ یہ بہت بڑا اخلاقی جرم ہے۔جس کی قرآن میں بھی سخت مذمت ہے،لیکن زنا سے بدتر گناہ کہنا درست نہیں۔یہ ان احادیث میں سے ہے جو زبان زد عوام ہیں اور جن کی تحقیق و تصحیح میں فلسطین کے شیخ اسماعیل عجلونی نے ساڑھے تین سو سال قبل یہ بے نظیر کتاب لکھی ہے۔

ص ۳۵ پر مشہور،قدیم محدث ابن جریج کا نام ابن جرتج مذکور ہے۔یہ طباعت کی غلطی بھی ہوسکتی ہے،لیکن میں نے بعض دیگر اردو کتابوں میں بھی اسی طرح آخر میں حرف ''ح'' سے دیکھا ہے۔اس کی اصلاح ہونی چاہیے۔

اسی صفحہ پر موصوف نے الجبرا کو مسلمانوں کی ایجاد بتایا ہے۔ یہ بات درست نہیں، مسلمانوں سے بہت پہلے یونان اور ہندوستان میں الجبرا کا علم موجود تھا۔عہد عباسی میں تیسری صدی ہجری میں قسطا بن لوقا نے دیوفنتس یونانی کی کتاب ترجمہ کی تھی۔صحیح بات یہ ہے کہ مسلمانوں نے اس علم کو ترقی دی۔ نئے مسائل اور ان کے حل پیش کیے اور انہی کی تحقیقات کی وجہ سے یورپ میں یہ علم عربی نام سے یاد کیا گیا۔عربی میں یہ الجبر والمقابلہ ہے۔

صفحہ ۳۶ پر اس تقریر میں جو بنو عباس کے دور کے بارے میں ہے ایک اور جھوٹی حدیث: ''العلم علمان ، علم الادیان و علم الابدان ''(علم کی دو قسمیں ہیں،علم ادیان اور علم اجسام) کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد کہا گیا ہے۔یہ ایک موضوع حدیث ہے۔ (ملاحظہ ہو،شیخ اسماعیل العجلونی کی مذکورہ کتاب۔ج ۲،ص ۶۸)اس میں انہوں نے حافظ ابن حجر

Marfat.com

عسقلانی کے حوالہ سے اس کو موضوع لکھا ہے۔ امام سیوطی مصری نے اپنے رسالہ "الطب النبوی" میں اسے شافعی کا قول بتایا ہے۔ اس قول سے عطاروں نے بہت فائدہ اٹھایا ہے۔ اس موضوع حدیث کو اپنے دو کانوں پر لکھ کر خوب دوائیں فروخت کرتے رہے ہیں۔ پھر ظاہر ہے کہ علم صرف دو ہی نہیں ہیں۔ علم کی بہت سی شاخیں ہیں، جن کا نہ مذہب سے تعلق ہے اور نہ جسم سے۔

اس موضوع (جھوٹی) حدیث کو بنیاد بناتے ہوئے، فاضل مصنف نے عباسی دور میں علمی ترقی کے خلاف جو سخت سست لکھا ہے اور دوسرے پہلوؤں سے جو عام تنقید کی ہے وہ محض خطابت اور جذباتی بیان ہے۔ اس میں حقائق سے صرف نظر کیا گیا ہے۔ حیرت کی بات ہے کہ اس طرح کی غیر حقیقی باتیں کس طرح ڈاکٹر ملک غلام مرتضیٰ صاحب کے قلم سے نکلی ہیں، وہ کہتے ہیں:

"مگر بدقسمتی سے علمی مزاج ہی کے نام پر ہی عباسی دور کے مسلمانوں میں حکومت کے زیر سرپرستی ایک ایسی تحریک شروع ہوگئی جس نے آخر کار علمی، معاشرتی، سیاسی اور معاشی بلکہ ہر اعتبار سے مسلمانوں کو مفلوج کر کے رکھ دیا۔ یہ تحریک بظاہر آزادی فکر کی تحریک تھی، لیکن یہ ایک سوچی سمجھی سازش تھی جس نے مسلمانوں کے عقائد ان کے مشن اور ان کی مجاہدانہ زندگی کا جنازہ نکال دیا۔ یہ فلسفہ یونان کی درآمد تھی، جس کے ساتھ عیسائی رہبانیت اور ہندو فلسفہ ویدانت بھی آ گیا۔" (ص ۳۷)

یہ ایک بڑا ہی غیر ذمہ دارانہ بیان ہے۔ جس کا ایک ایک لفظ تاریخی حقائق کے خلاف ہے۔ حیرت و افسوس کا مقام ہے کہ وہی اولین عہد عباسی جو باتفاق مورخین و محققین مسلمانوں کا علمی اعتبار سے سنہرا دور ہے، انہوں نے اسے مسلمانوں کا ایک فالج زدہ دور قرار دیا ہے۔ بلکہ انہیں عباسی خلافت کے زیر سرپرستی اس عہد میں ایک ایسی تحریک، بلکہ آزادی فکر کے نام پر ایک ایسی سازش نظر آتی ہے، جس نے مسلمانوں کا ہر حیثیت سے جنازہ نکال دیا۔ سبحان اللہ!

موصوف یونانی فلسفہ کے تراجم سے شدید برہم ہیں، جو المامون العباسی کے دور میں ہوئے۔ مگر وہ یہ بھول گئے کہ اس سے بہت قبل ابوجعفر المنصور کے عہد میں پہلے یونان و ہندوستان کی ریاضیات و طب کی کتابوں کے تراجم ہوئے، ان کے ذریعہ سے مسلمانوں میں یہ مفید اور انتہائی ضروری علوم عام ہوئے اور مسلمان انجینئرنگ اور طب میں غیروں کے محتاج نہ رہے۔ بلکہ

Marfat.com

بعد میں انہوں نے انہیں موضوعات پر مزید تحقیق کر کے بے نظیر کتابیں لکھیں اور عملی طور پر سوسائٹی کی ترقی کے کام کیے۔ یونانی فلسفہ کی کتابوں کے ترجمے اس علمی ترقی کے دور میں غیر مسلم مصنفین نے خود کیے اور بعض بغداد کے مشہور علمی مرکز ''بیت الحکمۃ'' میں ہوئے، جس کی ترقی میں مامون الرشید کا بڑا ہاتھ تھا۔ لیکن المامون نے اس فلسفہ کی نہیں، بلکہ اس کے رد کے لیے جو نیا علم ''کلام'' کے نام سے وجود میں آیا، اس کی سرپرستی کی۔ ڈاکٹر ملک غلام مرتضیٰ صاحب بولتے ہیں کہ اولین عہد عباسی کا بغداد، موجودہ لندن اور پیرس و نیویارک کی طرح تھا۔ جہاں ہر مذہب و ملت کے لوگ جمع تھے اور الحاد و زندقہ کی پہلی رومانی کی تعلیم کے اثرات سے آئی تھی اور مامون الرشید عباسی کے دادا خلیفہ المہدی نے ایسے ملحدین کے رد اور ان کے خلاف عملی تدابیر اختیار کرنے کے لیے ایک محکمہ تشکیل دیا تھا، جس کا نام ''دیوان افسر زنادقہ'' تھا۔ معتزلہ نے اس سلسلہ میں اول اول اہم خدمات انجام دیں اور المامون نے خاص طور پر ان کی سرپرستی کی اس لیے کہ وہ ملحد فلسفیوں اور ایرانی طرز کے زندیقوں کے خلاف فکری طور پر بڑے سرگرم تھے، لیکن ان سے ایک خاص مسئلہ میں جو ''خلق القرآن'' کے نام سے مشہور ہے، توحید الٰہی ثابت کرنے میں غلطی ہوئی اور المامون نے اس کی سرپرستی کی۔ اس کے بعد المعتصم اور الواثق اس راستہ پر قائم رہے۔ لیکن جلد ہی یعنی صرف بیس سال بعد حکومت کی تائید اس سلسلہ میں ختم ہوگئی۔ معتزلہ کو اس قول کے پرچار سے روک دیا گیا اور سنت نبوی کی اہمیت دوبارہ سے امام احمد بن حنبل کے ثبات و قربانی کے سبب قائم ہوگئی۔

اسلامی تاریخ کا ادنیٰ طالب علم بھی جانتا ہے کہ مسلمان اس دور میں علمی، عملی، سیاسی، معاشرتی، اقتصادی، غرض کسی اعتبار سے ہرگز مفلوج نہیں ہوئے تھے۔ بلکہ تفسیر، حدیث، فقہ، معاشیات، عقائد کی بنیادی کتابیں اسی دور میں لکھی گئیں۔ اس طرح ریاضیات، فلکیات، طب وغیرہ میں بے پناہ ترقی ہوئی اور دو سو سال تک بے نظیر کتابیں لکھی گئیں، جن سے بعد میں یورپ نے اپنی علمی و تمدنی ترقی میں فائدہ اٹھایا۔

امام مالک، امام شافعی، امام احمد بن حنبل، امام بخاری، امام مسلم اور دیگر مصنفین صحاح ستہ، قاضی ابو یوسف، خود امام ابو حنیفہ اور پھر ان کے دوسرے شاگرد امام محمد شیبانی، مورخ و مفسر محمد بن جریر طبری، کتاب الاموال کے مصنف ابو عبید القاسم بن سلام اور پھر سائنس میں ابو موسیٰ الخوارزمی

Marfat.com

، ابو العباس فرغانی، البتانی، ابن ہیثم، محمد بن زکریا الطبیب، البیرونی، ابن سینا وغیرہ ماہرین ریاضیات وطب اس دور کے مشاہیر ہیں اور ان کی کتابیں مشہور ہیں، پھرانہی کا یہ علم اندلس پہنچا، جہاں دیگر مایہ ناز علماء اور نوابغ روزگار سائنسدان پیدا ہوئے۔

سیاسی طور پر عباسی خلفاء المنصور، المہدی، ہارون الرشید اور المعتصم سبھی نے دشمن اسلام بیزنطی حکومت کے خلاف جہاد قائم رکھا۔ ہارون الرشید اور المعتصم دونوں خود اسلامی لشکر کی قیادت کرتے ہوئے رومی (بیزنطی) سلطنت کے علاقے میں پہنچے اور رومیوں کو شکست فاش دی، ہارون الرشید نے نقفور، شہنشاہ بیزنطہ کو شکست دے کر اس کے سر پر دو دینار جزیہ لگایا اور معتصم نے مسلمان عورتوں پر ظلم کے خلاف رومی شہر عموریہ کی اینٹ سے اینٹ بجادی۔

ہارون الرشید نے تو بیزنطی علاقہ میں حکومت کے زیر سرپرستی موسم گرما اور موسم سرما میں مجاہدانہ حملوں کو منظم کرنے کے لیے، جنہیں عربی زبان میں علی الترتیب ''الصوائی'' اور ''الشواتی'' کہا جاتا تھا، موجودہ ترکی میں فرنٹیر کا ایک علیحدہ سے صوبہ بنایا، جس کا نام العواصم تھا۔ اس صوبہ میں فوجی چھاؤنیاں قائم کی گئی تھیں، جہاں سے رومی دشمنان اسلام کے خلاف جہاد کا عمل پابندی سے جاری رہا۔ چوتھی صدی ہجری میں عباسی حکومت کی کمزوری کے بعد شمالی عراق وشام میں قائم نیم آزاد مملکت حمدانیہ نے اس جہاد کو جاری رکھا۔

پھر کس طرح ڈاکٹر ملک غلام مرتضیٰ صاحب کہہ سکتے ہیں کہ اس عباسی دور میں مسلمانوں کے عقائد اور ان کی مجاہدانہ زندگی کا جنازہ نکل چکا تھا۔ یہ تو بڑا غلط اور ظالمانہ الزام ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اولین عہد عباسی میں مسلمان سیاسی طور پر دنیا کی سب سے بڑی سیاسی طاقت تھے۔

معاشی طور پر بنو عباس کے اس دور میں مسلمان انتہائی خوش حال تھے۔ جس سے تاریخ کا ہر طالب علم واقف ہے۔ ہارون الرشید اپنے سر پر گزرتے ہوئے بادل کو مخاطب کر کے کہتا تھا: ''امطری حیث شئت یاتینی خراجک'' (جہاں چاہو جا کر برسو، میرے پاس اس زمین سے مالیانہ آئے گا، جہاں تم برسو گے)

مشہور عالم ومورخ امام سیوطی ہارون الرشید کے عہد کے بارے میں کہتے ہیں:

''ہارون الرشید کے ایام حکومت اپنی فراوانی میں گویا شادیوں کے دن تھے۔'' یعنی ہر شخص

Marfat.com

اس زمانہ میں خوش حال تھا اور یہ سلسلہ اس وقت تک قائم رہا جب تک اس پر بعض بیرونی مسلمان طاقتیں مسلط نہیں ہوگئیں، یعنی بنو بویہ اور سلاجقہ۔

پھر اس دور عباسی میں معروف کرخی، جنید بغدادی، بایزید بسطامی، سہل التستری اور فضیل بن عیاض وغیرہ جیسے اصحاب زہد و ورع تھے جو اساطین تصوف میں شمار ہوتے ہیں اور ان کے لاکھوں متبعین تھے جو عراق، ایران، حجاز اور مصر و شام میں پھیلے ہوئے تھے۔

ان حقائق کے پیش نظر، فاضل مصنف کس طرح کہہ سکتے ہیں کہ: ''عباسی حکومت کے زیر سرپرستی علمی تحریک نے علمی، معاشرتی، سیاسی اور معاشی طور پر بلکہ ہر اعتبار سے مسلمانوں کو مفلوج کر کے رکھ دیا۔'' یہ کیا انداز بیان اور کیا الزام تراشی ہے!!

بہر حال نہ کوئی ایسی تحریک تھی نہ سازش، نہ مسلمانوں کے عقائد، ان کے مشن اور ان کی مجاہدانہ زندگی کا جنازہ نکلا تھا، جیسا کہ اوپر کے پیش کردہ حقائق سے واضح ہو گیا ہوگا اور نہ مسلمان علمی، سیاسی اور معاشی اعتبار سے اس دور میں مفلوج ہوئے تھے، اگر ایسا تھا تو ڈاکٹر ملک غلام مرتضیٰ صاحب بتائیں کہ ہمارے مذکورہ اور ان جیسے سیکڑوں نوابغ دہر، علماء، فقہاء، محدثین، مفسرین، متکلمین، ائمہ تصوف و روحانیت، شعراء، ادباء اور یگانہ روزگار ریاضی دان، ماہرین فلکیات، اطباء، انجینئر اور مخترعین کس طرح اور کہاں پیدا ہوئے؟ ہمارے پیش کردہ ناموں کی فہرست میں دوسرے عباسی دور کے نوابغ امام ابوالحسن الاشعری، ماتریدی، باقلانی، امام غزالی، شیخ عبدالقادر جیلانی، ابن الجوزی اور زمخشری وغیرہ کا اضافہ کیا جاسکتا ہے۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ڈاکٹر ملک غلام مرتضیٰ صاحب نے مسلمانوں کی تہذیبی، علمی اور سیاسی تاریخ کے مطالعہ کی طرف توجہ ہی نہیں دی، ورنہ وہ یہ سب کچھ نہ لکھتے جو انہوں نے لکھا ہے۔ موصوف تو عربی جانتے ہیں۔ عربی میں ایم اے ہیں۔ وہ ابن خلکان کی ''وفیات الاعیان'' اور امام ذہبی کی عظیم کتاب ''سیر اعلام النبلاء ۲۵ جلدیں''، قفطی کی ''اخبار الحکماء'' اور ابن ابی اصیبعہ کی ''طبقات الاطباء'' تو مطالعہ فرمائیں اور یہ قدیم مآخذ نہیں تو، احمد امین کی ''ضحی الاسلام وظہر الاسلام ۶ جلدیں'' یا پھر سوئس مستشرق آدم متز کی جرمن کتب کا عربی ترجمہ ''الحضارۃ الاسلامیۃ فی القرآن الرابع الہجری دو جلد'' ہی مطالعہ کریں تو ان پر اس دور کی علمی و تمدنی عظمت کا راز کھلے گا۔

Marfat.com

پھر افسوس کہ ملک غلام مرتضیٰ صاحب کی یہ تقریر اور اب مطبوعہ مضمون ''بنو عباس کے دور میں مسلمانوں کا معاشرتی کردار'' تضادات کا ایک عجیب مجموعہ ہے۔ مضمون کے شروع میں انہوں نے مختصراً اس عہد میں علمی ترقی اور صوفیاء کی روحانی خدمات کی مدح سرائی کی ہے اور دو صفحوں کے بعد اس سب کا جنازہ نکال دیا ہے۔ اس مضمون میں وہ تصوف اور اہل تصوف کے تو مداح ہیں کہ خود صوفی ہیں، لیکن خلیفہ المامون کے عہد میں بیت الحکمۃ میں جو علمی تراجم کا کام ہوا، اس پر ناراض ہو کر انہوں نے اس دور کی تمام علمی ترقی پر خط تنسیخ پھیر دیا ہے۔

وہ اس دور میں رہبانیت اور ہندو فلسفۂ ویدانت کے، مسلمانوں میں در آنے کے بھی شاکی ہیں۔ آخر وہ یہ تو بتائیں کہ یہ کس راستہ سے آیا؟ کیا اہل تصوف کے ذریعہ سے نہیں آیا؟ پھر اس موضوع پر بھی وہ تضاد کا شکار ہیں، ایک طرف ابتدا میں تو فرماتے ہیں:

''تصوف پر اہم ترین کتب اس دور میں لکھی گئی ہیں اور صوفیا کی بزرگ ترین شخصیات اس دور میں روشنی کے میناروں کی طرح چمک رہی ہیں۔'' (ص ۴۵)

اور پھر صرف دو صفحوں کے بعد اس دور میں وہ رہبانیت اور ہندو فلسفہ ویدانت کے ظہور کا رونا روتے ہیں (ص ۴۷) اس رہبانیت اور ہندو فلسفہ سے کون متاثر تھے؟ وہ ائمہ تصوف جن کا ذکر ہم نے اوپر کیا ہے؟ یا پھر بعد کے شیخ عبدالقادر جیلانی حنبلی، امام القشیری، شہاب الدین السہروردی (مصنف عوارف المعارف) یا ان سے قبل عبداللہ بن المبارک؟ جن کو جناب ڈاکٹر ملک غلام مرتضیٰ صاحب نے صرف ایک بزرگ صوفی کی حیثیت سے پیش کیا ہے، جو حقیقت کے بالکل برعکس ہے، کیونکہ وہ معروف معنی میں صرف کوئی صوفی ''بزرگ'' نہیں تھے، بلکہ مشہور محدث، فقیہ اور مجاہد تھے۔ ان کا پیشہ تجارت تھا اور وہ بہت صاحب ثروت تھے۔ معتبر کتابوں میں بتایا گیا ہے کہ ان کا اثاثہ چار لاکھ دینار تھا اور اس میں حجاج، فقراء اور مجاہدین پر بہت سخاوت کے ساتھ خرچ کرتے تھے۔ علمی حیثیت سے وہ سفیان ثوری، امام ابوحنیفہ اور امام مالک جیسے تابعین کے شاگرد تھے اور خود اپنے وقت کے بیسیوں محدثین و ناقدین رجال حدیث کے استاد تھے۔ یہاں تک کہ ان کو ''امیر المومنین فی الحدیث'' کا لقب دیا گیا ہے۔ پھر وہ عراق کے شمال میں رومی سرحدوں پر جہاد میں بھی شریک ہوتے تھے۔ ایک مرتبہ انہوں نے ایک معرکہ میں چھ رومی کافروں

Marfat.com

کو واصل جہنم کیا۔ خطیب بغدادی کی عظیم تاریخ بغداد میں اس کا مفصل تذکرہ ہے اور اس سے بڑھ کر امام ذہبی کی ''سیر اعلام النبلاء جلد ۸ میں''۔

پھر ان کا جو قصہ ہارون الرشید کے مقابلے میں فاضل مصنف نے اپنی کتاب کے صفحہ ۳۶ پر نقل کیا ہے، وہ بغداد میں نہیں، بلکہ عراق کے ایک دوسرے شہر الرقہ میں وقوع پذیر ہوا۔ ص ۳۷ پر قسطا بن لوقا کا نام غلط طور پر قسطا بن بوتا لکھا گیا۔ (یہ طباعت کی غلطی بھی ہوسکتی ہے) یحیٰی بن عدی کی کنیت ابو جعفر لکھی ہے، جو غلط ہے۔ صحیح کنیت ابوزکریا ہے (ملاحظہ ہو قفطی کی کتاب اخبار الحکماء) اور اس کے ساتھ ''جریل'' نہ جانے کس نام کی بگڑی ہوئی صورت ہے، کیونکہ جریل نام کا کوئی مترجم اس عباسی عہد میں نہیں تھا۔

اور سب سے زیادہ حیرت انگیز اور دلچسپ بات اس سارے مضمون اور اسی صفحہ ۳۷ پر، جسے پڑھ کر مجھے بے اختیار ہنسی آگئی اور یقیناً قارئین بھی محظوظ ہوں گے وہ موصوف کا یہ انکشاف ہے کہ ابن سینا اور ابی سینا ایک ہی شے ہیں، پڑھیے اور سر دھنیے فرماتے ہیں:

''یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں میں فلسفہ مشائین کے سب سے بڑے استاد ابن سینا کے بارے میں علامہ اقبال یوں فرماتے ہیں:

یورپ کے کرگسوں کو ابھی تک نہیں خبر ہے کتنی زہرناک ابی سینا کی لاش

ہونے کو ہے یہ مردہ دیرینہ قاش قاش

اتنا تو عام قارئین بھی جانتے ہیں کہ ابن سینا مسلمانوں کے ایک مشہور فلسفی گزرے ہیں۔ جہاں تک ابی سینیا کا تعلق ہے، وہ اس ملک کا نام ہے جسے اسلامی تاریخ میں حبشہ کہا جاتا ہے۔ اور آج کل ایتھوپیا کہتے ہیں اور یہ مشرقی افریقہ کا بہت مشہور ملک ہے۔ سن ۱۹۳۵ء میں اطالوی حکومت نے سخت بمباری کی تھی اور اس پر قبضہ کر لیا تھا۔ علامہ اقبال نے اسی پر تنقید کی ہے، نہ کہ کسی یورپین طاقت نے ایران میں مدفون ابن سینا کی قبر پر بمباری کی تھی، نہ ابن سینا کی لاش میں کوئی زہر نا کی تھی۔ البتہ ابی سینیا کا قدیم ملک اٹلی کے لیے زہرناک ثابت ہوا۔

ڈاکٹر غلام مرتضیٰ صاحب نے علامہ اقبال کے شعر کی جو شرح فرمائی ہے، اس پر تو مجھے یقین ہے کہ علامہ مرحوم بھی اپنی قبر میں زیر لب متبسم ہوئے ہوں گے۔

Marfat.com

ایک انتہائی افسوس ناک بات یہ ہے کہ اس صفحہ ۳۷ پر مشہور عرب مسلمان فلسفی و عالم ریاضیات وطبیعیات یعقوب کندی کو عیسائیوں اور یہودیوں کے زمرہ میں شمار کیا ہے، فرماتے ہیں:

''لطف کی بات یہ ہے کہ ان کتابوں کے ترجمہ کا سارا کام عیسائی اور یہودی علماء نے کیا، جن کے مشہور نام یعقوب کندی۔۔۔۔وغیرہ ہیں۔''

صفحہ ۳۸ پر امام غزالی کی مشہور کتاب ''تہافت الفلاسفۃ'' کا املاء غلط طور پر ''تہافتہ الفلاسفتہ'' لکھا ہے۔ یہ لفظ تہافت، ہفت بمعنی سقوط سے تفاعل کے وزن پر مصدر خماسی ہے، جیسے تناسب، تدارک وغیرہ۔

الغرض، انتہائی افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ اس مقالے یا مضمون کا بیشتر حصہ اسلامی تاریخ سے بے خبری اور تضاد و تناقض کا عجیب مظہر ہے۔ بعض مثالیں پیش کی جا چکی ہیں، زیادہ کی گنجائش نہیں۔ غالب خیال یہ ہے کہ ریڈیو اور ٹیلی ویژن کی تقریروں، دروس اور مجالس وعظ و ارشاد میں مشغولیت کی وجہ سے ملک غلام مرتضٰی صاحب کو پڑھنے کا موقع کم ملتا ہے اور تاریخی معلومات علم لدنی کے ضمن میں آتی نہیں، یا پھر وہ زیادہ تر قرآن کے تراجم وتفاسیر ہی پڑھتے ہیں۔

حصۂ مقالات کے ضمن میں ''عظمت شہید'' کے نام سے ایک مضمون میں صفحہ ۴۷ پر ایک زبان زد عام فارسی رباعی:

شاہ ہست حسین، بادشاہ ہست حسین — دین است حسین، دین پناہ ہست حسین
سرداد نہ داد دست دردست یزید — حقا کہ بنائے لا الٰہ ہست حسین

کو عام روش کے مطابق، خواجہ معین الدین اجمیری کی رباعی بتایا ہے اور اس کے بعد فرماتے ہیں:

''حضرت معین الدین اجمیری، امام حسین رضی اللہ عنہ کو، بنائے لا الٰہ کا خطاب دیتے ہیں۔''

یہ ایک لغو بات ہے۔ دراصل یہ رباعی ایک ایرانی شیعی شاعر معین الدین کاشفی ہروی کی ہے اور اہل تحقیق اس سے باخبر ہیں۔ پھر یہ کہ سوائے شیعہ حضرات کے کون یہ کہہ سکتا ہے کہ سیدنا حسین کے تمام مخالفین کافر ہو گئے تھے اور حضرت حسین نے اپنا خون دے کر دوبارہ لا الٰہ کی بنیاد

Marfat.com

رکھی۔ اہل سنت والجماعت کا ہرگز یہ عقیدہ نہیں۔ اگر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد بنائے لا الہ کا خطاب کسی کو دیا جا سکتا تھا تو وہ حضرت ابو بکر تھے، جنہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات کے فوراً بعد جزیرہ عرب کے مرتد ہونے والے قبائل کے خلاف تلوار اٹھائی اور بعض کی بیخ کنی کی، اور بقیہ کو اسلام کی طرف دوبارہ واپس لانے میں کامیاب ہوئے، لیکن جب انہیں ہی یہ خطاب نہیں دیا گیا تو اور کون اس خطاب کا مستحق ہو سکتا ہے۔

صفحہ ۱۰۷ پر ایک مشہور تابعی عروہ بن زبیر کو مصنف نے صحابی بنا دیا ہے۔ یہ بات مدینہ منورہ میں ایک لیکچر کے دوران میں کہی گئی جو انہوں نے بعض پاکستانی ججوں اور پولیس افسران کو دیا تھا۔ یہ عروہ بن الزبیر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات کے پندرہ سال بعد حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی خلافت میں ۲۶ھ میں پیدا ہوئے، پھر صحابی کس طرح ہو سکتے ہیں!

صفحہ ۱۱۳ پر اس لیکچر میں ام المومنین سیدہ ام حبیبہؓ کے سابق شوہر کا نام انہوں نے عبداللہ بن جحش بتایا ہے، جب کہ دو صفحات قبل انہی عبداللہ بن جحش کو ام المومنین زینب بنت خزیمہ کا سابق شوہر بتا چکے ہیں، حقیقت یہ ہے کہ ام المومنین ام حبیبہ کے سابق شوہر کا نام عبید اللہ بن جحش تھا، جنہوں نے ہجرت حبشہ کے دوران وہاں وفات پائی۔

صفحہ ۱۸۸ پر ایک عجیب قصہ درج ہے:

''مہابت خان (مضمون میں ''محابت'' طبع ہوا ہے، جو غلط ہے) نے جہانگیر کو گرفتار کرنے کے بعد، حضرت مجدد الف ثانی کو اقتدار کی پیش کش کی۔''

موصوف نے اپنے اس دعویٰ کے لیے کسی حوالہ کی ضرورت نہیں سمجھی اور پھر حوالے لے تو انہوں نے اپنی اس کتاب میں شاذ و نادر ہی دیے ہیں۔ بہر حال، تاریخ میں اس واقعہ کا کہیں ذکر نہیں اور پھر حضرت مجدد الف ثانی اپنے وقت کے ممتاز ترین مرشد طریقت تھے۔ حکومت و اقتدار کے طالب کب تھے؟ وہ تو ایک عظیم داعی اور مصلح امت تھے۔ یہی نہیں، موصوف نے یہاں تک فرمایا ہے کہ:

''حضرت مجدد نے قبول نہیں فرمایا اور تخت دوبارہ جہانگیر کو لوٹا دیا۔''

جن بعض خوش عقیدہ تذکرہ نگاروں کی تحریروں سے ڈاکٹر غلام مرتضیٰ صاحب نے یہ اخذ کیا

Marfat.com

ہے، ان کو یہ پتا نہ تھا کہ مہابت خان کی بغاوت حضرت مجدد الف ثانی کی وفات کے ایک سال بعد ۱۰۳۵ھ/ ۱۶۲۶ء میں ہوئی۔ موصوف نے بھی تحقیق کی ضرورت نہ سمجھی اور اپنے قارئین کے سامنے اس جھوٹے واقعہ کو ایک حقیقت کے طور پر پیش کر دیا۔

پھر مزید یہ کہ جہانگیر کے جن درباری امراء سے حضرت مجدد کو یک گونہ تعلق تھا اور جن کو آپ نے متعدد خطوط میں، عہد اکبری سے پیدا شدہ فساد کی اصطلاح کی طرف توجہ دلائی۔ ان میں مہابت خاں کا ذکر نہیں ملتا۔ ان امراء میں نواب مرتضیٰ خاں المعروف بہ شیخ فرید، عبدالرحیم خان خاناں، خواجہ صدر جہاں، مرزا عزیز کوکہ، خاں جہاں لودھی، لال بیگ جہانگیری وغیرہ کو حضرت مجدد سے محبت وعقیدت تھی جنہیں آپ نے متعدد مکاتیب تحریر فرمائے، لیکن مہابت خاں کے نام کوئی مکتوب نہیں ملتا۔ اگر جناب غلام مرتضیٰ صاحب حضرت مجدد پر کوئی تحقیقی کتاب مثلاً عظیم محقق ومصنف مولانا سید ابوالحسن علی ندوی صاحب مدظلہ ہی کی کتاب ''تذکرۂ مجدد الف ثانی'' مطالعہ فرما لیتے، تو اس وہم کو عام نہ کرتے، بہر حال تاریخی طور پر ان کا پیش کردہ واقعہ درست نہیں۔

صفحہ ۲۹ پر سیرت نبوی ﷺ کے ذکر میں فرماتے ہیں کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس اثاثہ میں صرف آٹھ چیزیں تھیں۔

''ایک چادر، ایک تکیہ، ایک لوٹا، ایک جائے نماز، ایک جوڑا کپڑوں کا، ایک مشکیزہ اور چکی۔''

اب اگر انہیں گنا جائے، تو صرف سات چیزیں بنتی ہیں۔ خیر چھوڑیئے، اس گنتی کے مسئلہ کو۔ لیکن کیا یہ عقل میں آنے کی بات یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس کپڑوں کا صرف ایک ہی جوڑا تھا؟ کیا آپ ہمیشہ اسے ہی پہنے رہتے تھے، لباس دھوتے یا دھلواتے کس وقت تھے؟ جب کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی احادیث میں صفائی پر بہت زور دیا ہے اور صفائی کو علامت ایمان بتایا ہے، مشہور حدیث ہے: ''النظافة من الایمان''

جو کچھ موصوف نے لکھا ہے، وہ کسی طرح درست نہیں، اگر وہ سیرت نبوی ﷺ کے تفصیلی پہلوؤں پر انتہائی مستند اور مفصل کتاب یعنی حافظ حدیث ابن القیم کی ''زاد المعاد فی ہدی خیر العباد'' یا پھر امام ذہبی کی کتاب ''تاریخ الاسلام'' کی پہلی جلد کا مطالعہ فرماتے جو سیرت نبوی پر ہے، تو انہیں

Marfat.com

ان کتابوں میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اثاثہ اور اسلحہ کی تفصیل معلوم ہوتی اور اس میں مذکورہ اشیاء کے علاوہ بہت سی چیزیں نظر آتیں۔ وہ دیکھتے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اثاثہ میں مندرجہ ذیل چیزیں تھیں:

نو تلواریں (ان سب کے علیحدہ علیحدہ نام ان کتابوں میں مذکور ہیں، ذوالفقار بھی انہی میں سے ایک تھی)۔

چھ کمانیں (ان کے نام بھی مذکور ہیں)۔

ایک ترکش تھا، جس کا نام کافور تھا۔

ایک چمڑے کی پیٹی تھی جس میں چاندی کے تین حلقے تھے۔

دو ڈھالیں تھیں، جن کے نام زلوق اور فتق تھے۔ ایک اور ڈھال آپ کو ہدیہ میں ملی تھی، جس پر ایک تصویر بنی ہوئی تھی۔ اس پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنا دست مبارک رکھا اور اللہ تعالیٰ کے حکم سے وہ تصویر مٹ گئی۔

پانچ برچھے تھے اور چند مختلف سائز کی لاٹھیاں یا چھڑیاں تھیں۔

دو خود تھے، یعنی (Helmets) جو جنگ میں سر پر پہنتے ہیں۔

تین جبے تھے، جو آپ جنگ میں زرہ کے نیچے پہنتے تھے، انہی میں ایک سبز دبیز ریشم (دیبا) کا تھا اور اس سے امام احمد بن حنبل نے اپنی ایک روایت میں میدان کارزار میں ریشم پہننے کو جائز لکھا ہے۔

ایک سیاہ علم تھا، جس کا نام عقاب تھا اور اس کے علاوہ چند زرد و سفید علم بھی تھے۔

آپ کا ایک بڑا خیمہ تھا جس کا نام الکن تھا۔

سات گھوڑے تھے جن کے نام مشہور مصری شافعی عالم ابن جماعہ نے ایک شعر میں جمع کر دیے ہیں:

والخیل، سکب، لحیف، سبحة، ظرب　　لزاز، مرتجز، ورد لها اسرار

چار خچر اور دو گدھے تھے، جو منقوس فرماں روائے مصر اور دوسرے عرب حکمرانوں نے ہدیہ میں دیے تھے۔

Marfat.com

تین اونٹنیاں سواری کی تھیں: قصواء، عضباء، جدعاء، بعض نے ان آخر الذکر دونوں کو ایک کہا ہے۔ (زاد المعاد، صفحہ ۱۳۱۔۱۳۴، طبع بیروت ۱۹۸۵ء)

۴۵ اونٹنیاں دودھ دینے والی تھیں اور ایک سو بھیڑیں تھیں اور سات دودھ دینے والی بکریاں جن کو ام ایمن چرانے لے جاتی تھیں۔

جہاں تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ملابس کا تعلق ہے، اس کو حافظ ابن القیم نے ایک علیحدہ فصل میں ذکر کیا ہے، جس میں آپ کے عمامہ، جس کا نام سحاب تھا، جبہ، قبا، اونی عبا اور مختلف جوڑوں اور چادروں کا ذکر ہے۔ انہوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ آپ کے پاس فرد کی ایک ایسی عبا تھی جس کا استر ریشم کا تھا اور وہ آپ کو شاہ روم نے ہدیہ میں بھیجی تھی اور آپ کا ایک یمنی جوڑا تھا، جس کی بنائی میں سرخ و سفید لائنیں تھیں۔

الغرض ان مشہور حافظ حدیث، مصنف اور محقق نے ۱۶ صفحات اور مختلف فصول میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اثاثے، یعنی ہتھیاروں، سواری کے جانوروں، مواشی اور ملابس کی تفصیل بیان کی ہے اور ایسا ہی کچھ سیرت نبوی کی دیگر مفصل عربی کتابوں میں ہے۔

انتہائی افسوس کی بات یہ ہے کہ ڈاکٹر غلام مرتضیٰ صاحب نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اثاثے کی جو انتہائی مختصر اور ناقص فہرست دی ہے، اس کو انہوں نے سید سلیمان ندوی مرحوم سے منسوب کیا ہے۔ حالانکہ ہم نے ''زاد المعاد'' سے اثاثے اور خاص طور پر ہتھیاروں کی جو فہرست پیش کی ہے، تقریباً وہی سید صاحب مرحوم نے ''سیرۃ النبی'' کی دوسری جلد میں دی ہے اور لباس شریف کا ذکر بھی اسی طرح ہے۔ انہوں نے اپنی ''سیرۃ النبی'' میں کہیں یہ نہیں لکھا ہے کہ آپ کے پاس صرف ایک جوڑا تھا اور ایک چکی۔۔۔۔!!

کتب حدیث میں بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اثاثے کا ذکر آتا ہے اور ان میں سب سے زیادہ مفصل حدیث امام طبرانی کی ہے، جس کا ذکر حافظ ابن القیم نے اسی موقع پر کیا ہے، امام ابن تیمیہ کے یہ جلیل القدر شاگرد اپنے استاد کی طرح ایک انتہائی ثقہ محدث اور عظیم عالم تھے۔

کتاب کے آخر میں ایک رسالہ یا کتابچہ سیرت نبوی ﷺ پر ہے، اس میں صفحہ ۴۲۴ پر موصوف نے ''الذکر'' سے مراد قرآن و سنت دونوں لکھے ہیں۔ یہ جناب کی بالکل نئی تحقیق ہے اور

Marfat.com

انہوں نے ضروری نہیں سمجھا کہ اپنی اس تفسیر کے لیے کسی صحابی، تابعی یا کسی قدیم و جدید مفسر کا کوئی حوالہ پیش کریں۔ پھر موصوف نے ''الذکر'' سے جو معنی مراد لیے ہیں، یعنی کتاب وسنت، اس کے لیے جس آیت سے استدلال کیا ہے، وہ ہے: ''وانزلنا الیك الذكر لتبين للناس ما نزل اليهم'' ترجمہ وہ یوں فرماتے ہیں: ''ہم نے تیری طرف ذکر (سنت اور حکمت عملی) نازل کیا، تاکہ لوگوں کے سامنے اس کو واضح کر سکے، جو (قرآن کی صورت میں) ہم نے ان کی طرف اتارا ہے۔''

یہ ایک عجیب وغریب ترجمہ ہے، جس میں اپنی طرف سے بریکٹ میں اضافہ کیا گیا ہے۔ عربی اور اردو کی ساری تفاسیر میں ''الذکر'' سے مراد قرآن ہے (ملاحظہ ہو سورۃ النحل کی تفسیر، طبری، قرطبی، ابن کثیر اور زمخشری) پھر یہ کہ خود قرآن میں اس کے بہت سے دیگر نام مذکور ہیں، جیسے الکتاب، النور، الفرقان، التنزیل وغیرہ اور انہی میں سے ایک نام ''الذکر'' ہے۔ امام سیوطی مصری نے اپنی مشہور کتاب ''الاتقان فی علوم القرآن'' کی سترہویں صنف میں قرآن اور اس کی سورتوں کے یہ نام گنوائے ہیں، لیکن انہوں نے کہیں ''الذکر'' کے معنی ''سنت اور حکمت عملی'' نہیں لکھے، نہ کسی محدث نے کہیں یہ لکھا ہے۔ سورۃ الحجر کی مشہور آیت ہے: ''انا نحن نزلنا الذكر و انا له لحافظون'' (ہم نے قرآن اتارا ہے اور ہم ہی اس کی حفاظت کرنے والے ہیں) اب اگر ''الذکر'' سے قرآن وسنت دونوں مراد ہوتے ہیں تو عربی قواعد کی رو سے ہونا چاہیے تھا: ''وانالهما لحافظون'' (ہم ان دونوں کی حفاظت کرنے والے ہیں)۔

پھر یہ کہ اللہ تعالیٰ کا وعدہ پورا ہوا اور آج تک قرآن میں کوئی تحریف نہیں ہوئی، یعنی کوئی کمی بیشی نہیں ہوئی، جب کہ سب جانتے ہیں کہ احادیث میں ایسا ہوا، سیکڑوں، بلکہ ہزاروں حدیثیں مختلف ادوار میں وضع کرنے والوں نے وضع کیں اور موضوع یعنی جھوٹی احادیث کی نشاندہی اور ان کی تکذیب وتنقید کے لیے ایک مخصوص علم وجود میں آیا، یعنی ''علم الموضوعات'' جس پر بیسیوں کتابیں لکھی گئیں، جن میں اہل علم واقف ہیں۔ اب اگر اللہ تعالیٰ نے قرآن کے ساتھ سنت کی حفاظت کا وعدہ بھی کیا ہوتا، تو یہ موضوع احادیث وجود میں نہ آتیں اور علمائے کرام کو ذخیرہ حدیث نبوی ﷺ کو ان موضوع احادیث سے پاک وصاف کرنے کی دردسری نہ ہوتی۔

Marfat.com

جناب غلام مرتضیٰ صاحب نے اس آیت کریمہ میں جملہ ''ما نزل الیھم'' کا ترجمہ بھی غلط کیا ہے۔ اس جملہ میں ''ما'' موصولہ سے مراد قرآن نہیں، بلکہ بقول تمام ثقہ مفسرین کے مطابق وہ اوامر ونواہی اور وعدوعید ہیں، جو قرآن میں مذکور ہیں اور بشریت ان کی مخاطب ہے اور جن کی تشریح وتوضیح کی ذمہ داری نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو سونپی گئی۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے سپرد کردہ اسی ذمہ داری اور دوسری آیات قرآنی سے حجیت حدیث ثابت ہوتی ہے، اور ''الذکر'' سے قرآن وسنت مراد لینے کی ضرورت نہیں پڑتی۔

غالباً مصنف کو یہ غلط فہمی مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کی ''تفہیم القرآن'' میں اس موقع پر تشریحی نوٹ سے ہوئی ہے، جس میں انہوں نے اس آیت کو منکرین حدیث کے خلاف قرار دیتے ہوئے اس سے حجیت حدیث ثابت کی ہے، لیکن انہوں نے ''الذکر'' کا ترجمہ یہاں سنت و حکمت عملی نہیں کیا ہے، بلکہ آگے کے جملے ''لتبین للناس ما نزل الیھم'' سے ثابت کیا ہے کہ حدیث نبوی دین میں حجت ہے۔ (ملاحظہ ہو تفہیم القرآن۔ ج ۲، ص ۵۴۳، نوٹ ۴۰)

صفحہ ۴۲۸ پر وہ فرماتے ہیں کہ لندن اور تاشقند میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے زمانہ کے لکھے ہوئے قرآن کے دو نسخے موجود ہیں۔ لندن میں کسی مصحف کا ذکر تو آج تک کسی نے نہیں کیا اور یہ صریحاً غلط ہے۔ ہاں تاشقند میں ایک مصحف عثمانی کا ذکر کیا جاتا ہے، جسے کوثر نیازی صاحب نے اپنی کتاب (کوہ قاف کے دیس میں) بڑی اہمیت دی ہے، لیکن اہل تحقیق کے نزدیک یہ نسبت سخت مشکوک ہے۔ کہا جاتا ہے کہ حضرت معاویہ کے زمانہ میں حضرت قثم ابن عباس جو مصحف (قرآن) لے کر ماوراء النہر کی فتح کی مہم میں گئے تھے یہ وہی ہے۔ اگر یہ درست بھی ہو تو زیادہ سے زیادہ حضرت قثم کا ذاتی نسخہ ہے جو مصحف عثمان کے کسی سرکاری نسخے سے منقول ہے، کیونکہ سرکاری نسخے جو مصحف عثمان کہلاتے تھے دمشق، کوفہ اور بصرہ وغیرہ کے والیوں کے پاس محفوظ تھے اور ان میں سے ایک نسخہ حضرت عثمان کے پاس مدینہ منورہ میں محفوظ تھا جسے ''الامام یا المصحف الامام'' کہا جاتا ہے۔

البتہ ایک مصحف عثمانی کا وجود استنبول کے میوزیم ''توپ قاپی سرائے'' میں بتایا جاتا ہے، جو سلطان محمد الفاتح کے زمانہ سے سلاطین آل عثمان کا ذاتی محل اور دفتر تھا، سلطان سلیم اول کے عہد

Marfat.com

۱۵۱۷ء میں عثمانی ترکوں کے شام و مصر و حجاز پر قبضہ کے بعد مصر میں مقیم نام نہاد عباسی خلیفہ سے دوسرے آثار نبویہ، یعنی جبہ، موئے مبارک، عصائے مبارک کے ساتھ یہ مصحف بھی ملا، جو بنو عباس کا ایک فرد تاتاری حملہ کے نتیجہ میں سقوط بغداد کے وقت فرار ہوتے ہوئے اپنے ساتھ مصر لے گیا تھا، جہاں ۶۵۸ھ میں دوبارہ عباسی خلافت مملوک سلاطین کے زیر نگرانی قائم ہوگئی۔ بہر حال ان تبرکات نبویہ کو سلطان سلیم اول واپسی پر استنبول لے گیا اور اس کو اپنے رہائشی محل کے ایک اندرونی کمرے میں بحفاظت تمام رکھا، ان تبرکات کی حفاظت کے لیے چالیس فوجی افسران کا ایک مخصوص دستہ مقرر کیا گیا، عثمانی سلطان خود ان میں سے ایک تھا، اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ یہ تبرکات نبوی اور خود حضرت عثمان کا وہ قرآن جس کو وہ اپنی شہادت کے وقت پڑھ رہے تھے اور جس میں آیت ''فسیکفیکھم اللہ '' پر ان کے خون کے قطرات گرے تھے، عثمانی سلاطین کے نزدیک کتنا اہم تھا۔ بیسویں صدی کے نصف اول کے ایک انتہائی مشہور مصری علامہ و محقق احمد تیمور باشا نے اپنی کتاب ''آثار النبویہ'' میں اس قرآن کا ذکر کیا ہے، اور اس کو درست جانا ہے۔

آل عثمان کا یہ محل عثمانی خلافت کے خاتمہ کے بعد مصطفیٰ کمال کے عہد میں میوزیم بنا دیا گیا۔ راقم سطور نے بھی استنبول کی اپنی دوسری سیاحت میں ان آثار نبویہ اور مصحف عثمان کی زیارت ۱۹۷۲ء میں کی تھی۔

اس تنقیدی جائزے میں ''مشتے نمونہ از خروارے'' یہ بعض نکات اور ان کی تصحیح پیش کی گئی ہے۔ امید ہے کہ قارئین ان تصحیحات سے اپنی معلومات صحیح کرلیں گے اور ڈاکٹر ملک غلام مرتضیٰ صاحب بھی کتاب کے آئندہ ایڈیشن میں ان سے فائدہ اٹھائیں گے اور اپنی تحریروں میں زیادہ کاوش و تحقیق سے کام لیں گے۔

''وما توفیقی الا باللہ و فوق کل ذی علم علیم''

Marfat.com

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی کفالت کس نے کی؟

جناب ابو طالب نے یا زبیر بن عبد المطلب نے (۱)

عام قارئین کو مضمون کا یہ عنوان عجیب معلوم ہوگا، بلکہ اچھے خاصے تعلیم یافتہ اور بیشتر علماء و اہل دین کو اس سوال پر پریشان کن حیرت ہوگی، کیونکہ سیرت نبوی کی قدیم و جدید تمام کتابوں میں خواہ وہ عربی میں ہوں یا دوسری زبانوں (اردو، فارسی، انگریزی، فرنچ وغیرہ) میں یہی لکھا ہے کہ سرور کائنات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پرورش آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دادا عبد المطلب کی وفات کے بعد آپ کے چچا ابو طالب کے زیر سایہ ہوئی اور اگرچہ وہ اسلام نہیں لائے، لیکن بعثت نبوی کے بعد سے کفار قریش کے مقابلہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نصرت و تائید کا شرف ابو طالب کو ہی حاصل ہوا۔ انتہائی نامساعد حالات میں انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ساتھ دیا۔ تفاصیل عام کتب سیرت میں مذکور ہیں۔ جب تک جناب ابو طالب زندہ رہے، کفار مکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو قتل کرنے کا ناپاک منصوبہ نہیں بنا سکے۔

اور یہی سب کچھ مسلمان ہر سال سیرت نبوی کے جلسوں اور اجتماعات میں علماء و مورخین سے سنتے رہے ہیں اور یہی برصغیر کے مشہور ترین محقق سیرت نگار شبلی نعمانی، سید سلیمان ندوی اور قاضی سلیمان منصور پوری مصنف رحمتہ للعالمین نے اور اس صدی کے مشہور ترین عرب سیرت نگار محمد حسین ہیکل مرحوم نے تحریر کیا ہے۔

مگر افسوس کہ اس کے برخلاف ہمارے ملک کے ایک صاحب جناب ضیاء الدین کرمانی نے اپنی کتاب "ابدی پیام کے آخری پیغامبر" (جو ان کی انگریزی کتاب The last messanger with a lasting message کا ترجمہ ہے) یہ انوکھا انکشاف کیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پرورش ان کے مشہور چچا ابو طالب نے نہیں بلکہ ایک دوسرے چچا زبیر بن عبد المطلب کے زیر سایہ ہوئی، اور انہیں کی تائید و نصرت آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو

۱۔ ترجمان القرآن، لاہور، ۱۹۸۹ء

Marfat.com

حاصل تھی۔ ان کی یہی انوکھی رائے اس مضمون کی محرک ہے۔ (اس مضمون کی اشاعت کے بعد معلوم ہوا کہ یہ رائے درحقیقت محمود عباسی مصنف کتاب خلافت معاویہ رضی اللہ عنہ و یزید اور دیگر ناصبیوں کی ہے، اور کرمانی صاحب ان کے خوشہ چین ہیں)۔

ضیاء الدین کرمانی صاحب علمی دنیا اور تصنیف و تالیف کے میدان میں پہلے سے کوئی جانی پہچانی شخصیت نہیں ہیں۔ کتاب میں مؤلف کا جو تعارف لکھا ہے وہ یہ ہے کہ انہوں نے لکھنؤ یونیورسٹی سے تقسیم ہند سے کافی پہلے عربی میں ایم۔اے کیا تھا۔ پھر چند سال وہیں عربی و اسلامی تاریخ پڑھائی۔ لیکن ان کی عمر غیر منقسم ہندوستان میں اور پھر پاکستان میں انفریشن ڈیپارٹمنٹ میں گزری۔ حتیٰ کہ وہ پاکستان کی وزارت اطلاعات میں ڈپٹی پرنسپل انفارمیشن آفیسر کے عہدہ سے ریٹائر ہوئے۔ چالیس سال سے زائد عرصہ تک صحافتی اور سرکاری ذمہ داریاں سنبھالے رہے۔ وہ یقیناً سرکاری حلقوں میں معروف شخصیت ہوں گے، لیکن جو کتاب انہوں نے تحریر کی ہے اس کا تعلق صحافت سے نہیں بلکہ تاریخ اور سیرت نبوی سے ہے اور ایک تحقیقی کوشش ہے۔

مجھے اس وقت زیر نظر کتاب پر تبصرہ یا تنقید کرنا مقصود نہیں ہے، ہاں اتنا کہنا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ یہ ایک Provocotive (ہیجان انگیز) کتاب ہے، اور اس میں مصنف نے بڑے دعوے کئے ہیں، بلکہ ''انتساب'' کے تحت جو مختصر عبارت تحریر ہے وہ خود ایک بڑا دعویٰ ہے، اور جو افسوس کہ تنقید کی کسوٹی پر کھوٹا ثابت ہوتا ہے۔ اس پر لکھنے کا موقع انشاء اللہ کسی دوسری فرصت میں ملے گا۔ اس وقت میں صرف اس موضوع پر بحث کروں گا جس کا عنوان میں نے ذکر کیا ہے۔ اتنا ضرور کہوں گا کہ کتاب کا نام مذکورہ نام کے بجائے اگر ''سیرت نبوی کے بعض پیچیدہ مسائل'' ہوتا تو زیادہ مناسب ہوتا، اس لیے کہ کتاب میں پیغام رسالت کو تو نمایاں طور پر اجاگر نہیں کیا ہے، بعض مسائل کو پیچیدہ بنا کر ان پر بحث کی گئی ہے، جن میں بہت سے صحابہ کرام کی ہستیاں بھی ہیں، جس میں مصنف نے قدیم معتزلہ کی طرح بہت غیر محتاط اور بعید از ادب اسلوب بیان اختیار کیا ہے، جو بعض اوقات انتہائی گستاخانہ ہے۔

جناب کرمانی صاحب نے مسئلہ زیر بحث پر اپنی کتاب کے باب پنجم میں صفحات ۵۶، ۵۷، ۵۹، ۶۰ اور ۶۱ پر ''داد تحقیق'' دی ہے۔ نہ معلوم انہوں نے بیچ میں صفحات ۵۸، ۵۹ پر بجیری

Marfat.com

سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ملاقات کا مسئلہ اٹھا کر مختصر بحث کیوں کی ہے؟ کتاب میں یہ سقم ہے۔

کوئی شک نہیں کہ حضرت ابو طالب کی طرح زبیر بن عبدالمطلب بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سگے چچا تھے، لیکن مصنف کا یہ کہنا کہ حضرت عبدالمطلب کی آخری عمر میں زبیر نے سارے خاندان کی ذمہ داری سنبھال لی تھی، محض ایک دعویٰ ہے جس کے لیے انہوں نے کوئی بھی مستند کتابی حوالہ پیش نہیں کیا ہے اور پھر یہ تصریح کہ ''عبدالمطلب کی وفات کے بعد آنحضرت ﷺ کی پرورش کی ساری ذمہ داری زبیر ہی کے سر آ پڑی۔'' ایک بے بنیاد استنتاج ہے۔ ان زبیر کی شخصیت پر انہوں نے سرسید احمد خان کی کتاب ''خطبات احمدیہ'' کا ایک حوالہ دیا ہے، جس کا سیرت کے لٹریچر میں کوئی خاص مقام نہیں اور وہ خود کسی قدیم حوالہ کی محتاج ہے۔ لیکن بقول مصنف ''سرسید بھی اس حقیقت کو نہ پہنچ سکے'' جس کا انکشاف آنجناب نے کیا ہے یعنی ''زبیر کا مقام جاننے کے باوجود اس کے قائل رہے کہ آنحضرت ﷺ کی تربیت ابو طالب نے ہی کی۔''

اس کے بعد ہی مصنف نے اپنے دعوے کے ثبوت میں قدیم کتب سے جو بعض حوالے پیش کیے ہیں وہ یا تو موضوع سے کوئی تعلق نہیں رکھتے یا علمی بددیانتی کی بدترین مثال ہیں۔

وہ عربی کی مشہور تاریخ الیعقوبی کے حوالے سے لکھتے ہیں: ''اور عبدالمطلب کی وفات پر ان کی وصیت کے مطابق کعبہ کی تولیت اور دوسرے معاملات ان کے بیٹے زبیر نے سنبھالے'' (ص ۶۰)۔ ''واوصی عبدالمطلب الی ابنه الزبیر بالحکومة وامر الکعبة ''لیکن افسوس کہ انہوں نے یہاں الیعقوبی کی پوری عبارت نقل نہیں کی، جس کو موضوع زیر بحث سے براہ راست تعلق ہے اور جس سے ان کے جھوٹے دعوے کی صاف تردید ہوتی ہے۔ پوری عبارت یوں ہے: ''واوصی عبدالمطلب الی ابنه الزبیر بالحکومة وامر الکعبة، وابی طالب رسول اللّٰه و سقایة زمزم ''یعنی عبدالمطلب نے وصیت کی کہ قبائل میں فیصلہ کرنے اور کعبہ کے معاملات تو زبیر سنبھال لیں گے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تربیت اور زمزم سے حجاج کو پانی پلانے کا کام ابو طالب کے ذمہ ہوگا۔

اب بتایا جائے کہ اس سے زیادہ علمی بددیانتی کیا ہوگی کہ کرمانی صاحب نے اپنی مطلب

Marfat.com

برآری کے لیے الیعقوبی کی عبارت کا آدھا اور ضروری جملہ ہی حذف کر دیا اور ایسا ہی کیا کہ کوئی انسان قرآن کریم کی آیت (یا یھا الذین امنوا لا تقربوا الصلوٰۃ) کا ذکر کر کے نماز کے قریب نہ جانے کی تلقین کرے اور اس کے تکمیلی جملہ (و انتم سکارٰی) کو حذف کر دے۔

اسی طرح البلاذری کی انساب الاشراف کی جو عبارت انہوں نے نقل کی ہے (ص ٦٠، ٦١) وہ بھی ناقص ہے اور علمی دیانت سے بالکل دور ہے، انہوں نے البلاذری کی عبارت کا ترجمہ یوں پیش کیا ہے۔

''اور بعض لوگوں نے لکھا ہے کہ زبیر کی وفات کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی کفالت و پرورش ابو طالب نے کی۔ یہ غلط ہے، کیونکہ زبیر معاہدہ حلف الفضول کے وقت حیات تھے اور رسول اللہ ﷺ کی عمر اس وقت بیس سال سے زیادہ تھی۔''

کرمانی صاحب نے اصل عبارت کتاب کے آخر میں نوٹس میں دی ہے، لیکن افسوس کہ یہاں بھی انہوں نے ''لاتقربوا الصلوٰۃ'' کے طریقہ پر عمل کرتے ہوئے بعد کا ضروری جملہ حذف کر دیا ہے، جو یہ ہے: ''لا اختلاف بین العلماء فی ان شخوص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم الی الشام مع ابی طالب بعد موت عبدالمطلب باقل من خمس سنین '' (انساب الاشراف، جلد ۱۔ ص ۸۵) جس کا مطلب یہ ہے (علماء کے مابین اس بات میں کوئی اختلاف نہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ابو طالب کے ساتھ سفر شام عبدالمطلب کی وفات کے بعد پانچ سال سے کم عرصہ میں پیش آیا)۔

البلاذری نے اس بات کی تردید کی ہے کہ ''بعض لوگ'' جو کہتے تھے کہ آنحضرت ﷺ کی کفالت زبیر بن عبدالمطلب نے کی اس بات کو بے بنیاد بنا کر زبیر نے جب حلف الفضول میں شرکت کی تو اس وقت آنحضرت ﷺ کی عمر بیس سال سے زائد تھی، یہ غلط ہے کیونکہ جب آنحضرت ﷺ کی عمر گیارہ یا بارہ سال تھی، اس وقت آپ ابو طالب کے ساتھ شام کے سفر پر گئے تھے، تو پھر یہ کس طرح کہا جا سکتا ہے کہ زبیر نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی کفالت کی۔

اس کی وضاحت بہت کھل کر انساب الاشراف کے اسی پیرا گراف میں اسی صفحہ پر ہے، جس کو کرمانی صاحب نے توڑ مروڑ کر پیش کیا ہے۔ البلاذری لکھتا ہے:

Marfat.com

"ولما احتضر عبدالمطلب ، جمع بنيه، فاوصاهم برسول الله صلى الله عليه وآله وسلم و كان الزبير بن عبدالمطلب و ابو طالب اخوى عبدالله لامه و ابيه، و كان اسنهما فاقترع الزبير و ابو طالب ايها يكفل رسول الله صلى الله عليه و آله وسلم . فاصابت القرعة ابا طالب فاخذه اليه و يقال :بل اختاره رسول الله صلى الله عليه و آله وسلم على الزبير، و كان الطف عميه به، ويقال: بل اوصاه عبدالمطلب بان يكفله بعده."

ترجمہ: جب عبدالمطلب کی جان کنی کا وقت آیا تو انہوں نے اپنے بیٹوں کو جمع کیا اور ان سب کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نگہداشت کی ہدایت کی۔ زبیر بن عبدالمطلب اور ابو طالب (آنحضرت ﷺ کے والد) عبداللہ کے سگے بھائی تھے، زبیر ان میں بڑے تھے۔ لہٰذا زبیر اور ابو طالب کے درمیان قرعہ اندازی ہوئی کہ ان میں سے کون رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی کفالت کرے گا۔ قرعہ ابو طالب کے نام نکلا، لہٰذا انہوں نے آنحضرت ﷺ کو لے لیا۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ابو طالب کو زبیر پر ترجیح دی، کیونکہ وہ دونوں چچاؤں میں آنحضرت ﷺ کے ساتھ زیادہ مہربانی کے ساتھ پیش آتے تھے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ خود عبدالمطلب نے یہ وصیت کی کہ وہ (یعنی ابو طالب) ان کے بعد آنحضرت ﷺ کی کفالت کریں۔

اسی طرح البلاذری نے تین اقوال نقل کئے ہیں، اور تینوں سے واضح ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی کفالت و تربیت ابو طالب کے حصہ میں آئی، اور آخری قول وہ ہے جس کی تائید البلاذری کے معاصر مورخ الیعقوبی کے بیان سے بھی ہوتی ہے، جس کا اوپر ذکر کیا گیا ہے اور جس پر تمام قدیم و جدید مورخین سیرت کا اتفاق ہے، خود البلاذری نے قرعہ کی روایت کو ترجیح دی ہے، کیونکہ "یقال" (یعنی کہا جاتا ہے) کا لفظ کسی مؤلف کی اپنی رائے کا اظہار نہیں ہوتا ہے بلکہ کسی کمزور روایت پر دلالت کرتا ہے۔

اس ضمن میں مصنف نے بعد کے دو مورخین کی روایتیں زبیر بن عبدالمطلب سے متعلق نقل کی ہیں۔ ان کا نفس موضوع سے کوئی تعلق نہیں۔ لیکن ابو طالب کی مفلسی سے متعلق جو روایت انہوں نے یعقوبی سے نقل کرتے ہوئے ان کی مفلسی ثابت کرنے کے لیے لکھی ہے وہ ناقص اور

Marfat.com

یک طرفہ ہے افسوس کہ انہوں نے مورخ الیعقوبی کے ان الفاظ کو چھپایا ہے جو قدرے تنگ دستی کے باوجود ان کے سوسائٹی میں اعلیٰ مقام کا اشارہ دیتے ہیں یہ مورخ لکھتا ہے: ''و کان ابو طالب سیدا شریفا مطاعا مھیبا مع املاقه ''یعنی ابوطالب اپنی تنگ دستی کے باوجود ایک بارعب، پروقار، مانے ہوئے شریف سردار تھے۔ (تاریخ الیعقوبی۔ جلد ۲۔ ص ۱۴)۔

پھر خود کرمانی صاحب نے ہی اعتراف کیا ہے کہ ''عجیب عقدہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اکثر سیرت نگار زبیر کا حوالہ دینے اور خاص طور پر نام کے ساتھ ان کا ذکر کرنے سے کتراتے ہیں۔''

جناب کرمانی سے عرض ہے کہ یہ کوئی عقدہ نہیں۔ جب آنحضرت ﷺ کی پرورش اور کفالت میں ان کا کوئی رول ہی نہیں تو سیرت نگار کیوں ان کا ذکر کریں اور پھر کرمانی صاحب کو معلوم نہیں کہ زبیر بن عبدالمطلب ایک ایسے بچے کی تربیت وکفالت کے لیے موزوں آدمی نہ تھے، جس کو اللہ تعالیٰ نے نبوت کے اعلیٰ منصب کے لیے اختیار کیا تھا۔ اس کی تصدیق علامہ آلوسی عراقی کی اس تصریح سے ہوتی ہے، جو انہوں نے زبیر بن عبدالمطلب کا ذکر کرتے ہوئے اپنی کتاب بلوغ الارب فی معرفۃ احوال العرب، الجزء الثالث کے صفحہ ۱۴ پر کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں: ''وکان شاعرا مفلقا، شدید المعارضة، قذع الھجاء ''یعنی وہ بہت عمدہ شاعر، سخت مقابلہ باز اور گندی ہجو لکھنے والے تھے۔ ظاہر ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تربیت ایک ایسے سخت گیر اور ہجوگر شاعر کے زیر اثر نہیں ہو سکتی تھی، کیونکہ اللہ تعالیٰ کو اپنے حبیب کو رحمۃ للعالمین بنانا تھا، اور کافروں کے اس الزام کے شائبہ شک سے بھی دور رکھنا تھا کہ وہ شاعر تھے، جو ایک شاعر کے زیر تربیت ہونے سے پیدا ہو سکتا تھا۔

لہٰذا تمام محدثین و مورخین اور سیرت نگاروں نے جو لکھا ہے کہ ابو طالب نے آنحضرت ﷺ کی تربیت و کفالت کی وہی درست ہے، کرمانی صاحب یہ یاد رکھیں کہ امت اسلامیہ کا اجماع کسی غلط بات پر کبھی نہیں ہوا ہے۔ سرور کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حدیث اس بارے میں حجت ہے ''لا تجتمع امتی علی الضلالة ''اور اپنے نبی پاک کی سیرت کے معاملے میں امت اسلامیہ غلط اور گمراہ کن باتوں میں کبھی مبتلا نہیں ہوئی۔

Marfat.com

پھر کرمانی صاحب کو صحیح بخاری میں حضرت عباس بن عبدالمطلب سے مروی وہ حدیث بھی ذہن میں رکھنی چاہیے جو ''باب قصہ ابی طالب'' میں مذکور ہے۔ جس کے الفاظ یہ ہیں: ''حدثنا العباس بن عبدالمطلب رضی اللہ عنه قال للنبی صلی اللہ علیه و آله وسلم ما اغنیت عن عمك فانه کان یحوطك و یغضب لك قال: هو فی ضحضاح من نار، ولولا انا لکان فی الدرك الاسفل من النار'' (صحیح بخاری، باب قصة ابی طالب، فی کتاب مناقب الانصار)۔

(حضرت عبداللہ بن عباس سے روایت ہے کہ انہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے فرمایا کہ آپ اپنے چچا کے کیا کام آئے؟ کہ وہ آپ کے اردگرد آپ کی حمایت کرتے تھے اور آپ کی خاطر دوسروں پر غضبناک ہوتے تھے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ وہ اتھلی نار جہنم میں ہوں گے، میں اگر نہ ہوتا تو وہ جہنم کے سب سے نچلے حصے میں ہوتے)۔

اسی طرح کی ایک دوسری حدیث اسی بات میں حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے جب کہ زبیر بن عبدالمطلب کے بارے میں ہم کو کوئی حدیث کسی کتاب میں نظر نہیں آئی۔

معلوم نہیں جناب کرمانی نے اس موضوع پر قلم اٹھانا کیوں ضروری سمجھا، کیا واقعی یہ کوئی تحقیق طلب موضوع تھا، یا شیعہ مکتب فکر کی دشمنی میں ایسا کیا گیا ہے، ان کی کتاب میں بدنام زمانہ مصنف محمود احمد عباسی کی مختلف مقامات پر جو تعریف ہے، اور ان کی کتاب میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ اور ان کے انصار کی مختلف مقامات پر جو تنقیص ہے اس سے یقین ہوتا ہے کہ وہ بھی اپنے ممدوح کی طرح خواہ مخواہ ناصبیت کے مرض میں مبتلا ہیں، اور اس لیے انہوں نے ابو طالب کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تربیت و کفالت کے شرف سے محروم کرنے کی بے جا اور مذموم کوشش کی ہے، اور افسوس کہ انہوں نے اس کو Objectivity (موضوعیت) کا نام دیا ہے۔ الحمد للہ کہ اہل سنت والجماعت ابو طالب کے بارے میں کسی غلو کا شکار نہیں رہے لیکن اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ تاریخی حقائق کا بھی انکار کیا جائے اور توڑ مروڑ کر ناقص عربی عبارات کے حوالے دینے کو تحقیق کا نام دیا جائے۔ ارشاد ربانی بڑا حقیقت افروز ہے: ''فاما الزبد فیذهب جفاء ؛ واما ما ینفع الناس فیمکث فی الارض'' یعنی سمندر کے پانی پر جو جھاگ ہوتے ہیں وہ تو بہہ جاتے ہیں اور جو لوگوں کے لیے نفع بخش ہوتا ہے وہ تہ میں رہ جاتا ہے۔

Marfat.com

''خلافت معاویہ ویزید'' پر ایک نظر

ڈاکٹر سید رضوان علی صاحب کا ایک اچھا مضمون ترجمان القرآن جون ۱۹۸۹ء میں شائع ہوا، جس میں ایک اور صاحب (کرمانی صاحب) کی کتاب کے ایک مضمون کے جواب میں ثابت کیا گیا تھا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی کفالت حدیث صحیح، تاریخ وسیر اور علمائے امت کے اجماع کی رو سے جناب ابوطالب نے کی تھی۔ اس پر نہ معلوم کن جناب احمد نور صاحب (۱) نے سید رضوان علی صاحب کو ایک معترضانہ خط لکھا۔ اس سے فائدہ یہ ہوا کہ سید رضوان علی صاحب نے اپنے وسیع تاریخی مطالعہ، اپنے دینی تفکر اور پورے جوش تحریر کے ساتھ جواب لکھا جس میں بڑی مفید معلومات ہیں۔ یہ تحریر قارئین کی خدمت میں حاضر ہے۔ اس سلسلے میں بیکار کی بحثا بحثی ہم جاری نہیں رکھنا چاہتے۔ (نعیم صدیقی)

محترم جناب احمد نور صاحب السلام علیکم ورحمتہ اللہ وبرکاتہ

آپ کا طویل مکتوب مورخہ ۷ جنوری ۸۹ء مجھے بروقت ملا تھا، مگر معاف کیجئے میں ایک کام میں مصروف تھا۔ بروقت جواب نہ دے سکا۔ اب یہ فریضہ ادا کر رہا ہوں۔

آپ کافی معمر اور بزرگ آدمی ہیں۔ اپنا کوئی خاص تعارف آپ نے نہیں کرایا (صرف عمر ۷۲ سال لکھی ہے) اور مجھے بھی آپ اچھی طرح سے نہیں جانتے۔ آپ نے میرا ترجمان القرآن میں شائع شدہ مضمون ''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی کفالت کس نے کی ابوطالب نے یا زبیر بن عبدالمطلب نے؟'' غالباً غور سے نہیں پڑھا اور اس پر کافی طویل خط چھ صفحوں کا تنقید و نصیحت میں لکھ دیا۔ بہرحال میں نے آپ کے مشورہ پر عمل کیا اور محمود احمد عباسی کی ''خلافت معاویہ ویزید'' ایک صاحب سے لے کر تفصیل سے مطالعہ کی اور مجھے یہاں بھی علمی بددیانتی نظر آئی۔ جس کا شکوہ اپنے مضمون

۱۔ ان صاحب نے لکھا تھا کہ وہ پہلے جماعت اسلامی میں تھے، پھر انہوں نے محمود عباسی کی کتاب ''خلافت معاویہ ویزید'' پڑھی تو ان کو نظر آیا کہ ''ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں'' اور وہ جماعت سے علیحدہ ہو گئے۔

Marfat.com

میں، میں نے کرمانی صاحب پر تنقید کرتے ہوئے کیا تھا، یعنی اس میں بھی صرف ''لا تقربوا الصلوٰۃ'' لکھا گیا ہے اور ''وانتم سکاریٰ'' کو بالکل حذف کر دینے والی بات ہے۔ یہ میں نے تمثیلاً عرض کیا ہے، بڑی ہی غیر علمی اور بیہودہ کتاب ہے۔ میں نے اس موضوع پر اپنی لائبریری میں سے پچیس تیس کتابیں اس درمیان میں مطالعہ کی ہیں اور ان شاء اللہ اس پر ایک مفصل تنقید لکھوں گا۔

آپ کو غالباً معلوم نہیں ہے کہ میں نے دمشق یونیورسٹی میں پڑھا ہے اور کیمبرج سے پی۔ ایچ۔ڈی کے بعد ۲۴ سال تک عرب یونیورسٹیوں میں اسلامی تاریخ پڑھائی ہے۔ آپ نے جس موضوع پر خامہ فرسائی کی ہے یہ میرا پیشہ ہے۔ میرے مآخذ اصلی عربی زبان میں ہیں۔ آپ شاید اصل مراجع کو نہ دیکھ سکے ہوں۔ اس لیے آپ اور کئی اصحاب محمود عباسی کے عربی حوالوں اور اقتباسات سے متاثر ہو جاتے ہیں۔ اس بندۂ خدا نے تو کہیں کہیں صحیح ترجمہ بھی نہیں کیا، اس ناچیز نے تو عربوں کی عربی زبان درست کی ہے اور خود میری عربی زبان میں نو تصانیف ہیں۔ تاریخ و سیر پر میرا مآخذ مولانا مودودی رحمتہ اللہ علیہ کی کتاب ''خلافت و ملوکیت'' نہیں۔ میں ان تمام امور کو ان کی کتاب سے پہلے سے جانتا ہوں بلکہ میرے پاس بعض وہ مآخذ ہیں جن کا مولانا نے ذکر نہیں کیا۔ کیونکہ وہ مورخ نہیں تھے، بلکہ ایک انتہائی گہری نظر رکھنے والے مخلص عالم اور داعی تھے۔ ان کی کتاب میں نے پہلے عربی ترجمہ میں اور پھر اردو میں پڑھی تھی اور میری نظر میں اس کی بڑی قدر ہے۔ مولانا مرحوم نے امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے خلاف جو بعض شواہد پیش کیے ہیں، میرے پاس اس سے زیادہ معتبر اور اہم شواہد ہیں، مگر میں امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کا صحابی ہونے کی وجہ سے احترام کرتا ہوں۔ اگرچہ ان کے درجہ کبار صحابہ کے برابر نہیں۔ کیونکہ وہ ''السابقون الاولون'' میں نہیں، بلکہ جیسا کہ امام ابن تیمیہ نے لکھا ہے کہ فتح مکہ کے بعد اسلام لائے تھے۔

جہاں تک شیعہ فرقہ کی ریشہ دوانیوں کا تعلق ہے، اس کا مجھے بخوبی علم ہے۔ ایک نجدی طالب علم نے ریاض کی اسلامی یونیورسٹی میں میری زیر نگرانی عبداللہ بن سبا پر ایم۔ فل (M.Phil) کا مقالہ (Thesis) لکھا تھا عربی زبان میں، لہٰذا مجھے آپ کیا روافض کی ریشہ دوانیوں کا حال بتاتے ہیں۔ میں آپ کو اس موضوع پر دسیوں کتابوں کا نام بتا سکتا ہوں، مگر عربی میں۔

آپ کا عباسی کی کتاب کا تاثر ''کہ ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں'' میرے نزدیک

Marfat.com

اس کی حقیقت یہ ہے کہ اور جہاں تو ہیں مگر یہ تاریک ہیں۔ دیکھئے میرے بزرگ (میری عمر بھی ۶۱ سال کی ہے) اہل سنت والجماعت کے معتقدات پر قائم رہنے ہی میں فلاح مضمر ہے۔ شیعہ فرقہ جن کے بعد غالی فرقے قدیم علمائے اہل سنت جیسے امام ابوالحسن علی الاشعری، عبدالقاہر بغدادی، امام ابن حزم وغیرہ کے نزدیک مسلمان نہیں۔ انہی میں سے قرامطہ اور آغاخانی بھی ہیں، جن کے سرشاہ سلطان محمد آغاخان سوئم کی آپ کے عباسی صاحب نے بڑی تعریف کی ہے (اور جن کو میں نے ذاتی طور پر ان کی بیگم حسینۂ عالم کے ساتھ قاہرہ میں ۱۹۵۴ء میں انڈین سفارت خانہ کی پارٹی میں دیکھا تھا) جی تو اس شیعہ فرقے سے بدتر خوارج رہے ہیں، جن کی مذمت احادیث صحیحہ میں آئی ہے اور ان سے قتال کی ہدایت ہے، ان کے بعض فرقے بھی صلحائے امت نے کافر قرار دیے ہیں۔ کیونکہ وہ اپنے سوا تمام مسلمانوں کو کافر قرار دیتے تھے، اور ان کے بیوی بچوں کو غلام بناتے تھے اور ان کی مساجد کو اصطبل۔ آپ نے ان میں سے ازاقہ اور صفریہ کے بارے میں کچھ پڑھا ہے؟ اور ان میں سے ایک بدذات عبدالرحمٰن بن ملجم مرادی نے سیدنا علی رضی اللہ عنہ کو قتل کیا۔ ان کو اہل بیت النبی علیہ السلام سے بغض وکدورت تھی۔ یہی میں نے عباسی کی کتاب میں دیکھا اور یہی ناصبیوں کا مسلک ہے۔

غضب یہ ہے کہ اس نے مشہور مفسر، محدث، فقیہ اور مورخ امام محمد بن جریر الطبری کو بار بار شیعہ لکھا ہے۔ قیامت کے روز ان متقی اور صالح عالم بے مثال کا ہاتھ ہوگا اور اس کا دامن۔ آج کل میں سب سے پہلے اسی پر ایک مضمون لکھ رہا ہوں۔ (۱)

خیال کیجئے کہ جو عالم، حدیث کی کتابیں ''مسند ابی بکر رضی اللہ عنہ اور مسند عمر رضی اللہ عنہ'' لکھے وہ شیعہ ہو سکتا ہے؟ ان کی حدیث میں بے نظیر کتاب ''تہذیب الآثار'' کے تین اجزاء سے مسند عمر رضی اللہ عنہ، مسند علی رضی اللہ عنہ، مسند ابن عباس رضی اللہ عنہ (دو جلدیں) امام محمد یونیورسٹی، ریاض کی طرف سے چھپ چکے ہیں اور میری لائبریری میں ہیں۔ قدیم مصنفوں اور محدثین جیسے امام برزالی اور امام ابن کثیر وغیرہ نے ان کی اس کتاب کی بہت تعریف کی ہے، اور پھر مشہور مفسر اور حافظ حدیث اپنی تفسیر ابن کثیر میں برابر طبری کی تفسیر سے اقوال نقل کرتے ہیں، اور پھر جس مورخ نے اپنے قدیم وطن طبرستان میں شیعوں کی

۱؎ یہ مضمون بعد کو اگست ۱۹۹۰ء میں میرے رسالے البیان میں چھپا تھا اور اس مجموعہ میں شامل ہے۔

Marfat.com

ریشہ دوانیاں اور صحابہ پر تبرا کو دیکھا تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے فضائل میں کتابیں لکھیں اور وہ مار کھاتے کھاتے بچے، ان ہی کو یہ بدبخت عباسی شیعہ کہے اور بے تکان کہے، جناب نور احمد صاحب، امام طبریؒ کی تفسیر کو امام ابن تیمیہؒ نے سب سے صحیح اور بہت تفسیر قرار دیا ہے۔ کیا امام ابن تیمیہؒ بھی شیعہ تھے اور اس تفسیر کو مصر کے ایک سلفی عالم نے ایڈٹ کر کے حال میں تیس جلدوں میں چھاپا ہے۔ یہ ہے آپ کے عباسی صاحب کا مبلغ علم۔

کیا آپ امام بخاری رضی اللہ عنہ کے استاد محدث و مورخ خلیفہ بن خیاط کو جانتے ہیں۔ ان کا انتقال ۲۴۰ھ میں ہوا اور صحیح البخاری میں ان سے احادیث مروی ہیں۔ اسلام آباد کی اسلامک یونیورسٹی میں شاید یہ کتاب موجود ہو۔ وہاں جا کر اس میں ''بیعت یزید'' کا قصہ انتہائی موثوق سند کے ساتھ پڑھئے (ص ۲۱۳۔۲۱۷) یا کسی سے ترجمہ کرا کے سنیئے، آپ حیران ہو جائیں گے کہ امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے کس طرح تلواروں کے سایہ میں عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ، سیدنا حسین رضی اللہ عنہ اور عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ وعبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کی مرضی کے خلاف ان کی بیعت یزید کا اعلان کر دیا تھا اور انہوں نے اس طرح ملوکیت کی بنیاد رکھ دی تھی۔ بے چارے طبری نے تو اس روایت کو اس تفصیل سے ذکر بھی نہیں کیا ہے، اور وہ خلیفہ بن خیاط سے بعد کے مورخ ہیں۔

اور پھر آپ صحیح بخاری میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کا بیان پڑھئے کہ ان کو امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے ایک لاکھ درہم بھیجے کہ وہ یزید کی بیعت ان کی زندگی میں کر لیں، مگر وہ تیار نہ ہوئے کہ یہ صحیح نہیں ہے یا تو تم خلافت چھوڑ دو، یا تمہاری خلافت کے بعد یہ بات ہو گی۔ انہیں بخاری کے ان شیخ نے اپنی کتاب میں لکھا ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نے امیر معاویہ رضی اللہ عنہ سے کہا کہ تم سے پہلے بھی خلفاء تھے، ان کے بیٹے بھی تھے اور تمہارا بیٹا ان کے بیٹوں سے بہتر نہیں ہے۔ انہوں نے اپنے بیٹوں کو ولی عہد نہیں بنایا، تم کیسے بناتے ہو؟ حضرت عبدالرحمٰن بن ابی بکر رضی اللہ عنہ نے بھی یہی کہا تھا کہ خلافت کا مسئلہ تم کو مسلمانوں کے مشورہ پر چھوڑ دینا چاہیے۔ بلکہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو دھمکی بھی دی تھی کہ اگر تم نے یزید کی ولی عہدی کی بیعت لی تو ہم تمہارے خلاف اٹھ کھڑے ہوں گے۔ یہ ۵۱ھ کی بات ہے، لیکن ان کا ۵۳ھ میں انتقال ہو گیا تھا۔ طبری میں امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی بیعت یزید کا واقعہ غلطی سے ۵۶ھ میں درج ہو گیا ہے۔ اسی کو عباسی لے اڑا ہے۔ اس لیے تاریخ میں

Marfat.com

خلیفہ بن خیاط کا نام بھی نہیں سنا تھا۔ اگرچہ اس کا پہلا ایڈیشن ۱۹۶۷ء میں عراق سے چھپ گیا تھا اور دوسرا ایڈیشن ۱۹۷۷ء میں بیروت سے چھپا تھا۔

اور جناب نور احمد صاحب! آپ کتب حدیث میں بخاری، مسلم، ترمذی وغیرہ میں اہل بیت حضرت علی رضی اللہ عنہ، سیدنا حسن رضی اللہ عنہ وحسین رضی اللہ عنہ کی منقبت میں صحیح احادیث دیکھیں، کہیں ایک حدیث بھی آپ کو یزید تو کیا حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی منقبت میں بھی نظر نہیں آئے گی۔ جو احادیث بیان بھی کی جاتی ہیں، ان کی تنقید مشہور محدث امام ابن جوزیؒ نے اپنی کتاب ''العلل المتناهية فی الاحادیث الواهية کی جلد دوم میں کی ہے، یہ سب ضعیف احادیث ہیں۔ یہ کتاب فیصل آباد سے چھپی ہے۔

اور پھر آپ قرآن کریم پر تو ایمان رکھتے ہیں، اس میں صحابہ میں سے ''السابقون الاولون من المهاجرین و الانصار'' کی تعریف اور بیعت رضوان والے صحابہ کی تعریف آئی ہے۔ کیا امیر معاویہ رضی اللہ عنہ اس میں شامل ہیں؟ وہ تو فتح مکہ کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات سے صرف دو سال قبل ایمان لائے تھے، وہ کہاں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے برابر ہو سکتے ہیں۔ امام ابن تیمیہ رضی اللہ عنہ نے لکھا ہے کہ علی رضی اللہ عنہ کے مقابلہ میں معاویہ رضی اللہ عنہ غلطی پر تھے۔

اور کیا آپ جانتے ہیں کہ شیعوں کے سب سے بڑے مخالف شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ ہیں۔ آپ کو معلوم ہے کہ انہوں نے معاویہؓ و یزید کے بارے میں اپنے فتاویٰ (جلد ۴ طبع ریاض) میں کیا لکھا ہے؟ انہوں نے لکھا ہے کہ معاویہؓ اسلام میں سب سے پہلے بادشاہ تھے، یزید کے بارے میں تو انہوں نے صفائی سے لکھا ہے کہ جیسے بہت سے شہزادے گزرے ہیں وہ بھی ایک شہزادہ تھا۔ اس میں بہت سی برائیاں بھی تھیں اور اچھائیاں بھی، اور پھر انہوں نے اپنے فتاویٰ کی اسی جلد میں (ص ۴۸۱ تا ۴۸۸) بحث کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ''یزید صالحین میں سے نہ تھا اور اکراد(۱) کا ایک فرقہ جو ایسا سمجھتا ہے وہ گمراہ ہے۔'' اور پھر انہوں نے امام احمد بن حنبلؒ کا یہ قول اپنے بیٹے صالح کے جواب میں نقل کیا ہے کہ ''کوئی آدمی بھی جو اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتا ہے کیا وہ یزید سے محبت رکھ سکتا ہے؟'' اس پر ان کے بیٹے نے کہا کہ ''بابا پھر آپ اس پر لعنت کیوں نہیں بھیجتے؟'' تو

۱۔ اس سے مقصود کردوں کا فرقہ یزیدیہ ہے۔ (مصنف)

Marfat.com

امام احمد بن حنبلؒ نے جواب دیا، ''کبھی تم نے اپنے باپ کو دیکھا ہے کہ وہ کسی پر لعنت بھیجتا ہے۔''
عباسی نے یزید کی روایت حدیث کے بارے میں غلط لکھا ہے، یزید سے کوئی حدیث مروی نہیں۔
امام احمد بن حنبلؒ نے بھی اس کی نفی کی ہے۔

پھر انہوں (ابن تیمیہ) نے لکھا ہے کہ ''اس سے محبت کرنا جائز نہیں۔ اس کے ظلم اور فسق کی وجہ سے اور اس نے سیدنا حسینؓ کے ساتھ اور جو کچھ واقعہ حرہ میں کیا اس کی وجہ سے۔ اور پھر مزید کہتے ہیں کہ ''نہ تو ہم اس کو گالی دیتے ہیں اور نہ اس سے محبت کرتے ہیں۔ محبت اس لیے نہیں کرتے کہ وہ صالح آدمی نہیں تھا کہ اس سے محبت کریں اور گالی ہم کسی بھی مسلمان کو نام لے کر نہیں دیتے ہیں اور ہم جب ظالمین کا جیسے حجاج وغیرہ کا ذکر کرتے ہیں تو جو قرآن کریم نے بتایا ہے وہ کہتے ہیں "الا لعنة الله علی الظلمین" ہم اس پر لعنت نہیں بھیجتے لیکن بعض علماء نے لعنت کی ہے اور یہ ایک اجتہادی مسئلہ ہے۔ بہر حال جس نے سیدنا حسینؓ کو قتل کیا، یا ان کے قتل میں مدد کی یا اس پر راضی ہوا تو اس پر اللہ کی، فرشتوں اور سب انسانوں کی لعنت ہو۔'' اور انہوں نے اہل بیت کی محبت کو فرض بتایا ہے۔

یہ ہیں آپ کے عباسی کے ممدوح معاویہؓ و یزید کے بارے میں ''منہاج السنۃ'' کے مصنف امام ابن تیمیہ کے خیالات، جو شیعوں کے سخت مخالف تھے، اور عباسی نے تو اپنی کتاب میں بہت سے جھوٹے حوالے دیئے ہیں۔ "البدایة و النھایة" کے مصنف مفسر و محدث و مورخ یزید کو صراحتاً فاسق لکھتے ہیں۔ اس کے برخلاف اس نے کسی ایک مصنف کی رائے نقل کر دی ہے۔ جس کا ذکر ابن کثیر نے کیا ہے لیکن اس سے اتفاق نہیں کیا ہے اور یہ غلط لکھ دیا ہے کہ مزید تین سال متواتر حج کیے۔ ۵۱ھ اور ۵۲ھ اور ۵۳ھ۔ ابن کثیر میں یہی ایک روایت ہے بس۔ لیکن خود انہوں نے اور دوسرے ثقہ مورخین نے یزید کے خلاف سے پہلے صرف ایک حج کا ذکر کیا ہے۔ جس کے سنین میں اختلاف ہے۔ لیکن اغلب رائے یہ ہے کہ یہ ۵۰ھ میں تھا کیونکہ امیر معاویہؓ چاہتے تھے کہ یزید کو امت اسلامیہ کے سامنے اس طرح پروجیکٹ کریں، تاکہ بیعت کی جا سکے۔ اسی طرح بزور اس کو جہاد قسطنطنیہ پر روانہ کیا، اگر چہ وہ جانا نہیں چاہتا تھا۔ جیسا کہ بلاذری کی انساب الاشراف ہی میں تفصیل سے ذکر کیا، اگر چہ وہ جانا نہیں چاہتا تھا۔ جیسا کہ بلاذری کی انساب

Marfat.com

الاشراف ہی میں تفصیل سے ذکر ہے جو القدس میں چھپی تھی۔ (۱۹۳۴ء) اور میری لائبریری میں ہے۔

آپ نے یہ غلط لکھا، غالباً عباسی کی رائے سے متاثر ہو کر، کہ سیدنا حسینؓ کو ان کے سوتیلے بھائی محمد بن الحنفیہ نے اس اقدام سے منع کیا تھا۔ انہوں نے صرف یہ کہا تھا کہ آپ یزید سے مقابلہ کی تیاری کے لیے کسی اور جگہ یمن وغیرہ جائیں۔ پھر محمد بن حنفیہ اس عزیمت اور مقام کے آدمی نہ تھے جس مرتبہ کے سیدنا حسینؓ تھے۔ جن کے بارے میں صحیح حدیث ہے ''الحسن و الحسین سیدا شباب اھل الجنة'' (ترمذی وغیرہ) اور صحیح حدیث ہے ''الحسین منی وانا من الحسین '' آپ نے یہ بھی غلط لکھا ہے کہ سیدنا حسینؓ کے ساتھ کوئی صحابی نہ تھا، وہ خود صحابی تھے اور ان کے ساتھ صحابہ میں سے سلیمان بن صرد وغیرہ تھے۔

ذوالفقار علی بھٹو اور شہید ضیاء الحق کے حوالہ سے اسلامی تاریخ میں ابہام کی مثال بھی آپ نے غلط دی ہے۔ تاریخ کی اصلیت کبھی گم نہیں ہوتی ہے۔ سقوط ڈھاکہ کے بارے میں بھٹو کا کردار ''ادھر ہم ادھر تم'' اور ڈھاکہ اسمبلی میں جو جائے گا اس کی ٹانگیں توڑ دی جائیں گی۔ اس کے اقوال روز روشن کی طرح ہیں۔ پیپلز پارٹی کے لوگ اس کے الفاظ کو تاریخ سے مٹا نہیں سکتے۔ جس انسان کو کسی ملک کی سول اعلیٰ عدالت بلکہ دو عدالتیں قتل کے الزام میں پھانسی کا حکم دیں، اسلام کی رو سے وہ شہید نہیں ہو سکتا۔ ہاں کسی ناگہانی حادثہ میں جو مر جائے اور وہ پابند اسلام ہو تو اس کو حدیث نبوی کے مطابق شہید کہنا درست ہے۔ پھر یہ کہ تاریخ نے، موافقانہ یا معاندانہ، یہ کبھی نہ کہا کہ ضیاء الحق مرحوم شراب وزنا کے رسیا تھے، یہی کہا کہ وہ پابند صوم وصلوٰۃ اور پرہیز گار آدمی تھے۔ جب کہ دوسرے انسان کی شراب خوری کو سب جانتے ہیں، کسی نے نہیں کہا کہ وہ صالح آدمی تھا۔

جہاں تک کہ ''آمر'' کہنے کی بات ہے کہ تو یہ اسلام کی بات کرنے والوں کو زیب نہیں دیتا، افلاطونی جمہوریت کی دعوت اسلام نے کبھی نہیں دی ہے، لادین مغربی جمہوریت والے تو خلفائے راشدین کو بھی آمر کہہ سکتے ہیں۔ آمریت کے ساتھ وراثتی ملوکیت کا رواج امیر معاویہؓ نے کیا جس کے بارے میں تفصیل سے لکھ چکا ہوں اور یہی بات ابن خلدون نے بھی لکھی ہے۔ اسلام مشاورت کا قائل ہے جو خلفائے راشدین کرتے تھے۔

Marfat.com

کہاں تک آپ کو لکھوں، خیالات کا ایک طوفان ہے۔ ایک صحیح حدیث آپ کو لکھ دوں جو ترمذی، ابوداؤد، مسند امام احمد بن حنبل وغیرہ میں ہے کہ ''الخلافة ثلاثون سنة و بعده یکون ملکا'' یہ تیس سال سیدنا حسنؓ کی چھ ماہ کی خلافت پورے ہو جاتے ہیں اور اس کے بعد ملوکیت شروع ہو جاتی ہے۔ صدق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم۔ پھر آپ یہ بھی غور کیجئے کہ واقعہ حرہ میں یزید کے حکم سے کس طرح تین دن تک اہل مدینہ کا بے دردی سے قتل عام کیا گیا۔ انصار و مہاجرن اور ان کی اولاد کو یزید کے غلاموں کی حیثیت سے بیعت پر مجبور کیا گیا۔ متعدد صحابہ کو شہید کیا گیا۔ یہ واقعہ شیعوں نے نہیں، امام بخاری کے استاد اور ثقہ محدث و مورخ نے صحیح اسناد کے ساتھ اپنی تاریخ خلیفہ بن خیاط میں لکھا ہے۔ اس میں ساڑھے تین ہزار اہل مدینہ قتل کیے گئے۔ محدث خلیفہ بن خیاط نے ۳۰۶ انصار و مہاجرین اور ان کے اخلاف کے نام گنوائے ہیں۔ آپ کے محقق عباسی صاحب اسی واقعہ کی تفصیلات صرف دو صفحوں میں لکھ کر گول کر گئے ہیں۔ اور صحیح حدیث کی پیش گوئی فوراً پوری ہو گئی کہ ''جو اہل مدینہ کو ڈرائے گا، ان کو تنگ کرے گا، اللہ تعالیٰ اس کو سیسے کی طرح پگھلا دے گا'' وہ بڈھا یزیدی کمانڈر جس کو تاریخ نے مسلم کے بجائے مسرف بن عقبہ کا نام دیا فوراً اس کے بعد مر گیا، اور یزید بھی ۴۵ دن کے بعد چل بسا اور اس کے نیک بیٹے معاویہ بن یزید بن معاویہ نے اپنے باپ کے ظلموں کے پیش نظر خلافت قبول نہیں کی، اور پھر نور احمد صاحب یہ بھی غور کیجئے کہ تاریخ نے عبدالملک بن مروان، عمر بن عبدالعزیز، سلیمان بن عبدالملک وغیرہ اموی خلفاء کو فاسق کیوں نہ کہا بلکہ دوست و دشمن سب ہی نے عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ کی تعریف کی جن کو دوسرے فاسق یزید بن عبدالملک نے زہر دلوا کر مروا دیا۔ کیونکہ وہ اپنے نانا عمرؓ کے راستہ پر تھے اور احیائے سنت کرنا چاہتے تھے۔

میرے بزرگ یہ ایک المیہ ہے کہ جو لوگ جماعت اسلامی کو چھوڑ کر دوسرے راستہ پر ہو گئے اور ان کو قرآن وحدیث و تاریخ کا کتب عربی کے ذریعے براہ راست علم نہ تھا وہ گمراہی کے راستہ پر پڑ گئے ہیں ---------- اور ---------- کی مثالیں سامنے ہیں کہ پیپلز پارٹی کے ساتھ ہوئے اور کیسی رسوائیوں میں مبتلا ہوئے۔

یوں تو موت کا وقت کسی کو معلوم نہیں، لیکن آپ عمر کے ایسے حصہ میں ہیں جب آدمی عام

Marfat.com

طور پر عمر طبعی کے بعد موت سے قریب ہوتا ہے۔ اہل بیت سے محبت کیجئے کہ یہ احادیث صحیحہ سے ثابت ہے، صحیح کتابیں پڑھیے، جھوٹ لکھنے والے نام نہاد محققین سے متاثر نہ ہوئیے، جو ظالم کی تعریف کرتے ہیں۔

آپ چاہیں تو عربی میں اچھی کتابوں کے نام آپ کو بتا سکتا ہوں، بہر حال شاہ ولی اللہ صاحب، شیخ مجدد الف ثانی، مولانا تھانوی (اشرف علی) مولانا سید ابوالحسن علی ندوی، سید سلیمان ندوی اور ایسے ہی محققین کی کتابیں پڑھیے اور محمد عربی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم روحی فداہ کی حدیث ''لا تجتمع امتی علی الضلالۃ'' (میری امت ضلالت پر متفق نہ ہوگی) یاد رکھیے۔

آپ نے جن اردو کتابوں کے نام لکھے ہیں۔ وہ سب تیسرے درجہ کی کتابیں ہیں، ایک محقق و محدث کی کتاب کا نام آپ کو دیتا ہوں، وہ پڑھیے یعنی ''یزید اہل سنت کی نظر میں'' تصنیف مولانا عبدالرشید نعمانی جو لغات القرآن کے مصنف ہیں، ایک دوسری تازہ کتاب بھی ''المرتضٰی کرم اللہ وجہہ'' تصنیف مولانا سید ابوالحسن الندوی، شائع کردہ مجلس نشریات اسلام، کراچی۔ یہ سید احمد شہید رحمۃ اللہ علیہ کی ذریت میں سے ہیں اور عالم اسلام کے مانے ہوئے عالم ہیں۔

آخر میں عرض ہے کہ مولانا مودودیؒ کی کتاب ''خلافت و ملوکیت'' ایک مبنی بر حق مستند کتاب ہے، ان کی دیگر کتابوں سے ہزاروں نہیں لاکھوں انسان اسلام کے راستے پر آئے، عباسی کی کتاب سے ایسا نہیں ہوا۔

Marfat.com

بعض مشاہیر مصنفین کی ایک اہم تاریخی غلطی

اس تحریر کا مقصد نہ تو حرف گیری ہے اور نہ عیب چینی بلکہ اس کا محرک صرف وہ ذوق تحقیق ہے جو ہمارے اسلاف کا طرۂ امتیاز رہا ہے اور جس کے تحت انہوں نے احادیث نبویہ کی تحقیق و تصحیح کی خاطر ہزار ہا ہزار راویوں کے احوال اور ان کے بیانات اور احادیث کے متون کی چھان بین کی اور اس میں بڑے کارہائے نمایاں انجام دیئے۔ اس ضمن میں انہوں نے تنقید و تحقیق کا ایک ایسا اعلیٰ معیار قائم کیا جس کی نظیر مسلمانوں کے علاوہ کسی دوسری قوم میں ملنا مشکل بلکہ ناممکن ہے۔

عباسی عہد میں حدیث نبوی کے بارے میں اس تنقیدی و تحقیقی ذوق سے تاریخ و ادب وغیرہ بھی بڑی حد تک متاثر ہوئے۔ لیکن بعد کے دور جمہور و انحطاط میں یہ ذوق تحقیق و جستجو تقریباً ختم ہو گیا۔ پھر بعد کو ہم برصغیر میں عام طور پر اس انداز فکر و نظر کے عادی ہو گئے کہ "فلاں حضرت نے یہ فرمایا ہے" اور "فلاں بزرگ کا یہ قول ہے" اور بس اس کے آگے سر تسلیم خم کرنے کے علاوہ کسی بات کی گنجائش ہی نہیں رہی۔

اسلاف کے طرز فکر و عمل کو نظر انداز کر دینے اور شخصیت پرستی کے سبب ہم مزید جمود و انحطاط کا شکار ہوتے چلے گئے اور اب بات یہاں تک پہنچ چکی ہے کہ ہم اپنی محبوب شخصیات کے خلاف کوئی بات سننے کے لیے تیار نہیں اور گویا ان شخصیات کو ہم معصوم اور منزہ عن الخطاء سمجھتے ہیں۔ لیکن یہ بات عقیدۂ اہل سنت والجماعت کے خلاف ہے ان کے نزدیک انبیاء علیہم السلام کے علاوہ کوئی شخص معصوم نہیں، اور پھر مہر کے مسئلے میں یہ بات بھی مشہور و ثابت ہے کہ جب حضرت عمرؓ نے مہر کی بڑھتی ہوئی مقدار کے خلاف اقدام کرتے ہوئے اس کو محدود کرنا چاہا تو ایک عورت نے بر سر محفل قرآن کی آیت کے حوالے سے اس اقدام کو غلط بتایا تو حضرت عمرؓ نے جو خلیفۂ وقت اور حضرت ابوبکرؓ کے بعد افضل الصحابہ تھے یہ کہہ کر "اصابت امرأة و اخطأ عمرؓ" (عورت نے درست کہا اور عمر غلطی پر ہے) اپنی غلطی تسلیم کی۔

Marfat.com

یہی وہ طرز فکر وعمل تھا جس کو اسلاف نے فکر وعمل اور تصنیف وتالیف کے میدان میں اپنایا بلکہ بہت سے قدیم اور نوابغ روزگار مصنفین نے تو اپنے قارئین سے یہ التماس کی ہے کہ اگر ان کی تصنیف میں کسی کو کوئی غلطی نظر آئے تو وہ اس کو درست کر دے اور انہی اعلیٰ پایہ کے مصنفین اور نوابغ روزگار میں سے ساتویں صدی ہجری کے نصف اول کے ایک عظیم ومشہور محدث اور ماہر لغت امام صنعانی لاہوری ہیں جن کی کتاب مشارق الانوار حدیث میں کافی مشہور ہے اور مشکوٰۃ المصابیح سے پہلے برصغیر اور دوسرے ممالک میں درسی کتاب رہی ہے اور لغت میں تو ان کی عظیم وضخیم اور منفرد تصنیفات کی کوئی حد ہی نہیں۔ یہاں تک کہ ان کے اعلیٰ علمی مقام کے سبب عباسی خلیفہ المستنصر (۶۲۳-۶۴۰ء) نے انؔ کو بغداد میں سکونت پذیر ہونے کے لیے کہا اور پھر ان کو سفیر کی حیثیت سے شمس الدین التمش کے دربار میں دہلی بھیجا۔

ایسے عظیم المرتبت عالم اپنی عربی لغت کی ایک ضخیم کتاب التکملة و الذیل و الصلة (۶ جلدیں مطبوعہ مصر) کے دیباچہ میں قارئین سے درخواست کرتے ہیں کہ ''جس کسی کو اس کتاب میں کوئی غلطی نظر آئے تو وہ اس کو اپنے علم کی زکاۃ کے طور پر درست کر دے۔'' پھر یہ کہ حافظ حدیث زین الدین العراقی نے تین سو سال بعد امام غزالی کی کتاب احیاء العلوم میں وارد سیکڑوں احادیث پر تنقید کر کے ضخیم وسقیم کو آشکارا کیا اور اس میں موضوع احادیث کی نشاندہی کی۔

لیکن آج کل تو ہم میں سے بہت سے اہل علم اور مصنفین کا یہ عالم ہے کہ اگر کوئی ان کو محبوب ومقدس شخصیت کی کسی غلطی کی طرف اشارہ کرے تو وہ اس کو ایک بہت بڑی گستاخی سمجھتے ہیں۔ میں جس ایک تاریخی غلطی کی طرف اس مضمون میں اشارہ کرنا چاہتا ہوں وہ اگر صرف مولانا مودودی مرحوم ہی کی ہوتی تو شاید صرف جماعت اسلامی ہی کے لوگ ناراض ہوتے اور میری بات کو تسلیم کرنے میں پس وپیش کرتے۔ لیکن یہ عجیب اور ناقابل یقین غلطی ان سے کہیں زیادہ ایک عظیم اور مقدس شخصیت شاہ ولی اللہؒ کی ایک کتاب میں ہے اور اب مجھے شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے معتقدین کے غیظ وغضب کا خوف ہے۔ اسی لیے میں نے یہ طویل تمہید لکھی ہے کہ دونوں حضرات کے معتقدین اسلاف کے طرز عمل کو مدنظر رکھتے ہوئے ٹھنڈے دل سے اس تحریر کو پڑھیں۔ مجھے یقین ہے کہ اس کو پڑھنے کے بعد ان کو عربی کے اس مقولے کی صداقت پر پختہ یقین

Marfat.com

آجائے گا کہ: "کم ترك الاول للآخر" (کتنی ہی باتیں ہیں جو اگلے لوگوں نے بعد والوں کے لیے چھوڑ دی ہیں) اور وہ راقم الحروف کی اس تحریر کو بنظر استحسان دیکھیں گے۔

ہوا یوں کہ ان دنوں مجھے مولانا مودودی مرحوم کی کتاب "تجدید واحیائے دین" پڑھنے کا اتفاق ہوا۔ اس میں ایک فصل شاہ ولی اللہؒ کے کارناموں پر بھی ہے۔ اس میں انہوں نے ایک موقع پر شاہ صاحب کی بجا طور پر تعریف کرتے ہوئے ان کا مندرجہ ذیل قول نقل کیا ہے:

"حضرت عثمانؓ کے بعد کسی فرمانروا نے حج قائم نہیں کیا بلکہ اپنے نائب ہی مقرر کر کے بھیجتے رہے۔ حالانکہ اقامت حج خلافت کے لوازم میں سے ہے۔ جس طرح تخت پر بیٹھنا، تاج پہننا اور شاہان گزشتہ کا شہ نشین میں بیٹھنا قیصر و کسریٰ کے لیے علامت بادشاہی تھا، اسی طرح خود اپنی امارت میں حج قائم کرنا اسلام میں علامت خلافت ہے۔"

(تجدید واحیائے دین، ایڈیشن ۲۶، لاہور ۱۹۹۳ء، صفحہ ۹۳)

مولانا مودودی مرحوم نے شاہ ولی اللہ صاحبؒ کی یہ عبارت اس ضمن میں پیش کی ہے کہ انہوں نے خلافت و بادشاہت کے فرق کو خوب سمجھا تھا۔

راقم الحروف چونکہ برسوں عرب یونیورسٹیوں میں اسلامی تاریخ پڑھاتا رہا ہے، اس لیے مجھے یہ بیان تاریخی حقائق کے خلاف نظر آیا اور مجھے گمان ہوا کہ شاید مولانا مودودی مرحوم سے ترجمہ میں کوئی سہو ہوا ہے یا ترجمہ وطباعت میں کوئی نادانستہ غلطی ہوئی ہے۔ چنانچہ میں نے شاہ صاحبؒ کی اصل کتاب ازالۃ الخفاء دیکھنے کا ارادہ کیا۔ مگر مشکل یہ پیش آئی کہ مولانا مودودی نے اصل کتاب کا جو حوالہ دیا ہے وہ سوا سو سال پہلے سن ۱۲۸۶ھ میں بریلی میں چھپی تھی جو اب نایاب ہے۔ یہ کتاب پھر چھپی نہیں۔ اس لیے مجھے اس کتاب کے اردو ترجمہ پر اکتفا کرنا پڑا۔ یہ ترجمہ برصغیر کے ایک مشہور لکھنوی عالم مولانا عبدالشکور صاحب اور ان کے شریک کار مولانا انشاء اللہ کے قلم سے ہے۔ اس کتاب یا ترجمہ کا کراچی کا ایڈیشن میرے پیش نظر ہے جو محمد سعید اینڈ سنز نے طبع کیا ہے۔ (تاریخ طباعت مذکور نہیں)۔

اب دوسری مشکل یہ آپڑی کہ مولانا مودودی مرحوم نے لکھا ہے کہ یہ عبارت ازالۃ الخفاء کی جلد اول کی فصل ششم میں ہے۔ مگر یہ مولانا مرحوم کا سہو ہے۔ یہ اور ان کی دیگر پیش کردہ عبارات

Marfat.com

فصل ششم میں نہیں بلکہ فصل پنجم میں ہیں۔ بہرحال کافی ذوق گردانی کے بعد میں مولانا مودودی کا پیش کردہ حوالہ تلاش کرنے میں کامیاب ہو گیا جو شاہ صاحبؒ نے ان فتنوں کے ظہور کے سلسلے میں جن کی پیش گوئی حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمائی تھی، لکھا ہے۔ ان تیس فتنوں میں سے شاہ صاحب کے بقول بائیسویں فتنے کے ذکر میں وہ عبارت ہے جس کا ترجمہ مولانا مودودی نے اپنی مذکورہ کتاب میں پیش کیا ہے۔ مولانا مرحوم کے ترجمے میں کچھ حذف اور تغیر الفاظ ہے شاہ ولی اللہ صاحبؒ کی اصل عبارت ازالۃ الخفاء کے ترجمے میں اس طرح ہے:

''اور واقعات تاریخ سے یہ امر بھی بخوبی معلوم ہو چکا ہے کہ حضرت عثمانؓ کے بعد کوئی خلیفہ بذات خود حج قائم نہ کر سکا بلکہ خلفاء حج قائم کرنے کے لیے اپنا نائب مقرر کرتے تھے، بنفس نفیس خود اقامت حج سے معذور تھے اور حضرت علی مرتضیٰؓ اسی وجہ سے بذات خود حج قائم نہ کر سکے .... اور حضرت معاویہؓ بن ابی سفیانؓ نے اپنی خلافت کے زمانے میں ابان بن عثمان کو امیر حج مقرر کر دیا تھا۔ حالانکہ خلفائے سابقین بذات خود حج کو قائم کرتے تھے۔ مگر کسی عذر سے نہ جا سکے تو دوسری بات تھی اور حج کا قائم کرنا خلافت کا ضمیمہ بلکہ خلافت کی خصوصیات سے تھا۔ جس طرح تخت پر بیٹھنا اور سر پر تاج رکھنا یا اگلے بادشاہوں کا محل میں رہنا قدیم شاہان فارس میں بادشاہی کی علامات سے تھا۔'' (ازالۃ الخفاء۔ ج ا۔ ص ۳۲۰)

اس کتاب کے اس اقتباس سے ظاہر ہے کہ مولانا مودودی سے ترجمہ میں کوئی سہو یا غلطی نہیں ہوئی ہے۔ انہوں نے وہی لکھا ہے جو شاہ ولی اللہ صاحبؒ نے کہا ہے۔ الا یہ کہ ترجمے میں کچھ تقدیم و تاخیر ہے اور حضرت علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہ سے متعلق حذف کر دیا گیا ہے اور ایسے ہی حضرت معاویہؓ سے متعلق ایک جملہ۔ بہرحال بنیادی بات اس میں موجود ہے کہ حضرت عثمانؓ کے بعد کسی خلیفہ نے حج قائم نہیں کیا یا بالفاظ دیگر حج کی قیادت نہیں کی۔

تاریخی حیثیت سے یہی بنیادی بات راقم الحروف کو کھٹکی تھی اور اس تحریر کا اصلی محرک یہی بات ہے۔ میں عصر حاضر کے تمام علماء و محققین کی طرح ان دونوں بزرگ مصنفین کے اعلیٰ مقام اور نبوغ و تحقیق کا معترف و مداح ہوں مگر وہ جو عربی کی مثل ہے کہ ''لکل جواد کبوۃ'' (ہر اصیل گھوڑا بھی کبھی ٹھوکر کھا سکتا ہے) سو یہی اس موضوع پر شاہ صاحبؒ سے ہوا ہے۔ افسوس اس بات

Marfat.com

کا ہے کہ مولانا موذودی مرحوم نے بھی شاہ صاحبؒ کے اعلیٰ مقام کے تحت اس کو بے چوں و چرا نقل کر دیا اور اس مسئلے کی تحقیق کو ضروری نہیں سمجھا، حالانکہ حقیقت اس کے بالکل برعکس ہے۔

تاریخ سے ثابت ہے کہ حضرت عثمانؓ کے بعد پانچ اموی خلفاء اور تین عباسی خلفاء نے حج قائم کیا۔ یعنی مشاعر مقدسہ، مکہ و عرفات و منیٰ میں حج کی قیادت کی۔ اس کا ذکر قدیم مستند تواریخ یعنی تاریخ طبری، تاریخ یعقوبی، تاریخ مسعودی اور امام ذہبی کی تاریخ الاسلام وغیرہ میں ہے۔ ان متداول تاریخوں کے علاوہ ایک قدیم تر اور مستند ترین کتاب ''تاریخ خلیفہ بن خیاط'' میں پورے التزام کے ساتھ ان تمام خلفاء یا ان کے مقرر کردہ ان امراء کا ذکر ہے جنہوں نے اقامت حج کا فریضہ انجام دیا۔ طبری نے بھی اپنی تاریخ میں اس کا التزام کیا ہے۔ لیکن خلیفہ بن خیاط (وفات ۲۴۰ھ) طبری سے ۷۰ سال مقدم اور امام بخاری کے استاد ہیں جن کی مروی احادیث صحیح بخاری میں بھی موجود ہیں۔ یہ کتاب پہلی بار ڈاکٹر اکرم ضیاء العمری کی تحقیق سے سن ۱۹۶۷ء میں بغداد میں چھپی تھی۔ اس کے بعد اس کا دوسرا ایڈیشن ۱۹۷۷ء میں بیروت سے چھپا۔ یہ کتاب تاریخ طبری اور تاریخ ابن الاثیر وغیرہ کی طرح سنین کی ترتیب اور ان کے تحت تاریخی واقعات کے ذکر میں ہے۔ جس کو انگریزی میں (Annals) کہتے ہیں۔ مذکورہ کتاب مختصر یعنی ایک جلد میں ہے، لیکن ان کے مصنف نے امراء حج کے ذکر کا اس قدر اہتمام کیا ہے کہ بعض سنین کے ذکر میں صرف امراء حج کا ایک جملے میں نام دیا گیا ہے۔ جیسے سن ۲۱۶ھ اور سن ۲۳۲ھ (اسی سال پر یہ کتاب ختم ہو گئی ہے)

ہم اس کتاب سے ذیل میں اموی و عباسی خلفاء کا نام پیش کرتے ہیں جنہوں نے مختلف سنین میں اقامت حج کا فریضہ انجام دیا۔ تاریخ طبری میں بھی ان سب کا ذکر ہے:

۱۔ حضرت معاویہؓ بن ابی سفیان۔ ۴۴ھ۔ ۵۰ھ، ۵۱ھ (سن ۵۰ھ میں ان کے حج کے بارے میں اختلاف ہے۔ یعقوبی نے تصریح کی ہے کہ انہوں نے صرف دو حج کیے)

۲۔ عبدالملک بن مروان الاموی۔ ۷۵ھ۔

۳۔ ولید بن عبدالملک الاموی۔ ۹۱ھ۔

۴۔ سلیمان بن عبدالملک الاموی۔ ۹۷ھ۔

Marfat.com

۵۔ ہشام بن عبدالملک الاموی۔۱۰۶ھ۔

۶۔ ابوجعفر المنصور العباسی۔۱۵۲ھ،۱۵۸ھ (اسی سال یوم الترویہ سے ایک روز قبل اس کا انتقال ہوا۔حدود حرم میں مکۃ المکرمہ سے باہر اور تنعیم کے قریب دفن ہوا)

۷۔ المہدی بن المنصور العباسی۔۱۶۰ھ۔

۸۔ ہارون الرشید بن المہدی العباسی۔۱۷۰ھ،۱۷۳ھ،۱۷۴ھ،۱۷۵ھ،۱۷۷ھ،۱۷۹ھ، ۱۸۱ھ،۱۸۲ھ،۱۸۸ھ (۹ حج)

اس طرح پانچ اموی خلفاء اور تین عباسی خلفاء نے اپنے عہد خلافت میں ان مذکورہ بالا سالوں میں حج کی قیادت کی اور بعض نے ایک سے زیادہ مرتبہ اور ہارون الرشید نے تو نو مرتبہ اقامت حج کی اور جس سال وہ حج کو نہیں گیا اس نے اپنے خاندان کے کسی امیر (شہزادے) کو اس مہم پر مامور کیا۔اس کی تفصیل خلیفہ بن خیاط کی مذکورہ تاریخ کے علاوہ تاریخ طبری، تاریخ الاسلام، ذہبی وغیرہ میں بھی ہے۔ایک اور قدیم مورخ الیعقوبی (وفات ۲۹۲ھ بروایت صحیح) نے اپنی تاریخ الیعقوبی کی دوسری جلد میں ان مذکورہ بالا خلفاء کی خلافت کے ذکر میں بھی ان کے حج کی قیادت کا ذکر کیا ہے۔اس مورخ نے سنین کی ترتیب کے برعکس موضوع یعنی خلفاء کے ذکر میں یہ کتاب لکھی ہے۔یہ بڑے پایہ کا مورخ جغرافیہ نویس اور سیاح تھا اور عباسی دربار سے بحیثیت کاتب (سیکرٹری) وابستہ بھی رہا تھا۔اس نے ہارون الرشید کے ۹ مرتبہ حج کا ذکر بالتفصیل سنین بالا جلد دوم ص ۴۳۰ (بیروت دار صادر ایڈیشن) میں کیا ہے۔ملحوظ رہے کہ یعقوبی، طبری کا معمر معاصر ہے۔اس کی وفات طبری سے اٹھارہ سال پہلے ہوئی۔

ہمارے پیش کردہ مذکورہ تاریخی حقائق کے پیش نظر شاہ ولی اللہ صاحبؒ کا بیان کسی طرح صحیح تسلیم نہیں کیا جا سکتا ہے کہ ”حضرت عثمانؓ کے بعد کوئی خلیفہ بذات خود حج قائم نہیں کر سکا۔“

اور اس سے زیادہ تعجب اس بات پر ہے کہ مولانا مودودی نے شاہ صاحبؒ کے اس بیان کو صحیح تسلیم کیا ہے۔یہ تو ہو سکتا ہے کہ ان دونوں جلیل القدر مصنفین کے پیش نظر تاریخ خلیفہ بن خیاط اور تاریخ الیعقوبی نہ رہی ہو۔مگر تاریخ طبری تو ایک متداول کتاب رہی ہے اور ہے۔اسی طرح ابن الاثیر کی الکامل فی التاریخ۔حیرت ہے کہ ان دو کتابوں پر بھی ان عظیم مصنفین کی نظر نہیں گئی۔

Marfat.com

حقیقت یہ ہے کہ ہارون الرشید وہ آخری خلیفہ تھا جس نے حج کی قیادت آخری بار ۱۸۸ھ میں کی۔ اس کے بعد کسی عباسی خلیفہ نے حج قائم نہیں کیا۔

راقم الحروف کی اس تحریر کا اصلی محرک تو یہی مسئلہ تھا۔ لیکن شاہ ولی اللہ صاحبؒ کے ازالۃ الخفاء سے پیش کردہ اقتباس میں بعض دوسری باتیں بھی تصحیح طلب ہیں۔ من جملہ ان کے ایک بات یہ ہے کہ

''حضرت معاویہؓ نے اپنی خلافت کے زمانے میں ابان بن عثمانؓ بن عفان کو امیر حج مقرر کر دیا تھا۔''

یہ بات بھی تاریخی حیثیت سے درست نہیں کہ کبھی حضرت معاویہؓ نے اپنی خلافت کے بارے میں ابان بن عثمانؓ بن عفان کو امیر حج مقرر کیا۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ حضرت معاویہؓ نے خود تین بار (خلیفہ بن خیاط کے مطابق) بتفصیل مذکورۂ بالا حج کی قیادت کی یعنی سن ۴۴ھ، ۵۰ھ، ۵۱ھ میں۔ یہ دو سال ہیں، یعقوبی (۲/۲۳۹) کے مطابق یعنی سن ۴۴ھ، ۵۰ھ۔ پھر یہ کہ مذکورۂ بالا مورخین خاص طور پر خلیفہ بن خیاط، یعقوبی اور طبری نے التزام کے ساتھ سال بسال امراء حج کے ناموں کا ذکر کیا ہے۔ ان ناموں میں کہیں ابان بن عثمانؓ کا ذکر نہیں۔ ان کے عہد میں جن امراء نے مختلف سالوں میں حج کی قیادت کی وہ عتبہ بن ابی سفیان، مروان، عنبسہ بن ابی سفیان، ولید بن عتبہ بن ابی سفیان ہیں۔ ابان بن عثمان نے عبدالملک بن مروان کے دور خلافت میں سن ۷۴ھ سے ۷۷ھ تک چار سال حج کی قیادت کی جب وہ مدینہ منورہ کے امیر (حاکم تھے)۔

حضرت علی مرتضیٰ کے عذر کا تو شاہ ولی اللہ صاحبؒ نے ذکر بھی کر دیا ہے۔ جو یہ ہے کہ اپنی خلافت کے فوراً بعد ہی ان کو اپنے مخالفین سے جنگ جمل و جنگ صفین کرنا پڑی اور پھر خوارج سے۔ اس لیے ان کو خود حج کرنے کا موقع نہ مل سکا، لیکن اس سے قطع نظر حقیقت یہ ہے کہ خلفائے ثلاثہ حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ اور حضرت عثمانؓ نے بھی اپنی اپنی خلافت کے پہلے سال میں حج کی قیادت نہیں کی۔ حالانکہ ان کو کسی فتنہ کا بھی سامنا نہیں کرنا پڑا تھا۔ پھر حضرت معاویہؓ نے بھی صرف دو یا بقول آخر تین سال حج کی قیادت کی اور حضرت عمرؒ بن عبدالعزیز نے اپنے دو سالہ دور خلافت میں ایک بار بھی حج کی قیادت نہیں کی۔ حالانکہ ان کو بہت سے علماء نے خلیفہ راشد پنجم کہا ہے۔

بہر حال میری ناقص رائے میں یہ کہنا کہ خلیفہ کا خود اقامت حج کرنا ایسا تھا جیسا کسی بادشاہ کا تخت پر بیٹھنا یا سر پر تاج پہننا یا یہ کہ اقامت حج خلافت کی ایک علامت تھی، درست نہیں۔ ہاں خلیفہ

Marfat.com

وقت کا اقامت حج کے لیے اپنا نائب مقرر کرنا ضروری تھا اور یہ وہ سب کرتے رہے اور ہارون الرشید کے عہد تک بہت سے خلفاء بھی یہ فریضہ انجام دیتے رہے اور اس عباسی خلیفہ نے باوجود ایرانی طرز کی ملوکیت کے نو بار حج کی قیادت کی۔

مزید یہ کہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فتح مکہ کے بعد سن ۹ ھ کے حج کی اقامت کے لیے حضرت ابوبکرؓ کو اپنا نائب بنا کر بھیجا۔ حالانکہ اقامت حج کو فقہاء نے امامۃ الصلاۃ کی طرح نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور بعد کو خلفاء کی خصوصیات اور فرائض میں سے بتایا ہے اور بعد کو مسجد نبوی میں جب تک مدینہ منورہ مرکز خلافت رہا، وہ یہ فریضہ ادا کرتے رہے۔ اس کے بعد بھی حضرت علیؓ نے کوفہ میں اور ابتدا کے اموی خلفاء نے دمشق کی جامع مسجد میں اور پھر بعد کو ابتدائی عباسی خلفاء نے ہاشمیہ اور بغداد میں جمعہ وعیدین کی نماز میں امامت صلاۃ کی۔ لیکن پھر نمازوں اور جمعہ وعیدین کے خطباء وائمہ مقرر کیے جانے لگے اور خلیفہ کا کام صرف سیاست وحکمرانی رہ گیا۔

مشہور دستوری فقیہ ماوردی (وفات ۴۵۰ھ) نے اپنی کتاب ''الاحکام السلطانیہ'' میں جہاں خلیفہ کے ان اختیارات کا ذکر کیا ہے کہ وہ جمعہ وعیدین وغیرہ اور جہاد کے لیے اپنا نائب مقرر کر سکتا ہے، وہیں اپنی کتاب کے آٹھویں باب میں ''ولایت حج'' کا ذکر کیا ہے کہ اقامت حج کے لیے خلیفہ اپنا نائب مقرر کر سکتا ہے اور پھر اس نائب کے فرائض بھی لکھے ہیں۔ انہی میں سے یہ بھی ہے کہ وہ حجاج کی سہولت ونگرانی کے علاوہ عرفات ومنیٰ میں خطبہ ونماز کی امامت کرے۔

آخر میں عرض ہے کہ کسی کی بزرگی وفضیلت علمی کے لیے یہ ضروری نہیں ہے کہ اس کو تمام علوم ہی میں نبوغ حاصل ہو۔ شاہ ولی اللہ صاحبؒ کا میدان تحقیق وتصنیف، تفسیر، حدیث، فقہ اور تصوف تھے۔ تاریخ ان کا موضوع نہیں سوائے عہد خلافت کے۔ اسی طرح مودودی صاحب کا بھی زیادہ تر اشتغال، تفسیر، حدیث، فقہ اور سیاست سے تھا، لیکن ان کے بارے میں مجھے خیال تھا کہ انہوں نے اپنے ابتدائی عہد تصنیف میں تاریخ کے موضوع پر کچھ کتابیں لکھی تھیں، یعنی تاریخ سلاجقہ اور تاریخ دکن وغیرہ۔ تو شاید ان کو اموی وعباسی تاریخ کا گہرا علم رہا ہو گا یا دلچسپی ہو گی۔ لیکن زیر بحث موضوع پر ان کے خیالات وتحریر سے معلوم ہوا کہ ان عہود کی تاریخ پر ان کی نظر گہری نہ تھی ورنہ وہ شاہ ولی اللہ صاحبؒ کے اس بیان کو قبول نہیں کرتے۔ وما توفیقی الا باللہ

Marfat.com

کتاب ''نفحة العرب'' ایک تنقیدی جائزہ

''نفحة العرب'' تصنیف مولانا محمد اعزاز علی دیوبندی، درس نظامی کی ایک مشہور کتاب ہے۔ مرحوم ''دارالعلوم'' کے فارغ التحصیل اور پھر اس کے مشہور اساتذہ میں سے تھے۔ چالیس سال سے زیادہ دیوبند میں افتاء اور تدریس کے فرائض انجام دیتے رہے اور ۱۹۵۵ء/۱۳۷۴ھ میں عالم جاودانی کو رحلت فرمائی۔

مرحوم نے درس نظامی میں شامل، انیسویں صدی میں لکھی ہوئی قدیم کتاب ''نفحة الیمن'' تصنیف الشیخ احمد بن محمد الیمنی الشروانی کی طرز پر طلبہ کے لیے ایک کتاب تصنیف فرمائی اور اس کا ''نفحة العرب'' نام رکھا۔ جو برسوں سے برصغیر کے ان سیکڑوں اعلیٰ عربی مدارس میں پڑھائی جاتی ہے، جہاں درس نظامی کا نصاب پڑھایا جاتا ہے اور ''بلا مبالغہ'' ہزاروں طلبہ نے اس کو پڑھا ہوگا اور ہزاروں یا سیکڑوں اساتذہ نے اس کو پڑھایا ہوگا اور پڑھا رہے ہوں گے۔ ان مدارس میں عربی نثری ادب کا یہی اعلیٰ سرمایہ سمجھا جاتا ہے۔

چونکہ، راقم السطور نے ہندوستان میں صرف ایک سال ندوہ کا ''شہادت عالیہ'' کا نصاب پڑھا تھا اور پھر باقی اعلیٰ تعلیم عرب ممالک میں حاصل کی، اس لیے نہ تو کبھی ''نفحة الیمن'' پڑھنے کا موقع ملا تھا اور نہ ''نفحة العرب''۔ ان دنوں ایک تحقیقی کام کے سلسلے میں جس کا تعلق برصغیر میں عربی زبان و ادب سے ہے، ان دونوں کتابوں کو پڑھنے کا موقع ملا۔ یہاں دوسری کتاب یعنی ''نفحة العرب'' کا ایک جائزہ مقصود ہے۔

اس کتاب کی تصنیف سے مولانا مرحوم کے دو مقاصد تھے۔ ایک عربی زبان کے طلبہ کے لیے ادبی تحریروں کا ایک ایسا معیاری انتخاب پیش کرنا جو ان میں عربی ادب کا ذوق پیدا کر سکے اور دوسرے یہ کہ وہ غیر اخلاقی، فحش اور رومانوی حکایات سے بھی پاک ہو، جو ''نفحة الیمن'' میں پائی جاتی ہیں۔ یعنی ایک طرف ان کا مقصود علمی و ادبی تھا تو دوسری طرف اخلاقی اور دینی۔ بلاشبہ دونوں مقاصد بہت مستحسن تھے اور مرحوم بڑی حد تک ان میں اور خاص طور پر دوسرے، یعنی

Marfat.com

اخلاقی و دینی مقصد میں کامیاب رہے ہیں۔

جہاں تک علمی وادبی کاوش کا تعلق ہے، تو افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ بس یہ بھی ''نفحۃ الیمن '' کی طرح حکایات وقصص کا ایک مجموعہ ہے، جس میں اخلاقی عنصر غالب ہے۔ لیکن اس انتخاب میں کوئی تاریخ یا معیاری پہلو ملحوظ نہیں رکھا گیا ہے، یعنی یہ کہ اس میں عہد نبوی سے لے کر موجودہ عہد تک کی معیاری عربی تحریروں کے نمونے پیش کئے جاتے۔ سب سے اہم بات یہ کہ مصنف نے جن کتابوں سے یہ حکایات وقصص انتخاب کئے ہیں ان کا حوالہ نہیں دیا ہے کہ قاری ان سے رجوع کر سکے۔ کتاب میں یہ ایک بڑا منہجی نقص ہے۔

کتاب کا انداز وہی ہے جو آج سے ہزار بارہ سو سال قبل لکھی ہوئی بعض عربی کی عام ادبی معلوماتی کتابوں کا ہے، جیسے جاحظ کی ''البیان والتبیین'' ابن قتیبہ کی ''عیون الاخبار'' اور ابن عبدربہ کی ''العقد الفرید'' وغیرہ اور جو اب برسوں سے مصر، شام اور عراق وغیرہ ملکوں میں متروک ہو چکا ہے، بلکہ ہندوستان میں بھی عربی کے چوٹی کے ادیب مولانا سید ابوالحسن علی ندوی صاحب مدظلہ نے اس کو ترک کر کے نئے انداز سے عربی ادب کی مشہور وممتاز کتاب ''مختارات من الادب العربی'' کو ترتیب دیا ہے (اور وہ بھی اخلاقی معیار پر پوری اترتی ہے) جو عربی دنیا میں رائج ہے، اور جس سے عربی ادب کی چودہ سو سالہ نمائندہ تحریریں سامنے آجاتی ہیں جو عربی ادب وانشا کو سکھانے میں بڑی مدد ومعاون ہیں۔

بہرحال منہج یا طریقہ کار کی یہ بات تو ضمناً آگئی ہے، مجھے جس بات نے یہ جائزہ لکھنے پر آمادہ بلکہ مجبور کیا ہے وہ اصل کتاب یا اس کا متن نہیں، بلکہ وہ کثیر تاریخی حواشی ہیں جو کسی طرح بھی کتاب کے اصل متن سے کم نہیں، بلکہ یقیناً زائد ہی ہیں، اور ان حواشی یا تعلیقات میں بہت سی ایسی باتیں ہیں جو طلبہ کو غلط بلکہ بعض اوقات تو مضحکہ خیز معلومات مہیا کرتی ہیں، لہٰذا محض ان کے فائدہ کی خاطر اس جائزہ کو لکھنے پر اپنے آپ کو مجبور پاتا ہوں۔ میرا مقصد ہرگز کسی کی تنقیص یا عیب چینی نہیں، شاید اس سے کسی کو اختلاف نہ ہو کہ تاریخی وعلمی اغلاط کی تصحیح بھی ایک علمی فریضہ ہے، اور مسلمانوں نے اسی فریضہ کو ملحوظ رکھتے ہوئے علم حدیث سے متعلق بہت نمایاں کارنامے انجام دیے ہیں اور کسی بھی راوی کے رتبہ، علم سے مرعوب نہ ہوتے ہوئے غلط روایات کی نشان دہی کی ہے۔

Marfat.com

میرے سامنے "نفحة العرب" کا قدیمی کتاب خانہ، آرام باغ کراچی سے شائع شدہ تازہ نسخہ ہے، جو اس کے مالک جناب معراج صاحب ایم اے سابق لیکچرار شعبہ تاریخ، جامعہ کراچی نے بڑی محنت سے شائع کیا ہے۔ اس نسخے کو دیکھیے تو آپ کو نظر آئے گا کہ اکثر صفحات میں تین آدھے صفحہ یا تہائی صفحہ اور کبھی صرف چند سطور پر مشتمل ہے اور چونکہ متن کتاب موٹے حروف میں ہے اور حواشی اس کے مقابلے میں کافی چھوٹے حروف ہیں، اس لیے یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ یہ نسخہ جو ۳۰۴ صفحات میں پھیلا ہوا ہے، اس میں تقریباً دو تہائی حصہ ان حواشی کا ہے۔ ان میں بہت سے حواشی بعض الفاظ کے معنی سے متعلق ہیں جو کبھی عربی میں دیئے گئے ہیں اور کبھی فارسی میں اور کبھی اردو میں بھی ہیں۔ تعجب کی بات ہے کہ ایک ایسی اعلیٰ ادبی منتخبات کی کتاب میں جو مبتدیوں کے لیے نہیں لکھی گئی، بیشتر ایسے الفاظ کے معانی دینا ضروری سمجھا گیا ہے جس کو ایک عام عربی داں بھی سمجھتا ہوگا، جیسے افعال "ناول، بغی، اسقط، عثر، ابطر، خشي وغیرہ یا اسماء "العمران المسامر، سبحة، السجادة، حضرة، الفاسق، مراهق" وغیرہ وغیرہ۔

میں سمجھتا ہوں کہ یہ حاشیہ نویسی کے اس مرض کا تسلسل ہے جو صدیوں سے برصغیر کے علماء کو لگ چکا تھا اور جس کے وہ ایسے اسیر ہو گئے تھے کہ ان کو یہ بھی احساس نہیں رہا تھا کہ کہاں حاشیہ لکھنے کی ضرورت ہے اور کہاں نہیں۔ آخر قاری کی سمجھ بوجھ پر کچھ تو اعتماد ہونا چاہیے، اور کچھ تو خود اس کو محنت کرنے کے لیے چھوڑ دینا چاہیے، تاکہ وہ خود کوئی لغت اٹھا کر دیکھے۔ آخر ہمارے قدیم علمائے عرب نے یہ "صحاح" یہ "القاموس المحیط" یہ "لسان العرب" وغیرہ کس کے لیے لکھی تھیں؟ جمہرۃ اللغۃ، المخصص، تہذیب اللغۃ اور معجم مقاییس اللغۃ وغیرہ کو تو چھوڑیے اور کچھ نہ سہی تو لبنان کے عیسائی لویس معلوف کی المنجد (۱) ہی سہی، پھر دوسری عربی اردو لغات۔ اس طرح کی حاشیہ نویسی اور حاشیہ خوانی نے طلبہ اور اساتذہ دونوں کے قوائے فکری و ذہنی کو مفلوج کر دیا ہے اور کسی علمی میدان میں وہ کوئی اہم کام نہیں کر سکے، الا ماشاء اللہ۔

۱ـ پاکستان میں اس لغت کو بہت اہمیت دی جاتی ہے لیکن یہ سکولوں کے طلبہ کے لئے ہے اور عرب یونیورسٹیوں کے طلبہ کو اس سے رجوع کرنے کا مشورہ نہیں دیا جاتا بلکہ اس سے گریز کرنے کے لئے کہا جاتا ہے کیونکہ اس میں بہت سی لغوی اغلاط موجود ہیں۔ میرے دمشق یونیورسٹی کے استاذ اور عظیم عرب محقق الاستاذ سعید افغانی تو اس کے بہت خلاف تھے۔

Marfat.com

بہر حال میرے تنقیدی جائزہ کا مقصود یہ حواشی بھی نہیں مگر مجھے ان پر حیرت و استعجاب ضرور ہوا۔ میرے جائزے کا مقصد دراصل وہ حواشی ہیں اور جن کو عربی میں ''تراجم'' کہتے ہیں اور جن میں سے بہت سوں کو پڑھ کر افسوس کے ساتھ میری زبان پر آ گیا: ''ناطقہ سر بگریباں کہ اسے کیا کہیے۔''

یاد رہے کہ یہ سب حواشی مصنف کتاب یعنی مولانا محمد اعزاز علی دیوبندی مرحوم کے قلم ہی سے ہیں۔ کاش کہ مولانا یہ حواشی نہ لکھتے یا پھر لکھتے تو کچھ تاریخی شعور استعمال کرتے، اور کتابوں میں چھان بین کرتے۔ دونوں باتوں کا بہت سے ایسے ''تراجم'' میں فقدان نظر آتا ہے۔

اب میں بعض ایسے حواشی کی نشان دہی اور ان کی تصحیح پیش کرتا ہوں:

ا۔ صفحہ ۱۰ حاشیہ نمبر ۲:

متن میں ایک جملہ ہے ''ماحكاه ابوبكر التاريخي في كتاب اخبار النحويين'' یعنی ''ابوبکر التاریخی نے کتاب اخبار النحويين میں جو روایت کی ہے۔'' اب اس ابوبکر التاریخی پر مصنف نے ایک سوانحی نوٹ پانچ سطور کا لکھا ہے جس میں ایک سے زیادہ اغلاط ہیں۔ سب سے پہلے تو یہ کہ موصوف نے ابوبکر التاریخی کو مشہور محدث الخطیب البغدادی سمجھا اور اس کا اظہار بھی کیا۔ پھر اس کو تقریباً سو کتابوں کا مصنف ٹھہرایا۔ یہ دونوں باتیں غلط ہیں۔ حیرت ہے کہ مصنف کو یہ خیال نہیں کہ بغداد کے یہ مشہور محدث تو خطیب بغدادی کے نام ہی سے مشہور ہیں، اور پھر وہ علمائے نحو میں سے بھی نہیں، جب کہ متن میں ایسے ابوبکر التاریخی کا ذکر ہے جس نے کتاب ''اخبار النحوين'' لکھی ہے۔ پھر وہ کس طرح خطیب بغدادی ہو سکتا ہے۔ ابن خلکان سے نقل کرتے ہوئے جو سوانحی نوٹ موصوف نے لکھا ہے، تو عرض ہے کہ ابن خلکان نے بھی ان کے ترجمہ میں ان کو ''اخبار النحويين'' کا مصنف نہیں بتایا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ ابوبکر التاریخی کا پورا نام محمد بن عبدالملک ہے۔ اس کا اور اس کی کتاب ''اخبار النحويين'' کا ذکر ابن الندیم (یا زیادہ صحیح الندیم) نے اپنی کتاب ''الفہرست'' کے الفن الثالث المقالۃ الثانیہ میں علمائے نحو و لغت کے تذکرہ میں کیا ہے۔ مصنف اگر اس انتہائی مشہور کتاب سے رجوع کرتے تو اس غلطی میں نہ پڑتے، اور یہ ابوبکر احمد بن علی الخطیب البغدادی سے

Marfat.com

تقریباً سو سال پہلے کی شخصیت ہے کہ ابن الندیم نے کتاب ۳۷۷ھ میں لکھی تھی، جب کہ الخطیب البغدادی پانچویں صدی ہجری کے عالم ہیں۔ دوسری غلطی یہ کہ مولانا اعزاز علی صاحب نے خطیب بغدادی کو تقریباً سو کتابوں کا مصنف قرار دیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ انہوں نے جیسا کہ میرے مرحوم شامی استاد مورخ ڈاکٹر یوسف العش نے اپنی کتاب ''الخطیب البغدادی'' میں تحقیق کی ہے ۷۹ کتابیں تصنیف کی ہیں، جب کہ یاقوت نے ''معجم الادباء'' میں ان کے مفصل ترجمہ میں ۵۶ کتابیں ہی بتائی ہیں اور ان کے نام دیئے ہیں اور اس میں ''اخبار النحویین'' کا ذکر نہیں ہے اور پھر فاضل مصنف نے جس کتاب سے الخطیب البغدادی کا ترجمہ پیش کیا ہے یعنی ابن خلکان، اسی کو بنظر غور دیکھتے تو ان کو نظر آتا کہ اس میں خطیب کی کتابوں کی تعداد ساٹھ سے کچھ زائد بتائی گئی ہے، اس لیے تقریباً سو تصنیفات کی بات درست نہیں۔

۲۔ صفحہ ۵۶، حاشیہ ا:

متن میں ہے: ''حکی المسعودی فی شرح المقامات'' (مسعودی نے شرح مقامات میں روایت کی ہے) اس ''مقامات'' سے حریری کی مشہور مقامات مقصود ہے، جیسا کہ آگے چل کر واضح ہوگا۔

یہاں فاضل مصنف نے مسعودی پر جو سوانحی نوٹ لکھا ہے، اس کو پڑھ کر تو آدمی سر ہی پیٹ لے گا۔ فرماتے ہیں:

> ''قوله المسعودی :هو من مشاهیر المصنفین، وله ید طولی فی التصنیف ، و من مصنفاته مروج الذهب، اسمه عبدالرحمن بن عتبه بن عبدالله بن مسعود الکوفی المسعودی .. وهو من کبار اتباع التابعین.
>
> (المسعودی، مشہور مصنفین میں سے ہے، اس کو تصنیف کا بڑا ملکہ تھا، اس کی تصنیفات میں ''مروج الذہب'' ہے۔ نام ہے عبدالرحمٰن بن عتبہ بن عبداللہ بن مسعود الکوفی المسعودی۔۔۔اور وہ اکابر تبع تابعین میں سے ہیں)۔

اب اس حاشیہ میں جو اغلاط ہیں تو وہ ''ظلمات بعضها فوق بعض'' کا نمونہ نظر آئیں

Marfat.com

گی۔ یہ مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔ شرح مقامات (الحریری) کا مصنف مسعودی صاحب کتاب ''مروج الذہب'' کو بنادیا۔

۲۔ اور پھر اس مسعودی کا نام عبدالرحمٰن بن عتبہ بن عبداللہ بن مسعود رکھ دیا۔

۳۔ اور اسی صاحب ''مروج الذہب'' کو اکابر تبع وتابعین میں داخل کردیا۔

۴۔ اور پھر اس مسعودی کا، جو تبع تابعین میں سے ہیں، پورا نام بھی صحیح نہیں لکھا۔

اب عرض ہے کہ اگر فاضل مصنف کو حریری کا سن وفات ۵۱۶ھ اور مسعودی مصنف مروج الذہب کا سن وفات ۳۴۶ھ معلوم ہوتا تو وہ ہرگز یہ غلطی نہ کرتے۔ پھر اگر ان کو مروج الذہب کے مصنف کا صحیح نام معلوم ہوتا، جو الحسین علی بن الحسین المسعودی ہے، تب بھی وہ اس غلطی سے بچ جاتے اور اس کو تبع تابعین میں شمار نہیں کرتے کہ اس کی اور دوسرے مسعودی تبع تابعی کی وفات میں تقریباً دوسوسال کا فرق ہے۔

پھر، اگر فاضل مصنف اسماء الرجال کی متداول کتابوں میں دیکھتے تو ان کو پتا چلتا کہ جو مسعودی تبع تابعین میں شامل ہیں، انہوں نے ''مروج الذہب'' تو کیا کوئی کتاب ہی نہیں لکھی، وہ ایک بڑے فقیہ اور محدث تھے، جن کا سن وفات ۱۶۰ھ ہے۔

اور پھر انہیں کتابوں میں نظر آتا کہ ان کا نام عبدالرحمٰن بن عتبہ نہیں، بلکہ عبدالرحمٰن بن عبداللہ بن عتبہ بن مسعود ہے (ملاحظہ ہو ذہبی کی تاریخ الاسلام ۲۲۴/۷ اور سیر اعلام النبلاء ۹۴/۷۔ ۹۳) اب سوال یہ ہے کہ آخر ''شرح مقامات'' کا مصنف یہ مسعودی کون ہے؟ تو عرض ہے کہ مسعودی شہرت متعدد اشخاص ومصنفین کی ہے۔ ایک تو یہی محدث، جن کا نام مولانا اعزاز علی صاحب نے لکھا ہے، گوکسی قدر غلط۔ دوسرا مشہور مورخ وسیاح ومصنف ابوالحسین علی بن الحسین صاحب کتاب ''مروج الذہب ہے۔'' یہاں متن میں جو مسعودی تاج الدین الخراسانی المروروذی البندھی المسعودی المتوفی ۵۸۴ھ، جو ایک شافعی فقیہ اور ادیب تھے اور انہی نے ''شرح المقامات الحریریۃ'' کے نام سے متن میں وارد کتاب لکھی تھی، جو اب تک مخلوط کی صورت میں ہے۔ (ملاحظہ ہو، خیرالدین الزرکلی کی الاعلام ۶۴/۷) وفیات الاعیان، ابن خلکان اور لسان المیزان، ابن حجر میں بھی اس کا ذکر ہے۔

Marfat.com

اس تحقیق میں یہ بھی واضح ہو گیا کہ متن میں وارد ''المقامات'' سے مقصود ''مقامات الحریری'' ہی ہے تا کہ کوئی صاحب یہ نہ فرمادیں کہ متن میں کوئی دوسری ''مقامات'' مقصود ہے۔

۳۔ صفحہ۳۷، حاشیہ۶:

متن میں وارد ہے: ''لما فتح عمرو بن العاص قیسارية '' (جب حضرت عمرو بن العاصؓ نے قیساریہ فتح کیا) اب اس قیساریہ پر حاشیہ لکھتے ہوئے فاضل مصنف تحریر فرماتے ہیں:

''قوله ، قیسارية مدينة كبيرة عظيمة في بلاد الروم كانت كرسي ملك بني سلجوق ۔۔۔۔الخ''

(یعنی ،قیساریہ ایک بہت بڑا عظیم شہر بلاد روم (یعنی موجودہ ترکی) میں واقع ہے۔ یہ بنی سلجوق کا پایہ تخت تھا۔۔۔الخ)

حیرت کا مقام ہے کہ مولانا اعزاز علی صاحب کو یہ بھی نہ معلوم تھا کہ حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کے زمانے میں بلاد الروم کا کوئی شہر بھی فتح نہیں ہوا۔ انہوں نے اس طرف کا رخ ہی نہیں کیا تھا، بلکہ انہوں نے فلسطین کی فتح میں حصہ لیا تھا اور مصر فتح کیا تھا۔ اب اگر موصوف یاقوت کی ''معجم البلدان'' دیکھتے تو ان کو پتا چلتا کہ اس نے ایک دوسرے قیساریہ کا بھی ذکر ہے جو فلسطین میں ایک ساحلی شہر تھا اور یہی حضرت عمرو بن العاص نے سیدنا عمر کی خلافت میں فتح کیا تھا۔ دوسرا بلاد الروم (ترکی) میں واقع قیساریہ بہت بعد کو فتح ہوا۔ فلسطینی قیساریہ بھی قیصر روم (بیزنطہ) کے نام پر آباد ہوا تھا۔

پھر یہ کہ بلاد روم (ترکی) میں واقعی قیساریہ کبھی بنی سلجوق کا پایہ تخت نہیں رہا، بلکہ ان کا دار السلطنت شہر قونیہ تھا، وہی شہر جہاں مولانا جلال الدین رومی کی قبر ہے۔

۴۔ صفحہ۹۳، حاشیہ۱۰:

متن میں ''عمدۃ القریہ'' کی مجلس کا ذکر ہے: ''فاجانا بمجلس عمدة القرية رجل ''

اس ''عمدۃ القریہ'' پر حاشیہ تحریر فرمایا گیا ہے: ''قرية شهيرة من قوى مصر '' یعنی یہ مصر کے گاؤں میں سے ایک مشہور گاؤں ہے۔

مصر میں اس نام کا کوئی گاؤں مشہور تو کیا، غیر مشہور بھی نہیں۔ بلکہ ''عمدۃ'' مصر کی مقامی

Marfat.com

عربی میں گاؤں کے مکھیا یا چودھری کو کہتے ہیں اور نئے زمانے کی پیش کردہ عربی تحریر میں اس سے گاؤں کے مکھیا کے گھر کا اجتماع مراد ہے۔ جو لوگ مصر میں راقم السطور کی طرح رہے ہیں یا مصری قصے پڑھتے ہیں، ان کے لیے یہ لفظ نامانوس نہیں۔

۵۔ صفحہ ۱۰۷، حاشیہ ۹:

''رب اخ لم تلده امك '' کے عنوان کے تحت ایک قصہ مذکور ہے، جو ملک شاہ سلجوقی کے عہد میں پیش آیا۔ اس قصہ میں تین کرداروں کا نام ہے، احمد بن مروان، شاعر عجمی بنام الغسانی اور ابن اسد۔ قصہ میں موجودہ ترکی کے جنوب میں واقع ایک قدیم اسلامی شہر میافارقین کا بھی ذکر ہے، جہاں پانچویں صدی ہجری اور اس کے بعد ایوبی دور وغیرہ میں مستقل اسلامی سلطنتیں قائم رہی ہیں، اور کبھی یہ مشہور قدیمہ شہر دیار بکر میں واقع سلطنت کا بھی ایک حصہ رہا ہے۔

اس قصہ کے دو کرداروں کے بارے میں مصنف نے حاشیئے لکھے ہیں۔ ایک ابن اسد پر (ص ۱۰۷) اور دوسرے ملک شاہ پر (ص ۱۰۸)۔ سلجوقی سلطان ملک شاہ پر جو تشریحی نوٹ ہے (نمبر ٦)، اس میں اس کا سن وفات ۴۸۵ھ بھی درج ہے۔ اس سے قبل مصنف نے پانچ سطور کا حاشیہ ابن اسد پر رقم کیا ہے۔ اب سطور بالا کی روشنی میں آپ اس حاشیہ کو دیکھیں تو یہ بالکل ہی بے محل اور غلط ہے۔ عربی میں یہ حاشیہ لکھتے ہوئے فرماتے ہیں کہ یہ ''شیخ ابن اسد، مصری اور ہزل گو، خوش مذاق اور عیش و عشرت کا دلدادہ شاعر تھا، وغیرہ وغیرہ اور ۷۳۸ھ میں اس کی وفات ہوئی۔

اب حیرت کا مقام ہے کہ یہ شاعر جو آٹھویں صدی میں تھا، پانچویں صدی ہجری کے ایک واقعہ میں اور مصر سے ہزاروں میل دور میافارقین میں کیسے شریک ہو گیا؟ یہ سراسر غلط ہے، یہ ابن اسد نہ تو کوئی ساتویں، آٹھویں صدی ہجری کا شاعر ہے اور نہ وہ مصری تھا۔ مزے کی بات یہ ہے کہ فاضل مصنف نے قصہ کے اصل کردار ایرانی شاعر غسانی پر نہ تو کوئی تشریحی نوٹ لکھا ہے اور نہ احمد بن مروان پر، حالانکہ یہ مؤخر الذکر ایک مشہور تاریخی شخصیت ہے جس کا ذکر ابن الاثیر کی مشہور تاریخ ''الکامل'' (حوادث سنہ ۴۵۳ھ) یا دار الکتب العربیۃ بیروت کی جلد ۸ ص ۹۱۔۹۲ میں آیا ہے۔ یہ نصر الدولہ احمد بن مروان الکردی ہے، جو دیار بکر اور میافارقین وغیرہ میں واقع بنو مروان کی کردی سلطنت کا ایک مشہور حاکم تھا اور اس نے پچاس سال سے زائد اس سلطنت پر شان و شوکت

Marfat.com

سے حکومت کی اور پھر اس کے بیٹے اور پوتے حکمران رہے۔

ابن خلدون نے بھی اپنی تاریخ میں ان بنو مروان کی سلطنت کا ذکر کیا ہے۔(جلد ۱۰،ص ۴۱۰ تا ۴۱۸، طبع دارالفکر بیروت ۱۹۸۱ء) اور زیر بحث شخصیت کو احمد بن مروان الکردی کے نام سے یاد کیا ہے۔

جس سیاسی چپقلش کا اس قصہ میں ذکر ہے اس کی تفصیل ''ابن الاثیر'' اور ''ابن خلدون'' میں موجود ہے۔ یہ ۴۷۷۔۴۷۸ھ کا ذکر ہے۔ مگر مولانا اعزاز علی کی کتاب میں یہ واقعہ کسی غیر تاریخی کتاب سے لیا گیا ہے، کیونکہ اس میں اشخاص کا نام اور دیگر تاریخی تفصیلات درست مذکور نہیں۔ ابن الاثیر میں ابن اسد نامی کسی شخص کا ذکر نہیں، بلکہ ایک ابوالحسن کا ذکر ہے۔ ہوسکتا ہے یہ ابن اسد ہو، مگر یہ کوئی طالع آزما سیاسی شخصیت معلوم ہوتی ہے، کوئی شاعر نہیں جو مصر کا رہنے والا ہو اور جس کی وفات تقریباً ڈھائی سو سال بعد واقع ہوئی ہو۔

مصنف کی تاریخ سے بے خبری کی یہ ایک اور مثال تھی۔ حیرت یہ ہے کہ دیئے ہوئے قصہ میں موجود صریح قرائن اور خود اپنی ہی پیش کردہ ایک تاریخ سے تعارض بھی ان کو محسوس نہیں ہوا۔ اب طلبہ اگر یہ غلط باتیں یاد کرلیں، تو کس کا قصور ہے۔

۶۔ صفحہ ۱۰۹، حاشیہ ۷، ۸:

عبداللہ بن سوار اور ربیع الحاجب سے ایک قصہ نقل فرماتے ہیں:

''قولہ عبداللہ لاندری من ہو'' (ان عبداللہ کے بارے میں ہم نہیں جانتے کہ کون ہیں) ''قولہ: الربیع لم یتیسر لنا ترجمتہ'' (یعنی ہمیں ربیع کے حالات میسر نہیں)''

جہاں تک عبداللہ بن سوار کا تعلق ہے، مولانا کا اعتراف ناواقفیت تسلیم کہ وہ کوئی مشہور شخصیت نہیں، اگرچہ اس کا پتا چلانا بھی کوئی مشکل بات نہیں تھی، لیکن تعجب یہ ہے کہ ربیع بن یونس خلیفہ ابوجعفر منصور کے حاجب جیسی مشہور شخصیت کا ترجمہ یا سوانح حیات نہ معلوم کرسکے، جو الربیع الحاجب کے نام سے مشہور ہوگیا تھا اور وزیر کے بعد عباسی خلافت میں اہم ترین سیاسی وانتظامی شخصیت تھا۔ اس کا ذکر تاریخ کی ہر کتاب میں ہے اور وہ کتاب جس کا حوالہ بعض اوقات مصنف

Marfat.com

نے دیا ہے، یعنی ابن خلکان کی ''وفیات الاعیان'' اس میں اسی الربیع بن یونس الحاجب کا ذکر چھ صفحات میں ہے۔

اب جہاں تک عبداللہ بن سوار کا تعلق ہے، اس کا ذکر ابن عبدوس الجہشیاری المتوفی ۳۳۱ھ کی کتاب ''الوزراء والکتاب'' میں موجود ہے اور یہ یحییٰ البرکی کا کاتب تھا اور یہ الربیع الحاجب کا معاصر اور مردان سیاست میں سے تھا۔

مولانا نے یہ قصہ ابن عبدربہ کی ''العقد الفرید'' سے لیا ہے، یا کسی اور کتاب سے، بہرحال العقد ۲/۱۸۶ میں مذکور ہے۔

۷۔ صفحہ ۱۱۲، حاشیہ ۳:

متن میں ایک قصہ اس طرح شروع ہوتا ہے: ''روی عن الشیبانی قال: حدثنا محمد بن زکریا'' (اسی طرح ''ز'' سے جو غلط املاء ہے)

فاضل مصنف نے پہلے الشیبانی پر طویل حاشیہ تحریر فرمایا ہے اور اس کا سن وفات ۲۰۶ھ بتایا ہے اور پھر اس کے فوراً بعد محمد بن زکریا پر ایک طویل تر گیارہ سطور کا حاشیہ لکھا ہے، جس میں محمد بن زکریا ابوبکر الرازی الطبیب کا سن وفات ۳۱۱ھ بتایا ہے، جو تقریباً صحیح ہے، بعض لوگوں نے ۳۱۷ھ بتایا ہے۔

اب غور طلب اور حیرت انگیز بات یہ ہے کہ ایک شخص جس کی وفات ۲۰۶ھ میں ہوئی، ایک دوسرے شخص سے جس کی وفات ۳۱۱ھ میں ہوئی کس طرح روایت کر سکتا ہے؟ دونوں کی وفات میں ۱۰۵ سال کا فرق ہے۔ یہ اسی وقت ممکن ہے جب محمد بن زکریا کی عمر ایک سو پچیس سال رہی ہو۔ شاید کوئی مولوی صاحب یہ کہہ بیٹھیں! تو ہم ان کی اطلاع کے لیے عرض کریں گے کہ اس ابوبکر محمد بن زکریا الرازی الطبیب کی پیدائش ۲۵۱ھ کی ہے، یعنی یہ اس الشیبانی ابوعمرو بن اسحاق کی وفات کے ۴۵ سال بعد پیدا ہوئے تو وہ پھر کس طرح محمد بن زکریا سے روایت کر سکتے ہیں؟ یقیناً ان دونوں میں سے کسی کی شخصیت کا تعین حاشیوں میں غلط ہے۔

اسی صفحہ میں غالباً طباعت کی دو غلطیاں ہیں کہ پہلے حاشیہ میں ''اراجیز العرب کے بجائے ''اراجین العرب'' چھپا ہے اور علی بن ربن الطبیب کا نام ''علی بن زین'' چھپا ہے۔

Marfat.com

۸۔ صفحہ ۱۱۶، حاشیہ ۳:

میں ''السہیلی'' پر نوٹ لکھتے ہوئے فرماتے ہیں: ''ہم کو اس کا ترجمہ نہیں مل سکا'' حالانکہ ''السہیلی'' سیرت کی مشہور کتاب ''الروض الانف'' کا مصنف ہے، اس کا پورا نام ابو القاسم عبدالرحمٰن بن عبداللہ ہے، سن وفات ۵۸۱ھ ہے اور یہ اندلس کا باشندہ تھا اور اس نے رجال وسیرت پر اور کتابیں بھی لکھی ہیں۔ اس کا ترجمہ ''ابن خلکان'' کی تیسری جلد میں موجود ہے اور الزرکلی کی ''الاعلام'' میں بھی رقم ہے۔

۹۔ صفحہ ۱۹۱، حاشیہ ۱۱:

''تحلم السلاطین'' کے عنوان کے تحت ایک قصہ ابن طاؤس کے بارے میں نقل فرماتے ہیں جس میں امام مالک بن انس انہی ابن طاؤس کے ساتھ ابو جعفر المنصور عباسی خلیفہ کے دربار میں حاضر ہوتے ہیں۔

مذکورہ حاشیہ میں ابن طاؤس کا سن وفات ۱۳۲ھ درست تحریر فرماتے ہیں، مگر یہ خیال نہیں آتا کہ یہ قصہ جو ابن خلکان کی ''وفیات الاعیان'' اور ابن عبدربہ کی ''العقد الفرید'' ہی وارد ہے (مصنف نے غالباً العقد الفرید سے لیا ہے، ابن خلکان میں الفاظ کچھ کم ہیں) تاریخی طور پر غلط ہے، کیونکہ ابو جعفر المنصور کی خلافت ابن طاؤس کی وفات کے چار سال بعد ۱۳۶ھ میں شروع ہوئی، ابن خلکان نے اس قصہ کو صیغۂ شک، یعنی ''روی'' سے بیان کیا ہے جب کہ شیخ الاسلام امام ذہبی نے تاریخ الاسلام، (وفیات سن ۱۳۶ھ) میں ابن خلکان میں وارد قصہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اس کو غلط بتایا ہے، یہی کہہ کر منصور کی خلافت سے قبل ابن طاؤس کا انتقال ہو گیا تھا۔

۱۰۔ صفحہ ۱۶۷، ۱۶۹:

متن کتاب میں سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کی شہادت کے قصہ میں عمرو بن سعد بن وقاص کا نام لکھا گیا ہے جو غلط ہے۔ صحیح نام جیسا کہ مستند کتب تاریخ طبری، تاریخ خلیفہ ابن خیاط، ابن الاثیر، البدایۃ والنہایۃ وغیرہ میں درج ہے، وہ عمر بن سعد بن وقاص ہے۔ یہ متن کی غلطی ہے، مصنف نے محسوس نہیں کی۔

Marfat.com

۱۱۔ صفحہ ۲۰۶:

سب سے افسوسناک بات یہ ہے کہ موصوف نے عشرہ مبشرہ میں سے ایک صحابی، یعنی سعید بن زید بن عمرو بن نفیل کا نام، نہ معلوم، کس کتاب سے غلط نقل کیا ہے۔ یعنی سعید بن عبدالرحمن اور حاشیہ پانچ فرماتے ہیں: ''کذا فی مجمع البحار'' اور پھر حافظ ابن عبدالبر کی کتاب ''الاستیعاب'' سے تفصیلی صحیح ترجمہ لکھتے ہیں۔ کتاب کے ناشر نے اس نام کے نیچے ایک جملہ کے فٹ نوٹ میں تصحیح کر دی ہے۔ مگر سوال یہ ہے کہ موصوف نے ابن سعد، حافظ ابن البر، حافظ ابن حجر، ابن الاثیر جنہوں نے صحابہ پر تحقیقی اور تفصیلی کتابیں لکھیں ہیں، ان کے اقوال اور سیرت نبوی پر دوسری تمام قدیم کتابوں کے اقوال کو چھوڑ کر اس جلیل القدر صحابی کے نام کے لیے ایک شاذ روایت کیوں اختیار کی ہے۔ یہ سراسر غلط ہے۔ ان کا نام سعید بن زید بن عمرو بن نفیل ہی درست ہے۔ اس میں کسی اختلاف کی گنجائش نہیں اور ''مجمع البحار'' کے ہندوستانی مصنف محمد بن طاہر فتنی سورتی کا وہ مقام نہیں جو مشہور وثقہ عرب مورخین اور حفاظ حدیث کا ہے۔ پھر انہوں نے ان عشرہ مبشرہ بالجنۃ جلیل القدر صحابی کی کنیت ابوالاعور کو نمایاں کر کے ایک طرح سے ان صحابی کی شان میں گستاخی کی ہے۔ قدیم وجدید عرب مصنفین ایسا نہیں کرتے۔ ان کے تذکروں میں یہ کنیت آتی ہے، مگر نمایاں حیثیت سے نام کے ساتھ نہیں۔

یہ محض چند اہم اغلاط کی نشان دہی اور تصحیح ہے۔ کتاب میں اور بہت سے ایسے مقامات ہیں۔ دیوبندی علماء کا فرض ہے کہ وہ اپنی اس ادبی کتاب کے حواشی کی تصحیح کریں۔

ایک اور بات قابل ذکر یہ ہے کہ مصنف نے انتہائی مشہور شخصیات جیسے خلفائے اربعہ پر تو تفصیلی حاشیے تحریر فرمائے ہیں، لیکن بہت سی غیر معروف شخصیات پر کوئی حاشیے نہیں لکھے، جو کرنے کا کام تھا اور بہت سوں کے بارے میں بغیر کسی جستجو کے لکھ دیا ہے کہ ''ہم کو معلوم نہ ہوسکا'' کتاب میں ایک اور اہم نقص یہ ہے کہ مصنف نے جن شعراء کے کلام کے نمونے آخر میں دیئے ہیں، ان پر کوئی سوانحی نوٹ نہیں لکھے، جو بہت ضروری تھے، تاکہ معلوم ہوتا کہ یہ کس دور کے شاعر تھے اور ان کا شعری ادب میں کیا مقام ہے۔

انتہائی افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ ایسی ہی کتابوں کے سبب پاکستان کے عربی مدارس

Marfat.com

اوران دارالعلوم میں جہاں درس نظامی رائج ہے، عربی کا معیار انتہائی پست ہے۔ نہ ان کے فارغ التحصیل طلبہ بآسانی عربی زبان کی ہر کتاب پڑھ سکتے ہیں، اور نہ سمجھ سکتے ہیں، رہا ان کا تاریخی شعور تو وہ تو عام طور پر صفر ہوتا ہے۔

امید کی جاتی ہے کہ اب ان عربی درسگاہوں کے منتظمین اس جیسی کتابوں کو اپنے نصاب ہائے تعلیم سے خارج کر کے ان میں ہندوستان ہی میں لکھی ہوئی اور بسہولت دستیاب ہونے والی کتاب ''مختارات من الادب العربی'' تصنیف مولانا سید ابوالحسن علی ندوی اپنے نصابوں میں شامل کریں گے۔ اس سے عربی زبان کا اعلیٰ ذوق پیدا ہوتا ہے، ہندوستان میں تصنیف شدہ یہ ایسی کتاب ہے جو بعض عرب ممالک کے اسکولوں میں بھی پڑھائی جاتی ہے۔ گروہی تعصب کو اس میں حائل نہیں ہونا چاہیے، مولانا مدظلہ انتہائی اعلیٰ پایہ کے عربی زبان کے ادیب اور عربی میں بیس پچیس کتابوں کے مصنف ہیں، ان کی یہ کتابیں کثرت سے مختلف عربی ممالک میں چھپتی ہیں، پھر یہ کہ ان کے اہل دیوبند سے بلکہ دیگر مکاتب فکر سے بھی گہرے روابط ہیں، اور اللہ تعالیٰ نے ان کی کتابوں کو عجیب قبولیت عطا فرمائی ہے۔ اور ان سے مسلمانوں کو بہت فیض پہنچ رہا ہے۔

Marfat.com

تاریخی حقائق کو مسخ نہ کریں

کالم نویسی صحافت کا ایک اہم جز ہے۔ اخبارات جہاں ہمیں روزمرہ کی خبریں مہیا کرتے اور احوال عالم سے باخبر رکھتے ہیں۔ وہاں کالم نگار حضرات اپنے کالموں سے ان حالات پر تبصرہ کرتے یا ان کا تجزیہ پیش کرتے ہیں۔ سیاسی، سماجی، اقتصادی، مذہبی، تعلیمی اور دیگر احوال پر اپنے تبصروں اور تجزیوں سے کالم نگار ہمارے قومی اور ملی شعور کو بیدار اور صحیح رخ کی طرف رہنمائی کرتے ہیں۔ اس حیثیت سے صحافت میں کالم نگار حضرات کا وہی مقام ہے جو مدرسے، سکول، کالج اور یونیورسٹی میں ایک معلم یا پروفیسر کا ہوتا ہے۔ بالفاظ دیگر یہ ایک مقدس اور تربیتی فریضہ ہے، اور کالم نگار کو اپنا فرض اسی طرح ادا کرنا چاہیے جس طرح ایک اچھا استاد ادا کرتا ہے، یعنی پوری ''ذمہ داری کے ساتھ۔'' ایک اچھا، ذمہ اور فرض شناس استاد اپنے مسلسل مطالعے اور تحقیق کے بعد طلبہ کو صحیح علمی غذا فراہم کرتا اور اس کی شخصیت کی تعمیر کرتا ہے۔ اسی طرح ایک کالم نگار کا فرض ہے کہ وہ بھی جو بات لکھے وہ مطالعہ اور تحقیق کے بعد لکھے اور اپنے قارئین کو صحیح معلومات فراہم کرے کہ وہ بھی ایک بڑے طبقہ کا فکری معمار ہوتا ہے۔ یعنی وہ لوگ جن کا مطالعہ کتب کی فرصت نہیں اور اخبارات ہی ان کا ذریعۂ علم ہیں۔

لیکن انتہائی افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ ہمارے بعض صحافی اور کالم نگار حضرات اس ذمہ داری کا قطعاً احساس نہیں کرتے۔ ان کے ہاتھ میں بس ایک رواں قلم ہے۔ اخبار کے صفحات ان کے لیے حاضر ہیں، وہ جو چاہے لکھ دیں۔ چھپ ہی جائے گا اس کے برخلاف بعض ایسے صحافی بھی ہیں۔ جیسے میرے مرحوم اور بزرگ دوست ابن الحسن صاحب جو قلم اٹھانے سے پہلے موضوع پر کچھ پڑھ کر تحقیق بھی کر لیتے تھے۔

اخبارات میں آئے دن ایسے کالم چھپتے ہیں جن سے بعض کالم نویسوں کی غیر ذمہ دارانہ روش کا پتہ چلتا ہے۔ جنگ کے ایک انتہائی مقبول اور مستقل کالم نویس ہیں جن کو عربی دانی اور

Marfat.com

قرآن فہمی کا بھی دعویٰ ہے اور وہ اپنے کالموں میں گاہے بگاہے عربی اشعار اور آیت قرآنی لکھتے رہتے ہیں۔ لیکن افسوس کہ وہ ہمیشہ کسی قرآنی آیت یا جملہ سے قبل جو واو ہوتا ہے اس کو حذف کر دیتے ہیں جیسے ''وتلك الایام نداولها بین الناس'' کے شروع میں واوَ استئناف ہے۔ یعنی جملہ کی ابتداء کا واوَ اس کو باقی رکھنا ضروری ہے کہ عربی زبان کا یہی انداز بیان ہے، جو لوگ عربی زبان سے کماحقہ واقفیت رکھتے ہیں وہ یہ جانتے ہیں اور کبھی کسی آیت یا قرآنی جملہ لکھتے وقت اس واوَ استئناف کو حذف نہیں کرتے۔

میرے ذہن میں عرصہ سے ''غیر ذمہ دارانہ کالم نویسی'' کا موضوع تھا اور اب ۲۰ جنوری کے جنگ میں مشہور عالم نویس اظہر سہیل کا کالم ''قلم یا کلاشن کوف'' پڑھ کر ایک تازہ تحریک ہوئی۔ چونکہ وہ ایک ''سکہ بند'' کالم نویس ہیں اور قارئین ان کے کالموں میں مذکور واقعات و روایات کو مسلمہ سمجھتے ہوں گے۔ اس لیے ضروری سمجھا گیا کہ قارئین کی رہنمائی کے لیے ان اغلاط کی تصحیح کی جائے جو اس کالم میں نظر آئیں اس سے کالم نویس موصوف کی تنقیص مقصود نہیں۔

چنگیز خان جس صحرائے فتوحات چنگیزی کے لیے نکلا تھا اس کا نام اس کالم میں ''صحرائے گوبھی'' لکھا ہے۔ اس کا صحیح نام صحرائے گوبی ہے۔ پروفیسر آرنلڈ کی مشہور زمانہ کتاب ''ریچنگز اینڈ پریچنگز آف اسلام'' نہیں بلکہ صرف ''پریچنگز آف اسلام'' ہے۔ نا معلوم اظہر سہیل صاحب نے ''ریچنگز'' کا اضافہ کیوں ضروری سمجھا؟ فارسی کے شعر میں جو کالم کے آخری میں ہے۔ دوسرا مصرع یوں چھپا ہے۔ ''زاتشے بود کہ در خانہ من بار گزشت'' ''بار گزشت'' درست نہیں بلکہ صحیح ''پار گزشت'' جو امسال کے مقابلہ میں ہے یعنی پارسال (یہ ''بار'' کتابت کی غلطی بھی ہوسکتی ہے)۔

اس کالم میں جو مرکزی تاریخی واقعہ ہلاکو اور سقوط بغداد سے متعلق ہے اس میں بڑی غلط بیانی ہے اور اس کی تصحیح بہت ضروری ہے۔ اس ضمن میں موصوف نے ہلاکو (یا صحیح لفظ ہولاگو) کو چنگیز خان کا بیٹا لکھا ہے جب کہ وہ چنگیز خان کا بیٹا نہیں بلکہ پوتا تھا اور بیٹا تولوی کا تھا۔

اس کے بعد موصوف نے سلطان جلال الدین خوارزم شاہ، ہولاکو، خلافت بغداد اور سقوط بغداد سے متعلق جو کچھ لکھا ہے وہ سب غلط اور اسلامی تاریخ سے ایک بھونڈا مذاق ہے۔

وہ لکھتے ہیں: ''نوجوان سلطان جلال الدین خوارزم شاہ سلطنت کے علاوہ ہلاکو خان کی

Marfat.com

گھاتوں اور وارداتوں سے بخوبی آگاہ تھا۔ اس نے دنیا کی سب سے بڑی سلطنت یعنی حکومت بغداد کے خلیفہ سے منت وزاری کی کہ اس کی مدد کرے۔ خلیفہ مدد پر آمادہ ہو بھی گیا۔ بلکہ تھوڑی بہت مدد بھی کی۔ مگر اسے ہلاکو کی کوئی زیادہ پروا نہیں تھی، کیونکہ بغداد کا شاہ بہت مضبوط اور محفوظ تصور ہوتا تھا۔ یہ الگ بات کہ جب خوارزم شاہ کو شکست ہوئی تو بغداد کا یہ دفاع ریت کی دیوار بن گیا۔''

اس بیان کے ایک ایک لفظ کی تاریخ نفی کرتی ہے اور یہ اظہر سہیل صاحب کی اسلامی تاریخ سے بے خبری کی واضح دلیل ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ موصوف نے اس موضوع پر کوئی کتاب پڑھنے کی زحمت نہیں کی۔ عربی، فارسی میں اس موضوع سے متعلق متعدد مستند کتابیں ہیں جیسے ''منہاج سراج'' جوزجانی کی ''طبقات ناصری''، عطا ملک جوینی کی تاریخ جہاں کشا، وزیر رشید الدین فضل اللہ کی جامع التواریخ فارسی میں اور ابن الفوطی کی الحوادث الجامعۃ، ابن الطقطقا کی الفخری فی الآداب السلطانیہ عربی زبان میں اس دور کی مستند تواریخ ہیں۔ عطا ملک جوینی اور رشید الدین فضل اللہ تو علی الترتیب ہولاکو اور اولجاتیو کے وزیر اور تاتاریوں سے قریب ترین مورخ تھے۔ منہاج سراج نے سقوط بغداد کے دو سال بعد اپنی کتاب دہلی میں لکھی (اس کا ترجمہ اردو میں بھی ہو چکا ہے)۔

ان میں سے کوئی ایک کتاب بھی اظہر سہیل صاحب پڑھتے تو ان کو معلوم ہوتا کہ جلال الدین خوارزم شاہ تو ہولاکو کے ایران میں آنے سے ربع صدی قبل فوت ہو چکا تھا۔ یعنی ۶۲۸ھ میں اور اس وقت ہولاکو صرف ۱۳ سال کا بچہ تھا۔ لہٰذا ''ہولاکو کی گھاتوں اور وارداتوں'' سے جلال الدین خوارزم شاہ کے آگاہ ہونے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ یہ بہادر اور سخت کوش سلطان تو خود چنگیز خان کے لشکر کو افغانستان میں شکست فاش دے چکا تھا اور ۶۲۴ھ میں چنگیز کی وفات کے بعد سندھ سے ایران واپس آ کر اس نے اپنی کھوئی سلطنت کا بڑا حصہ تاتاریوں سے واپس لے لیا تھا مگر قسمت نے اس کا ساتھ نہ دیا اور ایک معرکہ میں شکست کے بعد وہ دھوکہ سے ایک گاؤں میں قتل کر دیا گیا۔ اس کو کیا ضرورت تھی کہ وہ بغداد کی انتہائی کمزور حکومت سے مدد مانگے۔

پھر یہ کہ بغداد میں کوئی ''شاہ'' نہ تھا بلکہ خلیفہ تھا اور وہ نہ تو ''بہت مضبوط'' تھا اور نہ ''محفوظ''،

Marfat.com

کیونکہ عباسی خلیفہ کی حکومت اس وقت صرف بغداد اور اس کے قریبی علاقہ پر تھی، شمالی عراق تک پر ایک دوسرا خاندان حکمراں تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ چنگیز خان کے حملہ سے قبل مشرق میں سب سے زیادہ طاقتور اسلامی حکومت علاؤالدین محمد خوارزم شاہ کی تھی جو بلاد ماوراء النہر سے لے کر عراق کی حدود تک پھیلی ہوئی تھی اور وہ خود سلجوقیوں کی طرح خلافت بغداد کو اپنے زیر نگیں کرنے کے درپے تھا، اور اس کے بعد مغرب میں ایوبیوں کی طاقتور حکومت مصر و شام میں تھی۔ چنگیز خان کی تاخت و تاراجی اور پھر اس کی وفات کے بعد علاؤالدین خوارزم شاہ کے بہادر جانباز بیٹے جلال الدین نے ایوبیوں، ایشیائے کوچک کے سلجوقیوں اور خلافت بغداد سے ایک مشترکہ اپیل ضرور کی تھی کہ یہ مسلمان حکومتیں اسکے ساتھ متحد ہو کر تاتاریوں کو ایران سے نکالنے کی کوشش کریں۔ ورنہ تاتاری ان سب سلطنتوں کا خاتمہ کر دیں گے۔ مگر افسوس کہ آپس کے کینہ وعداوت اور خودغرضی کے سبب اس اپیل پر کسی نے لبیک نہیں کہا اور وہی پیش آیا جس کا خطرہ جلال الدین خوارزم شاہ کو تھا۔

پھر حیرت وافسوس کی بات یہ ہے کہ اظہر سہیل صاحب جیسے صاحب قلم نے یہ بات کیسے لکھ دی کہ ''کتابوں میں لکھا ہوا ہے کہ اس سب کے باوجود بغداد کا دفاع ہوسکتا تھا مگر اس روز (یعنی جس روز موصوف کے بقول غدار ابن علقمی نے شہر کے دروازے تاتاری لشکر کے لیے کھول دیئے) خلیفہ اور عوام دجلہ کے کنارے ایک بہت بڑے مناظرے میں مگن تھے، جس میں خلق قرآن کے معاملہ پر بحث جاری تھی۔ دونوں طرف کے علماء دلائل اور تکفیر کا بازار گرم کیے تحیص و جدال میں مگن تھے۔ عوام کو بھی اس میں مصروف رکھا گیا اور یوں تاریخ کی سب سے بڑی اسلامی سلطنت قصۂ پارینہ بن گئی۔''

سبحان اللہ! کیا تاریخ شناسی اور کیا تحقیق ہے۔ یہ وہ بات ہے جس کا علم مذکورہ معاصر مورخوں بلکہ خود فلسفی وریاضی داں خواجہ نصیرالدین طوسی کو بھی نہ تھا، جو ہلاکو کے لشکر میں اس وقت موجود تھا، اور جس نے ہلاکو کی بغداد پر حملہ کے لیے ہمت افزائی کی تھی، اور پھر اس نے سقوط بغداد کی تفصیلات کے بارے میں آنکھوں دیکھا حال ایک رسالہ میں لکھا ہے جو عطا ملک جوینی کی ''تاریخ جہاں کشا'' جلد سوم میں بطور ضمیمہ شامل ہے۔ ویسے یہ بات تو تاریخ کا ایک طالب علم بھی جانتا ہے کہ خلق قرآن کا مسئلہ سقوط بغداد سے چار سو سال قبل ۲۳۵ھ میں خلیفہ متوکل عباسی کے حکم

Marfat.com

پر دفن کر دیا گیا تھا اور یہ کب کا قصۂ پارینہ بن چکا تھا، اس آخری عباسی خلیفہ المعتصم کے عہد میں اس دینی مسئلہ پر سرکاری تو کیا عامۃ المسلمین کی سطح پر بھی کوئی مناظرہ وجدال نہیں ہوتا تھا۔ معتزلہ اپنی موت خود ہی مر گئے تھے نہ کوئی کسی کی تکفیر کر رہا تھا نہ دلائل دے رہا تھا۔ خواہ مخواہ اظہر سہیل صاحب نے اس دور کے علماء کو بدنام کرنے کی کوشش کی ہے انہوں نے جو کچھ لکھا ہے وہ سراسر لغو اور بے بنیاد بات ہے۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ عباسی خلیفہ کو موصوف نے اپنے پر قیاس کیا ہے کہ راوی کے کنارے بیٹھے کسی سیاسی مباحثے میں مشغول ہیں اور جمہوریت و آمریت پر بحث ومباحث ہو رہا ہے۔ ایک طرف پیپلز پارٹی کے لیڈر اور جیالے ہیں اور دوسری طرف ضیاء الحق مرحوم کی باقیات، اور عوام بھی اس بحث ومباحثہ میں ہلڑ بازی کے لیے موجود ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ المعتصم ایک سیدھا سادھا کمزور شخصیت کا عباسی خلیفہ تھا۔ جس کی دلچسپی موسیقی اور کبوتر بازی سے تھی۔ وہ اپنے قصر میں ہی بند رہتا تھا۔ انتہائی بخیل تھا۔ ایک طرف وہ اپنے وزیر موید الدین ابن العلقمی کی باتوں میں آجاتا تھا جو بغداد پر حملہ سے کافی پہلے سے ایران میں ہلاکو سے ساز باز کر رہا تھا اور چاہتا تھا کہ عباسی خلیفہ اس کی اطاعت قبول کرے۔ دوسری طرف تین اعلیٰ فوجی قائدین تھے سلیمان شاہ، مجاہد الدین ایک دواتدار اور ابن کر جو خلیفہ کو ہلاکو سے مقابلہ کرنے اور اس کے لیے فوج کی تعداد بڑھانے کی ترغیب دلاتے تھے۔ مگر افسوس کہ خلیفہ نے فوج کے ساز وسامان اور اس کے اضافہ پر اپنے بخل کی وجہ سے کچھ زیادہ صرف نہیں کیا اور وہ آخر تک تذبذب میں مبتلا رہا۔ فوجی قائدین اور عوام کے اصرار پر اس نے شروع میں ابن العلقمی کی بات قبول نہیں کی اور مقابلہ کی فوجی قائدین کو اجازت دی۔ تاتاریوں کی آمد پر سلیمان شاہ اور مجاہد الدین دواتدار نے بغداد سے بیس پچیس میل کے فاصلہ پر ایک مقابلہ میں ان کو شکست دی۔ لیکن بعد کو ان کو پسپا ہونا پڑا۔ جس کی تفصیل کی یہاں گنجائش نہیں۔

ابن العلقمی کے شہر کے دروازے تاتاریوں کے لیے کھول دینے کی بات بھی درست نہیں اس کو یہ اختیار حاصل نہیں تھا۔ مذکورہ بالا کتابوں میں سے کسی کتاب میں بھی نہ خلق قرآن کے مسئلہ پر خلیفہ کے دجلہ کے کنارے مناظرہ کے بارے میں کچھ لکھا ہے اور نہ ابن العلقمی کے شہر کے

Marfat.com

دروازے کھولنے کے بارے میں اور نہ یہ کوئی اک دن کی بات تھی۔ اگر اظہر سہیل صاحب صرف رشید الدین فضل اللہ کی جامع التواریخ میں سقوط بغداد کا قصہ پڑھیں تو ان کو نظر آئے گا کہ اس سرکاری مورخ نے ۱۱ المحرم ۶۵۷ھ سے ۱۴ صفر ۶۵۷ھ تک کے واقعات، جس روز خلیفہ اور اس کے بیٹوں کو دیگر سیکڑوں علماء و مشائخ اور اعیان شہر کے ساتھ مکروفریب کے ساتھ قتل کیا گیا، روز بروز نہایت تفصیل سے ذکر کیے ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اہالی بغداد نے تاتاریوں کے چاروں طرف سے محاصرے کے باوجود بہادری سے ان کا مقابلہ کیا اور بالآخر تقریباً ایک ماہ کے محاصرے اور تباہی کے بعد وہ ابن العلقمی کے فریب میں آگئے کہ اگر خلیفہ اپنے خاندان اور اعیان شہر کے ساتھ ہلاکو سے ملنے اس کے کیمپ میں جائے تو بغداد اور اس کے باشندے قتل عام سے محفوظ رہیں گے۔ لیکن معاملہ اس کے برعکس ہوا۔ ہلاکو نے مکروفریب اور جھوٹ بول کر خلیفہ سے اہل بغداد کے نام اپنے کیمپ سے فرمان لکھوایا کہ اپنے ہتھیار ڈال دیں۔ اس کے بعد بزدل تاتاریوں اور ہلاکو نے جو قتل عام کیا وہ ایک انتہائی کریہہ داستان ہے جو سب کو معلوم ہے، اور یہ سب ایک سرکاری ثقہ مورخ نے لکھا ہے جس نے غازان محمود کی فرمائش پر جامع التواریخ لکھنا شروع کی تھی اور جس سے زیادہ مفصل تاتاریوں کی کوئی تاریخ نہیں ہے۔ اظہر سہیل صاحب اسلام آباد کی انٹرنیشنل اسلامک یونیورسٹی میں اس کتاب کا مطالعہ کر سکتے ہیں۔

اس موقع پر اظہر سہیل اور ان کے ہمنوا یہ تو کہہ سکتے ہیں کہ وہ ایک صحافی اور کالم نویس ہیں لیکن مورخ و محقق نہیں۔ یہ درست ہے مگر اس بات کو تو گوارا نہیں کیا جا سکتا کہ وہ تاریخ کو مسخ کر کے عام قارئین کو گمراہ کریں۔ اگر ان کو کسی تاریخی واقعہ کے بارے میں کچھ لکھنا ہی ہے تو اس کے بارے میں مستند کتابوں میں کچھ پڑھ لیا کریں۔

"قلم یا کلاشن کوف" کے حوالے سے موصوف کے کالم کا عنوان تھا۔ ایک اہم بات یہ ہے کہ کوئی شک نہیں کہ طلبہ کے ہاتھوں میں کلاشن کوف نہیں بلکہ قلم ہونا چاہیے لیکن یہاں ایک اہم اضافہ کی ضرورت ہے اور وہ یہ کہ یہ قلم تعمیری ہونا چاہیے تخریبی نہیں، وہ قلم نہیں جو گمراہی، الحاد، نفرتوں، منافقتوں اور خوشامد کو فروغ دیتا ہے بلکہ وہ قلم جو نیکی و صلاح، ایمان و اتحاد، محبت و خلوص اور حق پسندی و حق گوئی کی آبیاری کرتا ہے۔

Marfat.com

یہ بات اصحاب فکر ونظر سے پنہاں نہیں کہ قلم کلاشن کوف سے بھی زیادہ خطرناک ہوسکتا ہے۔کلاشن کوف سے ایک دو تین چار آدمی مارے جاسکتے ہیں مگر ایک غلط کار قلم سے تو ہزاروں اور لاکھوں انسان بلکہ پوری پوری نسلوں کو گم کردہ راہ اور برباد کیا جاسکتا ہے۔کارل مارکس اور لینن کے قلم نے کس طرح انسانیت ایمان، مذہب اور اخلاق کو مسخ کیا یہ سوویت یونین کی تباہی اور کمیونزم کے زوال کے بعد سب پر عیاں ہے۔مرزا غلام احمد قادیانی کے قلم نے لوگوں کو کس طرح خاتم الانبیاء محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت سے محروم کر دیا جو بالآخر ذوالفقار علی بھٹو صاحب کے عہد حکومت میں عوامی دباؤ کے تحت پارلیمنٹ کے متفقہ فیصلے کے بعد غیر مسلم قرار پائے۔ یہ سب کلاشن کوف کی نہیں ایک ناپاک وغلط کار قلم کی کارستانی کا نتیجہ تھا۔

اور ہمارے ہی عہد میں ملعون سلمان رشدی کے گندے اور منحوس قلم نے کس طرح غلاظت بکھیری اور فتنہ کا سامان مہیا کیا ہے اور اب اس راہ پر بنگلہ دیش کی تسلیمہ نسرین نے اپنے غلط کار قلم کو حرکت دی ہے۔

کون نہیں جانتا کہ اسی کلاشن کوف سے کشمیر میں جہاد کا کام لیا جاسکتا ہے اور دشمنوں کو زیر کیا جاسکتا ہے اور اسی قلم سے مسلمانوں کو گمراہ کیا جاسکتا ہے اور ان میں فتنہ وفساد کے بیج بوئے جا سکتے ہیں۔

Marfat.com

حضرت علیؓ اور حضرت معاویہؓ کی قبور اور مولانا تقی عثمانی

ایک تنقیدی جائزہ

ہر خاص و عام جانتا ہے کہ سیدنا علی کرم اللہ وجہہ کی قبر مبارک عراق کے شہر نجف اشرف میں ہے۔ لیکن میری نظر سے حال ہی میں جسٹس ریٹائرڈ مولانا محمد تقی عثمانی صاحب کے سفرنامے ''جہاں دیدہ'' کا تازہ ایڈیشن ۱۹۹۴ء گزرا، یہ سفرنامہ پہلی بار ۱۴۱۰ھ مطابق ۱۹۸۹ء میں چھپا تھا۔

عراق کے سفر کے ذکر میں مجھے یہ دیکھ کر بڑی حیرت ہوئی کہ مولانا موصوف نے سیدنا علی کرم اللہ وجہہ کی قبر کے بارے میں شکوک و شبہات پیش کیے ہیں (۱) جب کہ دمشق میں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی قبر کو تلاش کرنے میں کامیاب ہو گئے اور ایک ایسی قبر کو ان کی قبر قرار دیا جو تاریخی شواہد اور اہل ملک محققین کے بیان کے بموجب حضرت معاویہؓ کی قبر نہیں۔ اس کا ذکر ہم بعد میں کریں گے، پہلے سیدنا علیؓ کی قبر کے بارے میں مولانا کی تحقیق اور اس پر جائزہ پیش کرتے ہیں۔

لکھتے ہیں:

''واقعہ یہ ہے کہ اس مقام پر حضرت علی رضی اللہ عنہ کا مدفون ہونا تاریخی اعتبار سے خاصا مشکوک ہے'' دلچسپ بات یہ ہے کہ اس کے فوراً بعد وہ لکھتے ہیں ''اگرچہ اب یہ بات تواتر کے ساتھ مشہور ہو چکی ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا مزار یہی ہے'' اور پھر دوبارہ وہ اپنے شک کو اس طرح دہراتے ہیں'' لیکن حضرت علی رضی اللہ عنہ کے مقام تدفین کے بارے میں تاریخی روایات اس قدر مختلف اور متضاد ہیں کہ کوئی بات یقین کے ساتھ کہنا مشکل ہے۔''

اس کے بعد مولانا موصوف نے یہ ''مختلف اور متضاد تاریخی روایات'' تاریخ کی مختلف کتابوں سے نہیں بلکہ صرف ایک کتاب یعنی خطیب بغدادی (وفات ۴۶۳ھ) کی کتاب ''تاریخ بغداد'' سے پیش کی ہیں۔

مولانا محمد تقی عثمانی صاحب نے اپنے اس سفرنامہ میں صرف اپنے مشاہدات نہیں لکھے ہیں

Marfat.com

بلکہ بہت سے امور سے بحث کی ہے اور اس کے لیے عربی، اردو اور انگریزی کتابوں کے بیانات اور حوالے پیش کیے ہیں اور اس طرح اپنے سفرنامے کو ایک تحقیقی کتاب بنانے کی کوشش کی ہے جو بہت مستحسن اور مفید ہے، اگرچہ سفرنامے کا مقصد یہ نہیں ہوتا۔ مزید برآں یہ کہ انہوں نے خطیب بغدادی کی کتاب پر اکتفا کیا اور اسی بنیاد پر سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی قبر کے بارے میں مشکوک ہونے کا فتویٰ صادر کر دیا، حالانکہ تحقیق کا تقاضا تھا کہ وہ ایک ایسے اہم معاملے میں دوسری قدیم و جدید کتابوں سے بھی رجوع کرتے اور پھر کوئی فیصلہ دیتے۔

راقم الحروف نے سیدنا علیؑ کی قبر مبارک سے متعلق جو تحقیق کی ہے وہ اور اس کا نتیجہ یہاں قارئین کے سامنے پیش کرنا چاہتا ہوں، لیکن اس سے قبل میں وہ شکوک سامنے لانا چاہتا ہوں جو مولانا تقی عثمانی صاحب نے خطیب بغدادی کی کتاب ''تاریخ بغداد'' جلد اول سے پیش کیے ہیں اور پھر ان کا تنقیدی تجزیہ پیش کیا جائے گا۔

۱۔ احمد بن عبداللہ العجلی کہتے ہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو کوفہ میں دفن کیا گیا لیکن ان کی قبر کی جگہ معلوم نہیں۔

۲۔ ابن سعد کا کہنا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو کوفہ میں جامع مسجد کے قریب قصر الامارۃ میں دفن کیا گیا۔

۳۔ ابوزید بن طریف کہتے ہیں کہ جامع مسجد کی دیوار قبلہ کے ساتھ باب الوارقین کے سامنے ایک گھر ہے، حضرت علی رضی اللہ عنہ اس میں دفن ہیں۔ یہ گھر یزید بن خالد نامی ایک صاحب کا تھا اور ایک روایت یہ بھی ہے کہ کسی موقع پر اس گھر کو کھودنا پڑا تو اس میں سے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی نعش تر و تازہ برآمد ہوئی۔

۴۔ بعض روایات میں آیا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ دفن تو کوفہ میں کیے گئے تھے لیکن حضرت حسن رضی اللہ عنہ، حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے عہد میں آپ کی نعش مبارک کو مدینہ طیبہ لے گئے تھے اور وہاں حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے مزار کے قریب جنت البقیع میں آپ کو دفن کیا گیا۔

۵۔ ایک اور روایت میں ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو شہادت کے فوراً بعد ہی ایک تابوت میں

Marfat.com

رکھ کر ایک اونٹ پر سوار کر دیا گیا تا کہ انہیں مدینہ طیبہ لے جائیں، لیکن راستے میں قبیلہ طے کے علاقہ میں پہنچ کر وہ اونٹ گم ہو گیا۔ قبیلہ طے کے لوگوں نے اس صندوق کو خزانہ سمجھ کر اٹھا لیا لیکن جب اندر نعش دیکھی تو اسے وہیں اپنے علاقہ میں دفن کر دیا۔

۶۔ ابو جعفر حضرمیؒ (صحیح حضرمی ہے) جو مطین کے لقب سے مشہور ہیں، فرماتے ہیں کہ آج (نجف میں) جس قبر کو لوگ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا مزار سمجھ کر اس کی زیارت کرتے ہیں مگر وہ واقعتاً حضرت علی رضی اللہ عنہ کا مزار نہیں ہے اور جن صاحب کا وہ مزار ہے اگر ان کا نام روافض کو معلوم ہو جائے تو وہ اس قبر کی زیارت کرنے کے بجائے اسے سنگسار کرنے کی کوشش کریں۔ یہ صاحب مزار دراصل حضرت مغیرہ رضی اللہ عنہ بن شعبہ ہیں۔

یہ وہ چھ روایات ہیں، جن کو مولانا تقی عثمانی صاحب نے پانچویں ہجری کے ایک محدث اور اسماء رجال کے مصنف خطیب بغدادی سے نقل کرنے کے بعد اپنا فیصلہ یوں صادر کیا ہے۔

"ظاہر ہے کہ ان روایات کے پیش نظر حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے مزار کے بارے میں کوئی بھی بات یقین سے نہیں کہی جا سکتی۔"

عجیب بات ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چچازاد بھائی، پروردۂ رسول صلی اللہ علیہ وسلم، فاتح خیبر اور چوتھے خلیفہ راشد کی قبر کا پتہ ہی نہیں کہ وہ کہاں ہے، اور نجف میں جہاں صدیوں سے ان کی قبر مشہور و معروف ہے وہ بقول مولانا تقی عثمانی صاحب بحوالہ مطین رضی اللہ عنہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے مقرر کردہ گورنر کوفہ حضرت مغیرہ رضی اللہ عنہ بن شعبہ کی ہے اور جن کی وفات حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شہادت کے دس سال بعد ۵۰ ہجری میں ہوئی۔ یہ وہی حضرت مغیرہ رضی اللہ عنہ ہیں، جنہوں نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو مشورہ دیا تھا کہ اپنے بیٹے یزید کو ولی عہد بنا کر اس کی بیعت لیں (یہاں ملحوظ خاطر ہے کہ حضرت حسن رضی اللہ عنہ کی شہادت صحیح روایات، یعنی امام بخاری کے استاد محدث و مورخ خلیفہ بن خیاط اور عظیم مورخ امام ذہبی کے اقوال کے مطابق سن ۴۹ھ میں ہوئی (۲)۔ جب کہ حضرت مغیرہ رضی اللہ عنہ کی وفات شعبان ۵۰ھ میں ہوئی) اسی لیے مطین نے یہ بات کہی کہ اگر شیعہ حضرات کو معلوم ہو جائے تو وہ اس قبر کی تعظیم کے بجائے اس کو سنگسار کریں۔

اب ہم ان روایات کا ایک ایک کر کے تنقیدی تجزیہ کرتے ہیں تا کہ حقیقت حال معلوم ہو

Marfat.com

سکے اور مولانا تقی عثمانی کے بیانات کے سبب جو شبہات پیدا ہو گئے ہیں ان کا ازالہ کیا جا سکے۔

ان چھ متضاد روایات پر گفتگو سے قبل یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ خود خطیب بغدادی کا رجحان معلوم کیا جائے۔ سب سے پہلے یہ بات کہ کوئی شک نہیں کہ وہ ایک عظیم محدث، ناقد اور اسماء رجال کے ماہر اور ان موضوعات پر ایک مایۂ ناز مصنف اور محقق ہیں، لیکن وہ متعارف معنی میں امام طبری اور ابن الاثیر وغیرہ کی طرح مورخ نہیں، اور پھر سب سے بڑی بات یہ ہے کہ جغرافیہ ان کا موضوع نہیں۔ تاریخی رجحان نہ رکھنے کے علاوہ خطیب بغدادی پر ناصبیت کا الزام بھی ہے جس کا ذکر ذہبی نے ابن عساکر کی تاریخ دمشق کے حوالے سے کیا ہے اور بعض اخلاقی کمزوریوں کا بھی ذکر کیا ہے، (۳) جن کے ذکر سے ہم یہاں اعراض کرتے ہیں۔

پھر یہ کیا مولانا تقی عثمانی صاحب، خطیب بغدادی کی ان روایات کو تسلیم کرتے ہیں جو انہوں نے امام ابوحنیفہ کی قدح میں اپنی اسی تاریخ بغداد کی تیرھویں جلد میں پیش کی ہیں؟ جو ہم مشہور و منصف شافعی مورخ ابن خلکان کے اتباع میں پیش نہیں کرتے، جنہوں نے ان روایات کے نقل کرنے سے ان الفاظ میں احتراز کیا ہے۔ ''و مناقبه و فضائله كثيرة، وقد ذكر الخطيب فی تاریخه منها شیًٔا كثيرا. ثم اعقب ذلك بذكر ما كان الاليق تركه والاضراب عنه ''(۴) (امام ابوحنیفہ کے مناقب وفضائل بہت زیادہ ہیں۔ خطیب نے اپنی تاریخ میں ان میں سے بہت سے فضائل کا ذکر کیا ہے اور اس کے بعد امام صاحب کے خلاف ایسی باتوں کا ذکر کیا ہے، جن کا ترک کرنا اور ان سے چشم پوشی زیادہ مناسب تھا)

ہم یہاں مزید کہیں گے کہ خطیب کا یہ ناروا عمل محض مسلکی (شافعی) تعصب کی وجہ سے نہیں تھا بلکہ اس وجہ سے بھی تھا کہ امام ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ اہل بیت سے انتہائی محبت رکھتے تھے، انہوں نے محمد الباقرؒ اور جعفر الصادق سے تلمذ کیا تھا اور بنی امیہ کے خلیفہ ہشام بن عبدالملک کے خلاف مسلح تحریک میں مالی اور اخلاقی طور پر حضرت زید بن علی زین العابدین کا ساتھ دیا تھا، اور ابو جعفر منصور کے خلاف محمد النفس الزکیہ (سیدنا حسن رضی اللہ عنہ سبط کے پڑپوتے) اور ان کے بھائی ابراہیم کا ساتھ دیا تھا، اور درحقیقت اسی وجہ سے امام موصوف کو ان دونوں خاندانوں کے حکمرانوں نے کوڑوں کی سزا دی تھی، اور اسی محبت اہل بیت کی بناء پر خطیب بغدادی نے شافعی تعصب کے

Marfat.com

ساتھ اپنے ناصبی رجحان کے تحت امام صاحبؒ کو مطعون کیا۔

حقیقت یہ ہے کہ خطیب بغدادی امام ابوحنیفہ کے ان متعصب اور کور چشم دشمنوں کی زبان تھے، جنھوں نے امام اعظم کو بدنام اور بے اعتبار ٹھہرانے کی مہم چلائی اور ان سے ملحدانہ عقائد تک منسوب کر دیئے۔ اللہ تعالیٰ جزائے خیر دے عصر حاضر کے عظیم حنفی مصری عالم زاہد الکوثری مرحوم کو جنھوں نے خطیب بغدادی کے امام اعظمؒ کے خلاف ان اتہامات کی تردید میں اپنی کتاب ''تالیف الخطیب'' تصنیف کی۔

ہمیں پورا یقین ہے کہ مولانا تقی عثمانی صاحب خطیب بغدادی کے امام ابوحنیفہؒ کے خلاف اتہامات اور غلط بیانیوں سے واقف ہیں اور ان کو تسلیم نہیں کرتے ہیں، پھر انہوں نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی قبر مبارک سے متعلق خطیب بغدادی کی پیش کردہ روایات کو کس طرح تسلیم کر لیا؟

خطیب بغدادی کی مزعومہ روایات کا تنقیدی جائزہ:

ا۔ پہلی روایات احمد بن عبداللہ العجلی کی ہے، جو فرماتے ہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کوفے میں دفن کیے گئے لیکن ان کی قبر کی جگہ معلوم نہیں۔ سوال یہ ہے کہ یہ احمد بن عبداللہ العجلی کون ہیں؟ اور کب تھے؟ اور ان کے کیا افکار ہیں؟

اگر مولانا تقی عثمانی صاحب زحمت فرماتے ہیں تو اسی کتاب ''سیر اعلام النبلاء'' ذہبی میں جس کا حوالہ انہوں نے اپنے سفر نامے میں اکثر دیا ہے، ان کے حالات معلوم ہو جاتے۔ یہی وہ صاحب ہیں جو المامون کے زمانے میں ''مشہور مسئلہ خلق القرآن'' کے وقت کوفے سے شمالی افریقہ کے شہر طرابلس کو بھاگ گئے تھے اور تاریخ کے طالب علم جانتے ہیں کہ اس زمانے میں موجودہ لیبیا کا یہ شہر خارجیوں کا مرکز تھا۔ اگرچہ امام ذہبی نے یہ نہیں لکھا ہے۔

اور پھر امام ذہبی کے بقول یہی وہ صاحب ہیں جن کا کہنا ہے کہ ''جو یہ کہتا ہے قرآن مخلوق ہے وہ کافر ہے'' لیجیے عباسی خلفاء المامون المعتصم، الواثق، سب کافر ٹھہرے اور وہ تمام علماء شام و عراق و مصر وغیرہ بھی جنھوں نے ریاستی جبر کے تحت قرآن کو مخلوق مان لیا تھا اور اس میں امام احمد بن حنبل اور ان کے دو ایک ہم نواؤں کے علاوہ تمام محدثین و فقہاء شامل تھے۔ خود امام احمدؒ نے ان میں سے کسی کو کافر نہیں گردانا۔

Marfat.com

مگر ہمارے موضوع سے متعلق بات یہ ہے کہ انہوں نے تاریخ پر کوئی کتاب نہیں لکھی ہے نہ ان کا شمار مورخین میں ہے، ذہبی نے ان کی نقد رجال حدیث یعنی الجرح والتعدیل پر صرف ایک کتاب کا ذکر کیا ہے، اور پھر سب سے اہم قابل ذکر بات یہ ہے کہ ان کی وفات بقول ذہبی سن ۲۶۱ھ میں ہوئی (۵) جب کہ ان سے قبل کے ایک مصنف جو بغداد کے رہنے والے تھے یعنی ابن سعد (وفات ۲۳۰ھ) صحابہ کرام اور تابعین پر اپنی مشہور اور مستند کتاب الطبقات الکبریٰ میں پوری تفصیل اور وقت کے ساتھ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی کوفہ میں قبر کی جگہ متعین کرتے ہیں، جس کا ذکر ابھی آگے آتا ہے۔

اس طرح احمد العجلی کی روایت جو ابن سعد کی کتاب کے تقریباً چالیس پچاس سال بعد کی ہے، ناقابل اعتناء ہے، کیونکہ انہوں نے کوئی سلسلہ سند پیش نہیں کیا ہے، جب کہ ابن سعد نے متعدد ثقہ اسناد سے روایت کی ہے۔

۲۔ خطیب بغدادی کی دوسری روایت انہی ابن سعد سے منقول ہے، جس میں قطع و برید سے کام لیا گیا ہے، ابن سعد نے یہ نہیں کہا کہ "حضرت علی رضی اللہ عنہ کو کوفے میں جامع مسجد کے قریب قصر الامارۃ میں دفن کیا گیا جیسا کہ خطیب نے ذکر کیا ہے، بلکہ ان کے الفاظ یہ ہیں:

"ودفن علی بالکوفۃ عند مسجد الجماعۃ فی الرحبۃ ممایلی ابواب کندۃ" (۶)

یعنی علی رضی اللہ عنہ کوفے میں جامع مسجد کے پاس اس وسیع میدان میں دفن کیے گئے جو قبیلہ کندہ کے دروازوں سے قریب ہے۔

آپ نے دیکھا کہ خطیب بغدادی نے محض اپنی یادداشت پر بھروسہ کرتے ہوئے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی قبر کے بارے میں کیسی غلط بات لکھی ہے۔ یہاں یہ بھی عرض کر دوں کہ ان کے حافظے کے بارے میں ذہبی نے بعض قدیم محدثین کی رائے نقل کی ہے کہ وہ اچھا نہ تھا "اگر ان سے کوئی بات پوچھی جاتی تو وہ کئی دن کے بعد بتاتے اور اگر اصرار اور تقاضا کیا جاتا تو بہت غصے ہوتے اور سخت برہم ہو جاتے تھے، ان کا حافظہ ان کی تصانیف جیسا نہیں تھا۔" (۷)

حضرت علی رضی اللہ عنہ کی قبر کے بارے میں ابن سعد کا یہ بیان اس قدر دقیق ہے کہ ان میں کسی

Marfat.com

شک وشبہ کی گنجائش نہیں، وہ نہ تو قصر الامارۃ (گورنر ہاؤس) میں دفن ہوئے اور نہ کوفے کی مسجد میں، بلکہ قبیلہ کندہ کے محلے کے دروازوں کے پاس اس وسیع میدان میں دفن ہوئے جو جامع مسجد کے قرب و جوار میں واقع تھا۔ رحبہ اس وسیع میدان کو کہتے ہیں جو کسی شاہی محل یا جامع مسجد کے دروازے سے دور تک پھیلا ہوتا ہے اور مشہور قدیم عرب ماہر لغت ابن الاعرابی کے بیان کے مطابق رحبہ ایک وسیع و عریض زمین کو بھی کہتے ہیں، یاقوت نے اپنی جغرافیائی عظیم ڈکشنری ''معجم البلدان'' میں ''رحبہ'' کے تحت یہ تعریف نقل کی ہے اور بہت سے ان مقامات کا ذکر کیا ہے جو رحبہ کے نام سے مشہور تھے، انہی میں سے کوفہ میں ایک رحبہ قاضی ابو یوسف کے پردادا خنیس کے نام سے مشہور تھا۔

۳۔ خطیب بغدادی کی تیسری روایت انتہائی مہمل اور ناقص ہے، جو ابن سعد کی مذکورہ قدیم روایت سے متناقض بھی ہے۔ ابو زید بن طریف کہتے ہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کوفہ میں باب الوارقین کے سامنے ایک گھر میں دفن ہیں جو یزید بن خالد کا تھا اور جب اس گھر کو کھودا گیا تو اس میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی نعش تر و تازہ برآمد ہوئی۔ سبحان اللہ کیا روایت ہے: اتنا تو بتا دیا کہ تر و تازہ میت برآمد ہوئی، مگر پھر اس میت کا کیا ہوا، اس کا کوئی ذکر ہی نہیں۔

حیرت کی بات ہے کہ جسٹس ریٹائرڈ مولانا تقی عثمانی صاحب نے اس روایت کو بعینہ نقل کر دیا اور نہ اس پر کسی استعجاب کا اظہار کیا اور نہ ہی اس کے داخلی تہافت کو دیکھا۔ وراقین (کتب فروش) کے نام سے کئی محلے بغداد اور کوفے وغیرہ میں عباسی دور میں تیسری صدی ہجری میں قائم ہوئے، جب دوسری صدی ہجری کے اواخر اور تیسری صدی ہجری کی ابتداء میں خراسان و بغداد میں کاغذی صنعت کے قیام کے بعد کثرت سے کتابیں لکھی جانے لگیں اور ان قلمی کتابوں کی دکانیں قائم ہونے لگیں۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ انہی ایک دادا کی اولاد ہاشم سے ہیں جو عباسیوں کے بھی جد امجد ہیں، عباسیوں کی حکومت کے قیام کے بعد انہوں نے بنی امیہ سے حضرت علی رضی اللہ عنہ، حضرت حسین رضی اللہ عنہ اور دیگر شہدائے اہل بیت کا سخت انتقام لیا تھا۔ دمشق میں اموی حکمرانوں کی قبریں تک کھدوا کر پھینک دیں۔ لہٰذا وہ یہ کس طرح گوارا کرتے کہ انہی کے خاندان بنی ہاشم کے ایک عظیم فرزند حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پروردہ سگے چچازاد بھائی اور چوتھے خلیفہ راشد کی قبر کو وہ ایک عام آدمی کے گھر میں رہنے دیں اور پھر اس گھر کو کسی موقع پر کھودا جائے اور اس میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی

Marfat.com

نعش برآمد ہو تو عباسی خلفاء اس کا کوئی نوٹس ہی نہ لیں اور پتہ ہی نہ چلے کہ پھر ان کی اس تر وتازہ نعش کے ساتھ کیا کیا گیا۔

۴۔ چوتھی روایت کے راوی کے نام تک کا پتہ نہیں کہ یہ کس کی طبع زاد ہے، مگر یہ پہلی دو روایتوں کی طرح لغو ہے، اگر اس دور اول یعنی حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی نعش کو قبر سے کھود کر حضرت حسن رضی اللہ عنہ مدینہ منورہ لے جاتے تو ہر مورخ اس کا ذکر کرتا اور یہ بات حضرت علی رضی اللہ عنہ کے معتقدین سے چھپی نہیں رہتی اور نہ اولا د و اسفاد علی رضی اللہ عنہ جو اس وقت اور بعد کو برسوں مدینہ میں کثرت سے آباد تھے، بے خبر رہتے۔

اور پھر یہ کہ اس عہد اولین میں بلکہ کافی بعد تک اس کا رواج نہ تھا کہ کوئی شخص خواہ وہ کتنا ہی بڑا ہو اس کی نعش ایک شہر سے دوسرے شہر منتقل کی جائے۔ اگر ایسا ہوتا تو بغداد کے عظیم ترین خلیفہ ہارون الرشید کی نعش طوس میں واقع اس کی قبر میں نہ رہتی بلکہ بغداد لائی جاتی، اور المامون کی نعش موجودہ ترکی شہر طرطوس میں نہ رہتی، وہ بھی بغداد لائی جاتی۔ لہٰذا یہ بھی ایک گمنام اور بے سر و پا روایت ہے۔

۵۔ یہ پانچویں روایت کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی نعش کو ان کی شہادت کے فوراً بعد ایک تابوت میں رکھ کر مدینہ طیبہ لے جانے کے لیے ایک اونٹ پر سوار کر کے اس کو ہانک دیا گیا اور راستے میں قبیلہ طی کے علاقہ میں وہ اونٹ کھو گیا، قبیلہ طی کے ہاتھوں جب یہ تابوت لگا تو انہوں نے اس کو خزانہ سمجھ کر کھولا، اور جب اس میں سے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی نعش نکلی تو اس کو وہیں دفن کر دیا، کہاں؟ یہ معلوم نہیں۔ یہ ایک ایسی انتہائی بے سر و پا اور لغو روایت ہے کہ حافظ ابن کثیر تک نے اپنی تاریخ البدایہ والنہایہ۔(۸) میں اس کو بے سر و پا اور ایسی بات کہا ہے جس کو نہ عقل تسلیم کرتی ہے اور نہ شرعی طور پر یہ قابل قبول ہے۔ خیال تو کیجئے کہ ایک خلیفہ راشد کو شہید کیا جائے، اس کا فرزند سیدنا حسن رضی اللہ عنہ اس کے بعد کوفے میں خلیفہ تسلیم کیا جائے جس کے پاس چالیس ہزار کی فوج ہو اور وہ چھ ماہ تک وہاں خلیفہ اسلام رہے اور اس کے والد اور چوتھے خلیفہ راشد کی لاش کو ایک تابوت میں رکھ کر اونٹ پر کس کر یونہی ہانک دیا جائے، اس کے ساتھ کوئی فوجی دستہ تک نہ ہو اور اگر ہو تو اس دستے کو اونٹ کے گم ہو جانے کی خبر تک نہ ہو اور کسی گمنام جگہ پر قبیلہ طی کے صحراء میں وہ دفن کر دیئے جائیں۔ اس روایت کو عقل تسلیم کرنے سے عاجز

Marfat.com

ہے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مرفوع روایت ہے کہ ''کسی انسان کے (۹) جھوٹ کے لیے اتنا ہی کافی ہے کہ وہ جو کچھ بھی سنے اس کی بیان کرنا شروع کر دے۔'' (۱۰)

۶۔ چھٹی اور آخری روایت ایک صاحب مطین کی ہے اور یہ ایک عجیب ترین روایت ہے جس کی تحلیل و تجزیہ کیا جائے تو یہ بھی مہمل ولغو ٹھہرے گی اس روایت کے راوی ابو جعفر محمد بن عبداللہ الحضرمی المقلب مطین بھی ایک محدث تھے۔ یہ تیسری صدی ہجری کے آدمی ہیں، سن ۲۹۷ھ میں ان کی وفات ہوئی۔ نہ معلوم انہوں نے یہ انکشاف کب کیا کہ کوفے میں جو قبر سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی مشہور ہے وہ دراصل حضرت مغیرہ رضی اللہ عنہ بن شعبہ کی ہے جو کوفہ میں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے گورنر تھے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے دس سال بعد ان کا انتقال ہوا۔

ان کی وفات سے ۷۰۔۸۰ سال قبل ابن سعد نے اپنی طبقات الکبریٰ میں صراحت کی ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کوفہ میں دفن کیے گئے جن کے الفاظ اس بارے میں ہم اوپر نقل کر چکے ہیں۔ مزید توضیح اس سے ہوتی ہے کہ ابن سعد قبر کی جگہ تفصیلی نشاندہی کے ساتھ یہ بھی بتاتے ہیں کہ ''حضرت علی رضی اللہ عنہ کو صلاۃ الفجر کے فوراً بعد دفن کیا گیا اور حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے ان کو دفن کیا، اس کے بعد لوگوں نے ان کے ہاتھ پر بیعت خلافت کی۔'' (۱۱)

اب ابن سعد کے اس بیان کے بعد جو ان جناب مطین سے ۶۷ سال قبل فوت ہو چکے تھے، ان کی اس روایت کی کیا قیمت رہ جاتی ہے اور پھر سب سے بڑی بات یہ ہے کہ ابن سعد اپنی اس دقیق و مفصل روایت کو مشہور و ثقہ محدث وفقیہ وکیع بن الجراح کے واسطے سے ایک کوفی صحابی (۱۲) کلیب ابن شہاب الجرمی یا تابعی (۱۲ الف) سے روایت کرتے ہیں اور یہ محدث ابو داؤد کے بقول کوفہ کے بزرگ ترین لوگوں میں سے تھے، یہی نہیں ابن سعد یہ روایت دو اور سندوں سے مشہور تابعی شعبی سے بھی روایت کرتے ہیں۔ جن کی پیدائش، پرورش اور وفات کوفہ کی ہے اور وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شہادت کے وقت ۲۲ سال کے تھے اور یقیناً ان کے جنازہ میں شریک ہوئے، کیونکہ وہ کہتے ہیں کہ سیدنا حسن رضی اللہ عنہ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی نماز جنازہ پڑھائی اور چار تکبیریں کہیں، اس کے بعد انہی شعبی اور کلیب نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی تدفین کی جگہ کے بارے میں وہ دقیق بیان دیا ہے جس کو ہم اوپر نقل کر چکے ہیں۔ یہی نہیں ابن سعد نے یہ بیان امام بخاری کے استاد

Marfat.com

ابونعیم فضل بن دکین سے بھی سنا جنہوں نے پوری سند کے ساتھ اس کو شعبی سے روایت کیا ہے۔

اب اس سب کے بعد جناب مطین کے اس بیان کی کیا قیمت رہ جاتی ہے جو انہوں نے بغیر کسی سند کے ڈھائی تین سو سال بعد دیا ہے کہ جس قبر میں حضرت علی رضی اللہ عنہ مدفون ہیں اس میں ان کا جسد خاکی نہیں بلکہ مغیرہ رضی اللہ عنہ بن شعبہ ہیں۔

یہ ہے خطیب بغدادی کی ان چھ روایات کی حقیقت جن کا عقلی و نقلی بنیادوں پر ہم نے تفصیلی تجزیہ پیش کر دیا ہے۔ ان میں صرف ابن سعد کی قدیم اور مستند روایت ہی صحیح ہے، لیکن افسوس کے وہ بھی ناقص پیش کی گئی اور ہم نے اس عظیم اور ثقہ مصنف کی کتاب الطبقات الکبریٰ سے رجوع کر کے روایت کو انہی کے الفاظ میں لکھ دیا ہے۔

کوفہ۔ظہر الکوفہ، نجف:

ان روایات سے قطع نظر جن کی ہم تردید کر چکے ہیں، ایک اور سبب سے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی جائے تدفین کے بارے میں شک پیدا ہوتا ہے کہ قدیم عربی مآخذ میں کہیں ان کی جائے تدفین کوفہ ہے اور کہیں ظہر الکوفہ اور آج کل یا چند صدیوں سے اس کو نجف کہا جاتا ہے۔

یہ شک درحقیقت کوفہ کی قدیم و جدید جغرافیائی حیثیت سے ناواقفیت کی وجہ سے ہے، اگر ابتدا سے اب تک کوفہ کے قیام اور جغرافیہ پر گہری نظر ڈالی جائے تو واضح ہوگا کہ یہ تینوں نام ایک ہی تصویر کے مختلف رخ ہیں۔

یہ شہر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے حکم سے سن ۱۷ ہجری میں ایک فوجی چھاؤنی کی حیثیت سے حضرت سعد بن ابی وقاص نے آباد کیا، اس کے قریب ہی قدیم عربی شہر ''حیرہ'' تھا۔ خلافت راشدہ کا یہ وہ عہد ہے جب سادگی پسندی حکومت کا شعار تھی۔ قدیم مورخ البلاذری نے اپنی کتاب ''فتوح البلدان'' میں کوفہ کے قیام اور اموی و اولین عہد عباسی میں اس کی ترقی و عمارات کا تفصیل سے ذکر کیا ہے۔ وہ کوفہ جو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے عہد میں بسایا گیا تھا، بغداد کی تعمیر سے قبل عراق کا سب سے اہم اور صدر مقام ہو گیا تھا۔ بلاذری کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ اموی دور میں مغیرہ رضی اللہ عنہ بن شعبہ اور زیاد نے کوفہ کے دارالامارہ اور جامع مسجد میں کافی توسیع کی اور آخری عہد اموی میں کوفہ کے گورنر یزید بن عمر بن ہبیرہ نے کوفہ میں ہی فرات کے کنارے ایک دوسرا شہر آباد کیا، جو مکمل نہیں

Marfat.com

ہو سکا، کیونکہ آخری اموی خلیفہ مروان بن محمد نے حکم دیا کہ کوفہ چونکہ بنی ہاشم کے وفاداروں کا شہر ہے، اس لیے یہ نیا شہر اس میں تعمیر نہیں کیا جائے، اس لیے ابن ہبیرہ نے جاری تعمیر روک کر اپنے لیے قصر ہبیرہ کے نام سے ایک شہر کوفہ کے شمال میں تعمیر کیا، جس طرح حجاج بن یوسف نے کوفہ کو چھوڑ کر اس کے اور بصرہ کے درمیان واسط نام کا شہر بسایا تھا۔

سن ۱۳۲ ہجری میں عباسی حکومت کے قیام کے ساتھ اس کے پہلے خلیفہ ابوالعباس السفاح نے ابن ہبیرہ کے کوفے میں نئے تعمیر کردہ شہر کو اپنا مستقر بنایا اور اس کی نامکمل تعمیرات کی تکمیل کی اور کچھ نئی عمارات بنائیں (۱۳)۔ لیکن چونکہ لوگ اس کو مدینہ ابن ہبیرہ (شہر ابن ہبیرہ) کے نام سے ہی یاد کرتے رہے جو اموی عہد کی یاد دلاتا تھا، اس لیے السفاح نے اس کے مقابل ایک اور دوسرا شہر ہاشمیہ کے نام سے آباد کیا، لیکن وہ وہاں بھی زیادہ عرصے نہیں رہا اور اس سے قدرے دور اس نے پرانے عراقی شہر ''انبار'' سے ملحق ایک نیا شہر ہاشمیہ کے نام سے بسایا، جہاں وہ منتقل ہوا اور وہیں اس کی وفات ہوئی۔

سن ۱۳۶ ہجری میں جب ابوجعفر المنصور خلیفہ بنا تو اس نے دوبارہ ہاشمیہ کوفہ کو ہی اپنا پایہ تخت بنایا اور اس میں نئی تعمیرات کیں حتیٰ کہ سن ۱۴۹ ہجری میں بغداد کی تعمیر کے بعد وہ وہاں منتقل ہو گیا۔

ہم نے یہ تفصیلات اس لیے یہاں پیش کی ہیں کہ معلوم ہو سکے کہ جس کوفہ کا ذکر بعد کے مورخین کرتے ہیں اموی اور اولین عباسی دور میں وہ کوفہ نہیں تھا جس میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شہادت و تدفین ہوئی تھی وہ ''ظاہر الکوفہ یا ظہر الکوفہ'' (بیرون کوفہ) جہاں سے بلاذری کے مفصل و دقیق بیانات کے مطابق (۱۴) حضرت سعد رضی اللہ عنہ بن ابی وقاص نے کوفہ کی تعمیر شروع کی تھی بعد میں کے عہود میں کوفہ میں شامل ہو گیا، بالکل ایسے ہی جیسے بیرون موچی گیٹ، بیرون دلی دروازہ اور کراچی کے ان گوٹھوں کا معاملہ ہے جو اب لاہور، دہلی اور کراچی میں شام ہو چکے ہیں۔ اس لیے کوفہ اور ظہر الکوفہ ایک ہی چیز ہے۔

اصل اعتراض یا سوال تو یہ ہو سکتا ہے کہ پرانی تواریخ میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی تدفین کا مقام کوفہ ہے۔ یہ نجف کہاں سے آ گیا، جہاں اب صدیوں سے حضرت علی رضی اللہ عنہ کا مزار قائم ہے؟

اس سوال کا جواب بھی ہمیں ادب اور جغرافیہ کی قدیم عربی کتابوں کے تتبع سے مل جاتا

Marfat.com

ہے۔کوئی شک نہیں کہ قدیم ترین موجودہ ومتداول کتاب طبقات ابن سعداور دوسری قدیم تواریخ میں یہی ہے کہ وہ کوفہ میں دفن کیے گئے اور اس میں نجف کا ذکر نہیں، لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ نجف نامی کسی علاقے کا وجود ہی اس وقت نہیں تھا۔لیکن حضرت علی رضی اللہ عنہ کے مزار کے حوالے سے یہ کس طرح مشہور ہوا اس پر ہم یہاں روشنی ڈالیں گے۔

ہم ابھی کچھ پہلے عرض کر چکے ہیں کہ کوفہ کی ابتدائی تعمیر ظہر الکوفہ کے پر فضا مقام سے شروع کی گئی جو مختلف قسم کے صحرائی پھولوں کی وجہ سے اس وقت ''خدا العذراء'' (عارض حسینہ) کے نام سے یاد کیا جاتا تھا (۱۵)۔یاقوت نے اپنی جغرافیائی ڈکشنری معجم البلدان میں اس کا ذکر کیا ہے اور اس کے ساتھ مغربی سمت میں وہ صحرا تھا جہاں مختلف قسم کا شکار مہیا تھا، نجف کا قدیم ترین ذکر ہم کو اولین عباسی دور کے مشہور مغنی اور مصنف اسحاق بن ابراہیم الموصلی کے ایک قصیدے میں ملتا ہے جو اس نے اس وقت کہا تھا جب عباسی خلیفہ الواثق (۲۳۲۔۲۲۳ھ) وہاں سیر و تفریح و شکار کے لیے آتا تھا۔

یاقوت (وفات ۶۲۶ھ) نے اپنی مذکورہ بالا جغرافیائی ڈکشنری معجم البلدان میں مادہ ''نجف'' (۱۶) کے تحت یہ قصیدہ پیش کیا ہے، جس کا ایک شعر ہے:

ما ان اری الناس فی سھل ولا جبل

اصفی ھواء ولا اعذب من النجف (۱۷)

(حقیقت یہ ہے کہ لوگوں نے میدانوں اور پہاڑوں میں نجف سے زیادہ عمدہ اور پر فضا مقام نہیں دیکھا)

اس قصیدے کے صرف چند اشعار عربی ادب کی مشہور کتاب الاغانی۔ابوالفرج الاصفہانی کی پانچویں جلد میں (۱۸) اسحاق بن ابراہیم الموصلی کے سوانحی خاکہ میں موجود ہیں۔

ظاہر ہے کہ ''نجف'' کا یہ ذکر ۲۳۲ھ سے پہلے کی بات ہے اور اس تیسری صدی ہجری کے نصف اول میں ایک اور مشہور سیاسی وادبی شخصیت علی بن محمد بن جعفر الحمانی (وفات ۲۶۰ھ) نے بھی نجف کا ایک قصیدے میں ذکر کیا ہے جس کے تین اشعار یاقوت نے نقل کیے ہیں جس کا ایک شعر ہے:

Marfat.com

فیا اسفی علی النجف المعری   واودیة منورة الاقاحی

(ہائے وہ نجف جو ویران ومتروک ہے اور وہ وادیاں جن میں بابونے کے پھول کھلے ہوئے ہیں)

مولانا تقی عثمانی صاحب نے نجف کے وصف کے ذکر (ص ۴۳) میں ایک عجیب غلطی کا ارتکاب کیا ہے، انہوں نے بغدادی کی مراصد الاطلاع کے حوالے سے لکھا ہے کہ یہاں ربض اور نجف نام سے دو چشمے تھے "اگر وہ اصل کتاب یعنی یاقوت کی معجم البلدان" (مراصد الاطلاع جس کا اختصار ہے) دیکھتے تو ان کو معلوم ہوتا کہ یاقوت نے سہیلی (مصنف روض الانف) کے حوالے سے یہ ایک دوسری بستی الفرع کے چشمے بتائے ہیں اور الفرع کے ذکر میں ملے گا کہ وہ نواح مدینہ میں ایک گاؤں تھا۔ اس کا عراق کے نجف سے کوئی تعلق نہیں۔

یہ علی بن محمد الحمانی امام جعفر صادق کے پوتے تھے اور انہوں نے مکہ مکرمہ میں کچھ دوسرے علوی سادات کے ساتھ مل کر المامون کے عہد میں بغاوت کی تھی، پھر المامون نے ان کو معاف کر دیا تھا۔ یاقوت نے ان کے سن وفات کا ذکر نہیں کیا ہے۔ یہ ہم کو ترکی علامہ ڈاکٹر فواد سیزگین کی تاریخ التراث العربی سے معلوم ہوا، اس سے جہاں نجف کے نام پر روشنی پڑتی ہے جس کا ذکر چوتھی صدی ہجری کے مشہور جغرافیہ نویسوں، اسطخری اور ابن حوقل وغیرہ نے نہیں کیا، وہیں اس وقت نجف کی حالت زار کا پتہ چلتا ہے۔ لسان العرب کے مطابق "معریٰ" اس شے کو کہتے ہیں جس کو متروک کر دیا گیا ہو۔ ہمارے خیال میں اس علوی شاعر نے یہ قصیدہ عباسی خلیفہ المتوکل کے زمانے میں کہا ہے، جو اپنی ناصبیت (اہل بیت سے عداوت) میں مشہور تھا اور جس نے ۲۳۶ھ یعنی اس سیاسی وادبی شخصیت کے زمانے میں سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کا مزار کربلا میں کھدوا کر وہاں ہل چلوا دیا تھا اور ان کے معتقدین کو سختی کے ساتھ منع کر دیا تھا کہ وہ اس مقام کا رخ نہ کریں۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے میں متوکل عباسی کے خوف اور ناپاک ارادے سے متاثر ہو کر لوگوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی قبر پر بلکہ "نجف" جانا ہی ترک کر دیا تھا۔ اس لیے اس علوی شاعر نے اس شعر میں اپنے افسوس کا اظہار کیا ہے۔

نجف کا ذکر تو ہم کو تیسری صدی ہجری کے نصف اول میں مل گیا۔ لیکن اس سے اہم بات یہ ہے کہ قدیم عالم عرب کے عظیم ترین جغرافیہ نویس علامہ یاقوت نے اس موقع پر نجف کی جو تحدید

Marfat.com

بیان کی ہے اس سے یہ بات متعین ہوتی ہے کہ نجف اور ظہر کوفہ ایک ہی چیز ہیں کہ نجف ایک لا بنے پشتے کی طرح تھا جو کوفہ اور اس کے قبرستان میں دریائے فرات کے پانی کے سیلاب کو روکتا تھا اور اس سے زیادہ اہم بات اس سنی علامہ نے یہ لکھی ہے۔

وبالقرب من هذا الموضع قبر امير المومنين على بن ابى طالب رضى الله عنه۔

(اور اس جگہ کے قریب ہی امیر المومنین علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کی قبر ہے)

یہ چھٹی صدی ہجری کے ربع اول کی تحریر ہے۔ اس وقت تک نہ تو ایلخانی تاتاریوں کی شیعہ نواز حکومت قائم ہوئی تھی اور نہ ایران کی شیعی صفوی حکومت، بلکہ آزاد سنی عباس خلافت موجود تھی۔ اس لیے یاقوت کے بیان کے بارے میں شک وشبہ کی کوئی گنجائش نہیں۔

افسوس کہ نجف کی تاریخ اور وہاں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی قبر کے بارے میں دائرہ معارف اسلامیہ پنجاب یونیورسٹی کے مقابلہ نگار جناب مرتضیٰ حسین فاضل نے بھی ان مذکورہ بالا قدیم عربی شعراء اور یاقوت سے مدد نہیں لی۔ انہوں نے زیادہ تر بعد کے شیعی ماخذ پر اپنے فاضلانہ مقالے کی بنیاد رکھی ہے۔

اب ثابت ہو گیا کہ ظہر الکوفہ اور نجف اسی کوفہ کا ایک حصہ ہیں جو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں ایک پرفضا صحرائی مقام میں آباد کیا گیا تھا اور ظہر الکوفہ یا نجف میں ہی حضرت علی رضی اللہ عنہ دفن ہیں۔

اب سوال یہ رہ جاتا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے مزار پر گنبد وعمارت کب تیار ہوئی تو اس ذیل میں قدیم ترین بیان چوتھی صدی ہجری کے جغرافیہ نویس ابن حوقل کا ہے، جس نے ۳۶۵ھ میں اپنی کتاب ''صورۃ الارض'' (نقشہ دنیا) مکمل کی۔ وہ رقم طراز ہے۔ (باب ذکر الکوفہ) کو ''کوفہ میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی قبر ہے جو شہر کوفہ سے دو کوس کے فاصلے پر ہے'' (۱۹) (وہی ظہر الکوفہ یا نجف ہوا) ابوالہیجا عبداللہ بن حمدان نے اس جگہ کو مشہور کیا، وہاں ایک احاطہ بنوایا۔ قبر مبارک پر ایک بلند و بالا گنبد تعمیر کیا۔ جس کے چار دروازے قائم کیے۔ اس مزار میں اعلیٰ قسم کے پردے لٹکوائے اور قیمتی قسم کی ترکستانی چٹائیاں بچھوائیں، گنبد کے باہر ان کے متعدد عظیم فرزندان اور سادات آل ابی طالب دفن ہیں۔''

Marfat.com

یہ ابو الہیجاء عبداللہ بن حمدان کون ہے اور کب تھا؟ ابن الاثیر اور ابن خلدون وغیرہ کی تواریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ ابو الہیجاء جس کی وفات ۳۱۷ھ ہے ۲۹۳ھ میں موصل کا والی مقرر ہوا، وہ اس تیسری صدی ہجری کا ایک مشہور فوجی قائد تھا اور جس کے نام پر شمالی عراق میں چوتھی صدی ہجری میں ایک نیم آزاد حکومت (دولت حمدانیہ) قائم ہوئی۔

اردو دائرہ معارف اسلامیہ، پنجاب یونیورسٹی کے مقابلہ ''نجف'' کے مقالہ نویس مرتضٰی حسین فاضل کے بیان کے مطابق عبداللہ بن حمدان نے مزار کی یہ تعمیر و تزئین ۲۶۰ھ میں کی (۲۰) (لیکن ان کا ماخذ ایک عصر حاضر کی عربی کتاب ''مدینۃ الحسین کربلا'' ہے) بہر حال یہ بات یقینی ہے کہ نجف میں گنبد مزار کی تعمیر تیسری صدی ہجری میں ہوئی۔

یہ بات خطیب بغدادی کی وفات ۴۶۳ھ سے دو سو سال قبل کی ہے۔ اب یہ ظاہر ہے کہ جب دوسری صدی ہجری کا ایک مورخ (ابن سعد) اور چوتھی صدی و ساتویں صدی ہجری کے انتہائی مشہور اور ثقہ جغرافیہ نویس کوفہ کی ایک نواحی بستی ظہر الکوفہ ''نجف'' میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی قبر کی تصدیق کرتے ہیں تو خطیب بغدادی کے اٹھائے ہوئے شکوک وشبہات کی کیا قیمت رہ جاتی ہے؟

یہاں ایک قابل ذکر بات یہ ہے کہ ۳۱۲ھ اور ۳۱۵ھ میں دو بار قرمطی حکمران طاہر جنابی نے جزیرہ عرب کے اپنے مشرقی پایہ تخت ہجر سے آ کر کوفہ کو تاراج کیا۔ وہ اثنا عشری شیعوں کا بھی دشمن تھا، پھر اس کے بعد دوبارہ کوفہ اپنی مستقل حیثیت قائم نہ رکھ سکا۔ جب ۳۵۸ھ میں جغرافیہ نویس ابن حوقل نے اس کا حال لکھا ہے تو اس وقت اس کے بیان کے بموجب وہ بغداد کے زیر انتظام تھا۔

اس کے چند سال بعد ہی نجف کی حیثیت ابھرنا شروع ہوئی۔ جب مشہور ایرانی شیعی خاندان کے حکمران عضد الدولہ البویہی نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے مزار پر ۳۶۶ھ میں ایک نیا گنبد تعمیر کیا، لوگوں کو آباد کر لیا تو آٹھویں صدی ہمری کے ایرانی مورخ مستوفی کے بیان کے مطابق عضد الدولہ کے وقت سے یہ ایک چھوٹا سا شہر بن گیا، آل بویہ کا یہ طاقتور حکمران (عباسی خلفاء جس کے زیر نگیں تھے) اور اس کے بیٹے یہیں دفن ہیں، یہ خطیب بغدادی کی وفات سے سو سال قبل کی بات ہے، اس کے بعد سے کوفہ کی حیثیت گرتی ہی چلی گئی اور اس کی نواحی بستی نجف کو وہ مقام

Marfat.com

حاصل ہو گیا جو کبھی کوفہ کو تھا اور یہ سب حضرت علی رضی اللہ عنہ کے مزار کے سبب ہوا۔

جغرافیہ نویس ابن حوقل کے اب بیان کے بعد کہ ابوالہیجاء عبداللہ بن حمدان نے کوفہ کی نواحی بستی نجف میں ۲۶۰ھ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے مزار پر گنبد تعمیر کیا اور دوسری زیب و زینت کی۔ ان مطین صاحب کے بیان کی کیا قیمت رہ جاتی ہے کہ اس قبر میں حضرت علی رضی اللہ عنہ نہیں بلکہ مغیرہ رضی اللہ عنہ بن شعبہ دفن ہیں۔ ابن مطین صاحب کی زندگی ہی میں اس مزار کو ایک بڑا مرتبہ مل چکا تھا، کیونکہ ناصبی خلیفہ متوکل عباسی کا دور گزر چکا تھا، جس میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی قبر پر آمد و رفت اس کے ظالمانہ رویے کی وجہ سے بند ہو گئی تھی، وہ تو نشے کی حالت میں اپنے ہی ترک غلاموں کے ہاتھوں اپنے نئے شہر و محل جعفری (سامراء) میں قتل ہوا اور اس کی قبر کا بھی کہیں نام و نشان نہیں جب کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی قبور آج بھی مرجع خاص و عام ہیں۔

مزید برآں اگر مشہور انگریز مستشرق Le Strange کی کتاب The Lands of the Eastern Caliphate (کیمبرج ۱۹۰۵ء) جس کا ترجمہ عربی میں ''بلدان الخلافہ الشرقیہ'' کے نام سے عرصہ ہوا ہو چکا ہے، اس میں اور عصر حاضر کے عراقی عالم ڈاکٹر احمد سوسہ کے اٹلس ''العراق فی خوارط العالم القدیمہ'' میں کوفہ، نجف اور حیرہ کو دیکھا جائے تو ایک دوسرے سے اتنے ہی قریب قریب ہیں جیسے آج کراچی میں صدر کے علاقہ سے کورنگی یا ملیریا نارتھ کراچی۔ نجف ایک زمانہ میں کوفہ کا ایک حصہ تھا، اب وہ ایک بڑا اور مستقل شہر ہے، جب کہ کوفہ ایک چھوٹا سا گاؤں ہے۔(۱۲)

یہی نہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا مزار شیعہ حضرات کے نزدیک ہی مقدس و متبرک رہا ہے، اردو دائرہ معارف اسلامیہ پنجاب یونیورسٹی (۲۲) کے مقالہ نگار کے بیان کے مطابق تو پہلے عباسی خلیفۃ السفاح کے چچا داؤد بن علی بن عبداللہ بن عباس نے ۱۳۳ھ میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی قبر پر لکڑی کا ایک صندوق (Cover) رکھوایا اس کے بعد سے قبور نجف و کربلا پر صندوق رکھنے کا سلسلہ چلا آرہا ہے۔ پھر ۳۴۴ھ میں عراق اور عباسی خلافت پر تسلط کے بعد اس کے بعض سلاطین، ملکشاہ اور اس کا بیٹا سلطان سنجر بھی پانچویں صدی ہجری کے اواخر میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے مزار کی زیارت کو آئے اور انہوں نے یہاں تحائف و ہدایا دیئے۔

Marfat.com

اس طویل بحث کے بعد یہ بات واضح ہوگئی کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی قبر کے بارے میں اٹھائے ہوئے شکوک وشبہات بے بنیاد ہیں۔ نجف ہی کوفہ کا وہ علاقہ ہے جس کو قدیم ترین مآخذ میں ظہر الکوفہ کے نام سے یاد کیا گیا ہے اور یہیں حضرت علی رضی اللہ عنہ دفن ہوئے تھے۔ اموی عہد اور متوکل عباسی کے عہد میں یہ قبر اس لیے مخفی رکھی گئی کہ اندیشہ تھا کہ عداوت کی وجہ سے اس کی بے حرمتی نہ کی جائے۔ ۲۶۰ھ سے برابر یہ مزار مرجع خلائق رہا ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی اس قبر مبارک کے سبب ہی نجف ایک شہر بنتا چلا گیا، جب کہ کوفہ تباہی و بربادی کے ادوار سے ایک زمانے میں بالکل ویران ہوگیا تھا اور اب ایک گاؤں ہے۔

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی قبر:

ہم نے شروع میں عرض کیا تھا کہ مولانا تقی عثمانی صاحب دمشق میں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی جس قبر کی زیارت کر کے اور اس پر فاتحہ پڑھ کر خوش ہوئے وہ ان کی نہیں بلکہ قدیم وجدید روایات وتحقیق کے مطابق وہ ایک دوسری جگہ ہے، اب مختصراً اس کی وضاحت ضروری ہے۔

مولانا محمد تقی عثمانی صاحب نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے اس مزار کی زیارت کو بڑے ڈرامائی انداز میں بیان کیا ہے کہ وہ اپنے سیاحتی گائیڈ کے بتانے کے مطابق جامع اموی کے قریبی علاقے میں پیچ در پیچ گلیوں سے گزرتے ہوئے پرانے طرز کے ایک بوسیدہ مکان پر پہنچے، دروازے پر دستک دینے پر ایک عمر رسیدہ خاتون نے جواب دیا، جب ان سے کہا گیا کہ پاکستان سے کچھ حضرات مزار کی زیارت کے لیے آئے ہیں تو خاتون نے جواباً کہا کہ اس کے لیے محکمہ اوقاف سے اجازت نامہ لانا ضروری ہے۔ اس کے بعد جناب مولانا نے یہ انکشاف کیا ہے کہ حکومت نے عام زیارت کے لیے اس کو بند کر رکھا ہے اور وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ بعض روافض یہاں آ کر شرارت اور مزار کی بے حرمتی کا ارتکاب کرتے ہیں۔ (یاد رہے کہ ۱۹۸۶ء میں حضرت مولانا صاحب نے یہ زیارت کی ہے تو اس وقت بھی ''غالی روافض'' کا نمائندہ یعنی نصیری فرقہ کا حافظ الاسد وہاں کا صدر تھا)۔

لیکن جب پاکستانی سفارت خانے کے عنایت صاحب نے سفارش کی اور جناب مولانا کا تعارف کرایا تو خاتون نے اندر جانے کی اجازت دے دی اور پھر اندر مکان میں ''ایک کمرے کے

Marfat.com

اندر جا کر چند قبور دیکھیں جن میں سے ایک قبر حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی بتائی جاتی ہے۔''

اب جناب مولانا کی اس روئیداد زیارت کی مناسبت کے ساتھ انتہائی افسوس کے ساتھ عرض کرنا پڑتا ہے کہ جہاں وہ تشریف لے گئے وہاں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی قبر کا وجود نہیں، بلکہ وہ دمشق کے مشہور قبرستان باب الصغیر میں ہے۔ توضیح ان کی یہ ہے کہ مولانا تقی عثمانی صاحب نے اپنے سفرنامے میں دمشق ہی کے ایک مشہور زمانہ مصنف ذہبی کی کتاب سیر اعلام النبلاء کے حوالے دیئے ہیں۔ جو یقیناً ان کے دارالعلوم کے کتب خانہ میں ہوگی، اگر وہ اس عظیم وضخیم کتاب کی تیسری جلد میں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی سوانح حیات پڑھیں تو صفحہ ۱۶۰ پر نظر آئے گا کہ اس میں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی قبر 'باب الجابیہ اور باب الصغیر' کے مابین بتائی گئی ہے۔ (۲۳)

اور پھر اس کتاب کے شامی محققین نے فٹ نوٹ (نمبر ۳) میں وضاحت کی ہے کہ ''حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ'' کی قبر اب الباب الصغیر کے قبرستان میں داخل ہوگئی ہے جو دمشق کا ایک قبرستان ہے اور وہاں اب تک معروف ہے اور حکومت نے ان آخری برسوں میں اس کی عمارت کی تجدید کر دی ہے۔

علاوہ ازیں امام ذہبی سے کافی قبل مشہور مورخ المسعودی (المتوفی ۳۴۶ھ) نے بھی حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی خلافت کے ذکر کے ضمن میں شروع ہی میں تصریح کی ہے:

ودفن بدمشق بباب كذا الصغير ، وقبره يزار الى هذا الوقت . وهو سنة اثنتين و ثلاثين و ثلثمائة، وعليه بيت بنى يفتح كل يوم اثنين و خميس (۲۴)

یعنی وہ دمشق میں باب الصغیر میں دفن کیے گئے، ان کی قبر کی زیارت آج تک سن ۳۳۲ھ کی جاتی ہے اور ان کی قبر ایک حجرہ میں ہے، جس کا دروازہ ہر پیر اور جمعرات کو کھولا جاتا ہے۔

مسعودی کے تفصیلی قول اور امام ذہبی کے بیان اور سیر اعلام النبلاء کے محققین کی وضاحت کے بعد (جو مولانا تقی عثمانی صاحب کی سیاحت دمشق سے پانچ سال پہلے کی بات ہے، کہ یہ کتاب ۱۹۸۱ء میں چھپ گئی تھی) یہ بات تحقیق سے معلوم ہوگئی کہ دمشق میں جناب مولانا کسی گمنام قبر کو حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی قبر سمجھ کر اس کی زیارت کر آئے اور ان کو اس میں ذرا سا بھی شک وشبہ نہ ہوا۔ جب کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی قبر سے متعلق ایسے مصنف کے حوالے سے جس پر ناصبیت کا الزام

Marfat.com

ہے، شکوک وشبہات پیدا کیے ہیں۔

اس موقع پر مزید وضاحت کے لیے عرض ہے کہ قبرستان الباب الصغیر جامع اموی کے علاقے سے کافی دور دمشق کے مشہور محلہ ''المیدان'' کو جاتے ہوئے اس کی بائیں سمت ہے، جہاں حضرت بلال رضی اللہ عنہ اور دوسرے صحابہ کی قبور ہیں۔ راقم الحروف دمشق یونیورسٹی کے کلیۃ الشریعہ میں اپنی دینی وعربی تعلیم کے سلسلہ میں چار سال اور پھر ایک سال اپنی پہلی عربی کتاب ''العز بن عبدالسلام الدمشقی'' کی تصنیف وطباعت کے سلسلہ میں (ستمبر ۱۹۵۵ء تا اگست ۱۹۶۰ء) مقیم رہا۔ لیکن اس کو جامع اموی کے قرب وجوار میں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی کسی قبر کا پتہ نہیں چلا۔ جب کہ اسی علاقہ میں واقع مشہور کتب خانہ ظاہریہ میں وہ مہینوں کام کرتا رہا ہے اور اس کتب خانے کے اس وقت کے لائبریرین اور عظیم مصنف الاستاد عمر رضا کحالہ مرحوم سے بھی اس کی اکثر ملاقات رہتی تھی، اور برابر میں المجمع العلمی العربی (عرب اکیڈمی) کے ذمہ دار محققین سے بھی، کسی نے بھی حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی اس قبر کے بارے میں اس کی کوئی راہ نمائی نہیں کی۔

استاد معظم جناب مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہ (ہندوستان کے مولانا علی میاں صاحب) بھی ۱۹۵۰ء اور ۱۹۵۶ء میں دوبارہ دمشق گئے اور دوسری بار وہاں دو ماہ سے زائد مقیم رہے۔ انہوں نے اپنا سفرنامہ ''مذاکرات سائح فی الشرق العربی'' کے نام سے شائع کیا جس کا اردو ترجمہ ہو چکا ہے۔ اس میں بھی کہیں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی اس قبر کا ذکر نہیں۔

آخر میں عرض ہے کہ راقم الحروف خطیب بغدادی اور مولانا تقی عثمانی دونوں صاحبان کے علم کا معترف اور قدردان ہے۔ خطیب کی نہ صرف تاریخ بغداد بلکہ علوم حدیث کے موضوع پر ''الکفایہ فی علم الروایہ'' اور ''تقیید العلم'' بے نظیر کتابیں ہیں۔

Marfat.com

حوالہ جات

۱۔ مولانا محمد تقی عثمانی، جہاں دیدہ، ص ۴۳،۴۷۔ طبع ۱۹۹۴ء کراچی۔

۲۔ خلیفہ بن خیاط۔ تاریخ خلیفہ ابن خیاط، ص ۲۱۹۔ طبع بیروت۔

۳۔ وفیات الاعیان ۵/۴۱۳۔

۴۔ ذہبی، سیر اعلام النبلاء، ج ۱۸۔ ص ۲۸۲، موسستہ الرسالۃ بیروت، نیز یاقوت، معجم الادباء، ج ۱۔ ص ۲۵۶، المطبعۃ الہندیہ، مصر۔

۵۔ ابن خلکان، وفیات الاعیان، ج ۵۔ ص ۵۱۳، تحقیق احسان عباس، دارالثقافہ بیروت۔

۶۔ ذہبی، سیر اعلام النبلاء، ج ۱۲۔ ص ۵۰۷، موسستہ الرسالۃ، بیروت۔

۷۔ ابن سعد، طبقات ابن سعد، ج ۲۔ ص ۳۸، طبع بیروت۔

۸۔ ذہبی، تذکرۃ الحفاظ، ج ۳۔ ص ۱۱۴۲، طبع حیدر آباد۔

۹۔ ابن کثیر، البدایہ والنہایہ، ج ۷۔ ص ۳۲۹، دارالفکر بیروت۔

۱۰۔ مسلم، مقدمہ صحیح مسلم۔

۱۱۔ ابن سعد، طبقات ابن سعد، ج ۲۔ ص ۳۸، طبع بیروت۔

۱۲۔ ابن عبدالبر، الاستیعاب، ص ۳۱۳، حاشیہ الاصابہ، دارالاحیاء التراث العربی بیروت۔

۱۲ (الف) ان حجر، الاصابہ، ج ۳۔ ص ۳۲۳۔

۱۳۔ بلاذری، فتوح البلدان، ص ۳۵۱، طبع مکتبہ النہضہ العربیہ، القاہرہ۔

۱۴۔ ایضاً

۱۵۔ ایضاً

Marfat.com

۱۶۔ یاقوت، معجم البلدان، ج ۵۔ ص ۲۷۱، زیر مادہ ''نجف''۔

۱۷۔ ایضاً

۱۸۔ ابوالفرج الاصفہانی، الاغانی، ج ۵۔ ص ۳۶۰ طبع، دارالکتب العلمیہ بیروت۔

۱۹۔ ابن حوقل، صورۃ الارض، باب ذکر الکوفہ، ص ۲۱۵ طبع دار مکتبہ الاحیاء بیروت۔

۲۰۔ اردو دائرہ معارف اسلامیہ۔ زیر مقالہ ''نجف''۔

۲۱۔ بلدان الخلافہ الشرقیہ، ص ۴۰، موسسۃ الرسالۃ، بیروت۔

۲۲۔ اردو دائرہ معارف اسلامیہ، ج ۲۲۔ ص ۱۳۹، پنجاب یونیورسٹی لاہور۔

۲۳۔ ذہبی، سیر اعلام النبلاء۔ ج ۳۔ ص ۱۶۰، موسسۃ الرسالۃ، بیروت۔

۲۴۔ المسعودی، مروج الذہب، جلد ۳، ص ۱۱، طبع القاہرہ، بتحقیق الشیخ محمد محی الدین عبدالحمید، طبعۃ رابعۃ ۱۹۶۴ء۔

Marfat.com

سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کا قرآن کہاں ہے؟

محترم جناب عبدالقادر حسن صاحب نے اپنے ۱۶ اگست کے کالم میں ''مصحف عثمان رضی اللہ عنہ'' کو اپنا موضوع بنایا ہے۔ یعنی قرآن کریم کا وہ ذاتی نسخہ جس کو سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ اپنی شہادت کے وقت تلاوت فرما رہے تھے اور جس کے اس صفحہ پر جس میں آیت کریمہ: فسیکفیکھم اللہ وھو السمیع العلیم'' (سورۃ البقرہ آیت ۱۳۷) ہے، اس پر سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کے خون کے چھینٹے ہیں۔ جو ظالم قاتل کے وار کے نتیجہ میں اس آیت پر بکھر گیا تھا۔

قرآن کریم کا نام خلفائے راشدین کے عہد میں مصحف ہے کہ یہ صفحات پر لکھا ہوا مجلد شکل میں تھا اور عرب آج بھی قرآن کو مصحف کہتے ہیں۔ محترم کالم نگار صاحب نے اپنے تاشقند کے سفر میں شہر کی جامع مسجد میں جس ایک قدیم نسخۂ قرآن کی زیارت کی اس کو انہوں نے بعض دیگر سیاحوں کی طرح ''مصحف عثمان'' قرار دیا ہے، تاشقند میں اس کے پہنچنے کی جو مختصر تاریخ بیان کی ہے، تقریباً یہی بلکہ کسی قدر تفصیل سے کوثر نیازی مرحوم بھی اپنے سفرنامہ تاشقند و سمرقند وغیرہ میں لکھ چکے ہیں، جو پہلے جنگ میں چھپا تھا اور پھر ''کوہ قاف کی پریوں کے دیس میں'' کے عنوان سے کتابی شکل میں چھپا ہے۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کے تاشقند میں موجود ہونے کی یہ تاریخی تفاصیل کسی سرکاری سیاحتی کتابچے میں درج ہیں، جن کو تاشقند کے سیاح صحیح سمجھتے ہوئے اپنے سفرناموں میں نقل کر دیتے ہیں اور وہ یہ معلومات ہیں جو سوویت روس کے عہد سے نقل ہوتے چلے آ رہے ہیں۔

جناب عبدالقادر صاحب نے بڑی عقیدت کے ساتھ اس قرآن کریم کی زیارت کا ذکر کیا ہے اور یہ ان کے الفاظ میں ایک ایسی سرمایہ افتخار سعادت تھی جس میں وہ حامد ناصر چٹھہ اور دیگر سربراہان مملکت کی طرح شریک ہوئے۔ اب اگر یہ ثابت ہو جائے کہ درحقیقت یہ وہ ''مصحف عثمان'' نہیں ہے، جو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا ذاتی نسخہ قرآن تھا اور جس کے ایک صفحے پر وقت

Marfat.com

شہادت ان کے خون کے قطرات کے دھبے پائے جاتے ہیں، تو شاید ان کو صدمہ ہو، مگر کیا کیا جائے حقیقت کچھ اور ہے، جو تحقیق سے پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی ہے۔ مگر چونکہ سیاحوں کو خواہ وہ سربراہان مملکت و صحافی حضرات ہی کیوں نہ ہوں تحقیق کی کھکاوی سے کوئی دلچسپی نہیں ہوتی، اس لیے سرکاری گائیڈ اور سرکاری سیاحتی کتابچہ جو کچھ بتاتا ہے اس کو وہ خوش عقیدگی کے ساتھ قبول کر لیتے ہیں۔ پاکستان میں بعض مشہور مزاروں کے ساتھ بھی یہی معاملہ ہے۔ (ملاحظہ ہو، راقم الحروف کی تحقیق عبداللہ شاہ غازی کے مزار سے متعلق ہفتہ وار تکبیر، شمارہ ۱۵ جون ۹۵ء)

محترم کالم نگار نے لکھا ہے: ''کلام مجید کا نسخہ اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی خون آلود قمیص ان کے نام لینے والے عباسی خلفاء کی متاع عزیز تھی اور ان کے پاس محفوظ تھی، وسط ایشیا کے فاتح بادشاہ امیر تیمور نے جب بغداد فتح کیا تو وہ قرآن پاک کا یہ نسخہ اپنے ساتھ سمرقند لے آیا'' اور ان کے ہی الفاظ میں ''کلام مجید کا یہ نسخہ سب سے قیمتی اور بے مثال تحفہ تھا'' جو اس نے اہل سمرقند کی زیارت کے لیے ایک مدرسے میں محفوظ کر دیا۔''

عبدالقادر حسن صاحب سے سہو ہوا ہے، جہاں تک حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خون آلود قمیص کا تعلق ہے تو یہ عباسی خلفاء نہیں بلکہ اموی خلفاء کی متاع عزیز تھی کہ امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے اسی خون آلود قمیص کو جو انہیں مدینہ منورہ سے بھیجا گیا تھا دمشق کی جامع مسجد میں لٹکا کر شامیوں کو قاتلین سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ سے بدلہ لینے کے لیے بھڑکایا تھا اور پھر اس کا رخ سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی طرف مڑ گیا تھا جو حضرت عباس رضی اللہ عنہ بن عبدالمطلب کے بھتیجے تھے اور وہ اور بنو عباس دونوں بنی ہاشم میں سے تھے، سو عباسیوں کے لیے یہ قمیص کوئی متاع عزیز نہ تھی اور در حقیقت اس قمیص کا امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے عہد کے بعد کہیں ذکر نہیں ملتا، بہر حال یہ ہمارا موضوع نہیں۔

جہاں تک مصحف عثمان رضی اللہ عنہ کا تعلق ہے، تو وہ بیشک خلیفۂ راشد سویم کا ذاتی سرکاری نسخہ تھا، اور ان چھ نسخوں میں سے ایک نسخہ تھا جو سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ نے اس مصحف (قرآن) کے مطابق تیار کرائے تھے جو سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ کے عہد میں کتابت کرایا گیا تھا اور جو بعد کو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس تھا اور ان کی وفات کے بعد ام المومنین حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کے پاس محفوظ تھا اور انہی سے طلب کر کے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اس کے مطابق چھ نسخے کتابت کرا کے اہم اور بڑے اسلامی

Marfat.com

شہروں جیسے مکہ مکرمہ، بصرہ، کوفہ، دمشق وغیرہ دیئے تھے اور ایک نسخہ اپنے پاس محفوظ رکھا تھا، اس کو ''المصحف الامام'' بھی کہتے تھے اور یہی نسخہ خلفائے بنی امیہ اور خلفائے بنی عباس کے پاس ایک ''متاع عزیز'' کی حیثیت سے محفوظ تھا، جس طرح تبرکات نبوی یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا بردہ مبارک (جبہ) عصائے مبارک اور وہ انگوٹھی (خاتم) جو حضرت عثمان نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اس انگوٹھی کے عین مطابق بنوائی تھی جو خلافت کی نشانی تھی ''محمد رسول اللہ'' کندہ تھا اور اس کو خاتم خلافت (خلافت کی انگوٹھی) کہا جاتا تھا۔

ہلاکو کے ہاتھوں بغداد کی تباہی اور عباسی خلیفہ المعتصم کے قتل کے بعد اس کے خاندان کے ایک فرد احمد بن الظاہر کے بغداد سے مصر فرار کے وقت یہ تبرکات نبوی اور مصحف عثمان رضی اللہ عنہ مصر پہنچا، مصر میں وہاں کے مملوک بادشاہ الظاہر بیبرس نے تحقیق کے بعد قضاۃ وعلماء واعیان مملکت کے ایک بڑے جلسے میں ان کو عباسی خلیفہ تسلیم کیا اور ان کا لقب المستنصر (دوئم) قرار پایا۔ پھر ان کے خاندان میں تقریباً تین سو سال تک مصر میں صرف نام کی عباسی خلافت قائم رہی، جب کہ اصل حکمران لوگ ممالیک تھے، عثمانی اتراک نے جب ۱۵۱۷ء میں مصر پر قبضہ کیا تو کچھ دنوں تو یہ نام کی عباسی خلافت قائم رہی، لیکن بعد کو پھر یہ عثمانی سلاطین کو منتقل ہو گئی، مشہور ہے کہ یہ سلطان سلیم اول کے عہد میں ہوا لیکن محقق مورخین کے نزدیک یہ واقعہ سلطان سلیمان قانونی کے عہد میں ظہور پذیر ہوا، خلافت کی اس منتقلی کے بعد وہ تبرکات نبوی اور مصحف عثمان رضی اللہ عنہ جو آخری عباسی خلیفہ (مقیم مصر) المتوکل کے پاس محفوظ تھے، وہ سب سلطان سلیمان کو ملے، اور عثمانی سلطان نے ان تبرکات نبوی اور مصحف عثمان رضی اللہ عنہ کو انتہائی حفاظت کے ساتھ اپنے محل کے اندرونی حصہ میں ایک خاص کمرے میں رکھا اور اس کی حفاظت کے لیے چالیس فوجی افسر مامور تھے، اور ان چالیس میں خود عثمانی سلطان ایک تھا۔

یہ تبرکات نبوی اور مصحف عثمان رضی اللہ عنہ آج بھی عثمانی سلاطین کے قدیم محل توپ کاپی سرائے (توپ محل) میں محفوظ ہیں، جو اب استنبول کا سب سے اہم میوزیم ہے، اور جہاں علیحدہ سے ایک کمرے میں بلٹ پروف شیشے کے ایک صندوق میں مصحف عثمان رضی اللہ عنہ زائرین کے لیے موجود ہے، اور اس کا وہ صفحہ کھلا ہوا ہے، جس پر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خون کے قطرے اسی آیت پر نمایاں ہیں جس کا ذکر میں نے اوپر کیا، میں نے اس مصحف عثمان رضی اللہ عنہ کی زیارت استنبول کی اپنی دوسری

Marfat.com

سیاحت (۱۹۷۲ء) میں کی تھی، سن ۱۹۶۰ء میں پہلی سیاحت کے موقع پر جنرل جمال گورسل کے تازہ فوجی انقلاب کے سبب یہ میوزیم بند تھا۔

اب اس طرح ہمارے سامنے دو ایسے مصاحف ہیں، جن کے بارے میں دعویٰ کیا جاتا ہے کہ ان میں سے ہر ایک وہی مصحف عثمان رضی اللہ عنہ ہے جو شہادت کے وقت ان کے سامنے کھلا ہوا تھا اور وہ اس میں تلاوت فرما رہے تھے۔ اب سوال یہ ہے کہ ان دونوں میں سے کون سا اصلی مصحف عثمان رضی اللہ عنہ ہے؟ تاشقند کے علاوہ جو پاکستانی بھی استنبول میں توپ کاپی سرائے میوزیم گئے ہوں گے، انہوں نے حرم سرا کے اس کمرے میں یہ مصحف عثمان رضی اللہ عنہ اس طرح دیکھا ہوگا جیسے میں نے دیکھا تھا، اگر ان کو واقعی اس کا خیال اور شوق ہو۔

میں نے مصحف عثمان رضی اللہ عنہ کی تاریخ اور اس کے استنبول پہنچنے کی تاریخ ذکر کر دی ہے، اس کا ذکر ترکی اور عرب تواریخ میں ملتا ہے۔ بیسویں صدی کے ربع اول کے انتہائی مایۂ ناز مصری مورخ و محقق علامہ احمد تیمور پاشا نے استنبول میں موجود تبرکات نبوی اور تبرکات خلفائے راشدین پر عربی زبان میں ایک محققانہ کتاب ''الآثار النبویہ'' لکھی ہے۔ اس میں انہوں نے اس مصحف عثمان رضی اللہ عنہ سے بحث کی ہے۔ ان کی تحقیق کے مطابق اس ''مصحف عثمان رضی اللہ عنہ'' کی نسبت حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی طرف صحیح ہے۔ اور اس طرح وہ مصحف جو تاشقند میں اس نام سے موجود ہے، اس کو مصحف عثمان نہیں کہا جا سکتا۔

اب جہاں تک اس تاشقند میں موجود مصحف کی تاریخ کا تعلق ہے اور یہ کہ اس کو تیمور لنگ بغداد کی فتح کے وقت اپنے ساتھ سمرقند لے گیا تھا، تو یہ تاریخی طور پر انتہائی مشکوک اور نا قابل قبول ہے، کیونکہ اگر ایسا ہوتا تو تیمور اپنی تزک تیموری میں اس کا ضرور ذکر کرتا، لیکن اس میں اس ''متاع عزیز'' کے حصول کا کہیں ذکر نہیں۔ پھر یہ کہ دمشق کی فتح کے بعد امیر تیمور وہاں کے ایک مشہور عالم و مورخ ابن عربشاہ کو اپنے ساتھ سمرقند لے گیا تھا، جیسا کہ اس کا دستور تھا کہ اپنے پایہ تخت کی شان و شوکت بڑھانے کے لیے مفتوحہ علاقوں سے علماء، حکماء، شعراء اور ماہرین تعمیرات کو سمرقند لے جاتا تھا، ابن عربشاہ نے وطن سے دور اس جبری اقامت میں کئی سال گزارے، اور تیمور کی وفات کے بعد اپنے وطن دمشق واپس آیا جہاں اس نے تیمور کی زندگی پر ایک مفصل کتاب ''عجائب الدھور

Marfat.com

فی وقائع تیمور ''کے نام سے لکھی۔اگر تیمور لنگ اپنے ساتھ یہ مصحف عثمان رضی اللہ عنہ بغداد لے گیا ہوتا اور اس نے سمرقند کے کسی مدرسہ میں اسے عام پبلک کو دکھانے کے لیے رکھا ہوتا تو ابن عربشاہ اپنی اس کتاب میں ضرور ذکر کرتا جو راقم الحروف کے مطالعہ میں رہی ہے۔

پھر یہ کہ ہلاکو کے ہاتھوں بغداد کی تاراجی کے تقریباً ڈیڑھ سو سال بعد تیمور بغداد پر حملہ آور ہوا تھا، اس وقت وہاں جلایری خاندان کے ایک حکمران سلطان احمد جلایری کی حکومت تھی، اور بغداد اپنی قدیم عظمت کبھی کا کھو چکا تھا، اس عہد کے مورخین وہاں مصحف عثمان رضی اللہ عنہ کے وجود کا ذکر نہیں کرتے۔

سو تاریخی شہادت وقرآن کے مطابق ''مصحف عثمان رضی اللہ عنہ'' وہ ہے جو استنبول کے توپ کاپی میوزیم میں محفوظ ہے۔ مجھے معلوم نہیں کہ عبدالقادر حسن صاحب استبول گئے ہیں کہ نہیں؟ اور اگر کبھی گئے ہیں تو انہوں نے توپ کاپی سرائے میوزیم کے اس حصہ کی زیارت کی ہے جہاں تبرکات نبوی اور ''مصحف عثمان'' بلٹ پروف شیشے کے ایک کیس میں رکھا ہوا ہے، اور اس کا وہی صفحہ کھلا ہوا ہے جو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے لہو سے خون آلود ہے۔

اب جہاں تک تاشقند (قدیم اسلامی نام شاش، اور جس کے نام پر وہاں کے ایک عالم کی اصول فقہ میں مشہور کتاب اصول الشاشی ہے) کے مصحف عثمان رضی اللہ عنہ کا تعلق ہے تو راقم الحروف کے خیال میں وہ ان چھ مصاحف عثمان میں سے ایک ہوسکتا ہے جن کا ذکر میں نے اوپر کیا ہے اور وہ غالباً حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے چچازاد بھائی قثم ابن عباس رضی اللہ عنہ کے ذریعہ وہاں پہنچا، اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ حضرت قثم ابن عباس، سیدنا علی کرم اللہ وجہہ کے زمانہ خلافت میں مکہ کے والی (گورنر) تھے، پھر امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے عہد میں وہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے صاحبزادے سعید ابن عثمان رضی اللہ عنہ کے ساتھ سن ۵۶ھ میں خراسان (شمال مشرقی ایران) آئے اور جب گورنر خراسان سعید بن عثمان رضی اللہ عنہ نے پہلی بار دریائے جیحون (موجودہ آمو) کو عبور کر کے اس علاقہ ماوراء النہر پر حملہ کیا اور بخارا فتح کیا تو اس حملے میں حضرت قثم ابن عباس رضی اللہ عنہ بھی ان کے ساتھ شریک تھے، بخارا تو بآسانی بذریعہ صلح فتح ہوگیا جہاں اس وقت ایک ترک خاتون حکمران تھی، جس کو قدیم عرب مورخین صرف ''خاتون'' کے لقب سے یاد کرتے ہیں، لیکن سمرقند کی فتح میں امیر سعید بن عثمان رضی اللہ عنہ کو سخت مقاومت کا سامنا کرنا پڑا تھا اور اس کی فتح میں حضرت قثم بن عباس رضی اللہ عنہ

Marfat.com

سن ۵۶ھ میں شہید ہو گئے تھے، اور وہاں ان کی قبر مبارک ''شاہ زندہ'' کے نام سے مشہور ہے۔ بعد کے زمانے میں اس پر گنبد بنا دیا گیا، اور اس قبر کے قریب امراء اور بادشاہ دفن ہوئے، مختلف حکمرانوں نے یہاں مساجد و مدارس قائم کیے اور اب یہ پورا محلّہ ''شاہ زندہ'' کے نام سے مشہور ہے۔

سمرقند میں حضرت قثم کی شہادت کا ذکر قدیم مورخ بلاذری نے اپنی کتاب فتوح البلدان میں کیا ہے، میرا ذاتی خیال ہے کہ حضرت قثم مکہ مکرمہ والے مصحف عثمان رضی اللہ عنہ کو اپنے ساتھ خراسان لے گئے تھے، ان کی شہادت کے بعد وہ مصحف وہاں کے اموی اور عباسی گورنروں کے پاس رہا، اور پھر جب ان کی قبر کے قرب میں مسجد و مدرسہ تعمیر کیا گیا تو اس میں اس کو محفوظ کر دیا گیا، اور بعد کے زمانے میں اس کو مزید امتیاز و تقدس دینے کے لیے اس پر خون کے چھینٹے ڈال دیے گئے، تاکہ کہا جا سکے کہ یہی وہ مصحف عثمان رضی اللہ عنہ ہے جس کو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اپنی شہادت کے وقت پڑھ رہے تھے۔

کوئی شک نہیں کہ سمرقند کی اس پہلی فتح کے بعد جو کافی لڑائی کے بعد بطریقہ صلح ہوئی تھی، وہاں کے حکمرانوں نے صلح کی خلاف ورزی کی، یہاں تک مشہور مسلمان فاتح قتیبہ بن مسلم نے سن ۹۰ھ اور ۹۳ھ کے درمیان ماوراء النہر کے ایک ایک شہر کو بزور فتح کیا اور سمرقند کی فتح میں دونوں طرف سے بہت خوں ریزی ہوئی، لیکن اس عظیم فاتح کی کامیاب مہم کے بعد پھر ماوراء النہر یعنی موجودہ ازبکستان، ترکمانستان اور تاجکستان وغیرہ ہمیشہ کے لیے اسلامی علاقہ بن گیا، اور قتیبہ بن مسلم نے سمرقند میں پہلی بڑی مسجد تعمیر کی اور بہت ممکن ہے کہ یہ مسجد اسی علاقہ میں ہو جہاں حضرت قثم کی قبر تھی اور وہیں کہیں سامانی عہد یعنی تیسری صدی ہجری میں مدرسہ و مسجد قائم کیا گیا ہو جس میں ان کے لائے ہوئے مصحف عثمان رضی اللہ عنہ کو محفوظ کر دیا گیا، اور پھر سوویت روس کے عہد میں اس کو مرکزی شہر تاشقند میں منتقل کر دیا گیا ہو۔

Marfat.com

عمران خان کی شادی اور لغت کے بکھیڑے

عمران خان نے جس طرح اپنی کرکٹ سے ساری دنیا میں دھوم مچائی تھی اسی طرح انہوں نے اب انگلستان کے ایک خاندانی، انتہائی صاحب ثروت اور نوجوان وذہین خاتون سے شادی کر کے سارے عالم میں دھوم مچادی ہے، جب سے جمائما عرف حائقہ سے پیرس کے اسلامک سینٹر میں ان کے نکاح کا اعلان دو ہفتے قبل ہوا ہے، اس وقت ان کی شادی اور ان کی نئی نویلی بیوی دنیا کے اخبارات ورسائل اور محافل ومجالس کا موضوع سخن بنی ہوئی ہے۔

راقم الحروف نے اس میں کوئی دلچسپی نہیں لی کہ شادیاں آئے دن ہوتی رہتی ہیں، اور عمران خان کی شادی خواہ وہ کسی نومسلم مغربی خاتون سے ہی کیوں نہ ہو اس میں کوئی اچنبھے کی بات نہیں۔ میرے لیے اور عمران خان کے بہت سے حقیقی قدردانوں کے لیے ان کا بڑا کارنامہ تو ان کا قائم کردہ کینسر کا وہ انتہائی اعلیٰ معیار کا ہسپتال ہے جو انہوں نے کرکٹ سے ریٹائرمنٹ کے بعد چار پانچ سال کی شب وروز کی محنت ولگن اور پاکستانیوں کے تعاون سے ساٹھ پینسٹھ کروڑ روپے کی لاگت سے تعمیر کیا اور جس میں غریبوں کے علاج کا خاص طور پر خیال رکھا گیا ہے یہ ایک کارنامہ ہے اور اس جیسا ہسپتال کوئی وڈیرہ، جاگیردار اور سردار تو کیا پاکستان کی موجودہ حکومت، جو عوام کی خدمت کے دعوے کرتی ہے، وہ بھی قائم نہ کرسکی۔ یہی نہیں بنظیر حکومت نے تو حسد سے کام لیتے ہوئے عمران خان کو ٹی وی پر زکوٰۃ کی رقوم کی اپیل کرنے سے بھی منع کردیا۔

میرے نزدیک ان کا دوسرا کارنامہ ان کا وہ ذہنی وفکری اسلامی انقلاب تھا جو گزشتہ سال ڈیڑھ سال کے اندر رونما ہوا ہے اور جس کا اظہار ان متعدد مضامین میں ہوا جو ان کے قلم سے پاکستان کے مختلف اخبارات میں چھپے۔ پاکستان کے جاگیردارانہ اور مغربی نظام تعلیم اور مغربی اقدار پر ان کے پے در پے حملوں نے ملک کے لادین اور جاگیردارانہ عناصر کو چراغ پا کیا، صلیبی مغربی پریس کو بھی اپنی بھڑاس نکالنے کا موقع مل گیا، اور اب ان کی ایک نومسلم انگریز خاتون سے

Marfat.com

شادی پر ان لادین اور جاگیردارانہ عناصر اور حکومتی کارندوں کو ان کے خلاف ہرزہ سرائی کا موقع مل گیا، جس کا مدلل جواب انہوں نے جنگ کی ۲۸ مئی ۱۹۹۵ء کی اشاعت میں دے دیا ہے۔

میں نے عرض کیا کہ میرے لیے ان کی شادی کی خبر کسی خاص دلچسپی کا باعث نہ تھی لیکن ۲۷ مئی کی جنگ کی اشاعت میں اس شادی پر مجیب الرحمٰن شامی صاحب کا کالم بعنوان ''یہودی سازش'' اور اس میں بھی خاص طور پر عمران خان کی بیوی کے اسلامی نام ''حائقہ'' کی وہ معنوی توجیہ تھی جو موصوف نے اپنے اس کالم میں پیش کی ہے اور یہ لغوی مسئلہ میری اس تحریر کا محرک ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ ہمارے اس مایۂ ناز سابق کرکٹر کی بیوی کا نام دو طریقوں سے اخبارات میں چھپتا رہا، جنگ میں تو بار بار ''حقہ'' ہی چھپا، ڈان میں ''حائقہ'' اور ''حقہ'' دونوں طرح (روزنامہ ڈان جمعہ ۲۶ مئی میگزین سیکشن) یہ ایک عجیب کنفیوژن تھا، لیکن میں نے اس طرف بھی کوئی خاص توجہ نہیں دی، لیکن چھ سات روز قبل روزنامہ ڈان سے میرے ایک محترم اور ذی علم دوست کا ٹیلیفون آیا جو اسی نام کے سلسلہ میں تھا موصوف کا استفسار یہ تھا کہ ۷ امئی کے نوائے وقت (سرورق) میں انہوں نے عمران خان کا اپنا بیان پڑھا ہے جس میں تحریر ہے کہ انہوں نے اور ان کی بیوی نے قرآن میں دیکھ کر یا اس کا ایک ورق کھولنے پر ان کو جو پہلا لفظ پہلی سطر میں نظر آیا اسی پر انہوں نے یہ نام (یعنی حائقہ) رکھا ہے۔ میرے دوست یہ جاننا چاہتے تھے کہ کیا یہ لفظ اسی طرح قرآن کریم میں ہے؟ اور ہے تو اس کے کیا معنی ہیں؟

میرا جواب تھا کہ ''حائقہ'' قرآن میں کہیں نہیں آیا ہے اور اس کے معنی بھی اچھے نہیں ہیں کہ اس سے متعلق فعل (Verb) عذاب الٰہی میں مبتلا کرنے کے لیے واقع ہوا ہے۔ ساتھ ہی میں نے اپنے ان دوست سے کہا کہ مجھے خیال ہوتا ہے کہ عمران خان نے قرآن کے انتیسویں پارے میں سورۃ ''الحاقۃ'' کا یہ پہلا لفظ دیکھا ہوگا، جس پر انہوں نے اپنی بیوی کا نام رکھ لیا۔ اور جو بگڑ کر ''حائقہ'' ہو گیا، یا اس کو حقہ لکھا گیا، اس کے بعد اب جو میں نے قرآن کھول کر دیکھا جو عبداللہ یوسف علی کے انگریزی ترجمہ کے ساتھ چھپا ہے تو دیکھا کہ یہ ایک مستقل آیت ہے اور اس سورۃ کے نام کے مقابل انگریزی میں اس کا نام یوں چھپا ہے HAQQA the sure reality (قابل ذکر بات یہ ہے کہ HAQQA کے پہلے a کے اوپر انگریزی میں

Marfat.com

transliteration کے اصول کے مطابق ایک ڈیش لگا ہوا ہے جو الف کے اظہار کے لیے ہے تا کہ ''حائقہ'' پڑھا جائے، ورنہ یہ ''حقہ'' پڑھا جائے گا، عام انگریزی ٹائپ میں ڈیش کے ساتھ والا یہ حرف ''a'' نہیں پایا جاتا ہے جب کہ اسلام پر مستشرقین اور مسلمان مولفین (اسکالرز) کی کتابوں میں اس کا استعمال بہت عام ہے۔

بہر حال اس لفظ ''حـاقۃ'' کو اگر عام انگریزی ٹائپ میں چھاپا جائے تو HAQQA ہی ہو گا، جس کو اگر اردو میں منتقل کیا جائے تو ''حقہ'' ہو گا۔ اب پتہ نہیں کہ عمران خان نے اس کو ''حائقہ'' کس طرح بنا دیا؟

میرے اس گمان کی تصدیق کہ عمران خان نے قرآن کے ایک صفحہ پر جو پہلا لفظ دیکھا وہ سورۃ الحاقۃ کا لفظ ''الحـاقۃ'' تھا۔ اس بات سے بھی ہوتی ہے کہ انہوں نے اپنے سابقہ بیان میں عبداللہ یوسف علی کے ترجمہ قرآن کا ذکر کیا ہے۔ (جو غالباً عجلت میں مولانا یوسف چھپا ہے) اور ان مرحوم مترجم صاحب نے انگریزی میں اس لفظ کے جو معنی لکھے ہیں یعنی Sure Reality وہ ایک عمدہ لغوی معنی ہے جس کی بناء پر عمران خان نے اپنی بیوی کا نام اس لفظ پر لکھا، لیکن پھر بھی یہی سوال باقی رہتا ہے کہ عمران خان نے حاقہ کو حائقہ Haiqa کس طرح کر دیا؟

اب مجیب الرحمٰن شامی صاحب کے مذکورہ کالم سے معلوم ہوا کہ اس نام پر بھی اس مشہور زمانہ شادی کے دوسرے پہلوؤں کی طرح اخبارات میں بحث چھڑی ہے اور انہوں نے اس کی ایک اور ہی توجیہ پیش کی ہے، اسی بناء پر میں نے اپنی اس تحریر کا نام ''عمران خان کی شادی اور لغت کے بکھیڑے'' رکھا ہے جو ایسا بے جا نہیں، اس کا عنوان ''عمران خان کی بیوی کا نام اور لغت کے بکھیڑے'' بھی ہو سکتا تھا مگر میں نے اس غیر ملکی نومسلم خاتون کو اس میں الجھانا پسند نہیں کیا کہ نام کا یہ انتخاب عمران خان کا ہی معلوم ہوتا ہے۔

اس سے پہلے کہ میں جناب شامی صاحب کی اس عجیب وغریب توجیہ پر بحث کروں جو لفظ ''حائقہ'' کی انہوں نے پیش کی ہے یہ عرض کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ہر چند کہ حائقہ کے معنی انگریزی میں اکثر مترجمین نے Reality یا Sure Reality کے دیئے ہیں لیکن اس کا مفہوم ''قیامت'' ہے جو عبداللہ یوسف علی نے اپنے فٹ نوٹ میں دے دیا ہے، پھر اس میں بھی

Marfat.com

کوئی شک نہیں کہ اس لفظ کا مادہ (Rott Word) ''حق'' ہی ہے اور ''حقیقت'' کا لفظ بھی اس سے ہے اور جن عرب یا اردو میں لکھنے والے مفسرین نے لفظی ترجمہ کیا ہے، انہوں نے اس کا ترجمہ ''ہونی شدنی'' (مولانا مودودی) یا ''ثابت ہو چکنے والی بات'' (شیخ الہند مولانا محمود الحسن) کیا ہے لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ بعض دوسری مفسرین جیسے ابن کثیر نے اس کے معنی قیامت کے لکھے ہیں اور عربی زبان کی سب سے مستند اور ضخیم لغت ''لسان العرب'' میں اس کے لغوی معنی ''مصیبت'' کے دیئے ہیں، اور سورۃ الحاقۃ کی مذکورۃ آیتوں کے حوالے سے اس کے معنی قیامت کے دیئے ہیں اور اس کی توجیہ یہ بیان کی ہے کہ قیامت کے لیے یہ لفظ اس کے اختیار کیا گیا ہے کہ اس روز خیر وشر کی حقیقت معلوم ہو جائے گی اور اس کا حقیقی بدلہ ثواب وعذاب کی صورت میں مل جائے گا (ملاحظہ ہو جلد ۱۰ صفحہ ۵۴)۔

پھر یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ قرآن کریم نے قیامت کے لیے جو مختلف الفاظ اختیار کئے ہیں الواقعۃ، القارعۃ، ان ہی میں سے ایک ''الحاقۃ'' بھی ہے سو ہر چند کہ اس کے لغوی معنی ''حقیقت'' ہوں لیکن اسلامی اصطلاحی معنی قیامت ہی ہیں۔

اگر عمران خان نے واقعی یہ لفظ دیکھ کر اپنی بیوی کا نام رکھا ہے یا موصوفہ نے خود اسے پسند کیا ہے تو انہوں نے اس کے اصطلاحی قرآنی معنی پر توجہ نہیں دی۔ یا بالفاظ دیگر اس کے مفہوم پر توجہ نہیں دی، ہاں اگر یہ نام ''حق'' سے ''حقہ'' ہو تو درست ہے کہ وہ لفظ حق کی طرح ایک مصدر ہے جس کے معنی ''حق'' ہی کے ہیں، عربی لغات میں اس کے معنی ''حقیقۃ الامر'' کے بھی دیئے گئے ہیں۔

لیکن افسوس کہ لغت کا یہ بکھیڑا یہیں ختم نہیں ہو جاتا، مجیب الرحمٰن شامی صاحب نے اپنے تازہ ترین مذکورہ کالم میں عمران خان کی بیوی کا نام ''حائقہ'' لکھ کر ہمارے مذکورہ بالا گمان کی نفی کر دی ہے اور اس کی جو انہوں نے لغوی تشریح فرمائی ہے اس سے بھی اس نفی کی تصدیق ہوتی ہے کہ اس نام کا ''حق'' یا حاقۃ'' سے کوئی تعلق نہیں۔ عمران خان نے اپنی شادی خانہ آبادی سے متعلق جو کالم جنگ کی اشاعت ۲۸ مئی میں بعنوان ''میرا جرم کیا ہے'' سپرد قلم کیا ہے اس میں انہوں نے دوبارہ اپنی بیوی کا نام حائقہ لکھا ہے جو ان کے اس بیان (نوائے وقت ۱۷ مئی) سے متصادم ہے،

Marfat.com

جس میں انہوں نے کہا ہے کہ میں نے اور میری بیوی نے قرآن کا ایک صفحہ کھولنے پر جو پہلا لفظ نظر آیا اس پر یہ نام رکھا ہے اور ہم کہہ چکے ہیں کہ قرآن میں کہیں "حائقہ" نہیں آیا ہے اب صورت حال یہ ہے:

تو نے سلجھ کر گیسوئے جاناں
اور بڑھا دی دل کی الجھن

دل نہ سہی تو دماغ کی الجھن تو بہت سوں کی بڑھ ہی گئی ہوگی کہ عمران خان نے آخر اپنی بیوی کا یہ عجیب وغریب نام کیوں رکھا ہے جس پر بعض لوگ اعتراض کر رہے ہیں اور شامی صاحب کو اس کی "لطیف توجیہ" پیش کرنا پڑ رہی ہے۔

مجیب الرحمٰن شامی صاحب اپنے اس مذکورہ کالم میں فرماتے ہیں کہ "حائقہ" کے معنی ڈھونڈنے والے سے ایک آفت اور بلا قرار دے بیٹھے ہیں۔ اگر وہ عربی کی کسی لغت کو اٹھا کر ایک لمحے کے لیے بھی دیکھ لیتے تو انہیں پتہ چل جاتا کہ "حائقہ" کے معنی لپیٹ میں لینے والی کے ہیں اسے آنچل کی لپیٹ میں لینے والی یا زلف گرہ گیر کا اسیر بنانے والی کہہ کر لطافت پیدا کی جا سکتی تھی۔ لیکن جن لوگوں نے لطافت اور نزاکت کے خلاف جنگ کو بھی اسلام کا تقاضا بنا رکھا ہو ان کے حق میں دعا کرنا بھی آسان ہے۔

راقم الحروف کو فی الحال نزاکت ولطافت کے معاملات سے تو دلچسپی نہیں ہے اور نہ اس کی فکر کہ وہ اس کے فہم سے محروم لوگوں کے حق میں دعا کرنا پسند نہیں کرتے ہیں یا بددعا کرتے ہیں مجھے تو ان کی اس تشریح سے دلچسپی ہے جو اوپر ذکر کی گئی۔

اس سلسلہ میں عرض ہے کہ مجیب الرحمٰن شامی صاحب کو جناب ارشاد احمد حقانی اور جناب اظہر سہیل کی طرح عربی دانی کا دعویٰ تو کبھی نہیں رہا، لیکن نہ معلوم انہوں نے کون سی عربی اردو لغت کھول کر دیکھی ہے جس میں ان کو "حائقہ" کے معنی لپیٹ میں لینے والی کے ملے: حقیقت ہے (حق بھی کہا گیا ہے لیکن وہ ایسا غیر مہذب مفہوم ہے جس کے بیان کی یہاں گنجائش نہیں) اب اگر جناب شامی صاحب کسی عربی زبان کے پروفیسر کے ذریعے سے زمخشری کی لسان البلاغہ یا ابن منظور کی لسان العرب یا القاموس المحیط وغیرہ کوئی بھی مستند لغت دیکھیں تو ملے گا کہ ان میں اس لفظ

Marfat.com

''حاق'' کے معنی گھیرنے احاطہ کرنے اور واجب ہونے کے ہیں (احاطه به ، ولزمه و وجب علیہ) کہیں اس کے معنی لپیٹنے (لف) کے نہیں، اتفاق سے ایک مشہور و مستند عربی، اردو لغت بھی حال ہی میں مجھے ہدیہ میں ملی ہے، یعنی مصباح اللغات اس میں بھی یہی معنی دیئے ہیں۔ اس طرح حائقہ کے معنی گھیر لینے والی، مبتلا کرنے والی بنتے ہیں۔

پھر یہ کہ یہ لفظ عربی زبان اور قرآن کریم میں جہاں جہاں واقع ہوا ہے اس کی رو سے اس میں لطافت و نزاکت پیدا کرنے کی کوئی گنجائش نہیں کی ''حاق'' کا لفظ قرآن میں آٹھ سورتوں میں نو بار آیا ہے سورۃ الانعام، سورۃ ہود اور سورۃ النحل وغیرہ اور ہر جگہ اس معنی میں آیا ہے کہ اپنے اعمال بد کے نتیجہ میں کافر برے انجام سے دوچار ہوئے، یا یہ کہ اس عذاب قیامت سے دوچار ہونے جس کو وہ جھٹلاتے تھے، سورۃ النحل کی آیت نمبر ۳۴ میں ہے۔

''و حاق بھم ما کانوا بہ یستھزؤن'' یعنی قیامت کے جس عذاب کا وہ مذاق اڑاتے تھے اس نے قیامت کے روز ان کو گھیر لیا ہوگا۔

اس ایک صیغہ ماضی کی صورت کے علاوہ صرف ایک بار اس لفظ کا مضارع یحیق سورۃ فاطر کی آیت ۴۳ میں آیا ہے۔ ''ولا یحیق المکر السیئ الا باھلہ'' (اور برا داؤں کرنے والوں کا داؤں انہی پر الٹے گا)۔

یہ ہے حائقہ کے معنی کی عربی لغت و قرآن سے حقیقت، آنچل اور زلف گرہ گیر میں لپیٹ لینے کی لطیف و نازک باتیں اپنی جگہ لیکن کیا کیا جائے کہ عربی لغت میں اس کی کوئی گنجائش نہیں، بلکہ یہ لفظ برے مفہوم ہی میں استعمال ہوتا ہے۔ نہ معلوم کس ''عربی داں مولوی'' نے حائقہ کے یہ معنی عمران خان کو بتائے کہ انہوں نے اپنی بیوی کا یہ منفرد مگر برے مفہوم والا نام رکھ لیا۔ ہماری ان سے گزارش ہے کہ لندن میں شادی کے رجسٹر ہونے کے وقت سے قبل اس میں صرف ایک پہلے حرف کی تبدیلی کرلیں، اور ان کو بہت سے منفرد اور اچھے نام مل جائیں گے یعنی وہ فائقہ، شائقہ، یا پھر بہت ہی منفرد Unique نام رائقہ (خوشگوار) یا تائقہ (مشتاق) رکھ لیں ہاں صاعقہ، ضائقہ، مائقہ ہرگز نہ رکھیں کہ ان کے معنی اچھے نہیں۔ میرے پیش کردہ ناموں میں سے کوئی نام قرآن میں نہیں ہاں اگر ان کو اس قافیہ کے علاوہ اور کوئی منفرد سا قرآنی نام درکار ہے تو دو بڑے

Marfat.com

اچھے نام راضیہ و مرضیہ ہیں، جو سورۃ والفجر کے آخری الفاظ ہیں اور پاکستان میں رضیہ نام تو ہوتا ہے، لیکن راضیہ بہت کم ہے، اس طرح مرضیہ بھی کم از کم میں نے کسی کا نام نہیں سنا۔

ایک بار پھر جہاں تک حائقہ کا تعلق ہے راقم الحروف نے زندگی کے تیس پینتیس سال عربوں میں گزارے، لیکن آج تک حائقہ کوئی نام نہ سنا نہ پڑھا۔ آخر میں ایک اور اہم بات قابل غور ہے وہ یہ کہ اہل پنجاب (ق) کو عام طور سے (ک) تلفظ کرتے ہیں کسی نے اس تلفظ سے متاثر ہو کر اس نام کو حائکہ لکھ دیا تو اس کے معنی جولاہی کے ہیں، اور ہم نہیں چاہتے کہ اس محترم نو مسلم خاتون کو پاکستان میں اس نام سے پکارا جائے۔

امید ہے کہ میری ان معروضات پر عمران خان اور ان کے خیر خواہ توجہ کریں گے۔

Marfat.com

اسلام کا نظام معیشت اور زکوٰۃ
ایک تنقیدی جائزہ

سب لوگ جانتے ہیں کہ زکوٰۃ اسلام کے ارکان میں سے ایک اہم رکن اور دینی فریضہ ہے، مگر اس کی اقتصادی اہمیت سے عام طور پر لوگ غافل ہیں، اور اس کو نماز، روزہ اور حج کی طرح صرف ایک عبادت ہی سمجھتے ہیں۔

مولانا ارشاد الحق تھانوی صاحب نے بہت خوب کیا کہ جنگ کی اشاعت منگل ۳۰ مارچ ۱۹۹۳ء میں شائع شدہ اپنے ایک مضمون ''اسلامی معیشت کا بنیادی فلسفہ'' میں زکوٰۃ کی اہمیت کو اجاگر کیا ہے اور اس کو اسلام کے معاشی نظام کا ایک اہم ستون قرار دیا ہے اور معاشرہ میں خوش حالی پیدا کرنے کے لیے اس کی افادیت کی نشان دہی کی ہے۔ بلاشبہ یہ درست ہے۔ موصوف نے اس سلسلہ میں جو کچھ لکھا ہے کہ زکوٰۃ دینے کا مقصد ہرگز یہ نہیں ہے کہ اس سے زکوٰۃ لینے والوں کی خودی کو مجروح کیا جائے، اور ان کی تذلیل وتحقیر ہو وہ بھی درست ہے، اور یہ جبھی ہوسکتا ہے کہ جب زکوٰۃ بحیثیت ایک نظام کے حکومت وقت یا مسلمانوں کی جمعیت کے ذریعہ نافذ ہو، اور یہ کہ زکوٰۃ صدقہ و خیرات سے جدا درحقیقت دولت مندوں کے مال میں ناداروں اور غریبوں کا ایک حق ہے۔

مگر افسوس کہ موصوف کے مضمون میں اس ضمن میں بعض باتیں ایسی آگئی ہیں جن کا قرآن وحدیث سے کوئی تعلق نہیں اور نہ اسلام کے عہد زریں یا عہد صحابہ میں اس کی مثال ملتی ہے۔ اندیشہ ہے کہ اس سے فکری انتشار پیدا ہوگا اور غلط افکار پروان چڑھیں گے۔

سب سے پہلے تو مضمون کے شروع میں سورۃ الذاریات کی ایک آیت کا ترجمہ اس طرح پیش کیا گیا ہے۔ ''اور مومنین کے مالوں میں سائلوں اور ناداروں کا حق ہوتا ہے اسی کا نام زکوٰۃ ہے۔'' مولانا موصوف نے نہ تو سورت کا نام لکھا ہے اور نہ آیت کا نمبر، کہ یہ ایک مشہور آیت قرآنی ہے۔ بہرحال اس کا نمبر ۱۹ ہے۔ قابل تصحیح بات یہ ہے کہ آیت میں آخری جملہ کا وجود نہیں یعنی ''اسی

Marfat.com

کا نام زکوٰۃ ہے" یہ مولانا کا اپنا تفسیری جملہ ہے مگر افسوس کہ اس کو علامت اقتباس (" ") کے ساتھ لکھ دیا گیا ہے جس سے یہ غلط فہمی ہو سکتی ہے کہ یہ اس قرآنی آیت کا حصہ ہے۔

پھر سب سے عجیب بات مولانا موصوف نے یہ فرمائی ہے کہ "قرآن وحدیث کے مطابق زکوٰۃ نماز کے ساتھ ہجرت نبوی ﷺ سے قبل مکہ مکرمہ ہی میں فرض ہو چکی تھی۔ سورۃ المزمل جو نزول قرآن کی ابتدائی سورتوں میں سے ہے اس میں زکوٰۃ کا حکم موجود ہے۔" یہ بڑی ہی غیر ذمہ دارانہ بات ہے، جو خود سورۃ المزمل میں وارد آیت اور تاریخی حقائق کے خلاف ہے، حیرت ہے کہ مولانا موصوف اس سے کس طرح غافل ہو گئے، اس کی تفصیل یہ ہے کہ اسی سورۃ المزمل کی آخری طویل آیت میں "واقیموا الصلوٰۃ وآتوا الزکوٰۃ یعنی نماز قائم کرو اور زکوٰۃ ادا کرو" کے جملہ سے قبل "وآخرون یقاتلون فی سبیل اللہ" کا جملہ بھی ہے۔ یعنی اے نبی ﷺ تمہارے ساتھ نماز تہجد میں "ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں جو اللہ کی راہ میں جہاد کرتے ہیں" تو کیا مولانا موصوف کی رائے میں جہاد بھی مکی دور میں فرض ہو گیا تھا؟ حالانکہ یہ سب جانتے ہیں کہ جہاد کی اجازت مسلمانوں کو ہجرت مدینہ کے بعد دی گئی اور سورۂ حج کی وہ آیت اتری جس میں قتال یعنی جہاد کی اجازت دی گئی۔ اس سے قبل مکی دور میں تیرہ سال تک مسلمان کفار کا قریش کا ظلم برداشت کرتے رہے اور انہوں نے تلوار نہیں اٹھائی۔

درحقیقت مولانا ارشاد الحق صاحب تھانوی کی یہ رائے ایک غلط مفروضہ پر قائم ہے کہ سورۃ المزمل ساری کی ساری مکہ مکرمہ میں نازل ہوئی تھی، جیسا کہ انہوں نے تصریح کی ہے، حالانکہ اگر وہ کتب تفسیر اٹھا کر دیکھتے تو ان کو پتہ چل جاتا کہ سورۃ المزمل کی یہ آخری آیت جس میں نماز تہجد، قتال فی سبیل اللہ اور زکوٰۃ کا ذکر ہے، مدینہ منورہ میں نازل ہوئی تھی۔ جن بعض تفاسیر کا ذکر مولانا موصوف نے آگے چل کر کیا ہے یعنی تفسیر قرطبی (جو غلطی سے قطبی چھپ گیا ہے) اور تفسیر ابن کثیر وغیرہ ان میں بھی اس کے ارشادات ملتے ہیں۔

یہاں ایک اور بات کی طرف توجہ دلانا بھی ضروری ہے کہ وہ لوگ جن کو قرآنی علوم سے دلچسپی ہے اور تفاسیر پر ان کی نظر ہے اور وہ زرکشی کی البرہان فی علوم القرآن یا سیوطی کی الاتقان سے واقف ہیں، وہ جانتے ہیں کہ قرآن کریم میں کتنی ہی سورتیں ہیں جن کا کچھ حصہ مکہ مکرمہ میں

Marfat.com

اور کچھ مدینہ منورہ میں نازل ہوا۔ اور اس کو تو عام قارئین بھی غالباً جانتے ہوں گے کہ سورۂ علق کی صرف پانچ آیات سب سے پہلے مکہ میں نازل ہوئیں، پھر اس کے چند سال بعد بقیہ ۱۴ آیات مکہ ہی میں نازل ہوئیں۔

حقیقت یہ ہے کہ قرآن کریم میں زکوٰۃ اور صدقہ کے الفاظ متبادل معنی میں آئے ہیں۔ یعنی کبھی زکوٰۃ سے نفلی صدقہ وخیرات مراد ہیں اور کبھی صدقہ کا مطلب فریضہ زکوٰۃ ہے اس طرح علماء کا اتفاق ہے کہ ہجرت مدینہ سے قبل مکی آیات میں جہاں جہاں زکوٰۃ کا ذکر ہے اس سے صدقہ وخیرات یا انفاق فی سبیل اللہ مراد ہے، لیکن مدنی آیات میں جہاں زکوٰۃ کا ذکر ہے وہاں اس سے دینی فریضہ مقصود ہے، اور جہاں تک "صدقہ" کا مفروضہ زکوٰۃ کے معنی میں استعمال کا تعلق ہے اور جس کا ذکر مولانا ارشاد الحق صاحب نے خود کیا ہے وہ سورۂ براء کی آیت نمبر ۱۰۳ ہے جو فتح مکہ کے بعد سن ۸ھ میں نازل ہوئی تھی کہ "اے نبی ﷺ آپ ان کے مالوں میں سے صدقہ لیجئے اس واسطہ سے ان کو پاک کیجئے اور ان کا تزکیہ کیجئے۔" یہاں صدقہ کا لفظ مفروضہ زکوٰۃ کے لیے استعمال ہوا ہے۔

سورۃ المزمل کی آخری طویل آیت کے بارے میں جس میں زکوٰۃ کا ذکر ہے مزید یہ عرض ہے کہ مولانا مودودی نے تفہیم القرآن میں مشہور تابعی سعید بن جبیر کا ایک صریحی قول نقل کیا ہے کہ یہ آیت پہلے رکوع کے دس سال بعد نازل ہوئی اور سب سے بڑی بات تو یہ کہ اس آیت کریمہ کی داخلی شہادت یعنی اس میں مجاہدین کے ذکر سے یہ بات روشن ہے کہ مدینہ میں نازل ہوئی، کہ مکی دور میں مسلمانوں کو جہاد کی اجازت نہیں ملی تھی اور پھر جن لوگوں نے اس ساری سورت کو مکی کہا ہے، انہوں نے یہاں "زکوٰۃ" کے لفظ سے نفلی صدقہ کے معنی لیے ہیں جیسا کہ تفسیر قرطبی میں ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ زکوٰۃ کا نظام اسلام کے دوسرے احکامات کی طرح بتدریج قائم ہوا۔ پہلے مکی دور میں صرف اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کی ترغیب تھی نہ تو اموال کی تفصیل تھی نہ مقادیر کی، پھر مدینہ کی ہجرت کے بعد جیسے جمعہ فرض ہوا، روزے فرض ہوئے وغیرہ وغیرہ اسی طرح زکوٰۃ بھی فرض ہوئی جو انفرادی تھی۔ فتح مکہ کے بعد جب پورے جزیرہ عرب میں اسلام ایک سیاسی طاقت کی حیثیت سے قائم ہو گیا تو زکوٰۃ کو بحیثیت ایک اجتماعی نظام کے قائم کر دیا گیا اور پہلی بار سن ۱۰ھ میں جب آنحضرت ﷺ نے معاذ بن جبل کو یمن کا والی بنا کر بھیجا تو ان کو یہ حکم دیا کہ وہ لوگوں سے

Marfat.com

زکوٰۃ وصول کریں۔ (صحیح بخاری کی کتاب المغازی کے آخر میں سن ۱۰ھ کی تصریح ہے)

مولانا ارشاد الحق صاحب کے مضمون مذکورۂ بالا میں ایک تضاد یہ ہے کہ وہ پہلے کالم میں تو یہ لکھتے ہیں کہ ''تاہم نصاب زکوٰۃ اور مصارف زکوٰۃ کے احکام مدینہ میں نازل ہوئے'' پھر آگے چل کر دوسرے کالم میں یہ تحریر فرماتے ہیں ''البتہ قرآن کریم میں نصاب اور مقدار زکوٰۃ کے متعلق تصریح موجود نہیں۔''

حقیقت یہ ہے کہ ان کی دوسری بات ہی صحیح ہے اور پہلی بات کا صرف آخری حصہ درست ہے، یعنی مصارف زکوٰۃ کا حکم تو قرآن میں نازل ہوا ہے سورۂ براء میں لیکن نصاب اور زکوٰۃ کی تعداد داور وہ اموال، نقد، سامان تجارت، مویشی، باغات وزرعی اراضی وغیرہ جن پر زکوٰۃ لی جاتی ہے یہ سب حضور ﷺ نے تفصیل سے فرمایا بلکہ لکھوایا ہے۔

موصوف سورۃ البقرۃ کی مشہور آیت نمبر ۲۱۹ جس کا ترجمہ ہے ''دریافت کرتے ہیں کیا خرچ کریں۔ آپ فرمادیجئے جو ضرورت سے زائد'' پیش کرنے کے بعد تحریر فرماتے ہیں ''یہی بنیادی فرمان مکی دور سے آج تک اور قیامت تک جاری وساری رہے گا۔ البتہ اگر اس کے بعد بھی دولت جمع ہو جائے اور وہ صاحب نصاب ہو جائے تو اللہ کے نزدیک اس کی دولت نجس ہوگئی، کیونکہ وہ ضرورت سے زائد خرچ کرنے کے فرمان کے بعد کیوں اور کیسے اکٹھی ہوگئی ہے۔''

حیرت کی بات یہ ہے کہ جمہور مسلمین کے مسلک کے خلاف موصوف کے قلم سے یہ بات کس طرح نکل گئی۔ کیا مولانا ارشاد الحق صاحب یہ بات بھول گئے کہ صحابہ کرام بلکہ عشرہ مبشرہ بالجنۃ میں ایسے صحابہ بھی تھے جو انتہائی دولت مند تھے۔ جیسے حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ، حضرت زبیر رضی اللہ عنہ، حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ اور حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ وغیرہ یہ سب صاحبان نصاب تھے۔ تو کیا ان کی دولت نجس تھی۔ صحابہ کرام کے حالات میں قدیم ترین اور مستند کتاب طبقات ابن سعد میں ان حضرات کی دولت وثروت کا پتہ چلتا ہے۔ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ تو اسلام سے قبل ہی دولت مند تھے۔ ان کا ذکر اس لیے نہیں کیا گیا۔ تو سوال یہ ہے کہ کیا یہ سب دولت نجس تھی؟ کیا ان کو سورۃ البقرۃ کی آیت نمبر ۱۰۳ کا علم نہ تھا کہ اپنی ضرورت سے جو کچھ زیادہ ہو وہ سب اللہ کی راہ میں خرچ کر دینا چاہیے۔ یقیناً ان کو اس کا علم تھا لیکن ان کو یہ علم بھی تھا کہ مقررہ زکوٰۃ کی ادائیگی کے بعد مال

Marfat.com

پاک ہو جاتا ہے اور سورۃ البقرۃ کی یہ آیت سورۃ توبہ کی آیت زکوٰۃ سے قبل کی ہے، اور آیت زکوٰۃ نے اس کو منسوخ کر دیا ہے۔ صحابہ کرام کی زندگیاں ہمارے لیے روشنیوں کے مینار ہیں۔ ان میں اہل ثروت بھی تھے اور غریب بھی۔ لیکن آپس میں محبت وخلوص و یگانگت تھی۔ نہ کوئی رقابت اور نہ حسد اور نہ طبقاتی جنگ۔ جو یورپ کے جاگیردارانہ نظام اور سوشلزم کی نفرت کی بھڑکائی ہوئی آگ کے نتیجہ میں ظہور میں آئی۔ اب اس سوشلزم کے نظام کی عمارت خود ہی مسمار ہو چکی ہے کیونکہ اس کے نتیجہ میں سوویت روس میں اس کے پیروؤں کو ہزاروں کی تعداد میں ٹینک اور میزائل اور دوسرے جہنمی ہتھیار تو ملے لیکن روٹی کپڑا نہ ملا جس کے آج وہ ستر سال کے بعد شدت سے محتاج ہیں۔ مسلمانوں کا مطمحِ نظر چونکہ فلاح آخرت ہوتی ہے اس لیے عہد صحابہ میں اہل ثروت اور ناداروں میں کوئی رقابت نہ تھی۔

یہاں یہ بھی واضح کر دوں کہ اسلامی معیشت کے بنیادی فلسفہ میں زکوٰۃ کے ساتھ صدقات وخیرات کو بھی بڑی اہمیت حاصل ہے۔ مسلمانوں نے ہر دور اور ہر ملک میں اربوں روپیہ کے اوقاف مختلف رفاہی کاموں کے لیے کیے، جن میں مدارس، ہسپتال، مسافر خانے وغیرہ شامل ہیں۔ پھر علماء کا اس پر اجماع ہے کہ اگر ضرورت پڑے تو اسلامی حکومت زکوٰۃ کے علاوہ دوسرے ٹیکس بھی رفاہی کاموں کے لیے لے سکتی ہے۔ افسوس کہ ہمارے ملک میں زکوٰۃ کا نظام پوری طرح نافذ نہیں ہوا ہے۔ زکوٰۃ کے ساتھ اموال تجارت اور زرعی اراضی سے عشر پوری طرح وصول کیا جائے تو اربوں روپیہ وصول ہو سکتا ہے، اور اس سے ایسے رفاہی منصوبے قائم ہو سکتے ہیں جن سے غربت و ناداری کا خاتمہ ہو سکے۔ یا کم از کم سب کی بنیادی ضرورتیں پوری ہو سکیں۔

موصوف کی تحریر میں ایک سہو یہ بھی ہے کہ ''غزوہ تبوک سن ۸ ھ کے اختتام پر ہوا تھا۔'' صحیح تاریخ رجب سن ۹ ھ ہے قاضی ابوبکر ابن العربی کا نام بھی غلط طور پر ابن عربی، امام ابوبکر چھپ گیا ہے، ابن عربی تو مشہور صوفی تھے جن کو شیخ اکبر کے لقب سے بھی یاد کیا جاتا ہے لیکن ابن العربی جن کی کنیت ابوبکر ہے، اندلس کے مشہور قاضی اور کتاب احکام القرآن کے مصنف ہیں۔ امام قطبی بھی غلط ہے، صحیح نام امام القرطبی ہے جن کی تفسیر الجامع الاحکام القرآن مشہور ہے۔

Marfat.com

استنبول و اسلام بول۔ ایک تصحیح و توضیح

ہمارے محترم صحافی حضرات جو آئے دن ذاتی طور پر یا سرکاری وفود میں بیرون ملک جاتے رہتے ہیں، ان سفروں سے واپسی پر اپنے کالموں میں اپنی ان سیاحتوں کے ضمن میں ان ممالک یا شہروں سے متعلق کچھ تاریخی معلومات بھی اپنے قارئین کو بہم پہنچاتے ہیں۔ یہ یقیناً ایک اچھا اقدام ہے کہ اس سے قارئین کی معلومات میں اضافہ ہوتا ہے، لیکن ایسا کرتے وقت ہمارے ان صحافیوں کی یہ ذمہ داری ٹھہرتی ہے کہ وہ مستند تاریخی معلومات پیش کریں، سنی سنائی باتوں پر بھروسہ نہ کریں، تاکہ قارئین کو صحیح معلومات حاصل ہوں، اور یہ جبھی ممکن ہوسکتا ہے جب وہ اپنے موضوع سے متعلق ایک دو معیاری کتابیں اپنے مطالعہ میں رکھیں، ورنہ ایسی تاریخی اغلاط کی تکرار کرتے رہیں گے۔

۲۴/ اکتوبر۱۹۹۴ء کو جنگ میں محترم عبدالقادر حسن صاحب کا کالم ''استنبول کے معنی اسلام آباد'' پڑھ کر قارئین کی خاطر گستاخی تصحیح کی جرأت ہوئی۔

۱۔ محترم کالم نگار صاحب نے کہا ہے کہ ''فاتح قسطنطنیہ سلطان محمد فاتح نے اس شہر کا نام قسطنطنیہ سے بدل کر اسلام بول رکھ دیا جو رفتہ رفتہ استنبول ہوگیا۔'' یہ تو درست ہے کہ سلطان محمد فاتح کے عہد میں اس شہر کا نام اسلام پول (اسلام بول نہیں) رکھا گیا، جو ترکوں اور ترکی زبان پر عربی اثرات سے بعد میں ''اسلام بول'' ہوگیا۔ بعض علماء اسی نسبت سے اسلام بولی مشہور ہوئے۔ شام کے ایک ادیب و مصنف مہدی اسلام بولی سے مجھے بھی پچاس کی دہائی میں دمشق میں نیاز حاصل تھا۔ لیکن عبدالقادر حسن صاحب کی یہ بات درست نہیں کہ رفتہ رفتہ بگڑ کر یہی لفظ استنبول ہو گیا۔ لفظ اسلام کتنا ہی بگڑے، ظاہر ہے کہ وہ ''استن'' کی شکل اختیار کرسکتا اور پول تو ہے ہی شہر کے معنی میں۔ یہ تو عقل عام کی بات ہے، لیکن تاریخ سے بھی اس کی تردید ہوتی ہے جس کی تفصیل کچھ یوں ہے۔

Marfat.com

سلطان محمد فاتح نے قسطنطنیہ ۱۴۵۳ء (۸۵۷ھ) میں فتح کیا، اس سے تقریباً تین سو سال قبل ہرات (افغانستان) کے ایک مشہور عرب سیاح ابوالحسن علی ندوی (وفات ۶۱۱ھ) نے، جس نے قسطنطنیہ کی سیاحت کی تھی، اپنی کتاب ''الاشارات الی معرفة الزیارات'' مشہور بہ ''رحلتہ الھروی'' میں استنبول کا یہی نام لکھا ہے اور انتہائی مشہور شامی جغرافیہ نویس اور سیاح یاقوت نے بھی فتح قسطنطنیہ سے تقریباً ڈھائی سو سال قبل اپنی کتاب معجم البلدان میں قسطنطنیہ کے مادہ میں لکھا ہے کہ اس کو استنبول بھی کہتے ہیں۔ اسی ساتویں صدی ہجری/ تیرہویں صدی عیسوی کے ایک اور مشہور جغرافیہ نویس زکریا قزوینی نے اپنی کتاب آثار البلاد واخبار العباد میں الھروی کے حوالے سے شہر کا یہی نام لکھا ہے۔

اس طرح ہم کو عربی مآخذ میں استنبول کا ذکر سلطان محمد فاتح سے دو تین صدی قبل تک ملتا ہے، اس لیے یہ کہنا درست نہیں کہ اس عظیم فاتح نے قسطنطنیہ کا نام اسلام بول رکھا جو رفتہ رفتہ استنبول ہو گیا۔

درحقیقت اس کی صحیح توجیہ وہی معلوم ہوتی ہے جو پروفیسر برنارڈ لولیس نے اپنی کتاب۔ Istanbul and the Civilization of the Ottoman Empire کے مقدمہ میں لکھی ہے، کہ استنبول یونانی (Phrase) نصف جملہ eis ten polin سے ماخوذ ہے جس کے معنی ہیں: ''شہر کی طرف'' اس کے بعد پروفیسر لولیس کا شک کے صیغہ میں یہ کہنا کہ ممکن ہے کہ مسلمانوں نے اپنے یونانی پڑوسیوں سے ایشیائے کوچک میں یہ نام سنا ہو۔ اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ انہوں نے وہ قدیم عربی مآخذ نہیں دیکھے جن کا ہم نے اوپر ذکر کیا اور جن میں لفظ استنبول وارد ہوا ہے۔ انہوں نے یہ بات بہت صحیح لکھی ہے کہ قسطنطنیہ اس کے بانی قسطنطین اول کے نام پر یونانی میں Contantinopolis کہلاتا تھا اور اس عظیم دارالسلطنت کے باشندے اس کو عام طور پر Hi-Polis یعنی شہر کہتے تھے۔ راقم کے نزدیک یہ بالکل ایسا ہی ہے جیسے یثرب کی فتح کے بعد اس کا نام مدینۃ النبی ﷺ ہوا کہ پولس یونانی زبان میں شہر کو کہتے ہیں جس کا مخفف ''پول'' ہے اور سلطان محمد فاتح نے واقعی اس کا نام اسلام پول (اسلام آباد) رکھا۔ لیکن اس کا استنبول سے کوئی تعلق نہیں جو ایک قدیم یونانی نام ہے۔

Marfat.com

۲۔ کالم میں مذکورہ ٹوپ کاپی میوزیم درست نہیں۔ صحیح نام "توپ قپو" ہے، جس کے معنی ہیں دروازہ توپ، یہ درحقیقت سلطان محمد فاتح کے اس وسیع وعریض محل کا نام ہے جو اس نے قسطنطنیہ کی فتح کے بعد اس ایک پہاڑی ٹیلے پر بنایا تھا، اور سمندری سمت جس کے بڑے گیٹ پر ایک بڑی توپ نصب تھی اس لیے اس محل کو "توپ قپوسرائے" کہا جاتا تھا، تقریباً پانچ صدی تک یہ عثمانی سلاطین کی رہائش گاہ رہی۔ اس میں شاہی دفاتر بھی تھے، خزانہ بھی تھا، شاہی محافظوں کا ایک دستہ بھی رہتا تھا۔ انیسویں صدی میں جب عثمانی سلاطین نے دولمہ باغچہ اور یلدز کے یورپی انداز کے لیے محل بنائے تو اس کی وہ حیثیت ختم ہو گئی۔ کمال عہد میں سلطنت وخلافت کے خاتمہ کے بعد توقپو سرائے کو میوزیم بنادیا گیا، جہاں سلطانی نوادرات کے علاوہ سب سے اہم خزانہ سرور کائنات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعض متبرک اشیاء، موئے مبارک، نقش قدم، دستی چھڑی، عبائے مبارک اور ساتھ ہی مصحف عثمان رضی اللہ عنہ محفوظ ہے۔ (ملاحظہ ہو برنارڈ لولیس کی مذکورہ کتاب کا عربی ترجمہ "استنبول وحضارۃ الامبراطوریۃ العثمانیۃ" راقم کے قلم سے مطبوعہ بنغازی وجدہ)۔

۳۔ ایک اہم بات کی وضاحت بہت ضروری ہے وہ یہ کہ عبدالقادر حسن صاحب کے الفاظ سے مترشح ہوتا ہے کہ عظیم صحابی رسول صلی اللہ علیہ وسلم حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ نے شہر قسطنطنیہ میں وفات پائی، جب کہ حقیقت یہ ہے کہ ان کی وفات شہر کے فصیل سے باہر کافی دور مسلمانوں کے فوجی کیمپ میں ہوئی تھی کہ وہ بہت معمر اور مریض تھے۔ انہوں نے اپنی وفات سے قبل وصیت کی تھی کہ ان کی لاش کو قسطنطنیہ کی فصیل سے جس قدر قریب ممکن ہو، لے جایا جائے اور وہیں وہ دفن کیے جائیں۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا بعض مورخین کے مطابق دشمنوں نے تعجب کے اظہار کے ساتھ اس وقت دھمکی دی تھی کہ تمہارے جانے کے بعد ہم اس قبر کو کھود ڈالیں گے اور لاش نکال کر پھینک دیں گے جس پر جواباً کہا گیا تھا کہ فلسطین میں تمہارے مقدس مقامات مسمار کر دیئے جائیں گے۔ لہٰذا حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ کی یہ قبر بیرون شہر باقی رہی اور پچاس سال بعد اموی خلیفہ عبدالملک کے بیٹے مسلمہ کی قیادت میں جو دوسرا بڑا حملہ قسطنطنیہ پر کیا گیا اس کے نتیجہ میں اس اموی شہزادے اور سپہ سالار فوج نے اپنی شرائط صلح کے مطابق حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ کی قبر پر پکی عمارت بنائی اور شہر قسطنطنیہ میں مسلمانوں کے لیے ایک مسجد بنائی گئی۔ اس کا ذکر ہرات کے قدیم مشہور سیاح

Marfat.com

الہروی نے اپنے سیاحت نامے میں کیا ہے جس کا ذکر ہم نے اوپر کیا۔

اس عظیم مجاہد اور صحابیٔ رسول ﷺ کے جسد مبارک کی برکت اور نوجوان سلطان محمد فاتح کے جذبۂ جہاد و عزیمت اور حیرت انگیز منصوبے سے یہ بیزنطینی قدیم پایہ تخت فتح ہوا اور حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ کی قبر اس کے بعد سے استنبول کے اندر داخل ہو گئی۔ استنبول کے نام کے سلسلے میں یہ بات دلچسپی سے خالی نہ ہو گی کہ کچھ عرصہ تک سکوں اور سرکاری دستاویزات میں اس کا نام اسلام بول لکھا جاتا رہا، بعد کو اس کا نام دارالسعادہ اور آستانہ بھی رہا اور سلطان عبدالحمید ثانی کے زمانہ میں یہی آخری نام سرکاری نام تھا۔ قسطنطنیہ اور استنبول بھی ساتھ ساتھ عام لوگوں کی زبان پر تھا، کمال اتاترک نے قیام جمہوریت کے ساتھ قدیم یونانی نام استنبول کو اس کا سرکاری نام قرار دیا جو ہنوز مستعمل ہے۔

۴۔ یہ پڑھ کر افسوس ہوا کہ ان صحیح العقیدہ اور باعمل مسلمانوں کو جنہوں نے انتخابات میں کامیابی کے نتیجہ میں استنبول کے میونسپل کارپوریشن کی باگ ڈور سنبھالی ہے، عبدالقادر حسن صاحب نے اپنے اس کالم میں ''بنیاد پرستوں'' کے نام سے یاد کیا ہے، یہ تو ایک مغربی نئی اصطلاح ہے جو مذہبی سرپھروں کے معنی میں دشمنان اسلام استعمال کرتے ہیں۔ عبدالقادر صاحب سے تو اس کی امید نہیں کی جا سکتی تھی۔

۵۔ جہاں تک مغربی لباس میں ملبوس لڑکوں اور لڑکیوں کا بانہوں میں بانہیں ڈالے سڑکوں پر رواں دواں ہونے کا تعلق ہے تو یہ یقیناً معیوب بات ہے، مگر محترم کالم نگار کو یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ یہی تو کمالزم کا کرشمہ ہے مزید یہ کہ ان کو ایسے مناظر صرف استنبول ہی میں نہیں بلکہ مصر، شام، لبنان، تونس وغیرہ میں بھی نظر آئیں گے لیکن ان کو یہ بھی ملحوظ رکھنا چاہیے کہ استنبول میں سیکڑوں مسلمان نوجوان و لڑکیاں مساجد میں وعظ سننے اور نماز پڑھنے کے لیے بھی آتی ہیں، میں نے یہ منظر وہاں اپنی دو سیاحتوں ۱۹۶۰ء اور ۱۹۷۲ء میں دیکھا دوسری سیاحت میں میری بیوی نے مسجد ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ میں نماز ادا کی وہاں خواتین کے لیے مسجد کے پچھلے حصہ میں دروازہ مسجد کے قریب ایک سمت میں ایک مخصوص بڑا کمرہ ہوتا ہے جس میں وہ جماعت کی نماز امام کے ساتھ ادا کرتی ہیں۔ پھر یہ کہ ترکی اور مذکورہ عرب ممالک میں کافی عیسائی بھی آباد ہیں۔

Marfat.com

جہاں تک ان ممالک میں مغربی لباس کا تعلق ہے تو اس میں مرد عورتیں دونوں یورپ کے قرب کی وجہ سے شریک ہیں۔ ہمارے ملک میں اس سے بھی بدتر بعض عو[illegible] کا لباس ہے مگر ہم اس کا خیال نہیں رکھتے۔ میرا مطلب اس ساڑھی کے لباس سے ہے [illegible] عورتیں اتنا چھوٹا بلاوز پہنتی ہیں کہ ان کے پیٹ اور کمر کا بیشتر حصہ نمایاں ہوتا ہے اور برصغیر کے اکثر مسلمانوں میں اس کا رواج ہے جو ہندوؤں کے اثر سے ہے اور ظاہر ہے کہ پیٹ عورت کے جسم کا پنڈیوں سے زیادہ پرائیویٹ حصہ ہے۔ عرب ممالک کے زمانہ قدیم میں میرے بعض عرب دوست اس پر بڑے تعجب اور ناگواری کا اظہار کرتے تھے مگر افسوس کہ ہم کو اپنے عیوب نظر نہیں آتے ہیں۔ انہی عیوب میں ہماری تنگ نظری اور فرقہ بندیاں بھی ہیں، جو فرقہ درفرقہ بڑھتی جاتی ہیں جن کا ترکی اور عرب ممالک میں وجود نہیں۔

اس تحریر کا منشا کالم نگار صاحب کی قدح و مذمت نہیں، بلکہ تصحیح و توضیح ہے، اور یہ التماس کہ صحافی حضرات تاریخ سے متعلق جو کچھ لکھیں وہ مطالعہ و تحقیق کے بعد لکھیں تا کہ صحیح معنی میں ان کے قاری مستفید ہو سکیں۔

Marfat.com

ڈاکٹر اسرار احمد صاحب
مسئلہ کشمیر اور درس مفاہمت

محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب (ایم بی بی ایس) امیر تنظیم اسلامی جو نظام خلافت اور اسلامی انقلاب کے داعی ہیں، آج کل ملکی سیاست کی طرف متوجہ ہیں۔ پہلے تو ۳۰ اپریل ۱۹۹۴ء کے روزنامہ جنگ میں ان کا یہ مضمون چھپا ''تقسیم ہند برطانوی یا الٰہی تدبیر'' جس میں موصوف نے ایک سابق کمیونسٹ کارکن دانیال لطیفی کے انٹرویو کو صحیفۂ آسمانی کی طرح سچا سمجھتے ہوئے قائداعظم محمد علی جناح کو گاندھی کی صف میں لا کھڑا کیا۔ یعنی گاندھی کی طرح وہ بھی متحدہ ہندوستان چاہتے تھے اور یہ کہ قیام پاکستان میں نہ تو ان کا کوئی رول تھا نہ مسلمانوں کی جدوجہد اور قربانیوں کا اس میں کوئی دخل تھا، بلکہ یہ صرف ایک برطانوی منصوبہ تھا۔ (یہی مضمون موصوف نے اپنے ماہنامے میثاق میں دہرایا ہے۔ اشاعت مئی ۹۴ء)۔

قائداعظم پر ان کے اس اتہام اور لایعنی دلائل کے تاروپود تو جناب پروفیسر سید محمد یوسف عرفانی صاحب اور پھر بعد کو سعید صدیقی صاحب نے جنگ کے صفحات پر اچھی طرح بکھیر دیئے اور قارئین جنگ کو معلوم ہو گیا کہ ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کے پیش کردہ دلائل تار عنکبوت سے بھی زیادہ کمزور تھے، اللہ تعالیٰ ان دونوں صاحبان کو جزائے خیر دے کہ انہوں نے حق کی آواز بلند کی اور مسلمانان پاکستان کو قائداعظم سے بدظن کرنے کے منصوبہ کو بروقت دفن کر دیا۔

اب ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے اپنے طویل مضمون ''پاک بھارت مفاہمت اور مسئلہ کشمیر کا حل'' (جنگ ۲۱ مئی و ۲۸ مئی ۹۴ء) میں ایک نیا وار جہاد کشمیر پر کیا ہے اور پاک بھارت مفاہمت کے نام پر مسلمانان پاکستان کو درس روباہی دینے کی جسارت کی ہے اور موصوف نے جہاد افغانستان کی بھی تضحیک کی ہے۔ سوال یہ ہے کہ تنظیم اسلامی کے امیر آج کل کس کی زبان سے بول رہے ہیں؟ اور ان کا مشن کیا ہے؟ اور کیوں انہوں نے اپنی توپوں کے دہانوں کا رخ قائداعظم،

Marfat.com

مسلم لیگ اور جہاد کشمیر کی طرف موڑ دیا ہے؟

جناب ڈاکٹر اسرار احمد صاحب اپنے مضامین میں قرآنی آیات اور بعض عربی کے جملوں سے قارئین کو مرعوب کرتے ہوئے یہ باور کرانا چاہتے ہیں کہ وہ عربی زبان کے بڑے ماہر ہیں، اس لیے نفس مضمون پر کچھ کہنے سے قبل میں موصوف کے ۲۱ مئی کے مضمون ''پاک بھارت مفاہمت ۔۔۔۔۔۔'' میں واقع عربی لفظ ''جنت الحمقاء'' کی تصحیح ضروری سمجھتا ہوں، اس لفظ کا اگر اردو میں ترجمہ کیا جائے تو وہ ''احمق عورت کی جنت'' ہوگا، کیونکہ ''الحمقاء'' درحقیقت الاحمق (اردو میں احمق) کا مونث ہے اور ''احمق عورت کی جنت'' ایک مضحکہ خیز ترکیبی جملہ ہے، صحیح لفظ ہے ''جنت الحمقیٰ'' اور حمقیٰ جمع ہے احمق کی تو اس طرح اس عربی ترکیب کے معنی ہیں ''احمقوں کی جنت'' اور گفتگو و تحریرات میں یہی مقصود ہوتا ہے۔

ڈاکٹر اسرار احمد صاحب ایک پیر بھی ہیں کہ ان کی تنظیم اسلامی کے متبعین باقاعدہ ان سے بیعت کرتے ہیں، سو ان کے مریدین یا متبعین تو یہ تصحیح غالباً پسند نہ کریں لیکن خود ڈاکٹر صاحب موصوف اور عام قارئین کے لیے یہ فائدہ کی بات ہے۔ اسی مضمون کے کالم نمبر ۳ میں سورۃ بنی اسرائیل کی آیت ۲۰ کا ترجمہ ''ہم انہیں اور انہیں (یعنی طالبات دنیا اور طالبات آخرت)'' بھی غلط ہے۔ کیونکہ جملہ قرآنی ہے ''کلاً نمد ھولاء وھولاء'' جس کا ترجمہ ہے ''ہم دیتے ہیں (اپنی عطا سے) ان کو بھی اور ان کو بھی (یعنی طالبان دنیا کو بھی اور طالبان آخرت کو بھی) ''طالبات تو طالبہ کی جمع ہے جس کے معنی عام اردو دان بھی خوب جانتے ہیں یعنی طلب رکھنے والی لڑکی اور عام استعمال میں اسکول و کالج وغیرہ کی طالب علم۔

اب جہاں تک پاک بھارت مفاہمت اور مسئلہ کشمیر کے حل کا تعلق ہے تو اس موضوع پر شائع شدہ مضمون سے ٹھیک ایک ماہ قبل ڈاکٹر اسرار احمد نے اپنے یہ افکار ''تحریک خلافت پاکستان کے زیر اہتمام کشمیر سیمینار'' میں ۳۱ مارچ ۹۴ء کو لاہور میں پیش کیے تھے۔ اس میں پیش کردہ موصوف کا پورا صدارتی خطبہ ان کے رسالے میثاق، مئی ۹۴ء میں موجود ہے، اسی خطبہ کی ریزش کی صورت میں موصوف نے وہ دونوں مضامین جنگ میں اشاعت کے لیے دیئے جن کا ذکر اوپر ہوا ہے، کیونکہ ان کے خطبۂ مذکورہ کے ذیلی عنوانوں میں سے ایک عنوان ہے ''قیام پاکستان انگریز کا

Marfat.com

منصوبہ یا خدائی تدبیر'' (میثاق، مئی ص ۷) اوراسی شمارہ میثاق (ص ۲۱) میں ایک دوسرا ذیلی عنوان ہے ''بھارت کے ساتھ مصالحت۔۔۔وقت کا تقاضا۔''

غضب ہے کہ انڈین گورنمنٹ نے پاکستان بننے کے فوراً بعد عرب ممالک میں اس کی مقبولیت و پذیرائی دیکھ کر پانچویں دہائی میں جو پروپیگنڈہ شروع کیا تھا کہ پاکستان ہندوستان کے مسلمانوں کا مطالبہ نہیں تھا بلکہ اس کو انگریزوں نے بنایا ہے وہی بات آج چالیس سال بعد ہمارے پاکستانی ایک ''امیر'' کہہ رہے ہیں یہ کون سی پاکستانیت ہے؟ یہ کون سی پاکستان کی نظری اساس یعنی دوقومی نظریہ سے وفاداری ہے۔

پوری تصویر دیکھنا ہو تو قارئین ڈاکٹر صاحب موصوف کا میثاق میں شائع شدہ مذکورہ خطبہ پڑھیں انتہائی افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ موصوف نے اپنے اس خطبہ (صفحہ ۲۰) میں اس یہودی کا ذکر کرتے ہوئے جس نے فلسطین کے مقدس شہر الخلیل میں مسجد ابراہیمی میں نمازیوں پر تنگی بربریت کے ساتھ فائرنگ کی تھی، افغانی مجاہدین کی استہزاء کیا ہے۔ فرماتے ہیں ''اس کی داڑھی سے معلوم ہوتا ہے کہ کوئی افغانی مجاہد ہے'' افسوس کہ انہوں نے ایک خونخوار اور بزدل یہودی کو جس نے نماز پڑھتے ہوئے لوگوں کو شہید کیا افغان مجاہد سے تشبیہ دی ہے، مگر یہ تشبیہ موصوف کی کوتاہ نظری پر دلالت کرتی ہے کہ افغان مجاہدین خود ڈاکٹر صاحب کی طرح ایک مشت کی داڑھی رکھتے ہیں جب کہ اس یہودی کی داڑھی دوسرے پابند مذہب یہودیوں کی طرح قینچی کی گرفت سے آزاد اور بہت لمبی تھی، اسی داڑھیوں کی بہار تو نیویارک جانے والے سب لوگ کینال اسٹریٹ میں یہودیوں کی دوکانوں پر دیکھتے ہیں۔ تعجب ہے کہ ڈاکٹر صاحب جو امریکہ جاتے رہتے ہیں انہوں نے ان مطلقاً غیر تراشیدہ داڑھیوں کا منظر کینال اسٹیرٹ، نیویارک میں نہیں دیکھا، پھر انہوں نے یہ بھی غور نہیں فرمایا کہ اس یہودی کی تو مونچھیں بھی بڑھی ہوئی تھیں اور یہی حال عام یہودیوں کا ہوتا ہے کہ وہ مونچھیں اور داڑھی دونوں لمبی رکھتے ہیں اور ''مغضوب علیہم'' یہودیوں کی مشابہت سے بچنے ہی کے لیے نبی اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ حکم فرمایا کہ ''اعفوا اللحی واحفوا الشوارب'' یعنی ''داڑھویں کو بڑھاؤ اور مونچھیں کترواؤ یہود کی مخالفت کرو'' پھر صدر برہان الدین ربانی اور گلبدین حکمت یار وغیرہ کی داڑھی تو ہمارے یہاں کی عام علماء

Marfat.com

داڑھی اور خود اسرار صاحب کی داڑھی کی طرح ہے، پھر انہوں نے افغان مجاہدین پر یہ پھبتی کس لیے کسی۔ ان کا مقصد غالباً عبدالرب رسول سیاف، مشہور افغانی رہنما ہیں جن کی داڑھی بعض اہلحدیث علماء کی طرح کچھ زیادہ ہی لمبی ہے اور ان علماء کا اس حدیث نبوی پر اعتماد ہے جس میں وارد ہے کہ داڑھی پر کبھی قینچی نہیں لگانا چاہیے مگر وہ بھی مونچھیں ترشواتے ہیں۔

داڑھی کی یہ بات افسوس کہ قدرے لمبی ہوگئی درحقیقت یہ بات افغان جہاد کے بارے میں ان کے فکر کی آئینہ دار ہے کہ انہوں نے اپنے اسی خطبہ کے صفحہ ۱۸ پر اس کو امریکہ کی جنگ کہا ہے موصوف یہ بھول گئے کہ امریکن بزدل تو ویتنام کی جنگ اپنی تمام تر عظیم طاقت کے سبب نہ جیت سکے تھے، نہ معلوم کیوں وہ اب افغان مجاہدین کے ورثاء کا دل دکھا رہے ہیں، قیامت کے روز یہ شہید مجاہدین ان سے پوچھیں گے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زبان میں کہ ''کیا آپ نے ہمارے دل چیر کر دیکھ لیے تھے کہ ہم امریکیوں کے لیے لڑ رہے تھے؟''

ڈاکٹر اسرار صاحب کے افکار سے واقف لوگ جانتے ہیں کہ وہ مولانا ابوالکلام آزاد اور مولانا حسین احمد مدنی مرحوم کے بڑے مداح ہیں اور اول الذکر پکے کانگریسی اور موخرالذکر جمعیت علماء ہند کے صدر اور کانگریس کے ہمنوا، تقسیم ہند کے مخالف اور نظریۂ پاکستان کے شدید مخالف تھے۔ دوسری طرف ڈاکٹر اسرار، علامہ اقبال سے بھی عقیدت رکھتے ہیں اور اکثر و بیشتر ان کے اشعار سے اپنے مضامین کو مزین کرتے ہیں۔ انہوں نے اپنے مذکورہ مضمون میں ہندو مسلم منافرت کا ذکر کرتے ہوئے مسلمانوں کو افسانہ آمیزی کا موردالزام ٹھہرایا ہے اور ہندوؤں کی صفائی پیش کی ہے، خاص طور پر راجپوت اور کھتریوں کی۔ یہی نہیں موصوف نے انہی علامہ اقبال کو جن کے اشعار سے اسلام کے حقائق کے بارے میں استدلال کرتے ہوئے وہ نہیں تھکتے ''برہمن زادہ'' قرار دیا ہے اور ان کے ابتدائی دور کے وہ اشعار پیش کیے ہیں جب وہ وطن پرست اور نیشلسٹ تھے، اس ذیل میں سب لوگ جانتے ہیں کہ نہ تو علامہ اقبال کے والد ہندو تھے اور نہ ان کے دادا کہ ان کو برہمن زادہ کہا جائے، وہ اور ان کے والد ایک راسخ العقیدہ مسلمان تھے، انہوں نے جہاں کہیں اپنے لیے ''برہمن زادہ'' کا لفظ استعمال کیا ہے تو فخریہ نہیں بلکہ تواضعاً کیا ہے۔ اگر کئی پشت پہلے علامہ اقبال کے اجداد کشمیری برہمن تھے اور اسی کو ڈاکٹر اسرار صاحب ان کی

Marfat.com

شناخت سمجھتے ہیں تو وہ پھر صحابہ کرام ابوبکر، عمر، عثمان وعلی رضوان اللہ علیہم کے بارے میں کیا کہیں گے ان کے آباؤ اجداد تو مشرکین تھے، گو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے والد ابو قحافہ بعد کو مسلمان ہو گئے تھے، پھر وہ حضرت حسان بن ثابت کی اس شاعری کے متعلق کیا کہیں گے جو انہوں نے اسلام سے پہلے کی، اور جس میں انہوں نے بتوں اور شراب نوشی کی تعریف کی ہے۔ ڈاکٹر اسرار صاحب تو انگریزی طب کا پیشہ چھوڑنے کے بعد اب عالم یا متعالم ہیں وہ یقیناً یہ حدیث جانتے ہوں گے کہ ''الاسلام یجب ما قبلہٗ یعنی اسلام ماضی کے سارے رشتوں کو کاٹ دیتا ہے، پھر علامہ اقبال کو برہمن زادہ کے نام سے یاد کرنا کیا معنی رکھتا ہے۔ ڈاکٹر اسرار صاحب اس سے کیوں تغافل برت رہے ہیں کہ علامہ اقبال نے ''ہندی ہیں ہم وطن ہے ہندوستاں ہمارا'' کے نعرہ کو چھوڑ کر یہ نعرہ اپنایا تھا: مسلم ہیں ہم وطن ہے سارا جہاں ہمارا اور یہ کہ:

بمصطفیٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست

اگر باو نرسیدی تمام بولہبی ست

اور ڈاکٹر اسرار صاحب اس اسلامی اصول سے باخبر ہوں گے کہ ''العبرۃ بالخواتیم'' (اعتبار خاتمہ واعمال کا ہوتا ہے)

جہاں تک ہندو مسلم منافرت کا تعلق ہے تو نہ تو یہ انگریزوں کی پیدا کردہ ہے اور نہ یہ صرف سو سالہ ہے، یہ تو بہت ہی قدیم ہے اور ہندوؤں کے مذہبی اور سماجی افکار کا ایک بنیادی حصہ ہے۔ البیرونی نے جو ان کی زبان سنسکرت اور ان کے علوم سیکھے پانچویں صدی ہجری کے اوائل میں سندھ آیا تھا، ان کی نفرت کا ذکر اپنی کتاب الہندیا (تحقیق ماللہند من مقولہ۔۔۔۔۔) میں بار بار کیا ہے کہ وہ کس قدر تنگ نظر اور متعصب ہیں اپنے سوا سب کو ملیچھ یعنی گندہ سمجھتے ہیں سو ان کا یہ مفروضہ بالکل غلط ہے کہ ''دونوں قوموں کے مابین تلخی کا زہر گھولنے کا سب سے مؤثر کام بھی بعض انگریز محققین اور مورخین ہی نے سرانجام دیا۔''

افسوس کہ انہوں نے بابری مسجد کے انہدام سے بھی ہندوؤں کو بری کر دیا ہے اور اس کو بھی انگریزوں کے نامۂ اعمال میں ڈال دیا ہے۔ یہ ایسا ہی ہے جیسا کہ پوپ نے تقریباً دو ہزار سال بعد یہودیوں کو خون عیسیٰ علیہ السلام سے بری کر دیا۔ موصوف نے مسئلہ کشمیر کے حل کے لیے جنگ کی

Marfat.com

دہائی دینے کے مؤید پاکستان کوٹھہرا ہے جوایک بے بنیاداور بھونڈاالزام ہے۔ پاکستان کے عوام اور حکومت نے کبھی کشمیر کی آزادی کے لیے اولین طبل جنگ نہیں بجایا،ان دوایک جماعتوں کا کوئی ذکرنہیں جواپنی سیاسی دکان چمکانے کے لیے کبھی کبھار یہ نعرہ لگا بیٹھتے ہیں، بھارت کی حکومت جس نے پہلے روز سے پاکستان کے قانونی وجود کوتسلیم نہیں کیا وہ اور اس کے عوام ہی ایسے نعرہ ہائے جنگ بلند کرتے رہے ہیں۔جن مذاکرات کی تلقین ڈاکٹر اسرار احمد صاحب حکومت پاکستان کو کر رہے ہیں، وہ نواز شریف کی حکومت اور موجودہ حکومت کے مختصر عہد میں متعدد بار ہوئے، مگر بھارت کے سخت اور غیر لچکدار رویہ کی وجہ سے ہمیشہ ناکام رہے کہ بھارت کوساؤتھ ایشیا کی سپر پاور ہونے کا زعم ہےاوروہ پاکستان کوسری لنکااور بنگلہ دیش ونیپال وغیرہ کی طرح دوسرے درجہ کی طاقت سمجھ کراس سے ایساہی معاملہ کرناچاہتاہے،مگر مسلمانوں کی توگھٹی میں یہ بات پڑی ہوئی ہے کہ:

باطل سے دبنے والے اے آسماں نہیں ہم
سو بار کر چکا ہے تو امتحاں ہمارا

انتہائی افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ ڈاکٹر اسرار صاحب کے اس سارے مضمون کا مقصد پاکستان کو بھارت وامریکہ کی طاقت سے مرعوب (Demoralize) کرنا ہے،اس ضمن میں انہوں نے قرآنی آیات کا جواستعمال کیا ہے وہ عقیدہ وتاریخ دونوں کی رو سے غلط ہے۔ انہوں نے پاکستان کے مسلمانوں کے لیے نصرت خداوندی کے دروازے بھی بند کر دیے ہیں، جیسے نعوذ باللہ، اللہ رب العزت نے ان کواس کاٹھیکہ دے دیا ہو، وہ بھول رہے ہیں کہ پاکستان کے مسلمان اور حکومت اپنی بداعمالیوں کے باوجود اب بھی عقیدۂ توحید کے حامل ہیں۔الپ ارسلان سلجوقی، یوسف بن تاشفین سلطان المرابطین اور صلاح الدین ایوبی اور آخر میں بابر اور احمد شاہ ابدالی کے سپاہی کوئی بہت اعلیٰ درجہ کے صحابہ کرام اور تابعین کا کردار رکھنے والے لوگ نہیں تھے، اللہ تعالیٰ نے جب ان کی نصرت کی تھی تو وہ پاکستان کے ان مسلمانوں کی بھارت کی جارحیت و حربی اکثریت کے مقابلہ میں بھی مدد فرما سکتا ہے، چاہے وہ کتنے ہی برے سہی، مجبوراً سودی معیشت میں گرفتار سہی، مگر ہندوؤں کی طرح بت پرستی نہیں اور توحید کے علمبردار ہیں۔کیا اس موقع پر ڈاکٹر اسرار صاحب قرآن کریم کی وہ متعدد آیات بھول گئے جن میں کہا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ

Marfat.com

جارحیت کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا (ان اللہ لا یحب المعتدین، فلا عدوان الا علی الظالمین وغیرہ) اور پھر ''ان الشرك لظلم عظیم '' (یقیناً شرک بہت بڑا ظلم ہے) کی آیت کو بھی وہ شاید بھول گئے ہیں یا قصداً بھلا رہے ہیں۔

کیا کشمیر میں بھارت کے چھ لاکھ فوجی وہاں کے مسلمانوں کو دودھ، ڈبل روٹی کھلانے کے لیے موجود ہے؟ کیا ڈاکٹر اسرار صاحب کو وہاں بھارت کی بربریت کا ننگا ناچ نظر نہیں آتا؟ کیا ان کو وہاں شہیدوں کا بے دریغ بہتا ہوا خون نظر نہیں آتا؟ جس کو اب غیر ملکی مبصرین بھی محسوس کرنے لگے، وہ کشمیر کے مسئلہ کے حل کے لیے تیسرے آپشن کی وکالت کر رہے ہیں، جو درحقیقت امریکہ کی اختراع ہے۔ ایک طرف تو وہ امریکہ پر لعن طعن کرتے ہیں اور دوسری طرف اس کے پیش کردہ ''آپشن'' کی وکالت فرما رہے ہیں، تقسیم ہند کے وقت کوئی ایسا ''آپشن'' یا تیسرا حل وثیقہ، تقسیم ہند میں نہیں تھا۔ یہی تھا کہ ہندوستان کی ریاستیں اپنے عوام کی مرضی کے مطابق بھارت و پاکستان جس سے چاہیں الحاق کر سکتی ہیں، اور اسی کی تائید میں اقوام متحدہ کی متعدد قراردادیں موجود ہیں جہاں بھارت خود ہی مسئلہ کشمیر کو لے کر گیا تھا کیا مرور زمانہ سے عدل و انصاف کے تقاضے بدل جاتے ہیں اور حق و باطل کی تمیز مٹ جاتی ہے، جو ڈاکٹر اسرار صاحب پاکستان کو بھارت کے سامنے سر جھکانے اور تیسرے آپشن کو قبول کرنے کی تلقین فرما رہے ہیں۔

کیا وہ بھول گئے کہ اللہ تعالیٰ کی نصرت سن ۱۹۶۵ء کی جنگ میں کیسے ہوئی تھی جب بھارت کے جنرل چوہدری نے لاہور میں جشن فتح منانے کی دعوت کے کارڈ بھی تقسیم کر دیے تھے، لیکن اس کے عزائم ناکام ہوئے تھے۔ اس موقع پر ڈاکٹر اسرار صاحب قرآن کریم کے جملے ''متاع الی حین'' ''فینظر کیف تعلمون'' وغیرہ استعمال کر کے قارئین پر اپنی قرآن فہمی کا رعب جمانا چاہتے ہیں، مگر یہ سب انہوں نے بے محل کہا ہے۔ سورۃ انفطار کی جو ابتدائی آیت موصوف نے اس موقع پر درج کی ہے وہ بھی بے محل ہے، اور اس کی تفسیر بھی غلط ہے۔ اس کا تعلق عمل سے نہیں بلکہ عقیدۂ آخرت سے ہے کہ ''وہ رب کریم جس نے اسے انسان تجھے پیدا کیا ہر طریقہ سے درست کیا، متناسب بنایا اور جس صورت میں چاہا تجھے جوڑ کر تیار کیا، پھر کس طرح تو اس کے بارے میں جزا و سزا پر یقین نہیں رکھتے ہو۔'' بحمد اللہ پاکستان کے بلکہ تمام دنیا کے مسلمان اس ''یوم الدین'' پر

Marfat.com

عقیدہ رکھتے ہیں اس لیے وہ اس وعید میں نہیں آتے بلکہ مشرکین و کفار آتے ہیں۔

اس موقع پر ڈاکٹر صاحب موصوف نے فرمایا ہے کہ "پاکستان کو بعد میں اس (اللہ تعالیٰ) نے اپنے خصوصی فضل و کرم سے خالص معجزانہ طور پر ایٹمی صلاحیت کے ذریعے ایک موثر ڈیٹرنٹ عطا فرما دیا۔" سبحان اللہ! سیاست کی باتیں کرتے ہوئے کیا واعظانہ انداز بیان اختیار فرمایا ہے! ایسا معلوم ہوتا ہے کہ موصوف کے دروس قرآن میں دعاؤں کے طفیل ہی یہ معجزہ ظہور پذیر ہو گیا، اس کے لیے برسوں کوئی کوشش نہیں کی گئی، ڈاکٹر عبدالقدیر اور ان کی جماعت نے اس ایٹمی صلاحیت کے لیے اپنے علم اور مسلسل تجربات کرتے ہوئے کوئی کوشش ہی نہیں کی بس ایک لمحہ میں یہ معجزہ ظہور میں آ گیا! اس موقع پر قرآنی آیات کی تکرار کرتے ہوئے ڈاکٹر اسرار صاحب یہ آیت بھول گئے: "وان لیس للانسان الا ما سعی " (سورۃ والنجم آیت ۳۹) یعنی انسان کو صرف وہی ملتا ہے جس کے لیے وہ کوشش کرتا ہے، پھر اگر پاکستان کو بغیر استحقاق کے اچانک معجزہ کی صورت میں یہ ایٹمی صلاحیت حاصل ہو گئی تو بھارت کو یہ صلاحیت سن ۱۹۷۴ء میں کس معجزے کے طفیل حاصل ہوئی؟

اور پھر اس خصوصی فضل و کرم خداوندی سے پیدا شدہ ڈیٹرنٹ (Deterrent) کی افادیت کی بھی موصوف نے دوسرے پیراگراف میں نفی کر دی ہے، لیجئے چھٹی ہوئی۔ یہ پاکستان کو بھارت کے مقابلہ میں مرعوب کرنے کی ایک اور کوشش ہے۔ کوئی ڈاکٹر صاحب سے یہ پوچھے کہ "اس ایٹمی صلاحیت کے استعمال کا خیال جنت الحمقیٰ (الحمقاء نہیں) میں رہنے کے مترادف" ہے تو پھر امریکہ بہادر اور بھارت کیوں پاکستان کے پیچھے پڑے ہیں کہ اس کو اپنا ایٹمی پروگرام رول بیک کرنا چاہیے یا اس کے انٹرنیشنل معائنہ کے لیے اجازت دینی چاہیے۔

مضمون کی اس پہلی قسط میں ڈاکٹر اسرار صاحب نے مسئلہ کشمیر اور جہاد کشمیر کا ذکر کرتے ہوئے ان مذہبی گروہوں کی مذمت کی ہے جو اس کو جہاد افغانستان سے مشابہ قرار دیتے ہیں، اس کو وہ "قیاس مع الفارق" کہتے ہیں (موصوف کے اندر ایک کمپلیکس ہے کہ وہ اپنی تحریروں میں عربی کے ایسے جملے اور تراکیب استعمال کرتے ہیں جن کو عام قاری نہ سمجھ سکے اور وہ خود ایک بڑے عربی دان نظر آئیں) وہ اس لیے کہ جہاد افغانستان ان کی نظر میں امریکہ کی لڑائی تھی جسے افغان مجاہدین

Marfat.com

کرایہ کے ٹٹوؤں کی طرح لڑ رہے تھے۔ اس موقع پر موصوف نے مذہبی جماعتوں پر امریکہ کے مال کی بستی گنگا سے ذاتی فائدہ اٹھانے کا الزام بھی لگایا ہے۔ اس کا جواب تو ان مذہبی جماعتوں کے رہنما یعنی علمائے کرام ہی دیں گے۔ ہمیں صرف اتنا کہنا ہے کہ امریکہ کی جنگی و مالی امداد نہ ہوتے ہوئے آخر کشمیر کا یہ جہاد حریت کس طرح چار سال سے جاری ہے؟

انہوں نے اس ذیل میں یعنی کشمیری مجاہدین سے تعاون کرتے ہوئے ان کی اپنے جسم و جان سے مدد کرنے کو جو منع فرمایا ہے اور اس بارے میں علماء قرآن کریم سے (سورۃ نساء کی آیت نمبر ۷۵ سے) جو استدلال کرتے ہیں اس کو غلط قرار دیتے ہوئے اس آیت کریمہ کو عہد نبوی سے مختص فرمایا ہے یہ ان کی اصول تفسیر سے بے خبری کی دلیل ہے۔ کوئی شک نہیں کہ یہ آیت اہل مکہ کے کمزور مسلمانوں کی حمایت میں جنگ کرنے کے لیے نازل ہوئی تھی اور اس کے اولین مخاطبین مسلمانان مدینہ ہی تھے، لیکن اصول تفسیر سے واقف ہر مسلمان جانتا ہے کہ ایسی ''مقید'' آیات کا حکم ''مطلق'' ہوتا ہے ورنہ تو قرآن کریم میں جتنے احکامات عہد نبوی کے واقعات وحوادث سے متعلق نازل ہوئے ہیں وہ سب بعد کے زمانوں کے لیے بے اثر ہو جائیں گے اور قرآنی احکامات کی ابدیت ختم ہو جائے گی۔

پھر یہ کہ مظلوم مسلمانوں کی مدد کے لیے ''پہلے خود اپنے اندر پاکیزگی اخلاق اور پابندی شریعت اور اپنے معاشرہ میں نظام عدل وقسط (یہ پھر ٹھیٹ عربی لفظ کا استعمال کیا گیا ہے) قائم کرنا ضروری ہے'' ایک فریب نفس اور عذر لنگ ہے۔ یہ وہ وعظ ہے جو صرف ڈاکٹر اسرار صاحب اپنی بیعت و طاعت کے آرام دہ گنبد میں بیٹھ کر دے سکتے ہیں، یہ تو بالفاظ دیگر وہ بات ہوئی کہ جہاں کہیں بھی مسلمان ظالمانہ طور پر غیر مسلموں سے پٹ رہے ہوں، قتل ہو رہے ہوں، خواہ وہ بوسنیا ہو، فلسطین ہو، کشمیر ہو وہاں کے مسلمانوں کی ہم کو اس وقت تک مدد نہیں کرنی چاہیے جب تک ہم خود اعلیٰ درجہ کے مسلمان نہ بن جائیں اور اپنے معاشرہ میں شریعت نافذ نہ کر لیں اس وقت تک ہم کو ان کی جان و مال سے مدد نہ کرنا چاہیے یہ کون سا خود غرضی اور راحت وسکون والا اسلام ہے جس کی تبلیغ ڈاکٹر اسرار صاحب فرما رہے ہیں اس موقع پر جناب موصوف کو ایک مشہور صحابی ابو محجن ثقفیؓ کا وہ واقعہ یاد دلانا چاہتا ہوں جو جنگ قادسیہ کے موقع پر پیش آیا اور جو اسلامی تاریخ کی تمام

Marfat.com

بنیادی عربی کتابوں اور صحابہ کرام کے احوال میں جو کتابیں ہیں، جیسے طبقات ابن سعد، استیعاب اور اصابہ از ابن حجر وغیرہ، میں مذکور ہے۔

یہ صحابی مے نوشی کی عادت میں گرفتار تھے اور اس کی سزا میں جنگ قادسیہ کے وقت سپہ سالار حضرت سعد بن ابی وقاص کے کمانڈر کیمپ میں مقید تھے۔ حضرت سعد بن ابی وقاص مرض نقرس کے شدید حملہ کے باعث اس خاص معرکہ کو اپنے اس کیمپ سے دیکھ رہے تھے ابو محجن الثقفی جن کے پاؤں میں بیڑیاں پڑی تھیں، اس وقت بے چین تھے کہ مسلمان اس وقت کفار سے لڑ رہے اور شہید ہو رہے ہیں اور وہ جہاد میں شریک نہیں ہو سکتے، انہوں نے حضرت سعد کی زوجہ محترمہ سلمٰی سے درخواست کی کہ میری بیڑیاں کھول دیں اگر میں اس معرکہ میں شہید ہو گیا تو آپ پر کوئی الزام نہ آئے گا میں اپنے کئے کی سزا پا لوں گا اور بچ گیا تو واپس آ کر خود اپنے پاؤں میں بیڑیاں ڈال لوں گا۔ حضرت سلمٰی کو ان کا جذبہ ایمان پر رحم آ گیا اور ان کو انہوں نے سچا جانا اور بیڑیاں کھول دیں۔ حضرت ابو محجن، حضرت سعد بن ابی وقاص کے بندھے ہوئے گھوڑے پر کود کر بیٹھ گئے اور انہی کی تلوار سے میدان جنگ میں جا کر داد شجاعت دینے لگے۔ دور سے اپنے کیمپ کی بالائی منزل سے جب حضرت سعد نے یہ دیکھا تو وہ حیران ہوئے کہ یہ کون جانباز بہادر ہے ابو محجن الثقفی اپنی بہادر اور تیغ زنی میں بہت مشہور تھے ان کو خیال ہوا کہ یہ ابو محجن ہو سکتے ہیں۔ حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے اپنی زومہ سے اس گمان کا ذکر کیا تو انہوں نے سارا واقعہ بتا دیا، الغرض مسلمانوں کو فتح ہوئی حضرت ابو محجن واپس چپکے سے کیمپ میں آئے، اپنے پاؤں میں وعدہ کے مطابق بیڑیاں ڈالنی چاہیں مگر حضرت سعد رضی اللہ عنہ بن ابی وقاص نے ان کو معاف کرتے ہوئے کہا کہ میں ایسے مجاہد کے پاؤں میں اب بیڑیاں نہیں ڈالوں گا جو مسلمانوں کی جانیں بچانے کے لیے میدان میں کود پڑا تھا۔ حضرت ابو محجن الثقفی نے کہا کہ میں بھی اب کبھی شراب کو ہاتھ نہیں لگاؤں گا اور پھر وہ اپنی توبہ پر قائم رہے۔ "ان اللہ یحب التوابین و یحب المتطهرین"۔

ڈاکٹر اسرار صاحب کس خود ساختہ منطق کے تحت انے انفرادی و اجتماعی اعمال میں کمزور مسلمانوں کو مجاہدین کشمیر کی مدد سے روکنا چاہتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اس مناسبت سے ان کی سورۂ نساء کی آیت کی مزعومہ تفسیر غلط ہے اور دیگر علماء کا موقف انتہائی درست و مضبوط ہے جس کی

Marfat.com

تائیداوپر کے پیش کردہ واقعہ صحابی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ہوتی ہے۔

اس موقع پر جہاد کشمیر کے نام سے عوامی چندہ جمع کرنے والوں پر اس چندہ سے کمیشن لینے کا جو الزام موصوف نے عائد کیا ہے اس کا جواب ان مذہبی جماعتوں کے رہنما دیں گے جو یہ چندہ جمع کر رہی ہیں۔

اپنے مضمون کی دوسری اور آخری قسط (جنگ ۲۸ مئی) میں ڈاکٹر اسرار صاحب نے جہاد کشمیر کے سلسلہ میں وہ خیارات (Options) یعنی جنگ اور اقوام متحدہ کی قراردادوں کے مطابق استصواب آراء کی کامیابی کے امکانات کی نفی کرتے ہوئے تیسرے ''آپشن'' کی کھل کر دعوت دی ہے۔ وہ فرماتے ہیں ''گویا مسئلہ کشمیر کے حل کے لیے ہمیں تھرڈ آپشن کو اختیار کرنا ہوگا۔''

اس سے قبل موصوف نے امریکہ کی زبردست طاقت سے ڈراتے ہوئے اور علامہ اقبال کے ایک مصرع کی ریڑھ مارتے ہوئے فرمایا ہے: ''جانتا ہے جس پر روشن باطن ایام ہے'' کے مصداق عالمی حالات سے تھوڑی بہت واقفیت رکھنے والا ہر شخص جانتا ہے کہ اب امریکہ کو ''سول سپریم پاور آن ارتھ'' یعنی ''روئے زمین کی واحد عظیم ترین قوت کی حیثیت حاصل ہوگئی ہے۔''

علامہ اقبال نے تو اپنے اس شعر

جانتا ہے جس پہ روشن باطن ایام ہے
مزدکیت فتنہ فردا نہیں اسلام ہے

میں ابلیس کے کمیونزم کے مقابلہ میں اسلام سے اپنے خوف کا ذکر کیا تھا اور یہ عجیب حسن اتفاق اور ان کی بصیرت کا کرشمہ ہے کہ جہاد افغانستان نے ان کی پیش گوئی سچ ثابت کر دکھائی۔ مجاہدین افغانستان کی قربانیوں سے کمیونزم (مزدکیت جدیدہ) کی عمارت دھڑام سے زمین پر گر گئی۔ ڈاکٹر اسرار صاحب یا کسی اور کو یہ امریکہ کا کرشمہ نظر آتا ہو تو ہو لیکن ساری دنیا اس کے خلاف یہی کہہ رہی ہے کہ یہ جہاد افغانستان کا کرشمہ تھا۔ جنگی امداد تو روس نے جمال عبدالناصر کے سوشلسٹ مصر کی بھی بہت کی تھی زبردست میزائل پہلی بار ایک عرب ملک کو فراہم کیے تھے، مگر سن ۱۹۶۷ء کی جنگ میں انتہائی ذلت آمیز شکست مصریوں کا مقدر تھی کیونکہ وہ مجاہدانہ کردار اور مرد

Marfat.com

مومن کے مضبوط ہاتھوں سے محروم تھے۔

حیرت کی بات ہے کہ ڈاکٹر اسرار صاحب نے جو دین کے ترجمان بھی ہیں اور قرآنی آیات بکثرت اپنے مضامین میں استعمال کرتے ہیں امریکہ کو خدا کی زمین پر خدائی کا درجہ دے دیا ''سپریم سول پاور آن ارتھ'' ارشاد ربانی اور ایسے دوسرے متعدد قرآنی ارشادات بھول گئے۔ وللہ ملك السموات و الارض (اور اللہ ہی کے لیے ہے، آسمان و زمین کی بادشاہت و اقتدار) اور پھر دیکھئے کہ ''روئے زمین کی اس عظیم ترین واحد قوت'' نے چار سال سے لیبیا کا، ایران کا، شام کا، بلکہ عراق تک کا کیا بگاڑ لیا ہے۔ اپنی شر پسندی سے خاص طور پر لیبیا و عراق پر زندگی تلخ کر رکھی ہے۔ لیکن وہاں انسان آزاد ہیں اور جی رہے ہیں۔ اسی طرح شمالی کوریا اور ویتنام کا مسئلہ ہے اب آخر الذکر میں امریکہ خود مارکیٹ تلاش کرنے کے لیے وہاں کے چکر لگا رہا ہے۔ دریا ابھی تک اللہ تعالیٰ کے حکم اور اس کی سنت، (قانون کائنات) کے مطابق بہتے ہیں، زمین غلہ اگاتی ہے، امریکہ کے بس میں نہیں کہ انسانوں کو اس سے محروم کر دے۔ نواز شریف کے عہد حکومت میں دو سال تک پاکستان امریکہ کی مالی امداد کے بغیر جیتا رہا اور اس غیرت مند انسان نے امریکہ کے سامنے کشکول گدائی لے جانا پسند نہیں کیا، اور اس کی حکومت کے خاتمہ کے ساتھ ہی ورلڈ بینک کے ایک اعلیٰ افسر اور اب ہمارے نگراں وزیر اعظم کی وساطت سے ہماری نئی حکومت پر ورلڈ بینک اور آئی ایم ایف مہربان اور مزید حصول سود کے لیے نئے قرضے دینے پر تیار ہو گئے۔

ڈاکٹر اسرار صاحب کا یہ خیال غلط ہے کہ امریکہ کشمیر میں ایک دوسرا اسرائیل بنانا چاہتا ہے جہاں سے وہ آس پاس کے ممالک اور چین کو کنٹرول کرے۔ وہ یہ بھول رہے کہ اسرائیل ان یورپین یہودیوں کی کوششوں سے اور انہی کے لیے بنایا گیا تھا جو یورپ میں بکھرے ہوئے تھے اور وہ لاکھوں کی تعداد میں وہاں آ کر مغربی تہذیب کے علمبردار ہیں۔ کشمیری یہودیوں کی طرح برسہا برس سے یورپ میں غیر ملکی عناصر کی طرح زندگی نہیں گزار رہے ہیں کہ لاکھوں کی تعداد میں ان کو لا کر وہاں بسایا جا چکے۔ پھر کشمیری مسلمانوں کی وفاداری اول و آخر اسلام سے ہے۔ جب وہ لاکھوں کی تعداد میں وہاں بھارت کی فوج کے ہوتے ہوئے بھارتی حکومت کے اقتدار کو برداشت نہ کر سکے اور اس کے خلاف اپنے محدود وسائل کے باوجود مسلح جہاد کے لیے کھڑے ہو گئے تو وہ

Marfat.com

اپنے ملک میں امریکن اقتدار کو کیسے برداشت کر لیں گے۔ امریکہ بھی ایسا بے وقوف نہیں کہ بھڑوں کے اس چھتے میں ہاتھ ڈالے، ہاں وہ بھارت کی مدد کی خاطر جو چار سال کے اس جہاد حریت سے گھبرا گیا ہے، اس کے مفادات کے مطابق یہ مسئلہ حل کرانا چاہتا ہے۔ لیکن کشمیری مسلمان اگر ڈٹے رہے، مجاہدین افغانستان کی طرح، تو انشاء اللہ وہ ضرور کامیاب ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ کی نصرت ان پیمانوں کی پابند نہیں جو ڈاکٹر اسرار احمد نے مقرر کر رکھے ہیں۔ وہ مظلوموں کی بھی مدد کرتا ہے اور پھر یہ کشمیری مسلمان تو کلمہ گو ہیں۔

انہوں نے کمانڈر غلام محمد صفی صاحب (حزب المجاہدین) کے الفاظ سے جہاد کی جو تصویر پیش کی ہے وہ درست نہیں، ابھی چند ماہ قبل ایک مخلص دوست کے گھر میں ان کے اور ایک دوسرے مجاہد کمانڈر کے ساتھ نشست ہوئی تھی اور وہ پوری طرح پر امید تھے میں نے ان سے ہتھیاروں کی فراہمی کے بارے میں سوال کیا تو ان کا جواب تھا کہ ہم بھارتی افواج سے ہی ہتھیار چھینتے ہیں۔ ایک دوسرے کشمیری رہنما نے ابھی دو ماہ قبل ایک تقریب میں بتایا تھا کہ ہم ہتھیار چھیننے کے علاوہ وہاں کی پولیس سے خریدتے بھی ہیں، سو کشمیری مجاہدین کے لیے کوئی بے بسی کا عالم نہیں۔ ہاں ضیاء الحق مرحوم کے بعد پاکستان سے ان کی شکایت بجا ہے جس طرح ان کے جہاد حریت کو بالواسطہ نقصان پہنچایا گیا ہے۔ اب امریکہ بھارت پر ہی زیادہ مہربان ہے۔ کیونکہ "الکفر ملة واحدة" (کافرانہ طاقتیں باہم دگر ایک ملت ہیں)۔

ڈاکٹر اسرار صاحب کے طویل مضمون کا لب لباب یہ ہے کہ پاکستان کو بھارت کے ساتھ کچھ لے دے کر بلکہ دب کر مصالحت کر لینی چاہیے۔ انقلابی فکر و منہاج کی دعوت دینے والے ایک داعی اسلام کے قلم سے یہ بات بڑی عجیب و غیر متوقع ہے۔ انقلابی لوگ تو سودے بازیاں نہیں کرتے وہ تو اپنی دھن کے پکے اور نتائج کی پروا کیے بغیر جرأت مندانہ اقدامات پر عمل پیرا ہوتے ہیں۔ انقلاب فرانس، انقلاب روس وغیرہ سب انقلابات اسی کے مظہر ہیں۔ وہ شاعر اسلام، جس کے اشعار ڈاکٹر صاحب موصوف کثرت سے اپنے مضامین میں پیش کرتے ہیں۔ اس نے تو بنیوں والی یہ سودے بازی پسند نہیں کی بلکہ جرأت ایمانی کا یہی درس "دارو ہے ضعیفوں کا لاغالب الاھو" دیا تھا۔ اور یہی تاریخ کا بھی سبق ہے کہ جو قومیں اپنے خون سے اپنی تاریخ لکھتی

Marfat.com

ہیں بالآخر ہی کامیاب ہوتی ہیں۔ عصر حاضر میں ویتنام، الجزائر اور افغانستان کی مثالیں ہمارے سامنے ہیں۔ اس کے برخلاف یاسر عرفات کو اریحا کا ایک گاؤں اور غزہ کی پٹی مصالحت کے نتیجے میں ملی۔ ایک خوبرو اور نوجوان عیسائی لڑکی سے شادی کے بعد۔ اس صلح پر ایک مومن فلسطینی نوجوان نے یاسر عرفات کے بارے میں مجھ سے کراچی میں کہا کہ "خسر الدنیا والآخرة" یعنی اس نے اپنی دنیا و آخرت دونوں برباد کیں۔ ان کے مضمون کا ایک دوسرا خطرناک اور ظالمانہ پیغام یہ ہے کہ کشمیریوں کو مذاکرات میں شامل کئے بغیر بھارت وہ پاکستان دونوں تھرڈ آپشن کے مطابق کشمیر کا مسئلہ طے کرلیں۔ اس بارے میں یہاں تک انکشاف کیا ہے۔ جس کے لیے دونوں ملکوں کے اصحاب دانش و بینش کی حد تک تو زمین بہت ہموار ہو چکی ہے۔" یہ کون سے اصحاب دانش و بینش ہیں کہ کشمیریوں کا مسئلہ ان کی بغیر مرضی کے طے کریں؟ یقیناً یہ سادہ لوحی ہوگی اور اس کے نتائج بد ان دونوں ملکوں کے ایسے اصحاب دانش و بینش کو بھگتنا پڑیں گے۔ مسئلہ کشمیر کا صرف ایک ہی حل ہے کہ یا تو استصواب رائے کے ذریعہ ان کو اپنا سیاسی مستقبل طے کرنے کی اجازت دی جائے۔ یہی عام انسانی حقوق اور بین الاقوامی قانون کا تقاضا ہے۔ یا پھر وہ جہد مسلسل کے ذریعہ اپنی منزل کو پہنچیں گے جس طرح فرانس کے مقابلہ میں جزائر کے مجاہدین پہنچے تھے۔ "واللہ غالب علٰی امرہ و لکن اکثر الناس لا یعلمون" (اللہ اپنے معاملہ میں غلبہ رکھنے والا ہے لیکن بیشتر لوگ اس کو جانتے نہیں)۔

(روزنامہ جنگ کراچی، جون ۱۹۹۴ء)

Marfat.com

Marfat.com

اسلام میں عورت کی حکمرانی۔ایک تنقیدی جائزہ

روزنامہ جنگ کراچی کی اشاعت ۲۵ اکتوبر ۱۹۹۳ء میں ''مولانا'' کوثر نیازی صاحب کا ایک مضمون بعنوان ''کیا عورت حکمران ہوسکتی ہے'' شائع ہوا۔مضمون میں جو انداز بحث اختیار کیا گیا ہے اس سے واضح ہوتا ہے کہ صاحب مضمون اس کو جائز سمجھتے ہیں۔گویا یہ ان کی ذاتی رائے ہے جس کا ان کو حق ہے، لیکن اس کے لیے قرآن وحدیث اور فقہ وتاریخ سے جو وجہ جواز پیش کی گئی ہے اور جو خود ساختہ تاویلات اور غلط حوالے پیش کیے گئے ہیں ان کا تنقیدی جائزہ اس مضمون کا محرک ہے، نہ کوئی مخصوص سیاسی نقطۂ نظر اور نہ ذاتی پرخاش۔یہاں اس امر کا ذکر بے محل نہ ہوگا کہ ایک فوجی آمر ایوب خان مرحوم کے عہد میں صدارتی انتخاب کے موقع پر ایوب خان کی مرحومہ محترمہ فاطمہ جناح کے مقابلہ میں حمایت کرتے ہوئے کوثر نیازی صاحب عورت کی حکمرانی کو ناجائز قرار دے چکے ہیں۔

ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس تنقیدی جائزے سے قبل کوثر نیازی صاحب کی بعض تاریخی اغلاط کی نشاندہی کردی جائے تاکہ قارئین معلومات صحیح کرلیں۔

۱۔ اپنے مضمون کے نمبر (٦) کے تحت مسلمان خواتین حکمرانوں کے ذکر میں موصوف نے مصر کی ملکہ شجرۃ الدر کو بادشاہ مصر نجم الدین کی بیٹی لکھا ہے، یہ صریحاً غلط ہے۔شجرۃ الدر سلطان نجم الدین ایوب کی بیٹی نہیں بلکہ کنیز تھی۔نجم الدین ایوب کے بیٹے توران شاہ کے قتل کے بعد یہ انہی مملوک (غلام) قاتلوں کے سہارے ملکہ بنی اور وہ بھی صرف تین ماہ کے لیے، جس کے بعد اسے ایک مملوک سردار معز الدین ایبک سے شادی کرنا پڑی، پھر اس نے نسوانی غیرت میں آکر چند سال بعد اپنے اس شوہر کو قتل کرادیا۔جس کے بعد معز الدین ایبک کے وفادار غلاموں نے شجرۃ الدر کو قتل کردیا، اس کی لاش تین دن تک بے گور وکفن پڑی رہی۔اس کے لیے مصر کی کوئی بھی تاریخ دیکھی جاسکتی ہے، خاص طور پر ابن تغری بردی کی ضخیم تاریخ النجوم الزاہرۃ فی ملوک مصر وقاہرہ (جلد

Marfat.com

۶ صفحات ۳۶۴ تا ۳۷۹)۔ یہاں قابل ذکر بات یہ ہے کہ خلیفہ بغداد نے اس کو جائز حکمران تسلیم نہیں کیا تھا بلکہ مصر پیغام بھیجا تھا کہ اگر وہاں کوئی مرد حکمرانی کے لیے نہیں تو بغداد سے بھیج دیا جائے۔

۲۔ یمن کی ملکہ کا نام فاضل مضمون نگار نے فاطمۃ الشریفہ لکھا ہے اور اس کو ''ملکۃ العرب و الاسلام'' کا لقب دیا ہے۔ یہ بھی غلط ہے اس نام کی کوئی عورت یمن میں حکمران نہیں ہوئی بلکہ جو ایک عورت حکمران ہوئی اس کا نام السیدہ اروی الحمیر یہ تھا اور یہ ایک شیعی اسماعیلی خاندان صلیحی سے تھی جو مصر کے اسماعیلی فاطمی خلیفہ کے تابع تھا، اس وقت یعنی پانچویں چھٹی صدی ہجری میں بغداد کی عباسی خلافت اس کی معترف نہ تھی اس لیے اس کو ''ملکۃ العرب و الاسلام'' کہنا صحیح نہیں، نہ کسی نے کہا ہے، سوائے فرقہ اسماعلیہ کے۔ پھر یہ بھی اس لیے ملکہ بنی کہ اس کے شوہر المکرم کی کوئی اولاد نرینہ نہ تھی۔ سو یہ یمن کے ایک مخصوص علاقہ صفاء و جبلہ کی ملکہ بن گئی، بہر حال یہ ایک مخصوص فرقہ کا مسئلہ ہے، عام عالم اسلام سے اس کا کوئی تعلق نہیں (حوالہ کے لیے یمن کی کوئی بھی تاریخ دیکھی جاسکتی ہے) یا پھر مشہور شامی مصنف و محقق الزرکلی کی کتاب الاعلام (جلد اول، ص ۲۷۹)

۳۔ سلجوقی خاندان کی ایک ''ملکہ ترخان خاتون'' کا بھی مضمون میں ذکر کیا گیا ہے، یہ کوثر نیازی صاحب کے ذہن کی اختراع ہے، اس خاندان میں کوئی عورت حکمران نہیں ہوئی، ترخان خاتون نام بھی غلط ہے۔ صحیح نام ترکان خاتون ہے، یہ سلطان ملک شاہ سلجوقی کی بیوی تھی، سلطان کی وفات کے بعد اس نے اپنے چھوٹے نابالغ بیٹے کو حکمران بنانے کے لیے بعض سرداروں کے ساتھ مل کر سازش کی، جائز وارث اور اپنے سوتیلے بیٹے برکیاروق اور اپنے بیٹے محمود کے حامیوں میں جنگ کرائی، دو سال کے فتنہ اور جنگ و جدال کے بعد برکیاروق کی پوری مملکت سلاجقہ پر حکومت قائم ہوئی اور اپنی سازشوں کی پاداش میں یہ قتل ہوئی۔

۴۔ سعودی عرب میں پہلی بار ٹیلیفون کی آمد کے حوالہ سے علماء و شیوخ نجد کی تضحیک کرتے ہوئے کوثر نیازی صاحب نے اس کو ''شاہ سعود'' کے عہد کا واقعہ بتایا ہے۔ جو سراسر غلط ہے۔ یہ شاہ سعود نہیں ان کے والد ملک عبدالعزیز کے عہد کا واقعہ ہے جب کہ اس بیسوی صدی کی ابتداء میں انہوں نے ریاض میں از سر نو اپنی حکومت قائم کی تھی، ریاض اس وقت دنیا سے الگ تھلگ ایک بڑا

Marfat.com

گاؤں تھا، شاہ سعود تو ۱۹۵۳ء میں بادشاہ بنے تھے، جب میں ۱۹۵۰ء میں مکہ مکرمہ میں موجود تھا تو اس وقت تمام بڑے علماء نجد کے گھروں میں ٹیلیفون موجود تھے۔ نئی ایجادات کے بارے میں اس طرح کا ردعمل یورپ میں بھی ہوا ہے۔ ان ملک عبدالرحمٰن بن عبدالرحمٰن آل سعود کو باہر کے ملکوں میں ابن سعود کے نام سے بھی یاد کیا جاتا ہے، لیکن سعود کے نام سے نہیں۔

جہاں تک قرآن وحدیث کے حوالوں کا تعلق ہے تو انتہائی افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ ان میں صاحب مضمون نے بڑی مغالطہ آفرینی سے کام لیا ہے جو علمی دیانت کے بالکل خلاف ہے۔

ا۔ موصوف یہ ثابت کرنے کے لیے کہ قرآن میں کہیں مردوں کو عورتوں پر حکمرانی کی تصریح نہیں کی گئی ہے، سورۂ نساء کی مشہور آیت میں واقع لفظ "قوامون" کا ترجمہ تمام مفسرین واہل لغت کے برخلاف "کفالت کرنے والے اور روزی مہیا کرنے والے" بتاتے ہیں اور اس کے لیے لسان العرب اور تاج (یعنی تاج العروس) کا حوالہ دیا ہے اور موصوف نے اپنے اس مفہوم کی تائید میں آیت بالا میں واقع ایک جملہ بما انفقوا من اموالھم کا سہارا لیا ہے۔ جہاں تک لسان العرب کا تعلق ہے تو اس میں ہرگز وہ معنی نہیں لکھے ہیں جو صاحب لسان سے کوثر نیازی صاحب نے منسوب کئے ہیں، بلکہ اس کے برخلاف اس ضخیم و مستند لغت میں اس کے معنی محافظ اور اصلاح کرنے والے کے لکھے ہیں (ج ۱۲ ص ۴۹۷۔ بیروت ایڈیشن) اور یہاں قرآن کی آیت زیر بحث لکھی ہے۔ مزید یہ کہ لسان العرب سے کافی قدیم تر اور اہم لغت جو خاص قرآنی الفاظ کی تشریح میں لکھی گئی ہے یعنی علامہ راغب اصفہانی کی کتاب "المفردات" اس میں بھی "قوام" کے وہ معنی نہیں لکھے ہیں جو کوثر نیازی صاحب نے اختراع کیے ہیں۔ بلکہ تقریباً وہی معنی ہیں جو لسان العرب میں ہیں "کسی شے کی نگہبانی اور حفاظت بطریقہ اختیار کرنے والا" (بیروت ایڈیشن ص ۴۱۶) پھر یہ کہ قرآن میں کفالت کے مفہوم کے لیے یہی لفظ استعمال کیا گیا ہے جو اردو میں بھی مستعمل ہے۔ "ایھم یکفل مریم" (کون مریم کی کفالت کرے گا)؟

پھر مسئلہ اردو میں غلط یا صحیح ترجمہ کا نہیں ہے بلکہ عربی زبان جس میں قرآن نازل ہوا ہے اس میں اصلی معنی ومفہوم کا ہے، قرآن کو سمجھنے کے لیے خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ہاتھوں ایک علم کی بنیاد رکھی گئی جس کو تفسیر کہتے ہیں، اور صحابہ کرام وتابعین ودیگر علمائے عرب نے

Marfat.com

اس کو پروان چڑھایا۔ اس لیے مستند تفاسیر قرآن کے سہارے کے بغیر محض عربی لغت سے قرآنی الفاظ کے معانی و مفاہیم متعین کرنا بداہتہً ایک غلط بات ہے اور تمام قدیم و جدید ثقہ و مستند مفسرین جیسے امام ابن جریر الطبری، حافظ ابن کثیر، قرطبی اور زمخشری وغیرہ نے 'قوام' کے وہی معنی لکھے جو بعد میں ہندو پاکستان کے علماء نے اپنے تراجم میں اختیار کیے، یعنی عورتوں پر حاکم و نگراں۔ ان میں سے اسلام کے عقلی مکتب فکر کے ایک مشہور عالم اور ماہر لغت زمخشری نے تو یہاں تک لکھا ہے کہ ''وہ عورتوں پر اس طرح حاکم و نگراں ہیں جس طرح حکمران اپنی رعیت پر ہوتے ہیں۔'' (کشاف ص ۵۲۳)۔ یہاں گنجائش نہیں ورنہ ان دیگر مفسرین کے حوالے سے بھی ان کی تفاسیر سے دیئے جا سکتے تھے۔

۲۔ اس کے بعد موصوف اسلام میں عورت کی حکمرانی کے جواز کی وکالت کرتے ہوئے رقم طراز ہیں کہ ''اس ایک آیت کے برعکس قرآن کی سورۃ النمل میں ملکۂ سبا حضرت بلقیس کا قصہ بیان کیا گیا ہے جو ایک جمہوری حکمران تھیں۔'' مزید یہ کہ وہ اس موقع پر کہتے ہیں کہ کسی دلیل سے ثابت نہیں کہ حضرت سلیمان علیہ السلام نے ان کو یمن کی حکمرانی سے ہٹا دیا ہو۔''

اس مسئلہ میں مولانا تھانوی سے جو غلط فتویٰ منسوب کیا گیا ہے اس کی تردید تو مولانا محمد یوسف لدھیانوی کر چکے ہیں، مجھے یہاں صرف یہ کہنا ہے کہ بلقیس کا نام نہ تو قرآن میں ہے نہ حدیث میں نہ تورات میں۔ بعض یہودی روایات میں جو ایرانی افکار سے متاثر تھیں یہ نام آیا ہے جن میں ان کی شادی بلقیس سے کرا دی گئی ہے۔ اسی لیے کوثر نیازی صاحب نے ملکۂ سبا کے موہوم نام کے ساتھ احتراماً ''حضرت'' کا لفظ لگایا ہے جو بے محل ہے پھر موصوف پر یہ القاء کہاں سے ہو گیا کہ وہ ایک جمہوری حکمران تھی۔ یمن کی قدیم تاریخ پر کافی کام ہوا ہے اور انگریزی و عربی زبانوں میں کافی مواد موجود ہے، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ وہاں وراثتی بادشاہت قائم تھی، جمہوری حکمرانی کا ذکر مطلقاً نہیں ملتا۔ حضرت سلیمان و بلقیس کی شادی کا قصہ شاعرانہ تخیل کی پیداوار ہے اس کا قرآنی حقائق سے کوئی تعلق نہیں۔

حضرت سلیمان علیہ السلام نے اس کو اسلام لانے کے بعد حکمرانی پر برقرار نہیں رکھا یمن کے قدیم ترین یہودی نومسلم مورخ وہب بن منبہ سے روایت ہے کہ ملکہ سبا کے اسلام لانے کے بعد

Marfat.com

حضرت سلیمان علیہ السلام نے اس کی شادی اس کی خواہش کے مطابق یمنی علاقہ کے ایک دوسرے بادشاہ ذاتبع سے کرا دی اور اس کو یمن کا حکمران مقرر کر دیا۔ (ملاحظہ ہو تاریخ طبری، جدید مصری ایڈیشن ج ۱۔ص ۴۹۵) اس روایت کو قرطبی نے بھی اپنی مشہور تفسیر (ج ۳۔ص ۱۸۳) میں نقل کیا ہے۔

اس قصہ کے ذکر میں اور اس ممکنہ غلط فہمی کے اندیشہ سے امام قرطبی نے اپنی تفسیر (حوالۂ بالا) میں بخاری کی وہ مشہور حدیث جس میں ہے کہ ''وہ قوم کبھی کامیاب نہیں ہوسکتی جو عورت کو حکمران بنائے'' تصریح کی ہے یہ کہ عورت کی حکمرانی جائز نہیں اور یہاں انہوں نے اندلس کے مشہور قاضی وعلامہ ابوبکر ابن العربی کا قول بھی نقل کر دیا ہے کہ اس مسئلہ میں امت کے درمیان کوئی اختلاف نہیں۔

۳۔ اس کے بعد کوثر نیازی صاحب صحیح بخاری کی اس مشہور حدیث کی تکذیب کی سعی لاحاصل کرتے ہیں، جس کا ابھی ذکر کیا گیا، اور چونکہ وہ امام بخاری کے امت میں مرتبہ واحترام سے واقف ہیں اس لیے وہ ان کا نام لیے بغیر ایک شک آفرین انداز میں اس کا ذکر کرتے ہیں'' لے دے کر علما کرام اس سلسلہ میں (اسلام میں عورت کی حکمرانی کا عدم جواز) ایک حدیث پیش کرتے ہیں جس میں راوی کہتا ہے مجھے جنگ جمل کے دوران رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اس قول سے اطمینان ہوا کہ جب ایرانیوں نے اپنے بادشاہ کسریٰ کی بیٹی کو اپنا حکمران بنایا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس قوم نے عورت کو اپنا حکمران بنایا وہ کبھی فلاح نہیں پاسکتی۔''

موصوف نے اس حدیث کے ترجمہ میں غلطی کی ہے ''اطمینان'' کے بجائے صحیح ترجمہ یہ ہے کہ ''اللہ نے مجھے اس قول رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے فائدہ پہنچایا۔'' (کیونکہ حدیث میں لفظ نفعنی اللّٰہ ہے)۔

یہ حدیث نہ صرف صحیح بخاری میں بلکہ صحاح ستہ میں ترمذی ونسائی اور دیگر مستند کتب حدیث جیسے صحیح ابن حبان، مستدرک الحاکم اور مسند الامام احمد بن حنبل وغیرہ میں بھی ہے۔ موصوف نے حدیث کے آخری راوی یعنی صحابی رسول حضرت ابوبکرۃ الثقفی کا نام حذف کرتے ہوئے ''راوی کہتا ہے'' کا جملہ لکھا ہے۔

Marfat.com

دوسرا اعتراض یہ ہے کہ اس حدیث کے سب راوی بصری ہیں اور ''جس حدیث کے راوی مدنی یا مکی نہ ہوں اس کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں'' یہاں انہوں نے پھر حافظ ابن حجر کو غلط طور پر اپنا گواہ بنایا ہے اور سیوطی کی کتاب تدریب الراوی سے جو حوالہ پیش کیا ہے وہ بھی غلط اور ادھورا ہے۔

تیسرا اعتراض عقلی ہے کہ یہ قول رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نہیں ہو سکتا، کیونکہ تاریخ اس کے خلاف شہادت دیتی ہے کہ مشرق و مغرب میں متعدد خواتین حکمران ہوئیں، جن کے ادوار حکمرانی سنہری ادوار تھے۔

پھر ان کا آخری اعتراض مضمون کے آخر میں حدیث زیر بحث کے ایک لفظ پر ہے، یعنی موصوف نے اپنی عربی زبان دانی کے زعم میں لفظ ''قوم'' کو غلط قرار دیتے ہوئے اس کی جگہ ''القوم'' تصحیح کی ہے، تاکہ حدیث کے معنی کا اطلاق صرف ایرانی قوم پر کیا جا سکے۔

دین کا علم رکھنے والے اور علماء تو اس سے یقیناً متاثر نہیں ہوں گے لیکن عام قارئین کے لیے یہ سب گمراہی کا باعث ہو سکتا ہے کہ وہ کہاں ان حوالوں کی توثیق کریں گے!

ہمارے جوابات مندرجہ ذیل ہیں:

ا۔ اس حدیث کے آخری راوی حضرت ابوبکرۃ الثقفی، صحابی رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں، جو جنگ جمل کے موقع پر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے ساتھ اس جنگ میں شریک ہونا چاہتے تھے لیکن جب ان کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی یہ حدیث یاد آئی تو وہ اس سے باز رہے۔ یہ بات انہی حافظ ابن حجر عسقلانی نے لکھی ہے جنہیں کوثر نیازی صاحب نے اپنا شریک اعتراض بنایا ہے اور اس مقام پر ہے جس کا حوالہ موصوف نے دیا ہے یعنی جلد ۱۳ ص ۵۶۔ ان کی رائے ہرگز یہ نہیں ہے کہ ''حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی قیادت ثابت کرنے کے لیے اس روایت کا سہارا لیا گیا'' کس نے یہ سہارا لیا؟ بالفاظ دیگر یہ حدیث وضع کی، ایک صحابی رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے جن سے بیسیوں احادیث کتب حدیث میں منقول ہیں۔ کون ذی عقل یہ تسلیم کر سکتا ہے کہ حافظ ابن حجر کسی صحابی رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ایسا الزام لگا سکتے ہیں یا امام بخاری کی کسی حدیث میں شک کر سکتے ہیں؟

کوثر نیازی صاحب کے قول کے بالکل برعکس فتح الباری کے اسی صفحہ پر جس کا حوالہ

Marfat.com

موصوف نے دیا ہے اس کے عظیم مصنف ابن حجر کا یہ قول ملے گا کہ ابوبکرۃ رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث کی روشنی میں جمہور کا فیصلہ ہے کہ عورت کے لیے قاضی ہونا (حکمرانی تو درکنار) جائز نہیں ہے (فتح الباری ج ۱۳۔ ص ۵۶) امارت یا حکمرانی کا عدم جواز وہ اس سے قبل جلد ہشتم میں لکھ چکے ہیں۔

جہاں تک ان کے دوسرے اعتراض کا تعلق ہے کہ ''اس کے سب راوی بصری ہیں اور یہی حافظ ابن حجر نے لکھا ہے'' ''والاسناد کله بصریون'' اس لیے یہ حدیث لائق اعتبار نہیں۔ تو وہ ذرا آگے کے الفاظ پڑھ کر فتح الباری میں اس جگہ (ج ۸۔ ص ۹۷۔ مضمون میں صفحہ ۱۲۸ غلط ہے) مصنف کا یہ قول بھی تو دیکھ لیتے کہ ''اس حدیث کی بناء پر جمہور کا یہ قول ہے کہ عورت حکمراں اور قاضی نہیں ہوسکتی۔ ببیں تفاوت راہ از کجاست تا بکجا۔'' یہ تو وہی بات ہوگئی کہ کوئی آدمی پوری آیت قرآنی لکھنے کے بجائے صرف یہ لکھے ''یاایها الذین امنوا لا تقربوا الصلوٰة'' (اہل ایمان نماز کے قریب نہ جاؤ۔۔۔۔) اور باقی جملہ یعنی وانتم سکارىٰ (جب نشہ کی حالت میں ہو) حذف کردے۔

اب جہاں تک سیوطی کی کتاب تدریب الراوی سے استدلال کا تعلق ہے تو وہاں مولانا کوثر نیازی نے امام شافعی کے قول کا ترجمہ غلط کیا ہے، اور اس کے مفہوم کو بھی غلط سمجھا ہے۔ موصوف نے ترجمہ یوں کیا ہے کہ ''جس حدیث سے مکہ اور مدینہ کے اصحاب واقف نہ ہوں اس کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں'' امام شافعی کا قول یہ نہیں بلکہ یہ ہے کہ جو حدیث بھی پیش کی جائے اور اس کی اصل حجاز میں نہ ہو تو وہ قبول نہیں کی جاسکتی۔ اب جس صحیح حدیث نبوی کی تکذیب میں غلط طور پر اس قول سے استدلال کیا جارہا ہے اس کی اصل تو حجاز سے ہی ہے کیونکہ اس کے آخری راوی حضرت ابوبکرۃ الثقفی طائف میں اسلام لانے کے بعد مدینہ میں رہتے تھے اور وہیں سے وہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں بصرہ آباد ہونے پر منتقل ہوئے۔ شاید حضرت ''مولانا'' ابوبکرۃ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو ہمیشہ سے ہی بصرہ کا باشندہ سمجھتے ہیں! اگر یہی منطق درست ہے تو پھر کیا سیکڑوں ان صحابہ کی احادیث غلط نہ ٹھہریں گی جو حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں حجاز سے جا کر کوفہ، بصرہ، شام اور مصر وغیرہ نئے مفتوحہ ممالک میں آباد ہوگئے تھے، جن میں حضرت انس رضی اللہ عنہ

Marfat.com

، حضرت جابر رضی اللہ عنہ، حضرت ابوموسیٰ الاشعری رضی اللہ عنہ، حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ وغیرہ جیسے جلیل القدر صحابہ شامل ہیں۔ اگر موصوف کی یہی منطق درست ہے تو حضرت انس رضی اللہ عنہ کی وہ حدیث بھی غلط ٹھہرے گی جو بخاری میں ہے کہ ظالم و مظلوم بھائی کی مدد کرو، پوچھا گیا کہ مظلوم کی مدد تو درست ہے ظالم کی مدد کس طرح کی جائے، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا اس کو ظلم سے روکو، یہی اس کی مدد ہے''او کما قال علیہ الصلوٰۃ و السلام ''اب اس حدیث کے بھی سارے راوی بقول حافظ ابوعمرو ابن الصلاح بصری ہیں۔ (مقدمہ ابن الصلاح، بیروت ایڈیشن ص ۲۰۱) لیکن کوثر نیازی صاحب اس کو عالی الاسناد قرار دیتے ہیں۔

مولانا کوثر نیازی نے تدریب الراوی کے اس صفحہ پر قصداً امام شافعی کے ایک دوسرے قول سے صرف نظر کیا ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ بعد کو ان کی اس معاملہ میں رائے بدل گئی تھی اور جو یہ ہے کہ ''امام شافعی نے امام احمد بن حنبل سے کہا کہ تم حدیث اور اس کے راویوں کا حال مجھ سے بہتر جانتے ہو، اب اگر کوئی صحیح حدیث ہو تو وہ مجھے بتاؤ خواہ اس کے راوی کوئی ہوں، بصری ہوں یا شامی تاکہ اگر وہ صحیح ہو تو میں اس کو اختیار کروں۔'' (تدریب الراوی ص ۲۳) امام شافعی کا یہ قول سیوطی سے چھ سال قبل مشہور ناقد حدیث و رجال ابن ابی حاتم نے اپنی کتاب آداب الشافعی ومناقبہ (ص ۹۵) میں نقل کیا ہے اور وہیں سے سیوطی نے لیا ہے۔

تیسرے اعتراض کے جواب میں عرض ہے کہ تاریخ نے ہرگز اس حدیث رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تردید کی جرأت نہیں کی۔ بس اختلاف ''فلاح'' کے مفہوم میں ہے، موصوف کا معیار فلاح وہ مادہ پرستانہ نقطہ نظر ہے جس کی بناء پر انہوں نے دنیاوی ترقی و خوشحالی، کثرت فتوحات، فراوانی مال و زر اور دبدبہ و شوکت کو فلاح سمجھا ہے اور جس کی دلیل ان کی یورپ کی خواتین حکمرانوں کی پیش کردہ مثالیں ہیں لیکن یہ قرآن اور نبی اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا نظریۂ فلاح ہرگز نہیں، وہاں تو یہ ہے ''وہ کامیاب ہوا جس نے اپنا تزکیہ نفس کیا۔'' (سورۃ الاعلیٰ، آیت ۱۴) یا پھر سورۃ المومنون کی ابتدائی چھ آیات ہیں جو شروع ہی شرائط فلاح سے ہوتی ہیں اور ان میں اسلامی عبادات نماز و زکوٰۃ کے علاوہ ایسے اجتماعی و سیاسی اخلاق کا بھی ذکر ہے جن کا تعلق محض دنیوی معاملات سے ہے اور ان کے مطابق فلاح یافتہ وہ مومنین ہیں جو لغویات سے اجتناب، جنسی

Marfat.com

بے راہ روی سے پرہیز اور عہد و پیمان پر پابند اور امانتوں کی ادائیگی کا خیال رکھتے ہیں۔ کوثر نیازی صاحب کے معیار فلاح سے دیکھا جائے تو نعوذ باللہ تاریخ نے ان آیات قرآنی کی بھی تردید کردی ہے کیونکہ روس کی ملکہ کیتھرین اور انگلستان کی ملکہ الزبتھ اول و دوئم اور ہالینڈ وغیرہ کی ملکات کے عہود میں ان شروط پر عمل کا نام ونشان نہیں اور ان کے ادوار حکمرانی کو وہ سنہرا عہد کہتے ہیں۔ کیا ''مولانا'' موصوف بتا سکتے ہیں کہ ان حکمراں خواتین کے عہد حکومت میں زنا کوئی قانونی جرم تھا؟ یا ہے؟ کیا ان کے دربار اور اجتماعی اخلاق لغویات سے پاک تھے؟ کیا ان کے ہاں مرد وزن کے مابین مخلوط رقص کا رواج نہیں تھا اور نہیں ہے؟ کیا ان کے درباروں کی شان و شوکت مزدوروں اور کسانوں کا خون چوس کر اور ظالمانہ ٹیکس لے کر قائم نہیں کی جاتی تھی؟ پھر کیا مولانا کوثر نیازی کو معلوم نہیں کہ برطانیہ میں ہم جنسی یا فطری تعلق زناشوی کے خلاف فعل ملکہ الزبتھ دوئم کے زمانہ ہی میں قانونی طور پر جائز قرار دیا گیا، یہ چھٹی دہائی کے ابتدائی برسوں کا ذکر ہے جب میں کیمبرج (انگلستان) میں زیر تعلیم تھا، میں نے نہ تو اخبارات میں اس پرلے درجہ کی انسانی پستی کے خلاف کوئی بیان پڑھا تھا اور نہ سننے میں آیا کہ ملکہ محترمہ نے برطانوی پارلیمنٹ میں پاس شدہ اس قانون پر دستخط کرنے میں کوئی پس و پیش کیا تھا، اب تو یہ اخلاقی غلاظتیں Gays (خوش وخرم) کے حسین نام سے وہاں بہت زیادہ عام ہوگئی ہیں۔ کیا انہیں ملکہ الزبتھ کی فلاحی ریاست یا ہالینڈ کی ملکہ کی مملکت میں ناجائز بچوں کی تعداد معلوم ہے؟ یہی سب کچھ اندرا گاندھی اور گولڈا میر ممدوحہ مولانا کے اپنے ملکوں کے مسلمان کشمیریوں اور فلسطینی عربوں کے متعلق کہا جاسکتا ہے کہ انہوں نے اپنے عہد و پیمان کا کون سا خیال رکھا؟ رضیہ سلطانہ کے عہد میں فتنہ و فساد برپا رہا۔ وہ ایک اخلاقی جرم میں بھی بقول بعض مورخین ملوث تھی۔ آخر کار بے یار و مددگار ایک گاؤں میں قتل ہوئی، بغداد کے سفیر امام صغانی لاہوری اس کے عہد میں دہلی چھوڑ کر واپس چلے گئے تھے غالباً وہ اس حکمرانی کو جائز نہیں سمجھتے تھے کیونکہ ایک مشہور زمانہ محدث تھے۔ چاند بی بی کو ملکہ ہند کہنا درست نہیں۔ وہ جنوب ہند میں ایک چھوٹے سے علاقے احمد نگر میں اپنے چھوٹے و نابالغ بھتیجے کی نگران نائب تھی اور شجرۃ الدر و رضیہ سلطانہ کی طرح اس کا انجام بھی قتل ہوا۔ بھوپال کی مسلمان خواتین حکمرانوں کی مجبوری انگریزوں کا وہ ظالمانہ قانون تھا کہ اگر ریاست سابق نواب کی اولاد میں منتقل نہ ہوتی تو وہ اس کو

Marfat.com

برٹش انڈیا میں ضم کر لیتے اور اس طرح داخلی طور پر ایک آزاد مسلمان ریاست ختم ہو جاتی۔ اس لیے وہ علماء خاموش رہے مگر ان میں سے کسی نے کہیں یہ فتویٰ نہیں دیا ہے کہ اسلام میں نظری طور پر عورت کی حکمرانی جائز ہے۔

ان مثالوں سے ایک بات واضح ہے کہ مغرب و مشرق میں جہاں جہاں یہ خواتین شاذ و نادر حکمران ہوئیں وہاں وراثتی بادشاہی نظام رائج تھا، جہاں بادشاہ کا بیٹا، بیٹی یا بیوی اس کے بعد حکمرانی کا حق رکھتی تھی۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تو اس کی کوئی مثال قائم نہیں کی، وہ تو آئے ہی اس لیے تھے کہ اس نظام کسرویت و قیصریت کو ختم کریں، نہ خلفاء راشدین نے اس نظام وراثت پر عمل کیا حالانکہ ابوبکر و عمر و عثمان و علی رضی اللہ عنہم کے صاحب زادگان اس کے پوری طرح اہل تھے۔ اب اسلامی تاریخ کے اس زریں و مثالی عہد میں نہ تو وراثتی نظام حکمرانی ملتا ہے اور نہ عورت کی حکمرانی، جب کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا انتہائی اعلیٰ قابلیت کی مالک تھی اور ان کے علم و فضل کی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خود تعریف فرمائی ہے اور صحابہ کرام ان کا انتہائی احترام کرتے تھے، لیکن نہ تو انہوں نے خود اس کی خواہش کی اور نہ صحابہ کرام نے ام المومنین کو یہ پیشکش کی، ان سے زیادہ اسلام کا مزاج شناس کون تھا۔ خلافت راشدہ کے بعد جب بدقسمتی سے اسلام میں نظام حکمرانی میں وراثت کا بادشاہی طریقہ رائج ہو گیا تو اس کے بھی صدیوں بعد ہماری ۱۴سو سالہ تاریخ میں ایشیاء و افریقہ کے بعض ممالک میں ہزاروں حکمرانوں میں صرف چھ خواتین مختصر عرصوں کے لیے حکمراں ہوئیں جن کے عہود میں دو ایک کو چھوڑ کر فتنہ و فساد برپا رہا اور ان کا جو حشر ہوا اس کا ذکر اوپر کیا گیا تو پھر ان خواتین کو بطور مثال پیش کرنا اور اسلامی تاریخ سے عورت کی حکمرانی کا جواز نکالنا کہاں کا انصاف و دانائی ہے؟

پھر یہ بھی تو سوچنا چاہیے کہ انسانیت کی تاریخ میں جہاں مختلف ممالک میں لاکھوں حکمراں ہوئے وہاں کتنی خواتین حکمراں ہوئیں ان سب کو ایک ہاتھ کی انگلیوں پر گنا جا سکتا ہے، آخر کوئی تو اس کی وجہ ہے اور یہ وہی ہے جس کو قرآن نے اسی مذکورہ سورہ نساء کی آیت میں بیان فرمایا ہے یعنی ''مرد عورتوں پر نگراں، ان کے محافظ اور حاکم ہیں بسبب اس فضیلت کے جو اللہ نے بعض کو بعض پر دی ہے۔'' اور اس میں پہلے ''بعض'' سے باتفاق مفسرین، مرد اور دوسرے ''بعض'' سے عورتیں مراد

Marfat.com

نہیں، اور خالق مرد وزن نے اس فضیلت دہی میں عورتوں پر کوئی ظلم نہیں کیا ہے، تو اس لیے ان کو حکمرانی کے بکھیڑوں اور گراں ذمہ داریوں اور جانی خطرات سے چھوٹ دی ہے، اور مردوں پر ان کی حفاظت وحمایت کی ذمہ داری ڈالی گئی ہے اور اسی کو قرآن نے لفظ ''قوامون'' سے تعبیر کیا ہے۔

موصوف نے مسلمانوں میں عورت کی حکمرانی کو جائز نہ سمجھنے کا سبب مخصوص مذہبی رویہ اور معاشی وسماجی جبر کو قرار دیا ہے۔ بعض سطح بیں لوگ کوثر نیازی صاحب کے اس تجزیہ کو شاید اولین نظر میں صحیح سمجھیں، مگر اس کو اگر منصفانہ اور غائرانہ تنقید کی کسوٹی پر کسا جائے گا تو یہ بات کسی طرح درست نظر نہیں آئے گی۔ انہوں نے اس سلسلہ میں جو غلط مثال دی ہے اس پر کچھ کہنے سے قبل یہ سوال کیا جاسکتا ہے کہ یہ سماجی ومعاشی جبر یورپ کے مختلف ممالک جرمنی، فرانس، اٹلی، اسپین، بلجیم وغیرہ اور پھر چین، جاپان اور کوریا وغیرہ میں تو نہیں اور سب سے بڑھ کر دنیا کی سپر جمہوریت امریکہ ہے، ان سب ممالک میں عورتیں معاشی اور سماجی طور پر پوری طرح آزاد ہیں اور وہاں کوئی مخصوص مذہبی رویہ بھی حائل نہیں، پھر وہاں آج تک کوئی خاتون حکمران کیوں نہیں ہوئی؟ دو تین یورپین ممالک کی خواتین حکمرانوں کا ذکر کر کے جو صرف وراثتی اور دستوری حکمران ہیں اور ان کے انتظامی اختیارات کچھ نہیں بلکہ ان کے مرد وزراء اعظم کے ہاتھ میں ہیں، استدلال کرنا درست نہیں۔

اس موقع پر فاضل مضمون نگار نے ایک اور حدیث نبوی ''الائمة من قریش'' (مضمون میں تحریر کردہ القریش غلط عربی ہے، اس نام پر الف لام التعریف داخل نہیں ہوتا ہے) کا جو نیا مفہوم مولانا ابوالکلام کے مضمون سے پیش کیا ہے یعنی یہ کہ کوئی حکم نبوی نہیں کہ خلفاء قریش میں سے ہوں، بلکہ یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ایک پیش گوئی ہے۔ کوثر نیازی صاحب کی اسالیب عربی اور تاریخ سے بے خبری یا تغافل کی دلیل ہے۔ انصار ومہاجرین میں جب خلافت کے مسئلہ پر سقیفہ بنی ساعدہ میں اختلاف ہوا تو اس حدیث نبوی کو انصار نے نبوی حکم سمجھ کر اس کے آگے سر تسلیم خم کر دیا، ان سے زیادہ عربی زبان دان اور مزاج شناس نبوت کون ہو سکتا ہے؟ پھر ابوالکلام آزاد ہزار خطیب بے بدل، عظیم مصنف اور صحافی سہی، وہ کہاں کے عربی دان ہو سکتے ہیں کہ جنہوں نے نہ کبھی عربی زبان میں کچھ لکھا اور نہ وہ کوئی ماہر لغت تھے۔ ان سے پہلے اور بعد کو

Marfat.com

برصغیر میں عربی زبان کے بہت سے مایۂ ناز مصنف اور ماہر ہوئے ہیں اور اب بھی ہیں لیکن کسی نے اس حدیث کی یہ باطل اور لغو تاویل نہیں کی۔ پھر اگر ان کے پیش کردہ مفہوم کو صحیح سمجھا جائے تو اس سے تو وہی مشکل پیش آتی ہے جس کی دہائی پہلی حدیث کے بارے میں کوثر نیازی صاحب نے دی ہے، یعنی تاریخ اس کی تردید کرتی ہے کہ مراکش اور ترکی میں غیر قریش خلفاء ہوئے جن کو امت نے تسلیم کیا، خاص طور پر خلافت عثمانی۔ اب مولانا موصوف اپنے اس فکری تضاد و تناقض کے بارے میں کیا کہیں گے؟

حقیقت یہ ہے کہ یہ حدیث کسی سماجی جبر کی دلیل نہیں، کیونکہ ایک دوسری حدیث سے جو امام سیوطی نے اپنی کتاب تاریخ الخلفاء کے مقدمہ میں درج کی ہے اس کی تشریح ہوتی ہے جو یہ ہے ''الائمة من قریش ''، ''ماحکموا فعدلوا ـــــ'' (تاریخ الخلفاء، مصر، ص:۹) یعنی خلفاء قریش میں سے ہونا چاہیے بشرطیکہ وہ اپنی حکمرانی میں عدل وانصاف کو ملحوظ رکھیں۔ پھر مراکش کے موحدین اور اتراک عثمانی کی خلافت کو بھی مسلمانوں نے ایک دوسری حدیث نبوی کی بناء پر ہی جائز سمجھا جو یہ ہے کہ ''سمع وطاعت کرو اگرچہ تم پر کوئی حبشی ہی حکمران یا خلیفہ بنا دیا جائے جس کا سر سوکھی ہوئی کالی کشمش کی طرح ہی کیوں نہ ہو۔''

آخر میں کوثر نیازی صاحب نے ''نظریہ ضرورت'' کے تحت عورت کی حکمرانی کے جواز میں فلسطین کے ایک غیر مشہور حنفی فقیہ خیر الدین الرملی (رملہ فلسطین کا ایک چھوٹا سا شہر ہے) کا قول پیش کیا ہے، یہ بے محل ہے کہ ہمارے ملک میں کوئی ناگزیر ضرورت نہیں۔ الا یہ کہ موصوف یہ سمجھیں کہ ہمارے ملک میں ایک مخصوص خاتون کے علاوہ کوئی مرد بھی اس قابل نہیں کہ حکمران ہو سکے، پھر یہ تو شریعت اسلامی کے ''قواعد کلیة'' میں سے ایک 'قاعدہ کلیة' ہے کہ ''الضرورات تبیح المحظورات یعنی ناگزیر ضرورتیں ممنوع اشیاء کو جائز کر دیتی ہیں، یہ صورت بھوپال کی بیگمات کے معاملہ میں تھی جیسا کہ اوپر بیان ہوا، اور پھر راقم السطور کو تو شک ہے کہ کوثر نیازی کے دوسرے حوالوں کی طرح یہ حوالہ بھی درست نہیں کیونکہ خیر الدین الرملی (وفات ۱۰۸۱ھ) نے ''نہایۃ المحتاج فی شرح المنہاج'' کے نام سے کوئی کتاب نہیں لکھی بلکہ یہ کتاب ایک دوسرے شافعی عالم شمس الدین الرملی المصری کی ہے (وفات ۱۰۰۴ھ) اور یہ قول غالباً اسی کتاب سے منقول ہے۔

Marfat.com

لیکن جہاں مضمون نگار صاحب نے ایک غیر مشہور دسویں صدی ہجری کے شافعی فقیہ کا ناگزیر حالات میں عورت کی حکمرانی کے جواز کا فتویٰ نقل کیا ہے، وہاں جمہور امت کا فتویٰ عورت کی حکمرانی کے خلاف ہے اور اس میں مشہور زمانہ قدیم ائمہ مجتہدین اور نوابغ روزگار علماء کا نام آتا ہے۔ سب کا فیصلہ ہے کہ امامت یا حکمرانی کی وہی شروط ہیں جو امامت صغریٰ یعنی امامت نماز کے لیے ضروری ہیں یعنی مسلمان، مرد، بالغ، عاقل، آزاد ہونا۔

امامت یا حکمرانی کی بحث درحقیقت عقائد یا اصول دین کی کتابوں میں پائی جاتی ہے، جن سے مولانا کوثر نیازی صاحب نے بالکل رجوع نہیں کیا، عورت کی حکمرانی کے عدم جواز میں مشاہیر علماء یک زبان ہیں۔ ان میں امام الحرمین الجوینی الشافعی (الارشاد فی اصول الدین، ص ۴۲۶) امام ابن حزم الظاہری (الفصل فی الملل والاھواء والنحل ج ۴، ص ۱۶۶) ابوبکر ابن العربی الاندلسی المالکی (بحوالہ تفسیر قرطبی۔ ج ۱۳۔ ص ۱۸۳) اور علمائے احناف میں قاضی عضد الدین الایجی اور السید الشریف الجرجانی (المواقف وشروحہ، مصر، ص ۶۰۵۔ ۶۰۶) النسفی اور سعد الدین التفتازانی (العقائد وشرحہ، مکتبہ خیر کثیر، کراچی ص ۱۵۷) اختصاراً قابل ذکر ہیں اور آخر الذکر علماء احناف کی کتابیں تو ہمارے ملک کے درس نظامی میں شامل ہیں۔

مولانا کوثر نیازی صاحب نے اپنا یہ مضمون ان الفاظ پر ختم کیا ہے:

''صاف بات ہے جیسا کہ اوپر کہا گیا یا تو یہ قول رسول نہیں، اس کے راوی مشکوک ہیں، تاریخ اس کے خلاف شہادت دیتی ہے، یا پھر یہ پیش گوئی ہے اور صرف اس ایرانی قوم کے لیے تھی جو ایک خاص عورت کو حکمران بنا رہی تھی۔ راوی نے القوم کو ''قوم'' بنا کر اسے ہمیشہ کے لیے عام کر دیا۔ ان دو توجیہات کے علاوہ اس روایت کی اور شرح کرنا مذہب کے حق میں نادان دوستی کے سوا کوئی حیثیت نہیں رکھتی۔''

یہ ہے موصوف کی اس اہم موضوع پر سہل نگاری اور ایک مشہور اور صحیح حدیث بخاری اور اس کے راویوں کی چھان بین کیے بغیر تکذیب کرنا، تاکہ وہ بغیر کسی دلیل و برہان کے اپنے خطیبانہ انداز بیان سے اس کی تکذیب کر کے عورت کی حکمرانی کا جواز موجودہ حالات میں ثابت کر سکیں، کسی کی تو اس سے خدمت ہوگی، لیکن ہم نے دیکھ لیا کہ پوری امت اس حدیث کی صحت پر متفق

Marfat.com

ہے اور تاریخ نے کبھی اسلامی نظریۂ فلاح کے نقطۂ نظر سے اس کے خلاف شہادت نہیں دی۔ صاحب مضمون کی پیش کردہ سب مثالیں بے محل اور غلط ثابت ہوئیں۔ اپنے پیش کردہ قطع و برید شدہ کمزور دلائل پوچ محسوس کرتے ہوئے انہوں نے اس حدیث کو محض ایرانی قوم کے لیے ایک پیش گوئی قرار دینے کی ناکام کوشش کی ہے، اور چونکہ مشہور و ثابت الفاظ حدیث سے ان کی مطلب برآری نہیں ہوتی تھی، سو جناب نے افصح العرب والعجم نبی عربی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زبان کی اصطلاح کی کوشش کی ہے! ایک صحابی رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو تحریف کا مورد الزام قرار دینے اور نبی عربی روحی فداہ کی زبان کی اصلاح کی جرأت کوثر نیازی صاحب ہی اپنی عربی زبان دانی کے زعم میں کر سکتے ہیں مگر وہ یہ تو کیا کرتے، ان کی اپنی عربی زبان دانی کی پول کھل گئی ایسے ہی موقع کے لیے سعدی شیرازی نے کہا ہے:

تا مرد سخن نگفتہ باشد

عیب و ہنرش نہفتہ باشد

حدیث کے الفاظ ہیں:

''لن یفلح قوم ولو امرھم امرأۃ ''عربی قواعد یا نحو کی رو سے یہاں قوم ہی درست ہے، اگر ''القوم'' ہوتا تو ضروری تھا کہ اس کے بعد کا جملہ جو جملہ ''صفت ہے اس طرح ہوتا۔ ''الذین ولو امرھم امراۃ ''یہاں لفظ ''قوم'' کا نکرہ ہونا ہی درست ہے، ورنہ عبارت غلط ہو جائے گی۔ قرآن کریم میں ہے۔ ''الرo کتاب احکمت آیایۃ ''دوسری جگہ ہے۔ ''کتاب انزلنا الیك ''حالانکہ دونوں جگہ ایک خاص کتاب (الکتاب) مقصود ہے۔ یعنی قرآن جبکہ آیا ہے ''ھدی للمتقین الذین یومنون بالغیب ''میں المتقین معرفہ ہے، اسی لیے اس کے بعد جملہ صفت کو اسم موصول سے شروع کیا گیا ہے۔ معنی ہیں ''المتقین المؤمنین بالغیب ''جب کہ پہلی آیات کے معنی ہیں ''کتاب محکمه آیایۃ'' اور ''کتاب منزل الیك ''یہاں گنجائش نہیں، ورنہ قرآن اور کلام عرب سے بہت سی مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں۔

آخر میں ایک عام سوال اٹھائے بغیر، جو بہت سے قارئین کے ذہن میں ابھرا ہو، نہیں رہا جا سکتا کہ امریکہ جیسے انتہائی ترقی یافتہ ملک میں جہاں دو سو سال سے جمہوریت قائم ہے اور عورتیں

Marfat.com

مکمل طور پر آزاد ہیں، وہاں آج تک کوئی عورت صدر جمہوریت یا نائب صدر نہیں ہوئی اور برصغیر کے ہمارے جیسے پسماندہ ممالک سری لنکا، بھارت، بنگلہ دیش، پاکستان ہی میں آخر خواتین ووٹ کے ذریعہ جمہوری حکمران کیسے بنتی ہیں؟ میرے خیال میں اس کا سبب راجہ و پرجا، بادشاہ و رعیت کا وہ قدیم کلچر ہے، جو ایک طرف ہمارے عوام، ان پڑھ عوام، اور دوسری جانب جاگیرداروں، وڈیروں، سابق نوابوں یا نوابزادوں سرداروں اور چوہدریوں کے لاشعور میں رچا بسا ہے۔ پہلے راجہ یا نواب کے مرنے کے بعد اس کی اولاد نرینہ نہ ہونے کی صورت میں ملکہ یا رانی، یا شہزادی اور راجکماری اس کی وارث ہوتی تھیں، خاص طورف پر اس صورت میں جب موت ناگہانی ہو۔ اب یہ راج گدی اور نوابی تو ختم ہوگئی ہے، سیاسی دور ہے تو اس صورت میں مرنے والے شوہر یا باپ کے بعد، سری لنکا میں بندرا نائیکے، بھارت میں اندرا گاندھی، بنگلہ دیش میں خالدہ ضیاء اور پاکستان میں بینظیر بھٹو سیاسی وارث بنتی ہیں۔ ہر چند کہ ان میں سے بیشتر کا نہ پہلے اپنا کوئی سیاسی کردار ہے، نہ وہ غیر معمولی قابلیت اور تجربہ کی حامل ہیں، لیکن وہ اپنے شوہر یا والد کی جگہ سیاسی لیڈر تسلیم کی جاتی ہیں۔ پھر انتخابات کے موقع پر وہ اپنے آپ کو حکمرانی کا اس طرح مستحق سمجھتی ہیں جیسے کسی سابق راجہ کی رانی یا راج کماری، عوام کے لاشعور میں بھی روایتی پرجا یا رعیت کلچر رچا ہوا ہے۔ یہ ان عوام کے ووٹ ان خواص خواتین کو مل جاتے ہیں اور پھر وہ سربراہ حکومت بن جاتی ہیں۔ مگر ہمیں اس کے لیے آخر قرآن و حدیث کی غلط تاویلات کرنے اور ان میں جواز ڈھونڈنے کی کیا ضرورت ہے؟

خود بدلتے نہیں قرآں کو بدل دیتے ہیں
ہوئے کس درجہ ''وزیران'' حرم بے توفیق

Marfat.com

نور محمدی ﷺ اور حدیث جابر رضی اللہ عنہ ...... ایک تحقیقی جائزہ

عام لوگوں میں یہ بات مشہور ہے کہ اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلے نور محمدی کی تخلیق کی اور اسی سے ہی بعد کو ساری کائنات بلکہ نعوذ باللہ اپنا عرش و کرسی تک پیدا کیا۔ یہ مشہور قول جو عامۃ الناس میں بہت مقبول ہے میلادنبوی کی کتابوں، یا سیرت نبوی پر لکھنے والے بعض متاخر مصنفین کی کتابوں میں مذکور بعض روایات کی وجہ سے پیدا ہوا ہے، اور افسوس اس بات کا ہے کہ ہمارے بعض محترم و مقدس سیرت نگاروں نے بغیر کسی تحقیق کے اس روایت کو اپنی کتابوں میں شامل کر لیا۔ اس حدیث کا پہلا ٹکڑا یہ ہے کہ ''اللہ نے جو چیز سب سے پہلے پیدا کی وہ میرا نور تھا۔'' لیکن اس طویل حدیث میں جو کچھ مذکور ہے اور جس کو ہم آگے بیان کریں گے وہ ہماری عام کتابوں مین نہیں پایا جاتا لیکن ہندوستان میں درود شریف اور سیرت نبوی پر چھپی ہوئی ایک تازہ کتاب ''صلی علی محمد'' ۱۹۹۶ء میں یہ پوری حدیث موجود ہے۔ ہم آئندہ صفحات میں اسی حدیث کا ایک تحقیقی اور تنقیدی جائزہ پیش کرنا چاہتے ہیں۔ یہ حدیث کافی طویل ہے جو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے حضرت جابر رضی اللہ عنہ کے ایک سوال کے جواب میں ہے جو تخلیق کائنات سے متعلق تھا۔ تو اس کے جواب میں حضور صلی اللہ علیہ آلہ وسلم نے فرمایا سب سے پہلے جو چیز اللہ نے پیدا فرمائی وہ تمہارے نبی کا نور تھا۔

الفاظ حدیث اس طرح شروع ہوتے ہیں: ''اول ما خلق الله نور نبيك يا جابر'' پھر حدیث کا تکملہ اس طرح ہے کہ ''اللہ تعالیٰ نے تمام چیزوں سے پہلے اپنے نور سے تمہارے نبی کا نور پیدا کیا، اور اس نور کو جہاں اللہ نے چاہا وہاں پھیلا دیا، اور اس وقت نہ تو لوح تھا نہ قلم، نہ جنت نہ جہنم، نہ فرشتے، نہ آسمان نہ زمین، نہ سورج نہ چاند، نہ جن نہ انس۔ پھر جب اللہ کی مشیت ہوئی کہ مخلوق کو پیدا کرے تو اس نے اس نور کو چار اجزاء میں تقسیم کر دیا، پہلے جزء سے قلم پیدا کیا، دوسرے جزء سے لوح، تیسرے سے عرش،، پھر چوتھے سے جزء کو چار مزید اجزاء میں تقسیم کر دیا اور

Marfat.com

اس کے پہلے جزء سے حاملین عرش کو پیدا کیا، دوسرے جزء سے کرسی، تیسرے سے باقی فرشتے پیدا کئے اور چوتھے جزء کو پھر سہ بارہ چار اجزاء میں تقسیم کر دیا۔ اب اس کے پہلے جزء سے آسمان پیدا کئے، دوسرے جزء سے زمین، تیسرے سے جنت اور جہنم پیدا کیے۔ پھر چوتھے جزء کو مزید چار اجزاء میں تقسیم کر دیا اور اس نئی تقسیم میں پہلے جزء سے مومنین کی آنکھوں کا نور پیدا کیا، دوسرے جزء سے ان کے دلوں میں نور پیدا کیا جو اللہ کی معرفت ہے اور تیسرے جزء سے ان کے انس کا نور پیدا کیا جو توحید ہے۔ ''لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ''

یہ وہ الفاظ حدیث ہیں جو قسطلانی کی کتاب المواہب اللدنیہ(۱) میں ہیں اور قسطلانی نے اس حدیث کو عبدالرزاق بن ہمام الصنعانی الیمنی (م ۲۱۱ھ) سے منسوب کیا ہے جنہوں نے اپنی سند سے اس کو اپنی حدیث کی کتاب مصنف میں روایت کیا ہے۔

یہی حدیث ایک ترکی مصنف علاء الدین علی وہ السکتواری نے اپنی کتاب ''محاضرۃ الاوائل و مسامرۃ الاواخر'' (ص ۲۱) میں ذکر کی ہے اور یہ کتاب ۹۹۸ھ میں تصنیف کی گئی۔ قابل تعجب بات ہے کہ اس کتاب میں مذکورہ حدیث کے الفاظ ان الفاظ سے بہت مختلف ہیں جو ابھی ہم نے قسطلانی کی المواہب اللدنیہ کے حوالہ سے رقم کیے۔ کتاب ''صلی علی محمد'' کے مصنف کے سامنے علی ددہ السکتواری کی یہی عربی کتاب یا اس کا ترجمہ تھا جس پر اعتماد کرتے ہوئے انہوں نے نور محمدی کے سلسلہ میں اسی حدیث کو مستند باور کر لیا ہے اور غالب خیال یہ ہے کہ سیرت نبوی سے متعلق بعض اردو کتابوں میں نور محمدی سے متعلق حدیث کے یہی الفاظ زیادہ متداول ورائج ہیں جو ان سے بڑی حد تک مختلف ہیں اور اضافہ شدہ ہیں جن کا ذکر ہم نے اوپر کیا۔ اس عام مشہور حدیث کے الفاظ یوں ہیں: ''سب سے پہلے اللہ تعالیٰ نے جو چیز پیدا کی وہ تمہارے نبی کا نور تھا۔ اے جابر اس کے بعد اسی نور سے ہر اچھی چیز پیدا کی اور اس کے بعد تمام چیزیں پیدا کیں اور جب اس نور کو پیدا کیا تو اس کو اللہ تعالیٰ نے اپنے مقام قرب میں بارہ سال رکھا۔ پھر اس کو چار اقسام میں تقسیم کیا، ایک قسم سے عرش پیدا کیا اور دوسری قسم سے کرسی کو، تیسری سے حاملین عرش کو اور چوتھی قسم سے کرسی سنبھالنے والے اور انتظام کرنے والے فرشتوں کو پیدا کیا اور چوتھی قسم کو بارہ

۱؎ المواہب اللدنیہ (شرح الزرقانی علی المواہب) ص ۴۶، ج ۱۔

Marfat.com

سال تک مقام محبت میں حاضر رکھا پھر، اس کے چار حصے بنائے، ایک حصے سے قلم پیدا کیا، دوسرے سے لوح، تیسرے سے جنت، اور چوتھے حصے کو بارہ سال ایک تک مقام خوف میں رکھا پھر اس کو چار اجزاء میں تقسیم کیا، ایک جزء سے فرشتے پیدا کیے، ایک سے سورج اور چاند، تیسرے سے ستارے اور چوتھے جزء کو بارہ سال تک مقام رجاء (امید) میں رکھا، پھر اس سے چار اجزاء تخلیق کیے۔ پھر پہلے جزء سے عقل تخلیق کی، دوسرے سے علم اور حلم، تیسرے سے پاکیزگی اور توفیق، اور چوتھے حصے کو بارہ سال تک مقام حیاء میں رکھا پھر اللہ تعالیٰ نے اس کی طرف دیکھا تو اس نور سے (میرے نور سے) پسینہ ٹپکنے لگا اور اس سے ایک لاکھ چوبیس ہزار قطرے ٹپکے، پھر اللہ نے ہر نے قطرے سے ایک نبی اور رسول کی روح پیدا کی اس کے بعد ان انبیاء کی روحیں سانس لینے لگیں تو اللہ تعالیٰ نے ان کی سانسوں سے اولیاء، نیک بختوں اور شہداء اور اطاعت شعار مومنین کی روحوں کا نور پیدا کیا روز قیامت تک کے لیے۔ اس طرح عرش اور کرسی میرے نور سے ہیں، مقربین اور روحانیین میرے نور سے ہیں اور ساتوں آسمان کے فرشتے میرے نور سے ہیں، جنت اور اس میں جو کچھ نعمتیں ہیں وہ میرے نور سے ہیں۔ سورج، چاند، ستارے میرے نور سے ہیں۔ عقل، علم اور توفیق خداوندی میرے نور سے ہیں۔ پھر اللہ تعالیٰ نے بارہ سال حجاب (پردے) تخلیق کیے اور میرے نور (جو چوتھا جزء ہے) اس کو ہر پردے میں ایک ہزار سال رکھا اور یہ مقامات عبودیت ہیں، یہ بارہ پردے اس طرح ہیں۔

حجاب کرامت، حجاب سعادت، حجاب ہیبت، حجاب رحمت، حجاب رافت، حجاب علم، حجاب حلم، حجاب وقار، حجاب سکینت، حجاب صبر، حجاب صدق اور حجاب یقین۔ پھر اس نور نے ہر ایک حجاب میں ایک ہزار سال اللہ کی عبادت کی پھر جب ان تمام پردوں پر میرا نور نکلا تو اللہ تعالیٰ نے اس کو مٹی سے مرکب کیا اور اس سے مشرق و مغرب اس طرح روشن ہو گئے کہ جیسے چراغ سے اندھیری رات روشن ہو جاتی ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے زمین سے آدم کو پیدا کیا اور ان کی پیشانی میں یہ نور دکما دیا، پھر ان سے یہ حضرت شیث کو منتقل ہوا، پھر یہ نور برابر طاہر سے طیب اور طیب سے طاہر کو منتقل ہوتا رہا، یہاں تک کہ عبداللہ بن عبدالمطلب کی پشت میں منتقل ہوا اور اس سے میری والدہ کے رحم میں منتقل ہوا، پھر اللہ تعالیٰ نے مجھے دنیا میں نکالا اور مجھے سید المرسلین، خاتم النبیین، رحمۃ

Marfat.com

للعالمین اور قائد الغر المحجلین (نورانی پیشانی والوں کے سردار) بنا کر بھیجا۔ اے جابر! اس طرح تمہارے نبی کی تخلیق ہوئی۔"

آگے اس نام نہاد حدیث نبوی کو ہم روایت و درایت کے اصول پر جانچنے کی کوشش کریں گے۔

ا۔ نقد حدیث از روئے اصول حدیث:

حقیقت یہ ہے کہ حضرت جابر بن عبداللہ انصاری سے منسوب یہ حدیث نہ تو صحاح ستہ میں ہے اور نہ اس مجموعۂ احادیث میں ہے جو مسند جابر کے نام سے حدیث نبوی کی عظیم و ضخیم کتاب مسند امام احمد بن حنبل میں شامل ہے، پھر یہ حدیث بعد کے جمع کردہ مجموعہ ہائے حدیث، جیسے امام سیوطی کی جمع الجوامع اور علی المتقی ہندی کی کنز العمال میں بھی نہیں پائی جاتی۔

اس حدیث کا قدیم ترین حوالہ وہ ہے جو دسویں صدی ہجری کے مصری مصنف قسطلانی (م ۹۲۳ء) نے سیرت نبوی پر اپنی کتاب المواہب اللدنیہ میں دیا ہے اور وہ ہے عبدالرزاق ابن ہمام الیمنی (وفات ۲۱۱ھ) کی کتاب مصنف (ن پر زبر کے ساتھ) اور پھر اسی کتاب المواہب اللدنیہ سے بعد کے عرب اور غیر عرب مصنفین نے سیرت نبوی کی بعض کتابوں میں اسی حدیث کا ذکر کیا ہے۔ عرب مصنفین میں سے شیخ اسماعیل عجلونی (م ۱۱۶۲ھ) نے اپنی کتاب "کشف الخفاء و مزیل الالباس، عما اشتهر من الاحادیث علی السنة الناس" (ج ۱، ص ۲۶۵، ۲۶۶) میں قسطلانی کی روایت کردہ اس حدیث کو انہی الفاظ میں لکھا ہے اور اسی طرح ہندوستان کے بعض مصنفین جیسے شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے اپنی کتاب مدارج النبوۃ کی جلد اول میں اس حدیث کی طرف اشارہ کیا ہے اور اس کے بعد مولانا اشرف علی تھانوی نے اپنی کتاب نشر الطیب فی ذکر الحبیب میں اس حدیث کے اولین ٹکڑے کا مختصر ذکر کیا ہے۔

اس طرح یہ حدیث جو نہ تو قدیم کتب سیرت میں موجود تھی اور نہ مجموعہ ہائے حدیث میں وہ قسطلانی کے بیان اور بعد دور آخر کے مصنفین کی کتابوں میں راہ پا گئی ہے، اور افسوس اس بات کا ہے کہ ان متاخرین نے اس حدیث کی تحقیق کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ یہی نہیں بلکہ جیسا کہ ہمارے پیش کردہ اس حدیث کے دو نمونوں سے واضح ہوتا ہے دونوں احادیث ایک دوسرے سے

Marfat.com

بہت زیادہ مختلف ہیں، یعنی وہ حدیث جو مذکورہ بالا تازہ کتاب میں حبیب البشر خیری صاحب نے روایت کی ہے، قسطلانی کی روایت کردہ حدیث نہیں، بلکہ یہ وہ حدیث ہے جو ترکی کے دسویں ہجری کے ایک عام مصنف علی ددہ السکتواری کی کتاب میں ہے وار جس کے اندر بارہ بارہ ہزار سال نور محمدی ﷺ کو مختلف مقامات، جیسے مقام قرب، مقام محبت، مقام خوف وغیرہ میں رکھنے کا ذکر ہے۔ پھر نور محمد ﷺ سے جو پسینے کے قطرے ٹپکے تو اس سے ایک لاکھ چوبیس ہزار نبی ورسول پیدا کئے گئے۔ پھر بارہ ہزار پردے تخلیق کئے جانے اور ہر پردے کو ایک ہزار سال مختلف مقامات عبودیت وغیرہ میں رکھے جانے کا ذکر ہے۔

اس طرح اس دوسری روایت میں جو ہزاروں سالوں کا لمبا چوڑا حساب ہے وہ اس روایت میں نہیں جو قسطلانی نے ''المواہب اللدنیہ'' میں مصنف عبدالرزاق کے حوالہ سے لکھی ہے۔

اب یہاں اس حدیث پر دو جہتوں سے کلام کی ضرورت ہے ایک تو وہ روایت جو المواہب اللدنیہ میں پائی جاتی ہے اور جو بعض دوسرے ثقہ مصنفین نے اختیار کی ہے اور دوسری وہ روایت کہ جو ترکی کے عالم علی ددہ السکتواری کی کتاب ''محاضرۃ الاوائل ومسامرۃ الاواخر'' میں پائی جاتی ہے اور دونوں میں کافی اختلاف ہے۔

الف۔ جہاں تک قسطلانی کی روایت کردہ حدیث کا تعلق ہے تو یہ حدیث عبدالرزاق ابن ہمام کی مصنف بھی کہیں نہیں پائی جاتی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ قسطلانی کا ایک سہو ہے، کیونکہ اگر یہ حدیث مصنف عبدالرزاق کے کسی دوسرے نسخہ میں ہوتی تو امام سیوطی اور علی المتقی الہندی وغیرہ اس کا اپنے مجموعہ ہائے احادیث میں ضرور ذکر کرتے۔ یہاں قابل ذکر بات یہ ہے کہ علامہ شبلی نعمانی نے اپنی سیرت نبوی کی پہلی جلد میں جہاں اپنے مآخذ پر کلام کیا ہے وہاں انہوں نے المواہب اللدنیہ کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اس میں ہزاروں موضوع اور غلط روایتیں موجود ہیں (۱) اسی طرح مغرب اقصیٰ کے مشہور مصنف علامہ شیخ عبدالحئ کتانی نے اپنی کتاب التراتیب الاداریہ کے مقدمہ (ص ۲۳) میں قسطلانی پر تنقید کرتے ہوئے لکھا ہے کہ انہوں نے اس کتاب کو قاضی عیاض کی کتاب الشفاء کے مطابق مرتب کیا ہے بلکہ خطبہ میں بھی انہی کا اتباع کیا ہے (۲) اس طرح یہ

۱۔ شبلی نعمانی۔ سیرت النبی۔ ص ۳۷، ج ۱۔ دارالاشاعت کراچی۔ ۱۹۸۵ء

۲۔ عبدالحئ کتانی۔ التراتیب الاداریہ، مقدمہ ص ۲۳۔ دارالکتاب العربی۔

Marfat.com

حدیث روایۃً ثابت نہیں اور درایت کی رو سے بھی یہ حدیث قابل قبول نہیں ہوسکتی کہ اس میں چار چار مرتبہ جن تقسیمات کا ذکر ہے اور اس بات کی صراحت کہ عرش وکرسی بھی نور محمدی سے پیدا کیے گئے ہیں وہ قرآن وحدیث کے بیانات کے بالکل خلاف ہے جس کا ذکر ہم آگے چل کر کریں گے۔

یہ تو رہی اس حدیث نور محمدی کی اس روایت کی بات جو ہم کو دسویں صدی ہجری کے بعد کے ثقہ سنی مصنفین کی کتابوں میں ملتی ہے، لیکن جہاں تک اس حدیث کا تعلق ہے جو عام لوگوں میں زیادہ متداول ومقبول ہے تو وہ وہی ہے جو ''اللھم صل علی محمد'' کے مصنف نے اختیار کی ہے اور جس کا حوالہ ہم ترکی مصنف علی ددہ کی کتاب سے دے چکے ہیں۔

ب۔ اس حدیث کی وہ دوسری تفصیلی روایت جو ہم نے کتاب ''اللھم صل علی محمد'' سے پیش کی ہے اور جو علی ددہ کی کتاب سے منقول ہے وہ حدیث درحقیقت ایک شیعی مصنف ملا محمد معین کاشفی فراہی المعروف بملا مسکین (م ۹۰۷ھ) کی کتاب ''معارج النبوۃ فی مدارج الفتوۃ'' سے منقول ہے، اس کتاب کا ترجمہ اردو زبان میں بھی ہو چکا ہے اور تازہ شائع شدہ کتاب ''اللھم صل علی محمد'' کے مصنف نے راقم الحروف کو اپنے ایک خط میں اس کتاب کے حوالے سے بلکہ ان دونوں کتابوں کے حوالوں سے آگاہ کیا، کیونکہ موصوف نے اپنی کتاب میں یہ حدیث بغیر کسی حوالے کے ذکر کی ہے اور میرے استفسار پر انہوں نے یہ حوالہ دیا۔

ملا محمد معین کاشفی، ہرات کے رہنے والے تھے۔ شیعہ مصنفین کے بارے میں مشہور کتاب ''الذریعہ الی تصانیف الشیعہ'' تصنیف آغا بزرگ تہرانی میں اس کتاب کا ذکر ہے۔(۱)

دلچسپ بات یہ ہے کہ آغا بزرگ تہرانی نے ملا معین کا ذکر کرتے ہوئے ان کو مجنوں بھی لکھا ہے، اور یہ کہ وہ ایک ایسے شہر میں رہنے کی وجہ سے جہاں سنیوں کی اکثریت تھی (یعنی ہرات) تقیہ کرتے تھے۔ آغا بزرگ نے ان کی اور کتابوں کا ذکر بھی کیا ہے جن میں ان کا ایک شعری دیوان بھی ہے۔ اہم بات یہ ہے کہ آغا بزرگ نے معارج النبوۃ پر جو فارسی زبان میں ہے کلام کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ''ویظھر من المعارج ھذا انہ عامی یحتمل تقیۃ بمقتضی بلدہ و عصرہ .... '' یعنی کتاب معارج النبوۃ سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ (ملا معین) عوام میں سے تھے اور اپنے شہر اور زمانے کے حالات کے تقاضوں کے پیش نظر تقیہ کرتے تھے۔(۲)

۱۔ آغا بزرگ تہرانی۔ الذریعہ الی تصانیف الشیعہ۔ ص ۱۰۷۸، ج ۹۔

۲۔ آغا بزرگ تہرانی۔ الذریعہ الی تصانیف الشیعہ۔ ص ۱۸۴۔ ج ۲۱۔

Marfat.com

اس طرح نور محمدی سے متعلق دوسری مفصل نام نہاد حدیث جس میں متعدد بار بارہ ہزار سال نور محمدی کے مختلف مقامات میں رہنے کا ذکر ہے۔ وہ اسی شیعہ مصنف یعنی ملا مسکین (معین کاشفی) کی پیش کردہ روایت ہے جس کو ترکی کے مصنف علی ددہ نے اس کتاب سے نقل کیا اور وہ حدیث اس طرح عام ہوگئی۔

حقیقت یہ ہے کہ نور محمدی سے متعلق احادیث شیعی مصنفین ہی کی اختراع کردہ ہیں۔

اس ضمن میں مشہور شیعی مصنف ملا محمد باقر مجلسی (م ۱۱۱۱ھ) کی کتاب بحار الانوار (ج ۱۰) جو حضور ﷺ کی سیرت سے متعلق ہے اور اس کا عنوان ہے ''تاریخ نبینا'' اس کے ص ۳۳۔۳۴ میں نور محمدی سے متعلق چار حدیثیں ۴۱ تا ۴۴ پیش کی گئی ہیں ان میں پہلی حدیث دوسری صدی ہجری کے مشہور شیعی راوی جابر الجعفی کی ہے جو امام باقر سے مروی ہے اور اس حدیث کا پہلا جملہ ''یا جابر'' سے شروع ہوتا ہے کہ اس مضمون بھی یہی ہے کہ سب سے پہلے اللہ تعالیٰ نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو پیدا کیا، انہی کے ساتھ اپنی عظمت کے نور سے ''اہل بیت'' کو پیدا کیا۔

اس کتاب کی دوسری حدیث امام احمد بن حنبل سے مروی ہے، لیکن اس میں راوی صحابی کا ذکر نہیں، اور اس میں یہ ہے کہ ''کنت انا و علی نورا بین یدی الرحمن قبل ان یخلق عرشه باربعة عشر الف عام ''یعنی میں اور علی رضی اللہ عنہ اللہ تعالیٰ کے سامنے عرش کی تخلیق سے چودہ ہزار برس قبل نور (کی صورت میں) تھے۔

تیسری روایت جابر رضی اللہ عنہ بن عبداللہ سے مروی ہے جو یہ ہے کہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ بن عبداللہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پوچھا کہ ''اول شئی خلقه الله تعالیٰ ماهو؟ فقال نور نبیك یا جابر خلقه الله ثم خلق منه کل خیر ''یعنی حضرت جابر رضی اللہ عنہ بن عبداللہ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے عرض کیا کہ سب سے پہلی چیز جو اللہ تعالیٰ نے پیدا کی وہ کیا ہے؟ تو آپ نے فرمایا تمہارے نبی کا نور اے جابر! اللہ تعالیٰ نے اس کو پیدا کیا پھر اس سے ہر خیر پیدا کی۔

چوتھی حدیث ان الفاظ کے ساتھ ہے ''وعن جابر ایضاً قال قال رسول الله صلی الله علیه و آله وسلم اول ما خلق الله نوری ابتدعه من نوره و اشتقه من جلال

Marfat.com

عـظـمـتـہ" یعنی جابر ہی سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ سب سے پہلی چیز جو اللہ نے پیدا کی میرا نور ہے اسے اپنے نور سے تخلیق کیا اور اپنی عظمت کے جلال سے اس کا استخراج کیا۔

• قابل ذکر بات یہ ہے کہ ملا باقر مجلسی نے تصریح کی ہے کہ انہوں نے یہ چاروں احادیث ایک مصنف فضل اللہ بن محمود فارسی کی کتاب "ریاض الجنان" سے نقل کی ہیں۔ یہ کتاب ابھی تک قلمی ہے لیکن اس کتاب کے بارے میں آغا بزرگ تہرانی نے اپنی کتاب "الذریعہ الی تصانیف الشیعہ" میں تحریر کیا ہے کہ "فیـه اخبـار غـريبة فی المناقب" یعنی اس میں مناقب کے بارے میں بڑی عجیب وغریب باتیں مذکور ہیں۔

آغا بزرگ کے اس بیان سے ریاض الجنان میں مذکور نور محمدی سے متعلق احادیث کی حقیقت عیاں ہے کہ وہ نا قابل اعتماد ہیں، پھر یہ کہ شیعہ حضرات کی مشہور ترین اور مستند ترین کتاب "اصول کافی" کی جلد اول کتاب الحجہ میں ایک حدیث نور محمدی سے متعلق منقول ہے جو صرف اسی قدم شیعی راوی جابر الجعفی سے مروی ہے جس کا پورا نام جابر بن یزید ہے وہ یہ حدیث امام محمد الباقر سے روایت کرتا ہے اور وہ اس طرح شروع ہوتی ہے "یـا جـابـر ان اول مـا خلق ، خلق مـحـمـدا و عترته الهداة المهتدين فكانوا اشباح نور بين يدى الله . قلت وما الا شبـاح؟ قـال الـنـور، ابـدان نورانية بلا ارواح .... الخ " یعنی اے جابر! اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلے جو چیز پیدا کی وہ محمد اور ان کے اہل بیت ہیں جو ہدایت دینے والے اور ہدایت یافتہ ہیں وہ اللہ کے سامنے نوری اشباح تھے۔ میں نے کہا اشباح کا کیا مطلب ہے؟ فرمایا: "نور کا سایہ، نورانی جسم بغیر روحوں کے۔"

اس کے بعد حدیث میں اہل بیت کے اخلاق، علم وحلم، عبادات وغیرہ کا تذکرہ ہے لیکن وہ سب تفصیل نہیں جو ہمیں ملا معین کاشفی کی کتاب "معارج النبوۃ و مدارج الفتوۃ" میں اور پھر اس کے فوراً بعد علی ددہ کی کتاب "محاضرۃ الاوائل" میں ملتی ہے۔

ہماری ذاتی رائے ہے کہ نور محمدی سے متعلق جو حدیث عوام الناس اور بعض اہل سنت مصنفین کے ہاں مشہور ہے، اس کا اصل منبع مشہور شیعی راوی جابر بن یزید الجعفی (م ۱۲۸ھ) ہے

Marfat.com

جس کو کبھی کبھی شیعی کتابوں میں صرف جابر بھی لکھا جاتا ہے اور عام لوگ دھوکا کھا کر اس سے حضرت جابر رضی اللہ عنہ بن عبداللہ الانصاری مراد لے لیتے ہیں۔ اور اس نام نہاد مشہور حدیث کا پہلا لفظ بھی جیسا کہ مذکور ہوا ''یا جابر'' ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ اس لفظ یا جابر سے مراد وہی جابر بن یزید الجعفی ہے جو اہل سنت کی کتابوں میں یا خود شیعہ مصنفین کی طرف سے جابر بن عبداللہ بنا دیا گیا ہے۔

مزید برآں یہ کہ خود عبدالرزاق بن ہمام الصنعانی اپنے معتدل تشیع کے لیے مشہور ہیں لیکن وہ تبرا کرنے والے رافضی نہیں۔ امام ذہبی نے سیر اعلام النبلاء میں ان کی انتہائی مفصل سوانح عبدالرزاق بن ہمام الصنعانی الشیعی کہہ کر شروع کی ہے، تاحال ہم کو مصنف عبدالرزاق کے مطبوعہ نسخہ (بیروت ۱۳۹۰ھ فمابعد) میں یہ حدیث نہیں ملی۔ اگر کسی نسخہ میں پائی بھی جاتی ہو تو گمان اغلب یہ ہے کہ عبدالرزاق نے اس کو اس جابر الجعفی سے روایت کیا ہوگا۔

۲۔ نقد حدیث نور محمدی از روئے قرآن:

جہاں تک قرآن کریم کا تعلق ہے اور جس کا حوالہ سب سے زیادہ بنیادی بات ہے اس سے بھی اس نام نہاد حدیث کی تائید نہیں ہوتی ہے بلکہ قرآن کریم میں جو کچھ ہے وہ اس کے برعکس ہے۔ اس نام نہاد حدیث میں تو یہ کہا گیا ہے کہ نعوذ باللہ عرش و کرسی بھی دوسری تمام مخلوقات اور آسمان وزمین کے علاوہ نور محمدی سے پیدا کیے گئے جب کہ قرآن کریم کے برخلاف سورۂ ھود میں فرمایا ہے! ''وھو الذی خلق السموات والارض فی ستة ایام وکان عرشه علی الماء'' (سورۃ ھود ۷) یعنی ''وہی ہے جس نے چھ دن میں آسمان اور زمین پیدا کیے اور اس کا عرش پانی پر تھا۔''

اس آیت سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ آسمان وزمین اور کسی چیز کی پیدائش سے پہلے عرش الٰہی موجود تھا۔ امام محمد بن جریر الطبری (م ۳۱۰ھ) نے اپنی مشہور و مستند تفسیر میں ''وکان عرشه علی الماء'' کی تفسیر بیان کرتے ہوئے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کے مشہور شاگردوں مجاہد اور قتادہ وغیرہ سے روایت ہے کہ اس سے پہلے کہ اللہ تعالیٰ آسمان وزمین یا کوئی چیز بھی پیدا کرے اس کا عرش موجود تھا۔ (تفسیر طبری، آیت ۷ سورۃ ھود)۔

یہی بات امام رازی نے اس آیت کی تفسیر میں لکھی ہے۔ صحیح بخاری کی ایک حدیث سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے جس کا ذکر ہم آئندہ صفحات میں کریں گے۔

Marfat.com

حافظ ابن کثیر بھی اپنی تفسیر میں سورۂ ھود کی آیت نمبر ۷ کی تفسیر میں یہ کہا ہے کہ کسی چیز کے پیدا کرنے سے قبل اللہ تعالیٰ کا عرش موجود تھا اور انہوں نے ترمذی اور ابن ماجہ کا حوالہ عرش کی تخلیق کے بارے میں دیا ہے۔ علاوہ ازیں سورۃ القلم کی تفسیر میں حافظ ابن کثیر اور دوسرے مفسرین حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی یہ حدیث نقل کرتے ہیں کہ ''اول ما خلق اللہ القلم'' یعنی سب سے پہلے جو چیز اللہ نے پیدا کی وہ قلم ہے۔ اس طرح یہ ثابت ہوتا ہے کہ قرآن کریم کی رو سے نور محمدی کو سب سے پہلے پیدا نہیں کیا گیا بلکہ اس سے پہلے عرش خداوندی یا پھر قلم کو پیدا کیا گیا۔ بعض حضرات یہ کہتے ہیں کہ سورۃ المائدۃ کی آیت نمبر ۱۵ میں جو آخری الفاظ ہیں۔ ''قد جاء کم من اللہ نور و کتاب مبین'' اس میں نور سے مراد محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں۔

غالباً سب سے پہلے یہ بات امام محمد بن جریر الطبری نے اس آیت کی تفسیر میں لکھی ہے مگر یہاں قابل ذکر بات یہ ہے کہ یہ تفسیر جو ماثور تفاسیر میں سب سے قدیم ہے، یعنی وہ تفاسیر جن میں صحابہ کرام اور تابعین کے تفسیری اقوال نقل ہیں اس میں اس آیت کی تفسیر میں کسی صحابی یا تابعی مفسر جیسے مجاہد، سعید بن جبیر، قتادہ اور عکرمہ وغیرہ کا کوئی قول نقل نہیں۔ نہ سلف میں سے کسی اور مفسر کا ذکر ہے حالانکہ طبری کا عام طریقہ یہ ہے کہ وہ صحابہ اور تابعی مفسرین کے اقوال نقل کرنے کے بعد اپنی ترجیح بیان کرتے ہیں یا پھر اپنی تفسیر لکھنے کے بعد مفسرین سلف کے اقوال سے اس کی تائید پیش کرتے ہیں، لیکن آیت کے جملہ ''قد جاء کم من اللہ نور'' کی تفسیر میں نور سے رسول ﷺ مراد لیتے ہوئے کسی صحابی یا تابعی مفسر کا قول نقل نہیں کیا، یہ ان کی ایک ذاتی رائے ہے جس کے لیے کوئی دلیل بھی نہیں دی گئی اور جیسا کہ پوری اس آیت سے اور اس کے بعد والی آیت کے مفہوم سے ظاہر ہے۔ یہاں لفظ نور سے رسول ﷺ مراد لینا کسی طرح درست نہیں کیونکہ آیت اس طرح شروع ہوتی ہے۔ ''یا اھل الکتاب قد جاء کم رسولنا یبین لکم کثیرا مما کنتم تخفون من الکتاب و یعفوا عن کثیر قد جاء کم من اللہ نور و کتاب مبین'' یعنی ''اے اہل کتاب تمہارے پاس ہمارے رسول آ گئے جو (تمہاری) کتاب کی بہت سی چیزوں کو وضاحت سے بیان کرتے ہیں جن کو تم چھپاتے تھے اور بہت سی چیزوں سے درگزر کرتے ہیں۔ تمہارے پاس اللہ کا نور آ گیا ہے اور واضح کتاب آ گئی ہے۔''

Marfat.com

غور کیجئے جب آیت کے شروع ہی میں رسول ﷺ کے آنے کا ذکر کیا گیا ہے تو دوبارہ "نور" کے لفظ سے اس بات کو دہرانے کی کیا ضرورت تھی؟ پھر یہ کہ دوسری آیت ۱۶ کے اندر جو آیت ۱۰ کے ساتھ مربوط ہے اس میں ہے کہ "یھدی بہ اللہ" "یعنی" اللہ (قرآن) کے ذریعہ سے ہدایت دیتا ہے" اب اگر پہلی آیت میں لفظ نور سے مراد محمد اور کتاب مبین سے مراد قرآن ہوتا تو عربی قاعدے کی رو سے اس دوسرے آیت کے پہلے جملے میں "یھدی بہ اللہ" کی بجائے "یھدی بھما اللہ" "اللہ ان دونوں کے ذریعہ تم کو ہدایت کرتا ہے" ہونا چاہیے تھا۔ یہی بات شیخ رشید رضا نے اس آیت کی تفسیر میں اپنی تفسیر المنار جلد ۶ ص ۳۰۴ پر لکھی ہے۔

امام رازی نے "قد جاء کم من اللہ نور و کتاب مبین" کی تفسیر میں تین اقوال نقل کیے ہیں پہلے یہ کہ نور سے مراد محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں، دوسرے یہ کہ نور سے مراد اسلام اور کتاب سے مراد قرآن ہے، تیسرے یہ کہ نور اور کتاب دونوں سے مراد قرآن ہے۔ انہوں نے اس آخری قول کو ضعیف قرار دیا ہے اس بناء پر کہ واؤ عطف مغایرت کے لیے ہوتا ہے اور ان کے نزدیک یہی بات درست لگتی ہے کہ نور سے محمد ﷺ اور کتاب سے قرآن مراد ہے۔ لیکن انہوں نے یہاں اس بات سے تغافل برتا کہ واؤ یہاں عطف بیان کے لیے ہے یعنی واؤ سے لفظ نور کی تفسیر بیان کی گئی ہے۔ اس طرح اس سے مراد قرآن کریم ہے پھر یہ کہ انہوں نے آیت نمبر ۱۶ کے پہلے جملہ کی تفسیر میں (یھدی بہ) کے معنی قرآن کریم لکھے ہیں۔ حالانکہ عربی قواعد کی رو سے یہ جبھی درست ہو سکتا ہے کہ جب نور اور کتاب مبین کو ایک سمجھا جائے اور یہ بات درست ہے۔ قرآن کریم میں اس کی بہت سی مثالیں ہیں۔ بیسویں صدی عیسوی کے انتہائی مشہور مصری مفسر شیخ رشید رضا نے اس قرآنی جملہ کی تفسیر بیان کرتے ہوئے یہی بات کہی ہے کہ جو ہم کہہ رہے ہیں، انہوں نے امام رازی کا نام لیے بغیر "قد جاء کم من اللہ نور و کتاب مبین" میں لفظ نور کے بارے میں تین مختلف اقوال نقل کیے ہیں اور اس کے بعد اس کو ترجیح دی ہے کہ نور سے مراد یہاں قرآن کریم ہے، اور اگرچہ عطف کے اندر اصل بات یہ ہے کہ معطوف و معطوف علیہ سے مختلف ہوتا ہے، تاہم عطف تفسیر (بیان) کے لیے بھی آتا ہے۔ ان کے الفاظ ہیں: "ولکن العطف قد یرد للتفسیر" پھر یہ کہ لفظ "یھدی بہ" ہوتا اور قرآن کے لیے لفظ نور متعدد آیات میں

Marfat.com

بیان کیا گیا ہے۔ انہی میں سے سورۃ الاعراف کی مشہور آیت ۱۵۷ ہے "فالذین آمنوا بہ و عزروہ و نصروہ واتبعوالنور الذی انزل معہ اولئک ھم المفلحون" اور سورۃ التغابن کی آیت نمبر ۸ میں "فآمنو باللہ ورسولہ والنور الذی انزلنا" ہے۔

غرض قرآن شریف کی اس آیت سے نور محمدی کا استدلال درست نہیں۔

۳۔ جہاں تک احادیث نبویہ کا تعلق ہے تو ان میں کسی صحیح حدیث سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلے جو چیز پیدا کی وہ نور محمدی ﷺ تھا بلکہ اس کے برخلاف صحیح احادیث میں یہ ملتا ہے کہ سب سے پہلے اللہ تعالیٰ نے جو چیز پیدا کی وہ عرش الٰہی تھا یا یہ کہ عرش الٰہی، ذات الٰہی کے ساتھ موجود تھا اور سب سے پہلے جو چیز اللہ نے تخلیق کی وہ قلم تھا۔ صحیح بخاری کی کتاب التوحید میں حضرت عمران بن حصین سے ایک روایت ہے کہ جس میں آتا ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا "کان اللہ و لم یکن شئی قبلہ و کان عرشہ علی الماء ثم خلق السموات والارض" یعنی کہ "اللہ تعالیٰ موجود تھا اور اس سے پہلے کوئی چیز موجود نہ تھی اور اس کا عرش پانی پر تھا پھر اللہ نے آسمان اور زمین پیدا کئے۔"

ترمذی میں حضرت ابو رزین رضی اللہ عنہ سے ایک حدیث مروی ہے جس میں حضور ﷺ نے فرمایا کہ "اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلے عرش پیدا کیا۔" (باب التفسیر۔ تفسیر سورۃ ھود)

علاوہ ازیں ترمذی میں حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ سے ایک مرفوع حدیث مروی ہے جس میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ "پہلی چیز جو اللہ نے تخلیق فرمائی وہ قلم ہے" (باب التفسیر سورۃ ن والقلم) اسی طرح حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے اسی سورۃ القلم کی پہلی آیت "نٓ ۝ والقلم وما یسطرون" کی تفسیر میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے یہ حدیث مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ "اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلے قلم کو تخلیق کیا۔" (تفسیر سورۃ القلم۔ قرطبی ۱۸۔۲۲۳)

۴۔ اور جہاں تک کتب سیرت کا تعلق ہے تو تمام مستند و قدیم کتب سیرت جیسے سیرت ابن اسحاق ترتیب ان ہشام، طبقات ابن سعد کی سیرت نبوی ﷺ سے متعلق پہلی دو جلدیں، بلاذری کی کتاب انساب الاشراف کی جلد اول جو سیرت نبوی پر ہے، اور بیہقی کی دلائل النبوۃ، اور اسی طرح ابونعیم کی دلائل النبوۃ، قاضی عیاض الاندلسی کی کتاب الشفاء، ابن سید الناس کی عیون الاثر فی

Marfat.com

فنون المغازی والشمائل والسیر'' اور شیخ الاسلام الذہبی کی تاریخ الاسلام جلد اول و دوئم جو سیرت نبوی پر ہیں، نیز حافظ ابن قیم کی زاد المعاد وغیرہ، ان میں سے کسی کتاب میں اس نام نہاد نور محمدی کی حدیث کا ذکر نہیں اور ہمی یہ بات مکرر کہنا پڑتی ہے کہ یہ حدیث شیعہ مصنفین کی اختراع کردہ ہے اور ان کا منشا یہ ہے کہ اس کے ساتھ وہ اپنے ائمہ اثناء عشر کے نور کی تخلیق کی تائید بھی کر سکیں جیسا کہ ملا باقر مجلسی کی مجمع بحار الانوار کی پندرہویں جلد سے واضح ہے، جس میں نور محمدی ﷺ کی تخلیق کے ساتھ ہی حضرت علی کرم اللہ وجہہ اور دوسرے آئمہ اہل بیت کے نور الٰہی یا نور محمدی ﷺ سے پیدا ہونے سے متعلق مختلف اقوال نقل کیے گئے ہیں۔

آخر میں عرض ہے کہ اس ساری تحریر کا مقصد ہرگز نہیں ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات مبارک کو نور الٰہی سے کچھ حصہ نہیں ملا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے یہ نور تو عالم صالح مسلمانوں کے لیے بھی تخلیق کیا ہے جس کا ذکر متعدد مقامات پر قرآن کریم میں آیا ہے۔ سورۃ الحدید کی آیت ۱۲ میں ہے ''یوم تری المؤمنین و المؤمنات یسعیٰ نورھم بین ایدیھم'' یعنی ''وہ دن جب تم مومنین اور مومنات کو دیکھو گے کہ ان کا نور ان کے آگے اور ان کے دائیں طرف چل رہا ہے۔'' پھر رہے اللہ کے آخری نبی اور اشرف المرسلین سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تو انہیں تو اس نور الٰہی سے انتہائی وافر مقدار ملی تھی، لیکن یہ کہنا درست نہیں کہ اللہ نے سب سے پہلے نور محمدی ﷺ کو پیدا کیا اور اسی سے عرش و کرسی وغیرہ کو پیدا کیا۔ اس طرح تو اللہ تعالیٰ جس کی صفت غنی و صمد ہے یعنی ہر چیز سے بے نیاز وہ اپنے عرش کی تخلیق کے لیے نور محمدی ﷺ کا نعوذ باللہ محتاج ٹھہرے گا۔ تعالی اللہ من ذلك ۔ہم اس تنقیدی جائزہ کا اختتام اس صحیح حدیث نبوی ﷺ پر کرتے ہیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سچی اور صحیح محبت کرنے والوں کے لیے مشعل راہ ہے اور وہ یہ ہے: ''لا تطرونی کما اطرت النصاریٰ عیسی بن مریم فتھلکوا کما ھلکوا'' یعنی ''میری ایسی (مبالغہ آمیز) تعریف نہ کرو جیسی عیسائیوں نے حضرت عیسیٰ بن مریمؑ کی اور اس کے نتیجہ میں تم اسی طرح ہلاک ہو جس طرح وہ ہوئے۔''

ایک اور صحیح حدیث بھی جو بخاری و مسلم وغیرہ میں ہے اس نام نہاد حدیث کے موضوع (جھوٹ) ہونے پر دلالت کرتی ہے، جو یہ ہے: اللھم اجعل فی قلبی نوراً، وفی لسانی

Marfat.com

نوراً، و فی بصری نوراً، وفی سمعی نوراً، و عین یمینی نوراً، و عن یساری نوراً، ومن فوقی نوراً، ومن تحتی نوراً، ومن امامی نوراً، ومن خلفی نوراً، واجعل فی نفسی نوراً، واعظم لی نوراً۔" یعنی "اے اللہ تو میرے دل میں نور عطا فرما، میری زبان میں نور دے، میری آنکھوں کو نور دے، میرے نیچے نور دے، میرے آگے نور دے، میرے پیچھے نور دے، میرے نفس میں نور دے اور مجھے عظیم نور عطا فرما۔"

اب یہ واضح ہے کہ اگر اس مذکورہ صدر حدیث کے مطابق ساری کائنات اور "عرش و کرسی" حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نور سے پیدا کئے گئے تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یہ دعا نہ فرما کرتے جس میں اللہ تعالیٰ سے نور کی طلب ہے۔

روایت کی رو سے سب سے اہم بات یہ ہے کہ اس نام نہاد حدیث میں جو مختلف حجابات (حجاب کرامت، حجاب سعادت وغیرہ) یا "مقامات" کا ذکر ہے، تو یہ سب بعد کی صوفیانہ اصطلاحات ہیں (ملاحظہ ہو کتاب التعریفات الجرجانی و کشاف اصطلاحات الفنون) عہد نبوی و عہد صحابہ میں ان اصطلاحات کے وجود کا پتہ نہیں چلتا، لہٰذا یہ حدیث یقیناً ایک موضوع حدیث ہے۔

استدراک

جب یہ مضمون تحریر کیا جا چکا تھا تو ایک کرم فرمانے میری توجہ امام غزالی سے منسوب ایک کتاب مجربات امام غزالی کی طرف دلائی، یہ کتاب تقریباً نوے سال قبل ایک صاحب مولانا سید حافظ یاسین علی حسنی نظامی نے ترجمہ کی تھی، اور یہ پہلی بار سن ۱۳۲۸ھ میں چھپی تھی، اب لاہور کے ایک ناشر الفیصل بکڈپو نے اس کو فوٹو کاپی کر کے شائع کیا ہے، افسوس یہ ہے کہ امام غزالی کی اصل کتاب کا نام اس میں نہیں دیا گیا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ پہلی اشاعت کے دیباچے میں مذکور ہو، کتاب میں ایک باب طب جسمانی پر ہے، جس میں تشریح بدن اور کچھ دواؤں کا ذکر ہے اور دوسرا طویل باب (مقالہ) الٰہیات پر ہے۔ امام غزالی کی تصنیفات میں کسی ایسی کتاب کا ذکر نہیں جس میں طب کی باتوں کا ذکر ہو، اس لیے مجھے شک ہے کہ یہ کتاب امام غزالی کی ہے۔

بہر حال اس کے دوسرے باب یا مقالے میں نور محمدی سے متعلق اس زیر بحث حدیث کا ذکر ہے اور اس حدیث میں مضمون کی تفصیلات یعنی نور محمدی کے چار حصوں میں تقسیم کا ذکر نئے

Marfat.com

انداز میں ہے (ص ۲۶۳) اور ساتھ ہی اس کے برعکس صفحہ ۲۰۱ پر درج ہے کہ اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلے عقل کو پیدا کیا، اور یہ بھی کہ سب سے پہلے قلم کو پیدا کیا۔ نور محمدی سے متعلق حدیث کے اس تیسرے صیغہ سے بھی اس کے موضوع ہونے پر روشنی پڑتی ہے۔ ویسے بھی اس کتاب میں امام غزالی کی احیاء العلوم کی طرح بہت سی ضعیف اور موضوع احادیث مذکور ہیں، اور لائق اعتماد نہیں۔

وما توفیقی الا باللہ۔

Marfat.com

مغرب میں آنے والا ایک نیا سیلاب بلا

امریکہ جو ہم کو اپنے مختلف مالیاتی اداروں (ورلڈ بینک آئی۔ایم۔ایف وغیرہ) کے ذریعے بھاری سود پر قرضے فراہم کر کے معاشی غلامی کے بندھنوں میں جکڑتا اور ہمارے حکمران طبقے اور چند محدود دوسرے گروہوں کو خوشحالی کے مواقع بہم پہنچاتا ہے، وہ اب ہم کو ایک نیا ''تحفہ'' دینے والا ہے جو کسی طرح ایک سیلاب بلا سے کم نہ ہوگا، اس کی سنگینی طاقتور ترین ایٹم بم سے کہیں زیادہ اور دیر اثر ہوگی۔آپ جب اس ''عظیم تحفہ'' کی تفصیلات سے واقف ہوں گے اور گزشتہ تباہ شدہ قدیم اقوام کی تاریخ کی روشنی میں اس پر غور کریں گے تو آپ کو میری بات مبالغہ سے بالکل مبرا نظر آئے گی۔

اس تحفہ کی پیشکش کی تیاری خاموشی کے ساتھ کافی عرصہ سے ہو رہی تھی، اللہ تعالیٰ جزائے خیر دے مولانا محمد تقی عثمانی صاحب کو کہ انہوں نے پہلی بار اس کی نشاندہی جنگ کی ۲۹ اگست کی اشاعت میں ''قاہرہ کانفرنس کا پروگرام آف ایکشن'' کے عنوان سے اپنے مضمون میں کی ہے۔ مجھے ایک ماہ قبل لندن کے ایک اردو رسالہ کے ذریعہ اس کی مختصر خبر ملی تھی جس میں اس کنڈوم کلچر (Condom Culture) کی طرف اشارہ تھا جس کی کچھ تفصیلات مولانا تقی عثمانی صاحب کو ایک صاحب حمیت اور غیور مسلمان نے امریکہ سے بھیجی ہیں، اور جس کو امریکہ اب اقوام متحدہ کے ذریعہ دنیائے اسلام پر مسلط کرنا چاہتا ہے، اس کے لیے جیسا کہ قارئین نے پڑھا ہوگا آئندہ ہفتہ قاہرہ میں ۵ ستمبر سے ۱۳ ستمبر ۱۹۹۴ء تک ایک اعلیٰ سطح کی بین الاقوامی کانفرنس منعقد کی جا رہی ہے، جس کو آبادی اور ترقی (Population and development) کی کانفرنس کا خوشنما نام دیا گیا ہے، اور جس میں خاص طور پر ''بہبود آبادی'' اور ''خاندانی منصوبہ بندی'' (ایک اور شکر ملفوف عنوان) کے مسائل سے متعلق عملی اقدامات پر غور کیا جائے گا، ان اقدامات کو (Program of action) کا نام دیا گیا ہے، بلکہ جیسا کہ قارئین نے پڑھا ہوگا، یہ پروگرام

Marfat.com

اقوام متحدہ کی مقرر کردہ ایک کمیٹی نے ایک طویل مطبوعہ رپورٹ کی شکل میں تیار بھی کرلیا ہے اوراس کو ہی شرکائے کانفرنس کے سامنے منظوری کے لیے پیش کیا جائے گا اور یقین ہے کہ یہ منظور کرلیا جائے گا، کیونکہ اقوام متحدہ، جس کی کامل سرپرستی اب امریکہ کو حاصل ہے، کوئی ایسا قدم نہیں اٹھاتی جس سے اختلاف رائے کرکے اس کو ناکام بنایا جاسکے، وہ اس کے لیے پہلے سے مختلف عالمی حکومتوں سے رابطہ کرکے میدان ہموار کرلیتی ہے اور وہ ایسی حماقت نہیں کرتی جو ہماری موجودہ حکومت نے کشمیر کا مسئلہ جنیوا کے انسانی حقوق کمیشن کے اجلاس میں اٹھانے میں کی تھی۔

یہ ''کنڈوم کلچر'' یعنی ''محفوظ زنا ثقافت'' (یہ لفظی ترجمہ نہیں) کیا ہے؟ اور اس کے موٹے موٹے نقاط اور نمایاں پہلو کیا ہیں؟ اس کو قارئین نے ۲۹ اگست ۱۹۹۴ء کے مذکورہ مضمون میں پڑھ لیا ہوگا، جو اقوام متحدہ کے ''عملی پروگرام'' کی رپورٹ سے پیش کئے گئے ہیں، میں ان کو یہاں دہرانا نہیں چاہتا، اگرچہ اس کی بڑے پیمانے پر تشہیر ضروری ہے تاکہ تیسری دنیا کے مسلمان اس ابلیسی اور جہنمی پروگرام کے خطرات سے آگاہ ہوں، مختصراً اتنا کہوں گا کہ اس کی غرض وغایت یہ ہے کہ عام طور پر تیسری دنیا اور خاص طور پر اسلامی ممالک میں شرم وحیا، عفت و پاک دامنی کی اقدار کو پامال کرکے بے شرمی و بے حیائی اور بدکاری وحرام کاری کی ان تمام اقدار (Values) کو عام کیا جائے جو امریکہ کی سوسائٹی کا طرۂ امتیاز اور مرد وزن کے تعلقات میں حرام وحلال اور جائز وناجائز کی تمیز اٹھادی جائے۔

اس پروگرام کا سب سے زیادہ ابلیسی نقطہ یہ ہے کہ سکولوں میں کچی عمر کے طلبہ کو جنسی تعلیم دی جائے، تاکہ ان کے ذہنوں سے شرم وحیا اور عفت وعصمت کا فطری تصور ہی ختم ہوجائے اور سکولوں کے ان لڑکوں اور لڑکیوں کو کنڈوم کے استعمال کی ترکیب بتاکر ذہنوں میں یہ بٹھایا جائے کہ غلطی یہ نہیں ہے کہ وہ آزادانہ باہم جنسی تعلقات (یا صاف الفاظ میں زنا) قائم کریں، بلکہ غلطی یہ ہے کہ کنڈوم (مانع حمل غلاف) کے عدم استعمال یا غلط استعمال سے حرامی اولاد پیدا ہوجائے۔ (میں نے یہاں گناہ کا لفظ استعمال نہیں کیا ہے کہ مغربی سوسائٹی میں گناہ (Sin) کا تصور ختم ہوچکا ہے اور وہ چاہتے ہیں کہ ہمارے یہاں بھی یہ تصور بالکلیہ ختم ہوجائے)۔

پھر اگر زنا (یہ قرآنی لفظ ہے اور اس سے حرام کاری کا جو گھناؤنا تصور ذہن میں بیٹھتا ہے،

Marfat.com

وہ ناجائز جنسی تعلقات کے لفظ سے نہیں بیٹھتا، اس لیے اس کا استعمال موزوں ومفید ہے) کے ذریعہ حمل قرار پائے تو والدین، سوسائٹی اور حکومت کا فرض ہے کہ وہ ایسی ناجائز حاملہ لڑکیوں اور عورتوں کی پوری حمایت ونگہداشت کرے ان کو نفرت کی نگاہ سے نہ دیکھے۔

اور اتنا ہی نہیں اس ''بہبود آبادی'' پروگرام کا ایک اہم نقطہ یہ بھی ہے کہ اسی جنسی تعلیم وتربیت، مانع حمل ذرائع اور آزادانہ زناکاری کی ترویج کے لیے تمام ذرائع ابلاغ، ریڈیو، ٹیلی ویژن اور اخبارات وغیرہ کو استعمال کیا جائے۔

میں قارئین کرام سے کہوں گا کہ وہ مولانا تقی عثانی صاحب کے مذکورہ مضمون کو اگر انہوں نے نہ پڑھا تو ضرور پڑھیں، بلکہ بار بار پڑھیں اور اس کی کاپیاں کرا کرا اپنے دوستوں میں تقسیم کریں۔ ایک بات جس کا ذکر مجھ کو مولانا تقی عثانی صاحب کے مضمون میں نظر نہیں آیا یہ ہے کہ اس ''ایکشن پروگرام'' میں کہا گیا ہے کہ کارخانوں، دفتروں اور تجارتی مراکز میں زیادہ سے زیادہ نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کو آزادانہ اختلاط کے مواقع فراہم کیے جائیں اور ہر آدمی جان سکتا ہے کہ یہ جنسی آزادی کی طرف پہلا فعال قدم ہے۔ آخر یہ سب کیا ہے؟ کیوں ہے؟ شاید ہمارے بعض ان قارئین کو اس کا یقین نہ آئے جو امریکہ یا دوسرے یورپین ممالک نہیں گئے ہیں، یا جنہوں نے وہاں کی سوسائٹی کے بارے میں تفصیل سے نہیں پڑھا ہے، پھر یہ سوال بھی ہے کہ بے حیائی، بے شرمی، جنسی آزادی، اسقاط حمل (یعنی نفس انسانی کے قتل) کے اختیار سے متعلق مسائل کی کانفرنس آخر عرب اور اسلامی دنیا کے سب سے بڑے مرکز قاہرہ میں کیوں ہو رہی ہے؟ وقت کا شدید تقاضا ہے کہ ان سب امور پر روح ایمانی اور خلوص نیت کے ساتھ سوچا جائے اور بغیر کسی تاخیر کے کم از کم پاکستان میں ہم اک متحد موقف اختیار کریں اور اپنی حکومت کو مجبور کریں کہ سعودی عرب، سوڈان، ایران اور بنگلہ دیش کی طرح اس کانفرنس کا بائیکاٹ کرے اور سارے مسلمان ملکوں کو اس کانفرنس کو بے اثر کرنے پر آمادہ کرے۔(۱)

اب ہم ان سوالات کے جوابات دینے کی کوشش کرتے ہیں جو اوپر اٹھائے گئے ہیں۔

۱۔ بائیکاٹ تو کیا پیپلز پارٹی کی ہمارے ملک کی وزیراعظم بے نظیر بھٹو اس میں خود شریک ہوئیں اور وہاں تقریر کی، ان کی حکومت نے اس پروگرام کی حمایت کی۔ (مصنف)

Marfat.com

جاننے والے جانتے ہیں کہ مغرب اور خاص طور پر امریکہ میں حیا (Modesty) عصمت وعفت (Chastity) بے معنی الفاظ ہو چکے ہیں، بلکہ محبت بھی ان کے یہاں بیکار لفظ ہو چکا ہے، بس ان پر جنس (Sex) کا اک بھوت سوار ہے، غیر شادی شدہ نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کے ناجائز تعلقات (زنا) کو انہوں نے (Pre-marital relations) اور شادی شدہ مرد وزن کی زنا کاری کو (Extraa relations) کے نئے اور نام نہاد "مہذب" نام دیئے ہیں اور اس طرح زنا یعنی بائبل کا لفظ (Adultery) بھی ان کی لغت میں اب ایک بے معنی لفظ ہو چکا ہے، خاندان کا تصور بھی ان کے یہاں تقریباً بے معنی ہو چکا ہے، خاندان کا مطلب اب امریکہ میں یہ نہیں کہ ایک شادی شدہ مرد وزن اپنی اولاد کے ساتھ ایک جگہ رہنے والی ایک اکائی (Unit) ہوتی ہے، بلکہ نیا امریکی قانون تصور خاندان یہ ہے کہ ایک چھت کے نیچے وہ دو مرد وزن، یا صرف دو مرد، یا صرف دو عورتیں جو آزادانہ رہتے اور جنسی تعلقات رکھتے ہیں وہ ایک خاندان (Family) ہوتے ہیں۔ اس سب کے بالمقابل نہ صرف اسلامی ممالک کے معاشروں میں بلکہ امریکہ اور یورپ میں بسنے والے مسلمان معاشروں میں یا ان کی اکثریت میں شرم وحیا، عصمت وعفت، جائز وناجائز اور حرام وحلال کے تصورات باقی ہیں، وہ زنا کو اب تک زنا ہی سمجھتے ہیں، حتیٰ کہ وہ بھی جو اس آفت میں مبتلا ہو جائیں، ان کے یہاں خاندان کا اسلامی بلکہ عام مذہبی تصور بھی قائم ہے۔ بلکہ امریکہ میں بسنے والے تقریباً ساٹھ لاکھ مسلمانوں میں گزشتہ ربع صدی کے اندر جو مذہبی بیداری پیدا ہوئی ہے اور وہاں جس کثرت سے مساجد اور اسلامی مراکز قائم ہو رہے ہیں، پاکستان، ہندوستان اور عرب ممالک سے علماء جا رہے ہیں اور مختلف اسلامی تنظیمیں سرگرم عمل ہیں، امریکن مسلمان ہو رہے ہیں، اس سب سے وہاں کے مسلمانوں میں یہ احساس مضبوط ہو رہا ہے کہ اگرچہ ہم ان اصلی امریکن، کینیڈین اور برطانوی وغیرہ باشندوں سے علم و ٹیکنالوجی میں کمتر ہیں، لیکن ہم کو ان پر بحمد اللہ ایک اخلاقی برتری حاصل ہے، اس سے ان کا اسلامی تشخص مستحکم ہو رہا ہے۔ دوسری طرف اس سب کا اثر امریکی معاشرہ یا افراد پر ایک اور انداز سے پڑ رہا ہے، مسلمانوں کے قرب وجوار میں بسنے والے امریکن اور دوسرے مغربی باشندے یہ محسوس کرنے لگے ہیں کہ یہ مسلمان اگرچہ ہمارے مقابلہ میں پسماندہ ہیں، علم وٹیکنالوجی میں ہم سے پیچھے ہیں، لیکن ان کے پاس کوئی چیز ہم سے برتر ہے اور وہ ان کی اخلاقی قدریں ہیں، جن کا

Marfat.com

منبع ان کا مذہب ہے، ان کی خاندانی وحدت (Unity) ہم سے بہتر اور باہم مربوط ہے، ان کا کوئی بچہ اپنے اصلی ماں باپ کو چھوڑ کر قانون کے زور پر کسی دوسرے مرد و زن کو اپنا ماں باپ نہیں بناتا۔ اس سے بھی زیادہ گھناؤنی بات وہ اپنے معاشرے میں یہ دیکھتے ہیں کہ ان کے خاندانوں میں Incest (یعنی باپ بیٹی، بہن بھائی میں جنسی تعلقات) کی وبا عام ہو رہی ہے، جس کا مسلمانوں میں تصور بھی نہیں کیا جاتا، جس کو اس بارے میں کوئی شک ہو، وہ بیس بائیس سال قبل شائع شدہ امریکی کتاب (SexTecnage) پڑھے، یا پھر ایک تازہ کتاب (Breaking the Silence) جس کا ذکر چند ماہ قبل سی۔ این۔ این میں ہوا تھا، اور اس پر کچھ روتی ہوئی امریکن ماؤں کے انٹرویوز بھی دکھائے گئے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ امریکن اسلام کی طرف راغب ہو رہے ہیں، اور اسلام امریکہ میں عیسائیت اور یہودیت کے بعد سب سے بڑے مذہب کی حیثیت سے ابھر رہا ہے، جیسا کہ امریکن انفارمیشن سروس (USIS) کی تازہ رپورٹ میں بتایا گیا ہے اور جو ڈان (Dawn) کی ۳۰/ اگست ۱۹۹۴ء کی اشاعت میں چھپی ہے۔

امریکہ کی انتظامیہ اس صورتحال سے تشویش میں ہے اور اس کا ''نیو ورلڈ آرڈر'' خطرہ کی زد میں ہے، جو نہ صرف سیاسی ہے، بلکہ اقتصادی اور معاشرتی پہلو بھی رکھتا ہے، سیاسی و اقتصادی حد تک وہ بڑا کامیاب ہوا ہے، لیکن معاشرتی (Socital) امور میں وہ اب تک ناکامی سے دو چار ہے، کہ اس کو خود اپنے یہاں اور دوسرے مغربی ممالک میں مسلمانوں کی اعلیٰ معاشرتی قدروں سے مقابلہ ہے۔ ان ارفع معاشرتی اخلاقی قدروں سے بچنے اور اپنے تنزل پذیر معاشرے میں اپنی برتری قائم رکھنے کا ایک طریقہ تو یہ تھا کہ صلیبی طور طریقوں کو اپنایا جائے اور مسلمانوں سے وہ سلوک روا رکھا جائے جو قرون وسطیٰ میں بلکہ اٹھارویں صدی تک یورپ میں یہودیوں کے ساتھ کیا گیا تھا کہ ان کو (Ghettos) (یورپین شہروں میں یہودیوں کی پسماندہ علیحدہ بستیاں) میں محصور کیا جائے، ان پر معاشی اور تجارتی و سماجی سرگرمیوں کا دروازہ بند کیا جائے، وہ اچھوتوں کی طرح امریکہ اور دوسرے مغربی ممالک میں رہیں، لیکن چونکہ:

اس دور میں مے اور ہے جام اور ہے جم اور
ساقی نے بنا کی روش لطف و کرم اور

Marfat.com

امریکی انتظامیہ نے یہ طریقہ اپنایا کہ مسلمان ملکوں میں ان معاشرتی اخلاقی قدروں پر ضرب لگائی جائے کہ ''نہ رہے گا بانس نہ بجے گی بانسری'' یعنی ان ملکوں میں امریکی قدروں کو عام کیا جائے، ان کے یہاں جنسی انارکی پھیلائی جائے، جس سے ان مسلمان ملکوں میں شرم وحیاء، عصمت وعفت، جائز وناجائز، بدی وگناہ کا تصور ہی مٹ جائے تاکہ پھر وہ نہ تو اخلاقی ومعاشرتی برتری کے وہم میں مبتلا ہوں اور نہ امریکن اور دیگر مغربی معاشروں پر اپنا اثر ڈال سکیں۔

یہ ہے وہ حقیقی منصوبہ جو اس ''آبادی وترقی'' یا بہبود آبادی وخاندانی منصوبہ بندی کی عالمی کانفرنس کے پیچھے کارفرما ہے اور جس کے لیے امریکہ نے اقوام متحدہ کو آلۂ کار بنایا ہے، کہ اب یہی مقبول ترین حربہ ہے، جو امریکہ نے خلیج کی جنگ میں کامیابی کے ساتھ آزمایا اور پھر بوسنیا میں، جس سے سب واقف ہیں۔

امریکہ کے اس منصوبہ کو سمجھنے کے لیے کسی بڑے علم وفراست کی ضرورت نہیں، یہ معمولی فہم و دانش رکھنے والے پر عیاں ہے، لیکن المیہ یہ ہے کہ مسلمان حکومتیں، چند کو چھوڑ کر، اس پر خاموش ہیں، ہماری وزیراعظم صاحبہ بنفس نفیس اس میں شرکت کرنا چاہتی ہیں، یہی نہیں ۳۰ اگست کے اخبارات میں ہے کہ موصوفہ نے حکم فرمایا ہے کہ چاروں صوبوں کے وزرائے بہبود آبادی بھی اس میں شرکت کریں۔ جہاں تک قاہرہ کو اس کانفرنس کے انعقاد کے لیے اختیار کرنے کا سوال ہے تو سب جانتے ہیں کہ یہ سب سے بڑا عرب ملک ہے، یہ وہ ملک ہے جہاں ہزار سالہ قدیم ترین اسلامی یونیورسٹی جامعہ الازہر قائم ہے، جس سے ساری اسلامی دنیا مستفیض ہوتی رہی ہے۔ یہی وہ قاہرہ ہے جہاں اس صدی کے تیسرے عشرے میں سب سے بڑی اور مؤثر ترین اسلامی تحریک اخوان المسلمین نے جنم لیا، جس نے سارے عالم اسلام کو متاثر کیا، جس کو مصر کا ڈکٹیٹر جمال عبدالناصر اپنے سارے ظلم و جبروت کے باوجود نہیں دبا سکا، اور جو اس کی موت کے بعد دوبارہ وہاں فعال ہے۔ سو امریکن چاہتے ہیں کہ اپنے اس ابلیسی منصوبہ کی عالمی تشہیر وعملی تدابیر کی منظوری وہیں پر عالمی برادری سے حاصل کی جائے، تاکہ وہ اسلامی دنیا کو دکھا سکیں کہ اے مسلمانو! دیکھو ہم تمہاری معاشرتی واخلاقی قدروں کی پامالی کی ابتدا تمہارے ہی ایک عظیم وقدیم اسلامی ملک سے کرتے ہیں۔ مسلمانوں کی نفسیات پر اس کا جو اثر پڑے گا اس کا اندازہ ہر ذی شعور لگا سکتا ہے۔

Marfat.com

جہاں تک حسنی مبارک، مصری صدر، کا تعلق ہے جو سادات کے عہد میں مصری ایئر فورس کے اعلیٰ افسر تھے، تو وہ خلیجی جنگ میں سات ارب ڈالر کا امریکہ قرضہ معاف کرا کے اب امریکہ کے احسانات کے نیچے دبے ہوئے ہیں۔ لہٰذا ان میں سکت نہیں تھی کہ اس کانفرنس کے انعقاد کے لیے قاہرہ کے دروازے بند کر سکتے۔ پھر اقوام متحدہ کا موجودہ جنرل سیکرٹری بطرس غالی وہی نیم یہودی نیم عیسائی مصری ہے جو برسوں مصری وزارت خارجہ میں سی۔ آئی۔ اے کا ایجنٹ رہا ہے یہ وزیر مملکت کے عہدے پر فائز تھا اور یہی سابق مصری صدر انور سادات کو سن ۱۹۷۷ء میں اسرائیل جانے پر آمادہ کرنے میں کامیاب ہوا تھا، اور بالآخر اس کو امریکی تائید سے اقوام متحدہ کے جنرل سیکرٹری کا اہم عہدہ مل گیا، لہٰذا اس نے قاہرہ کو اس کانفرنس کے انعقاد کے لیے اختیار کرنے میں اہم رول ادا کیا ہے۔ لیکن مجھے امید ہے کہ مصر کے عوام اس کے خلاف احتجاج کریں گے اور جامعہ الازہر نے تو پہلے ہی اخبارات کی اطلاع کے مطابق اس کانفرنس کے انعقاد پر اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کیا ہے۔

اب اس صورتحال میں جب کہ یہ کانفرنس تو لامحالہ منعقد ہو گی ہمیں کیا لائحہ عمل اختیار کرنا چاہیے کہ اس کے زہرناک اثرات سے امت مسلمہ محفوظ رہے، یا علامہ اقبالؒ کے الفاظ میں ''پس چہ باید کرد اے اقوام مشرق؟''

میرے خیال میں اگر ہم اپنے کلمۂ توحید کی طرف توجہ کریں جس کو پڑھ کر اور جس پر یقین کر کے ہی ایک انسان مسلمان کہلانے کا مستحق ہوتا ہے، تو ہم کو اس میں اس طرح کے سارے مغربی غلط اقدامات کا مداوا نظر آئے گا، اس کلمۂ اسلام کا پہلا حرف ''لا'' ہے۔ جس کے معنی ہیں ''نہیں'' اللہ تعالیٰ کی وحدانیت، اس کی ربوبیت کی طرف دعوت یعنی ''الا اللہ'' سے قبل ''لا الہ'' کہنا اور اس پر عمل کرنا ضروری ہے، اور اس ''لا الہ'' کا مطلب صرف یہ نہیں کہ ہم کوئی دوسرا معبود نہیں مانتے، کوئی بت نہیں تسلیم کرتے، بلکہ اس کا مطلب ہے کہ ہم اپنی خواہشات نفس کی بھی نفی کرتے ہیں۔

قرآن کریم میں متعدد جگہ پر خواہشات نفس کو بھی الہ سے تعبیر کیا گیا ہے اور اس کی پیروی سے منع کیا ہے، ایک جگہ ارشاد ہے ترجمہ: ''اے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کیا تم نے اس شخص کی حالت پر غور کیا جس نے اپنی خواہش نفس کو ہی اپنا معبود بنا رکھا ہے۔''

Marfat.com

تو مغربی اقوام اور خاص طور پر امریکہ نے اپنی خواہش نفس کو اپنا معبود بنا رکھا ہے، ہر وہ چیز جس کو ان کا دل چاہتا ہے، وہ جائز ہے۔ خواہ یہ مذہبی اور اخلاقی اعتبار سے کیسا ہی مکروہ اور گھناؤنا فعل کیوں نہ ہو، ان کی مجالس قانون ساز نے اسی خواہش نفس کی پیروی میں لواطت (اس کو ہم جنسی کا مہذب نام دیا گیا ہے لیکن زہر کی گولی پر شکر چڑھانے سے وہ شکر نہیں بن جاتی ہے) جیسے غیر فطری فعل کو جائز قرار دے دیا ہے، اور یہ گھناؤنی بدکاری وہاں علی الاعلان ہوتی ہے، میں اپنا ایک ذاتی مشاہدہ بتاتا ہوں کہ جب سن ۱۹۷۸ء میں پہلی بار امریکہ گیا تو نیویارک میں، میں وہاں کی مشہور یونیورسٹی کولمبیا کے قریب ٹھہرا تھا، پہلی شام ہی ٹہلتا ہوا میں اس کیمپس میں پہنچا تو دیکھا کہ وہاں یونیورسٹی کے لوطی طلبہ کی جن کو (Gays) (خوش وخرم) کا نام دیا گیا ہے، ایک بڑی میٹنگ ہو رہی تھی، بڑے بڑے پوسٹر لگے ہوئے تھے، وہاں کے طلبہ نے مجھے اور میرے انڈونیشین ساتھی کو بھی شرکت کی دعوت دی مگر ہم وہاں سے انتہائی کراہیت کے ساتھ **اعوذ باللہ من الشیطان الرجیم** پڑھتے ہوئے واپس ہوئے، اور ایسا ہی ایک منظر اسی سفر میں بعد کو میں نے سان فرانسسکو کی مشہور یونیورسٹی برکلے میں دیکھا۔

مسلمان حکومتوں نے اب تک اس ناپاک عمل کو ''لا'' (نہیں) کہہ کر رد کیا ہے، لیکن بہبود آبادی کے نام پر جس جنسی آزادی کے لیے یہ کانفرنس منعقد کی جارہی ہے، ہمیں بلکہ پوری امت مسلمہ کو اس کے خلاف بھی پوری قوت سے اور بلند آواز سے ''لا'' (نہیں) کہنا چاہیے اور پوری قوم کو اس ناپاک منصوبہ کے خلاف اٹھ کھڑا ہونا چاہیے، ہم اس کے خلاف احتجاجی جلسے کریں، اخبارات میں لکھیں، کارپردازان حکومت کو لکھیں، قومی اسمبلی کو متحرک کریں اور حکومت کو مجبور کریں کہ وہ اس کانفرنس کا بائیکاٹ کرے جیسا بعض دوسرے اسلامی ممالک نے کیا ہے۔ بلکہ ہماری اسلامی جمہوریت پاکستان کا فرض ہے کہ وہ اعلیٰ سطح پر اس کانفرنس کے خلاف تحریک چلا کر اور دوسری مسلمان حکومتوں سے رابطہ کر کے اس کے ناپاک اثرات کو زائل کرنے کی کوشش کرے۔

وہ لوگ جو دنیا میں کثرت آبادی اور غذائی قلت کی شکایت کرتے ہیں وہ یہ بتائیں کہ کیا اللہ تعالیٰ نے اپنی صفت ''رزاقیت'' نعوذ باللہ انسانوں کو منتقل کر دی ہے، اور کیا قرآن کریم کی یہ آیت (ترجمہ): ''یقیناً اللہ ہی ہے جو رزاق اور بڑی مستحکم قوت والا ہے۔'' اب نعوذ باللہ منسوخ اور بے معنی ہو چکی ہے، نہیں ہرگز نہیں۔

Marfat.com

وہ مغربی اقوام اور خاص طور پر امریکہ جو ہم کو غذائی قلت کا مداوا کرنے کے لیے بہبود آبادی کا فریب کارانہ درس دیتی ہیں، وہ ہم کو یہ بھلانا چاہتی ہے کہ مسلمان ملکوں میں نیل، سندھ، دجلہ و فرات جیسے انتہائی بڑے اور بیسیوں ان سے چھوٹے دریا بہتے ہیں، ہمارے ملکوں میں ہموار اور قابل کاشت زمین کی کمی نہیں، ہمارے یہاں ہل اور ٹریکٹر چلانے والے ہاتھوں کی کمی نہیں تو جو کروڑوں ڈالر امریکہ، اقوام متحدہ یا ورلڈ بینک وغیرہ سے خاندانی منصوبہ بندی اور کنڈوم کے لیے دیا جاتا ہے وہ آخر ہم کو اپنے ذرائع آب رسانی کو بہتر بنانے اور ٹریکٹر خریدنے کے لیے کیوں نہیں دیا جاتا۔ اسرائیل اپنے بے آب و گیاہ صحرائے نقب میں نئی زرعی ٹیکنالوجی کے ذریعہ اپنی ضرورت کے لیے غلہ اگا سکتا ہے، بھارت اسی ٹیکنالوجی کی بدولت راجھستان جیسے ریگستان میں ہرے بھرے کھیت قائم کر سکتا ہے، ہم پانی اور زمین کی اس افراط کے باوجود، پاکستان، مصر، سوڈان، نائیجریا جیسے وسیع و عریض ملکوں میں اتنا غلہ کیوں نہیں پیدا کر سکتے ہیں جو سارے اسلامی ملکوں کے لیے کافی ہو۔ بنگلہ دیش اور انڈونیشیا وغیرہ کا تو ذکر ہی کیا کہ وہاں بے حد پانی ہے۔

سعودی عرب اس نئی ٹیکنالوجی کی بدولت سمندر کے پانی کو میٹھا کر کے اپنے یہاں اب اس قدر غلہ اگا رہا ہے کہ وہ گندم کا برآمد کرنے والا ملک بن گیا ہے۔ ہمیں مانع حمل ذرائع کی اتنی ضرورت نہیں جتنی اس نئی زراعتی ٹیکنالوجی کی ضرورت ہے جس کے ذریعے ہم امریکہ کی طرح اپنے یہاں کافی غلہ اگا سکیں، یورپ اور امریکہ مسلمان ملکوں کو سامان تعیش اور اسلحہ تو اپنی فیکٹریوں کو چلتا رکھنے کے لیے بہم پہنچاتا ہے، لیکن زراعتی ٹیکنالوجی فراہم نہیں کرتا، سو ہم خود ہی کاروں کے بجائے زیادہ سے زیادہ ٹریکٹر اور دوسرے آلات زراعت بنائیں، کھاد پیدا کریں، زمینوں کو قابل کاشت بنائیں، یقیناً ہم اپنی ضرورت کے مطابق غذا پیدا کر سکیں گے، اور پھر اللہ تعالیٰ رزاق ہے، کنڈوم کلچر غذائی قلت کا حل نہیں، یہ بے حیائی، بدچلنی کی طرف ایک انتہائی خطرناک قدم ہے، جنسی آزادی کی پوشیدہ دعوت ہے، جس پر چل کر قوموں کا وہ انجام ہوا ہے، جو قوم لوط کا ہوا تھا، اٹلی کے قدیم پر تعیش شہر پومپئی کا ہوا تھا، جن کی بربادی کے آثار میری طرح ہر انسان وہاں جا کر دیکھ سکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اس سے بچائے۔ سر دست تو ہم کو بہ یک آواز ہو کر اس بلند آہنگ سے ''نہیں'' کی آواز بلند کرنا ہے کہ ''عمومی قحبہ گری'' کی دعوت دینے والا مغرب گھبرا اٹھے اور اس کی یہ کانفرنس ناکام ہو جائے۔

Marfat.com

خاندانی منصوبہ بندی، شریعت اور قاہرہ کانفرنس

قاہرہ میں اقوام متحدہ یا صحیح الفاظ میں امریکہ کے زیر اہتمام جو بین الاقوامی کانفرنس ''آبادی وترقی'' کے مزعومہ نام سے ہورہی ہے اس پر سارے عالم اسلام بلکہ کیتھولک عیسائی دنیا (خاص طور پر فلپائن) میں احتجاج کی ایک لہر دوڑ گئی ہے۔ دنیا کی یہ سب سے بڑی کانفرنس ہے کہ اس میں ۱۸۲ ممالک کے ۳۵۰۰ نمائندے شریک ہیں غیر سرکاری تنظیمات کے نمائندوں کی تعداد علیحدہ ہے اور اخبارات کی اطلاعات کے مطابق ان سب کی تعداد ۱۵۰۰۰ ہے۔ ہماری وزیراعظم ملک میں احتجاج کے باوجود اس کانفرنس میں ایک بہت بڑا وفد لے کر گئیں اور ''نوائے وقت'' ۳ ستمبر ۱۹۹۴ء کی خبر کے مطابق اس وفد میں ایک عالم دین بھی شریک ہیں جن کا نام ہے ڈاکٹر رشید جالندھری (ازہری)۔

اس کانفرنس میں اس کے نیویارک میں منظور شدہ دستور العمل کے مطابق جو مسائل درپیش ہیں ان کی تفصیل ہفتہ وار تکبیر کے دو شماروں نمبر ۳۴، ۳۶، ۱۹۹۴ء اور مولانا تقی عثمانی اور راقم السطور کے جنگ میں حالیہ شائع شدہ مضامین میں آچکی ہیں۔ جنگ کی اشاعت ۳ ستمبر ۱۹۹۴ء میں ڈاکٹر رشید جالندھری صاحب کا ایک مضمون ''خاندانی منصوبہ بندی شرعی نقطہ نگاہ سے'' چھپا ہے جو اگرچہ وفاقی شرعی عدالت میں دائر کردہ ڈاکٹر محمود الرحمٰن فیصل کے خاندانی منصوبہ بندی کے خلاف دعویٰ کے نقاط کی تردید میں ہے، لیکن جس سے قاہرہ میں زیر انعقاد کانفرنس اور اس کے مقاصد: جبری خاندانی منصوبہ بندی، تقلیل آبادی اور اس کے وسائل یعنی پرائمری اسکولوں میں جنسی تعلیم (کنڈوم کا استعمال سکھانے کے لیے) اسقاط حمل کا آزادانہ حق وغیرہ کی تائید ہوتی ہے، اس لیے یہ مضمون خاص اس موقع پر اشاعت کے لیے جنگ کو بھیجا گیا اور اس مؤقر اخبار نے اپنی آزاد پالیسی (یعنی موافقانہ اور مخالفانہ نقطہ ہائے نظر کی بے لاگ اشاعت) کے مطابق اس کو جنگ میں شائع کردیا۔

Marfat.com

ہم شرعی حیثیت ہی سے اس مضمون میں پیش کردہ نقاط اور آیات قرآنی واحادیث پر روشنی ڈالنا چاہتے ہیں، لیکن اس سے قبل یہ عرض ہے کہ انسان کے افکار اس کے اپنے کردار کا آئینہ دار ہوتے ہیں۔ ایسے علماء مسلم سوسائٹی میں ہمیشہ رہے ہیں جنہوں نے اپنے مخصوص نقطۂ نظر اور حکومت وقت کی پالیسیوں کی تائید کے لیے قرآن و حدیث کو مسخر کیا ہے، لیکن راسخ العقیدہ اور استقامت پسند مسلمان عوام نے ایسی آراء وافکار کو ہمیشہ مسترد کر دیا ہے۔ ایوب خان کے عہد میں بھی ایسے ہی ایک ڈاکٹر صاحب نے سود اور بیمہ کے جواز کے فتوے دیئے اور خاندانی منصوبہ بندی کی تائید کی تھی، لیکن ان کو بالآخر عوام کے دباؤ کے تحت ملک چھوڑ کر امریکہ جانا پڑا، اللہ ان کی مغفرت کرے۔ ڈاکٹر رشید جالندھری نے سب سے پہلے اپنے نقطہ نظر کی تائید کے لیے علامہ اقبال کی ایک رائے پیش کی ہے۔ جو ہماری نظر میں مشکوک بلکہ غلط ہے، وہ لکھتے ہیں: ''علامہ اقبال نے آج سے تقریباً سو سال پہلے اس مسئلہ کی سنگینی کا احساس کرتے ہوئے مسلمانوں سے اپیل کی تھی کہ وہ شرح پیدائش کو نہ بڑھنے دیں تا کہ رسائی حاصل کر سکے، جن کے ساتھ حقیقی بہبودی وابستہ ہے۔''

صاحب مضمون نے اس کے لیے جو حوالہ دیا ہے اس کا تو ان کے مضمون میں کہیں نام و نشان نہیں۔ بہرحال یہ ان کی اپنی ترجمانی ہے، علامہ مرحوم کے الفاظ نہیں۔ پھر اتنی بات تو ہر صاحب علم جانتا ہے کہ تقریباً سو سال پہلے تو علامہ اقبال صرف فلسفہ وانگریزی کے طالب علم اور ایک عام شاعر تھے جو داغ دہلوی کے رنگ میں غزلیں اور مختلف عام موضوعات پر نظمیں لکھتے تھے، اور ہندوستانی وطنی قومیت کے علمبردار تھے۔ سن ۱۹۰۸ء میں یورپ سے اپنی تعلیمی سفر کے بعد واپسی پر بلکہ کافی دیر بعد ان کے فکر میں اسلامی انقلاب رونما ہوا اور سن ۱۹۱۵ء کے لگ بھگ ان کے پرزور اسلامی فکر کا آغاز ہوا، اور پھر ہماری اسلامی تاریخ بلکہ عام انسانی تاریخ اس کی شاہد ہے کہ تہذیب وتمدن کے اعلیٰ مدارج کا قلب آبادی سے کوئی تعلق نہیں۔ اسلام میں تہذیب وتمدن کے انتہائی عروج کا زمانہ تیسری وچوتھی صدی ہجری ہے جب بغداد وقرطبہ میں علوم وفنون اور ترقی و خوش حالی کے دریا بہہ رہے تھے۔ کیا ڈاکٹر رشید جالندھری صاحب بتا سکتے ہیں کہ اس وقت عباسی خلیفہ یا اندلس کے حکمرانوں نے خاندانی منصوبہ بندی کو حکومتی سطح پر اپنا کر یہ یا کارنامہ انجام دیا

Marfat.com

تھا؟ موجودہ دور میں چین دنیا کی سب سے بڑی آبادی والا ملک ہے اور اس صدی کے نصف ثانی میں ایک عالمی عسکری اور تجارتی طاقت کی حیثیت سے ابھرا ہے، تو کیا وہاں یہ ترقی خاندانی منصوبہ بندی کی بنیاد پر ہوئی ہے؟ برصغیر میں عہد جہانگیری و عہد شاہجہانی کی ہماری عظیم تاریخ اس بات کی شاہد ہے کہ اس دور کی ترقی و خوشحالی خاندانی منصوبہ بندی کی مرہون منت نہیں تھی۔

تہذیب و تمدن کا تعلق قلت آبادی سے منسلک کرنا ایک لایعنی بات ہے، اس کا تعلق دوسرے اہم عوامل سے ہے، جن میں سرفہرست عمومی خواندگی، اعلیٰ تعلیم اور دولت کی عادلانہ و منصفانہ تقسیم ہے، جو اس وقت ہمارے ملک میں مفقود ہے۔ اور پھر اس کے ساتھ ہی سیاسی قوت آزاد معاشی پالیسی اور قدرت کے عطا کردہ وسائل کا بھرپور استعمال ترقی کی راہ میں دوسرا اہم عامل یا محرک ہے، اور انہی محرکات کے طفیل خود یورپ و امریکہ اور جاپان نے وہ ترقی کی ہے جو ہم سب کے سامنے عیاں ہے اور پھر علامہ اقبالؒ نے تو خود "ضرب کلیم" میں اپنی مختصر نظم "مسلمانوں کا زوال" میں کہا ہے:

سبب کچھ اور ہے، تو جس کو خود سمجھتا ہے
زوال بندۂ مومن کا بے زری سے نہیں

لہٰذا ہمیں یقین ہے کہ علامہ اقبالؒ کی غلط ترجمانی کی گئی ہے، اور ایک اہم بات یہ ہے کہ قلت آبادی کے سبب ہی تو مسلمان سارے برصغیر میں اپنی حکومت انگریزوں کے جانے کے بعد قائم نہ کر سکے، اگر آبادی کے لحاظ سے وہ ہندوؤں سے زائد ہوتے تو آج سارے سابق ہندوستان میں جمہوری اصول کے مطابق ان کی حاکمیت ہوتی۔ جہاں تک علامہ مرحوم کی دوسری بات یعنی انہی کے الفاظ میں ضبط ولادت (نیا لفظ خاندانی منصوبہ بندی) کی شرعی حیثیت سے وکالت کا تعلق ہے تو جب وہ خود ہی یہ کہہ رہے ہیں کہ ان کی یہ رائے ماہر شریعت کی حیثیت سے نہیں محض اپنے علم و مطالعہ کی بناء پر ہے، تو پھر اس رائے کی کیا قدر و قیمت رہ جاتی ہے؟ اور پھر مشہور بات تو یہ ہے کہ علامہ اقبالؒ تو ضبط ولادت کے میکانکی وسائل نہیں بلکہ ضبط نفس کے قائل و داعی تھے۔ اور ایک اہم بات یہ بھی ہے کہ جس طرح مولانا جلال الدین رومیؒ کے افکار کا خزانہ ان کی مشہور عام طویل مثنوی ہے اسی طرح علامہ اقبالؒ کے افکار ان کی شعری تخلیقات میں پائے

Marfat.com

جاتے ہیں۔ ان کے دواوین میں، جو ہمیشہ میرے زیر مطالعہ رہے ہیں حتیٰ کہ قیام انگلستان کے طویل زمانہ میں بھی، میں نے کہیں ان کے فارسی یا اردو کلام میں ضبط ولادت یا برتھ کنٹرول کی تلقین کی کوئی تائید نہیں دیکھی۔

علامہ اقبالؒ کا کارنامہ یہ نہیں تھا کہ انہوں نے شرعی مسائل میں وقیع آراء پیش کی ہیں نہ یہ اس کا منصب تھا، بلکہ ان کا اصلی کارنامہ یہ تھا کہ انہوں نے اپنی شعلہ نوائی اور فکر سلیم سے مسلمانوں کے مردہ جذبہ ایمانی کو بیدار کیا، ان میں گہرا اسلامی قومیت کا شعور پیدا کیا، توحید ورسالت پر ان کا جو پختہ یقین تھا اس کو امت مسلمہ میں عام کیا، رسول عربی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ان کو جو بے پناہ عشق تھا اس کی شمع مسلمانوں کے دلوں میں روشن کی، ان کے دلوں کو گرمایا۔ انہوں نے مسلمانوں میں جو زندہ وتابندہ شعور اپنی مسلسل شعلہ نوائی سے پیدا کیا اس کا پاکستان کے قیام میں بہت اہم رول ہے، اور ساتھ ہی انہوں نے یورپین تہذیب پر مسلسل اور سخت تنقید کی جس کی مثال کہیں نہیں ملتی۔ پھر جیسا کہ جاننے والے جانتے ہیں ڈاکٹر رشید احمد جالندھری صاحب تو گاندھی، مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا حسین احمد مدنی اور پرانے احراری لیڈروں کے ماننے والوں میں سے ہیں، ان کو افکار اقبال سے یہ غیر مانوس وغیر معروف رائے پیش کرنے کی کیا سوجھی؟ کیا وہ علامہ اقبالؒ کے نام کو داغدار کرنا چاہتے ہیں؟ دیو بند کے قدیم طالب علم کی حیثیت سے ان کا فرض تھا کہ وہ اپنے مخصوص نقطۂ نظر کی تائید میں مستند علماء دیوبند، شیخ الہند مولانا محمود الحسن، مولانا شبیر احمد عثمانی، مولانا حسین احمد مدنی وغیرہ کی ماہرانہ آراء پیش کرتے۔ یہ سب ضبط ولادت کے مخالف رہے ہیں، اور انتہائی افسوس کی بات یہ ہے کہ انہوں نے مصر کے ایک نامور عالم اور مرحوم سابق شیخ الازہر شیخ محمود شلتوت پر اس سلسلہ میں افتراء کیا ہے، انہوں نے تو اپنی کتاب ''الفتاویٰ'' میں خاندانی منصوبہ بندی پر بحث کرتے ہوئے یہ عنوان باندھا ہے **تحدید النسل بالمعنی العام تاباہ طبیعة الحیاة و حکمة اللہ و شریعة الاسلام** (یعنی عام مفہوم میں خاندانی منصوبہ بندی کو نہ فطرت انسانی تسلیم کرتی ہے اور نہ اللہ کی حکمت اور نہ اسلامی شریعت) صفحہ ۲۹۴۔ اور پھر انہوں نے دو صفحوں میں اس عام خاندانی منصوبہ بندی کی بڑے پرزور انداز میں دلائل کے ساتھ تردید کی ہے اور اس مغربی نظام کے برعکس سورۃ النحل کی آیت نمبر ۷۲ تحریر کی ہے۔ جس کا ترجمہ ہے کہ ''اللہ تعالیٰ

Marfat.com

نے تمہارے لیے تم ہی میں سے بیویاں پیدا کیں اور پھر تمہاری بیویوں سے تمہارے بیٹے (بیٹیاں) اور پوتے پوتیاں پیدا کیں اور تم کو رزق حلال دیا'' انہوں نے مزید یہ حدیث کثرت آبادی کی دلیل میں پیش کی ہے ''تناکحوا، تناسلوا، فانی مباہ بکم الامم یوم القیامۃ'' (یعنی شادیاں کرو اور اولاد پیدا کرو، کہ میں قیامت کے روز دوسری امتوں پر تمہاری کثرت کی بدولت فخر کروں گا) ایک اور حدیث بھی پیش کی ہے جس کا ترجمہ ہے: ''بچے پیدا کرنے والی کالی کلوٹی عورت، بانجھ حسین عورت سے بہتر ہے۔'' ایک تیسری حدیث یہ لکھی ہے ''جو اولاد ہونے کے ڈر سے شادی نہ کرے وہ ہم میں سے نہیں'' یعنی مسلمان نہیں ہے۔

تو کیا ان آیات و احادیث کی روشنی میں جو خود شیخ شلتوت مرحوم نے پیش کی ہیں یہ دعویٰ کیا جاسکتا ہے کہ وہ خاندانی منصوبہ بندی کی وکالت کرتے تھے۔ ہاں انہوں نے آگے چل کر تمام علماء کی طرح اس کی اجازت دی ہے کہ مخصوص انفرادی حالات میں یعنی ماں کی متعدی بیماری اور بعض دوسرے اسباب کی بناء پر منع حمل کی تدابیر اختیار کی جاسکتی ہیں۔ ''اگرچہ شریعت نہ اس کا مطالبہ کرتی ہے اور نہ اس کی ہمت افزائی کرتی ہے بس صرف یہ ایک علاج کی صورت ہے اور وہ جب کہ نقصانات و بیماری کا اندیشہ ہو۔'' اور جہاں تک محمود الرحمٰن فیصل کا رد کرتے ہوئے ڈاکٹر رشید جالندھری کا یہ دعویٰ کہ ''سورۃ بنی اسرائیل کی آیت نمبر ۳۱ اور سورۃ الانعام کی آیت نمبر ۱۴۱ کا تعلق جن میں مفلسی کے ڈر سے قتل اولاد سے منع کیا گیا ہے، ان کا تعلق خاندانی منصوبہ بندی کی مخالفت سے نہیں بلکہ یہ زمانہ جاہلیت کی مکروہ رسم قتل اولاد کی مذمت ہے'' تو اس کے بارے میں بھی وہ شیخ شلتوت مرحوم ہی کی رائے پڑھ لیں۔ اس اپنے مذکورہ عنوان کے آخر میں بحث کو ختم کرتے ہوئے وہ کہتے ہیں: ''تو اس طرح (آیت کریمہ اور احادیث کی روشنی میں) خاندانی منصوبہ بندی اس عام معنی میں کہ وہ سب کے لیے جبری کی جائے الٰہی و نبوی احکام کی مخالفت ہے اور یہ ان لوگوں کے راستہ کی طرف ایک پیش قدمی ہے جن کو اللہ تعالیٰ نے مفلسی کے اندیشہ سے قتل اولاد سے منع فرمایا تھا۔ سو اس عمومی خاندانی منصوبہ بندی کے انکار پر سب کا اتفاق ہے اور ضروری ہے کہ تمام دانشور بھی اس انکار پر متفق ہوں۔'' (الفتاویٰ ص ۲۹۶) اور یہی ہمارے علماء اور جمہوریت مسلمہ کا فیصلہ ہے اب کیا فرماتے ہیں ہمارے فاضل مضمون نگار۔۔۔؟ اب شاید علامہ اقبالؒ کے الفاظ

Marfat.com

میں یہ کہنا درست ہو!

خود بدلتے نہیں، قرآں کو بدل دیتے ہیں
ہوئے کس درجہ فقیہان حرم بے توفیق

میں نے ڈاکٹر محمود الرحمٰن فیصل کو جانتا ہوں اور نہ ان کی کوئی تحریر پڑھی ہے، لیکن یہ ظاہر ہو گیا ہے کہ ان کے خلاف ڈاکٹر جالندھری کا استہزا ناروا بلکہ ظالمانہ ہے۔ فاضل مضمون نگار نے ''عزل'' اور بعض دوسری آیات قرآنی پر بحث کرتے ہوئے مختلف عربی کتب کے غلط یا ناقص حوالوں سے اتنے مسائل اٹھا دیئے ہیں کہ ان میں سے ہر ایک کے لیے ایک مستقل علمی و تحقیقی مضمون کی ضرورت ہے۔ اس طرح کے یک طرفہ مضامین سے عام قاری نہ صرف مرعوب ہوتا ہے، بلکہ وہ پراگندگی فکر کا بھی شکار ہو جاتا ہے، ایسے کسی مضمون کے رد کا ایک روزنامہ متحمل نہیں ہو سکتا ہے۔ لیکن ''جنگ'' کی یہ عالی ظرفی ہے کہ وہ موافق و مخالف نقطہ ہائے نظر کے علمی اظہار کا موقع دیتا ہے۔ لہٰذا میں مختصراً اب دوسرے دو اہم نقاط کی طرف آتا ہوں۔

فاضل مضمون نگار کا یہ کہنا کسی طرح سے درست نہیں کہ ''عہد رسالت میں کثرت اولاد اور منع حمل سے بچنے کے لیے ''عزل'' کا طریقہ رائج تھا جسے بڑے بڑے صحابہ کرام نے اختیار بھی کیا تھا اور یہ امر (عزل کا استعمال) آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے علم میں تھا'' یہ ایک بڑی ہی افسوسناک غلط بیانی اور ناقص مطالعہ کا نتیجہ ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مصر کے ایک نئے دانشور و مصنف (ممتاز اسکالر نہیں) کی کتاب ''خاندانی منصوبہ بندی اور میراث'' ان کے ہاتھ لگ گئی ہے، اور اس میں جو کچھ ہے اس کو ہمارے فاضل مضمون نگار نے اس ضمن میں نقل کر دیا ہے اور کچھ علامہ اقبالؒ سے غلط اقوال منسوب کرتے ہوئے، یا مولانا ابوالکلام آزاد کی بات یا کچھ سیاسی یا عام باتیں بے محل لکھ دی ہیں۔ ان کو واقعتاً اگر تحقیق سے کچھ لکھنا تھا تو چاہیے تھا کہ ذخیرہ حدیث کو اس سلسلہ میں کھنگالتے یا پھر حافظ ابن حجر کی صحیح بخاری کی عظیم شرح فتح الباری پڑھتے، یا حافظ ابن القیم کی زادالمعاد کی آخری جلد پڑھتے اور صحابہ کے حالات میں جو عربی کتابیں ہیں اور جن میں ان کی کثرت اولاد کا ذکر ہے یا تاریخ کی کتابیں، تو شاید وہ یہ سب کچھ نہ لکھتے جو انہوں نے کسی غیر معروف مصری عالم ڈاکٹر عبدالرحیم عمران کی کتاب سے نقل کر کے یا متاثر ہو کر لکھ دیا ہے۔ میں بھی

Marfat.com

مصر میں رہا ہوں ڈاکٹر رشید جالندھری بھی وہاں رہے ہیں بلکہ ازہر کے کلیۃ اللغۃ (عربی فیکلٹی) میں زیر تعلیم رہے ہیں، مصر کے نامور اسکالروں میں یہ صاحب نہیں جن کا ذکر انہوں نے بڑی شان سے کیا ہے۔ بلکہ ڈاکٹر محمود یوسف موسی، شیخ علی الحفیف، ڈاکٹر محمد البہی، شیخ احمد شاکر، شیخ پروفیسر ابوزہرہ وغیرہ معاصر علماء و محققین ہیں جو قریب ہی زمانہ میں مرحوم ہو چکے ہیں۔ ویسے مصر میں بلکہ الازہر میں ایسے بعض علماء بھی رہے ہیں جنہوں نے جمال عبدالناصر کے زمانہ میں ایسی کتابیں تک تصنیف کیں جنہیں سرور کائنات اور رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو عربی قومیت کا اولین علمبردار بتایا گیا ہے، اور اشتراکیت کو اسلام کا زریں اور بنیادی اصول، کیونکہ جمال عبدالناصر کی رضامندی حاصل کرنے کا یہ ایک اہم ذریعہ تھا، مگر اب وہ سب کچھ قرآنی تعبیر کے مطابق ''ھباء منثورا'' یعنی غبار کے بکھرے ہوئے ذرات، ہو چکا ہے۔

قرآن مجید میں کثرت اولاد سے بچنے کا تصور نہیں ہے۔ ''قرآن مجید اور کثرت اولاد سے بچنے کا تصور'' کے ذیلی عنوان کے تحت ڈاکٹر رشید جالندھری نے قرآن کریم کی دو آیتوں کی جو غلط تاویلات کی ہیں اور جو شاذ (غیر منقول و منفرد) روایات پیش کی ہیں اور پھر صحیحین (بخاری و مسلم) کی ایک روایت ''عزل'' کے سلسلہ میں خاص طور پر پیش کی ہے اس کے بارے میں عرض ہے۔

ا۔ سورۃ النساء کی آیت نمبر ۳ ''اگر تم کو یہ اندیشہ ہو کہ تم (ایک سے زائد) بیویوں میں عدل نہ کر سکو تو پھر ایک ہی شادی کرنی چاہیے، یہ ناانصافی سے بچنے کے لیے زیادہ مناسب ہے۔'' اس آیت کریمہ کا یہ وہ صحیح مفہوم ہے جو بلا استثناء تمام قدیم و جدید عربی و اردو تفاسیر و تراجم میں ہے فاضل مضمون نگار نے بھی یہی صحیح ترجمہ پیش کیا ہے، لیکن چونکہ ان کا مقصود ہے کہ کسی نہ کسی طرح کھینچ تان کر قرآن سے خاندانی منصوبہ بندی کی کوئی دلیل تلاش کر لیں، انہوں نے اس آیت کے آخری جملہ ''ذلك ادنى ان لا تعولوا'' کا ایک نیا مفہوم امام شافعی سے منسوب ایک شاذ تفسیری روایت سے پیش کیا ہے، جو یہ ہے ''اگر تم زیادہ اولادیں نہیں چاہتے تو پھر ایک ہی شادی کرنی چاہیے۔'' کوئی شک نہیں کہ یہ روایت ان دو تفسیروں اور بعض دیگر تفاسیر جیسے کشاف اور تفسیر ابن کثیر وغیرہ میں آئی ہے۔ لیکن عربی زبان کی مطبوعہ قدیم ترین ضخیم ترین اور مقبول ترین تفسیر طبری میں (جس کو تفسیر ابن جریر کے نام سے بھی یاد کیا جاتا ہے اور اس کا اصل نام جامع البیان ہے)

Marfat.com

امام شافعی کے اس شاذ تفسیری قول کا کوئی ذکر نہیں، حالانکہ امام محمد ابن جریر بن یزید بن غالب طبری نے (محمد بن جریر بن رستم الطبری ایک دوسرا شیعی عالم ہے، یہاں مغالطہ نہیں ہونا چاہیے) اس مختصر جملۂ قرآنی کی تفسیر میں صحابۂ کرام اور دیگر تابعین کے تمام اقوال دو کافی بڑے حجم کے صفحات میں نقل کئے ہیں۔ (ص ۲۳۹۔۲۴۵۔ جلد ۴) جن میں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ اور ان کے شاگرد مشہور مفسرین قرآن، مجاہد عکرمہ، قتادہ، سدی وغیرہ اور امام حسن البصری نے یہی کہا ہے جو ہم نے اوپر آیت کے ترجمے میں پیش کیا ہے۔ یہ ملحوظ رہے کہ امام طبری خود عربی زبان کے بڑے ماہر اور ادیب تھے اور عربی زبان میں عال، یعول، عول کے معنی ایک طرف کو میلان اور ظلم کے ہی ہیں (ملاحظہ ہو لسان العرب جلد ۱۱ مادہ ''عول'' بیروت ایڈیشن) اور ''عول الحاکم'' کے معنی عربی میں ہیں ''حاکم کا ظلم و جور'' اور یہی معنی اس جملہ قرآنی کے زمخشری نے لکھے ہیں، بلکہ اس نے تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے واسطہ سے خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے یہ روایت نقل کی ہے، ان لا تعولوا ن لا تجوروا ''یعنی ان لا تعولوا کے معنی ہیں ظلم و ناانصافی نہ کرو۔ (ملاحظہ ہو اساس البلاغۃ زمخشری صفحہ ۱۴۹، تفسیر کشاف زمخشری صفحہ ۴۹۷)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی یہ حدیث حافظ ابن کثیر نے بھی اپنی مشہور و مقبول و متداول تفسیر ابن کثیر میں صحیح ابن حبان سے نقل کی ہے، اور ساتھ ہی امام شافعی سے منسوب شاذ روایت نقل کر کے کہا ہے کہ یہ درست نہیں ہے اور ایک بڑی عمدہ عقلی توجیہ پیش کی ہے کہ ''اگر ایک سے زیادہ بیوی سے شادی نہ کرنے کا حکم اس لیے ہو تو لونڈیوں کی تعداد میں تو کوئی بندش نہیں، ان سے بھی تو بہت سی اولاد پیدا ہو سکتی ہے۔'' اس لیے اس آیت کی صحیح تفسیر وہی ہے جو جمہور مفسرین نے کی ہے۔'' اور پھر اس ناچیز کے خیال میں ایک سیدھی سی بات یہ ہے کہ سورۂ نساء کی اس آیت میں جس میں اہل استطاعت و اصحاب ضرورت کو چار شادیوں کی اجازت دی گئی ہے، ان سے کہا گیا ہے کہ وہ اگر عدل نہ کر سکیں تو ایک شادی کریں، تو عدل کے مقابلہ میں تو ظلم ہی ہوتا ہے۔ اس کی ضد کثرت عیال تو نہیں۔ امام شافعی سے منسوب قول کی صحت کے بارے میں مجھے شک ہے اور اس کی دلیل یہ ہے کہ مشہور محدث ابن ابی حاتم الرازی الشافعی (وفات ۳۲۷ ہجری) نے امام شافعی کی زندگی اور ان کے اقوال و آراء پر مشتمل ایک کتاب ''آداب الشافعی ومناقبہ'' کے نام سے لکھی ہے جس میں ان کے کافی

Marfat.com

تفسیری اقوال بھی مذکور ہیں، مگر سورۃ النساء کی اس آیت کی یہ تفسیر مذکورہ نہیں جو ڈاکٹر رشید جالندھری نے بعض تفسیروں سے نقل کی ہے۔ پھر اگر وہ اس کو صحیح سمجھتے ہیں تو کیا وہ امام مالک بلکہ خود امام شافعی سے منسوب سورۃ البقرۃ کی آیت نمبر ۲۲۳ جس میں ہے، ''تمہاری بیویاں تمہاری کھیتیاں ہیں جس طرح سے چاہو ان کھیتیوں میں آؤ'' آیت کی یہ تفسیر ماننے کے لیے تیار ہیں کہ اس میں بیویوں کے ساتھ غیر فطری عمل کرنے کی اجازت ہے (ملاحظہ ہو آداب الشافعی ومناقبہ صفحہ ۲۱۷)۔

مشہور حنفی فقیہ ابو بکر الجصاص کا اپنی کتاب احکام القرآن (ص ۴۰، ۴۱ میں اصرار ہے کہ امام مالک سے منسوب یہ مکروہ تفسیر جھوٹی نہیں، مگر میری ذاتی رائے ہے کہ ان دونوں انتہائی بزرگ آئمہ دین سے منسوب یہ قول درست نہیں اور ان پر کسی مخالف یا زندیق کا جھوٹا الزام ہے جو دوسری صدی ہجری میں لگایا گیا، جب بغداد میں زنادقہ اور ملحدین کافی سرگرم تھے اور اسلام و مسلمانوں کے خلاف سازشیں کر رہے تھے، حتیٰ کہ خلیفہ مہدی عباسی کے زمانہ میں حکومت کو ان کی خلاف اسلام سرگرمیوں کو چیک کرنے کے لیے ایک محکمہ ''دیوان الزنادقہ'' کے نام سے قائم کرنا پڑا۔ اسی طرح امام شافعی کے کسی دشمن نے ان سے وہ تفسیر منسوب کر دی ہے جس پر ڈاکٹر رشید جالندھری کو قرآن کریم سے خاندانی منصوبہ بندی ثابت کرنے کے لیے اصرار ہے۔ ان کو چاہیے کہ سورۃ نساء کی اس آیت کی تفسیر میں قدم اور ممتاز حنفی فقیہ جصاص کی رائے بھی پڑھ لیں جس میں انہوں نے امام شافعی سے منسوب اس قول کو عقلی، نقلی اور لغوی طور پر غلط ثابت کیا ہے۔ (احکام القرآن ص ۳۴۹، ۳۵۰)

اس طویل بحث کی روشنی میں ان کا یہ کہنا کہ ''امام شافعی سے کوئی اتفاق کرے یا نہ کرے، لیکن اس سے یہ بات ثابت ہو گئی ہے کہ دوسری صدی ہجری میں شرکت اولاد سے بچنے کا تصور موجود تھا'' محض ایک بے بنیاد دعویٰ ہے جس کی تاریخ اور آئمہ کے اقوال سے کوئی شہادت نہیں ملتی۔ الا یہ کہ وہ تسلیم کریں کہ اسی صدی میں مسلمانوں میں معاذ اللہ بیویوں کے ساتھ اغلام بازی کا تصور بھی موجود تھا۔ مگر کوئی صاحب ضمیر، منصف محقق اس کو ہرگز تسلیم نہیں کر سکتا۔ جہاں تک کلاسیکی عربی ادب میں حضرت عمرو بن العاص کا خطبہ جمعہ میں ''کثرت عیال سے بچنے'' کی ہدایت کا تعلق ہے تو اس ادب کا ہر طالب علم جن میں سے یہ ناچیز بھی ایک ہے، جانتا ہے کہ دینی و

Marfat.com

اخلاقی امور میں ان کتابوں کی کوئی قیمت نہیں، ان میں بہت کچھ رطب و یابس لذت تقریر کے لیے موجود ہے، اور پھر ان کے مضمون میں حوالہ بھی مذکور نہیں کہ اس کی صحت معلوم ہو سکے۔

۲۔ اب جہاں تک دوسرے مسئلہ یعنی عزل Quitus Interruptus ''عزل'' میں ابوبکر جصاص کی کتاب احکام القرآن سے انہوں نے سورۃ النساء کی مذکورہ آیت نمبر ۲۲۳ میں ''تمہاری بیویاں تمہاری کھیتیاں ہیں جس طرح چاہو اپنی کھیتی میں آؤ'' عزل کی اجازت کا ذکر کیا ہے تو وہ ان آیات وحدیث سے متصادم ہے جن کا ذکر ہم نے سابق شیخ الازہر شیخ محمود شلتوت کے حوالہ سے اس بحث کی ابتداء میں نقل کی ہے یعنی قرآن میں اللہ تعالیٰ بطور انعام ذکر فرماتا ہے کہ ''ہم نے تمہاری بیویوں سے تمہارے لیے اولاد پیدا کی پوتے، پوتیاں پیدا کیں'' اور وہ احادیث جن میں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ ''میں قیامت کے روز دوسری امتوں سے اپنی امت کی کثرت سے فخر کروں گا'' اور یہ کہ ''بچے پیدا کرنے کی صلاحیت رکھنے والی کالی کلوٹی بیوی، حسین بانجھ بیوی سے بہتر ہے'' وغیرہ وغیرہ۔ پھر اس غیر مکمل آیت کا جملہ متمہ ہے ''وقدموا لانفسکم'' جس کے معنی امام قرطبی نے اپنی تفسیر (ص ۹۶، جلد ۳) میں ''ابتغاء الولد والنسل'' لکھے ہیں، یعنی اولاد اور نسل کی طلب کے لیے بیوی کے پاس جانا چاہیے اور اس کی تائید میں انہوں نے ایک صحیح حدیث ذکر کی ہے جس کا ترجمہ ہے کہ ''جس کسی نے تین اولادیں پیدا کیں جو بلوغت کی عمر سے پہلے وفات پا گئیں، اس کو جہنم کی آگ نہیں چھوئے گی۔ مگر صرف قسم خداوندی پوری کرنے کے لیے'' یعنی اس کا سورۃ طٰہٰ کی آیت کے مطابق جہنم کی آگ کے پاس سے صرف گزر ہوگا۔ اس سب کے بعد ڈاکٹر رشید جالندھری کا یہ کہنا سراسر غلط ہے کہ قرآن مجید میں ''عزل'' کے واضح اشارات ہیں۔ درحقیقت لفظ عزل اس مخصوص معنی میں آیا ہی نہیں ہے۔ اب جہاں تک بخاری و مسلم میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی اس روایت کا تعلق ہے کہ ''ہم عزل کیا کرتے تھے اور قرآن مجید نازل ہو رہا تھا'' جو جناب رشید جالندھری نے عزل کے استدلال میں پیش کی ہے اور پھر لکھا ہے ''گویا آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے عہد مبارک میں صحابہ کرام عزل کے عمل سے آشنا تھے جو اقتصادی مشکلات اور کثرت عیال سے بچنے کے لیے ایک وسیلہ تھا'' تو یہ ایک ناقص حوالہ اور غلط استنتاج ہے، جس کی تفصیل یہ ہے۔

Marfat.com

''عزل'' کے بارے میں صحیح بخاری و مسلم اور دوسری کتب حدیث میں صرف یہی ایک حدیث نہیں ہے بلکہ صحاح ستہ میں اور بھی احادیث ہیں۔ صحیح بخاری کے سب سے بڑے شارح حافظ ابن حجر عسقلانی نے اپنی عظیم ترین شرح فتح الباری (۱۳ جلدیں) کی جلد نمبر ۹ میں اس مسئلہ پر بڑے حجم کے چھ صفحات میں بحث کی ہے اور تمام احادیث جمع کر دی ہیں اور صحیح علمی تحقیق کا تقاضا ہے کہ کوئی فیصلہ دینے سے قبل ان سب احادیث کو پیش نظر رکھا جائے اور یہی حافظ ابن حجر سے قبل امام ابن القیم نے زاد المعاد کی آخری جلد میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے تمام احکام وفتاوی نقل کرتے ہوئے کہا ہے کہ انہوں نے آٹھ صفحات میں عزل سے بحث کی ہے یہاں گنجائش نہیں کہ ان سب کی تفصیل بیان کی جائے۔ لیکن اتنا کہنا کافی ہے کہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی حدیث کے مقابلہ میں صحیح مسلم کی حضرت جذامہ رضی اللہ عنہا بنت وہب سے مروی حدیث میں ہے کہ وہ کچھ صحابہ کے ساتھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مجلس میں حاضر ہوئیں ان صحابہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے عزل کے بارے میں پوچھا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یہ واد خفی ہے (یعنی پوشیدہ قتل اولاد) اور ساتھ ہی فرمایا کہ یہی واذا المؤدة سئلت ہے یعنی سورۃ التکویر کی اس آیت کا مفہوم ہے جس میں آیا ہے کہ قیامت کے روز اللہ تعالیٰ پوچھے گا کہ زندہ دفن شدہ لڑکی کس جرم میں قتل کی گئی؟ (صحیح مسلم، باب النکاح) ابن حزم اور دیگر علمائے محققین نے اسی بنیاد پر کہا ہے کہ یہ حدیث حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی اس حدیث کو منسوخ کرتی ہے جس میں آپ نے عزل سے ان کو منع نہیں فرمایا اس لیے عزل ان کے نزدیک حرام ہے۔ (فتح الباری ص ۳۰۸۔ جلد ۹)

پھر صحیح بخاری و صحیح مسلم میں ہی حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ کی وہ حدیث ہے کہ ''ہم کو کنیزیں (ایک لڑائی میں ملیں) اور ہم ان کے ساتھ عزل کرتے تھے تو آپ نے تعجب سے تین بار پوچھا کہ کیا تم ایسا کرتے ہو، اور پھر فرمایا کہ جو غفلت قیامت تک پیدا ہونے والی ہے وہ ہو کر رہے گی، یعنی عزل کے باوجود بھی اگر خدا کا حکم ہے تو اولاد ہو کر رہے گی۔ (بخاری و مسلم باب النکاح) اس حدیث میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے متعجبانہ مکرر سوال سے جس کو استفہام انکاری بھی کہا جا سکتا ہے، ڈاکٹر رشید جالندھری کے اس بیان کی نفی ہوتی ہے کہ ''عزل'' کا استعمال آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے علم میں تھا'' آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے علم میں اگر یہ بات ہوتی تو ہرگز تین

Marfat.com

مرتبہ ابو سعید خدری سے یہ بات نہ پوچھتے۔ پھر انہی حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے ایک دوسری روایت ''صحیح مسلم'' میں ہے جس کا ترجمہ ہے کہ جب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سامنے عزل کا ذکر کیا گیا تو آپ نے فرمایا: ''لا علیکم ان الا تفعلوا ذلك'' (یعنی نہیں تم پر واجب ہے کہ ایسا نہ کرو) مشہور تابعی ابن سیرین نے اس حدیث کی شرح کرتے ہوئے فرمایا کہ یہ ممانعت سے قریب تر بات ہے اور امام حسن البصری نے تو یہاں تک کہا کہ یہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف سے سخت تنبیہ ہے۔ (فتح الباری ص ۳۰۷، جلد ۹) حافظ ابن القیم کے مطابق یہ ایک طرح سے نکاح کے مقصد کے خلاف نسل کشی ہے، بیوی سے بد سلوکی اور اس کو فطری لذت سے محروم رکھنا ہے۔ (زاد المعاد ص ۱۴۳، جلد ۵)

حضرت جابر رضی اللہ عنہ ہی کی ایک اور حدیث ترمذی و نسائی میں ہے، جس میں ہے کہ ''ہماری لونڈیاں تھیں اور ہم ان سے عزل کرتے تھے'' اور اس کی تائید و وضاحت ایک اور صحیح حدیث سے ہوتی ہے جس میں ہے کہ ''ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ غزوہ بنی المصطلق میں گئے اور اس غزوہ میں عرب کے بڑے خاندانوں کی لڑکیاں غنیمت میں ملیں، ہمارے لیے تجرد کی زندگی کافی زیادہ ہو گئی تھی اور ہم چاہتے تھے کہ ہم ان لونڈیوں سے اپنی فطری خواہشات کو پورا کرنے کے لیے تمتع کریں اور عزل کریں، مگر ہم یہ بھی چاہتے تھے کہ ان لونڈیوں کو ان کے خاندانوں کو واپس کر کے فدیہ کی رقم حاصل کریں، ''ورغبنا فی الفداء'' تو ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پوچھا اور آپ نے وہ تفصیلی جواب دیا جس کا ذکر ہم اوپر حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ کی حدیث میں کر چکے ہیں۔ اس طرح عزل کی اجازت کا مسئلہ ایک خاص حالت سے متعلق ہے یعنی حالت جنگ، حافظ ابن حجر نے اس کی بڑی عمدہ توجیہ کی ہے کہ یہ اجازت اس لیے دی گئی کہ لونڈی کی اگر اولاد ہو جائے یعنی وہ ''ام ولد'' ہو تو اس کا فروخت کرنا جائز نہیں، اور اس پر انہوں نے اپنی انتہائی طویل بحث کا خاتمہ کیا ہے (فتح الباری ص ۳۰۱۔۳۰۷، جلد ۹)۔ اور پھر امام ابن حزم کی انتہائی وقیع اور معقول رائے ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پہلے اس کی اجازت دی تھی، لیکن بعد کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو منع فرما دیا۔ آخری بات یہ کہ اس مسئلہ ''عزل'' کے جواز میں علماء کے درمیان قدیم سے اختلاف ہے لیکن اس پر سب کا اتفاق ہے کہ آزاد عورت (بیوی) کی

Marfat.com

اجازت کے بغیر کوئی مرد ''عزل'' نہیں کر سکتا۔ جہاں تک ڈاکٹر رشید جالندھری کی یہ بات کہ ''عہد رسالت میں کثرت اولاد اور منع حمل سے بچنے کے لیے ''عزل'' کا طریقہ رائج تھا جسے بڑے بڑے صحابہ نے اختیار بھی کیا تھا'' تو یہ ایک بے بنیاد دعویٰ ہے جس کی تاریخ سے تصدیق نہیں ہوتی، بلکہ اس کے برعکس حقیقت یہ ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ و حضرت عثمان رضی اللہ عنہ عزل سے منع فرماتے تھے بلکہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے تو اپنے بعض لڑکوں کو ''عزل'' کرنے پر سزا بھی دی۔ اسی طرح حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ بن مسعود نے تو اس کو نسل کشی کہا ہے (الموؤدۃ الصغریٰ) حضرت علی رضی اللہ عنہ بھی ان کو نا پسند فرماتے تھے اور حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نے تو یہاں تک کہا کہ اگر میرا کوئی بیٹا عزل کرے گا تو میں اس کو سخت سزا دوں گا۔ (لنکلتہ) (ملاحظہ ہو زادالمعاد۔ ص ۱۴۳۔ ج ۵)۔

صحابہ کرام اگر (عزل) پر عمل کرتے ہوتے تو نہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی ۳۲ اولادیں ہوتیں، ۱۴ بیٹے اور ۱۸ بیٹیاں (تاریخ یعقوبی ص ۲۱۳۔ جلد ۲)۔ نہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی بارہ اولادیں ہوتیں (جمہرۃ الانساب، ابن حزم ص ۱۵۲) اور نہ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف کی ۲۰ اولادیں ہوتیں (جمہرۃ الانساب ص ۱۳۱۔۱۳۲) اور نہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے ۹ بیٹے ہوتے (ص ۸۳)۔ بیٹیوں کی بات تو علیحدہ ہے ان سب کے نام ابن حزم کی مذکورہ کتاب میں موجود ہیں اور یہی حال دوسرے صحابہ اور ان کی اولاد کا تھا۔

ڈاکٹر رشید جالندھری کی یہ بات قطعاً غلط ہے کہ ''اسلام کا عالمگیر اور ماورائی مزاج ہجوم اور بھیڑ کا کبھی قائل نہ رہا، تعداد کی کثرت یا قلت کبھی بھی اس کی نگاہ التفات کا مرکز نہیں بن سکی'' یہ محض لفاظی ہے ہم نے جو حقائق اوپر پیش کئے ہیں خاص طور پر وہ حدیث کہ ''قیامت کے روز حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنی امت کی کثرت پر فخر فرمائیں گے'' ان کی اس رائے کی نفی کرتی ہے۔ حجۃ الوداع کے موقع پر خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانہ میں صرف جزیرۂ عرب میں ایک لاکھ بیس ہزار سے زیادہ لوگ موجود تھے اس کو فاضل مضمون نگار ایک بھیڑ سمجھیں تو ان کی مرضی، لیکن تمام مسلمان ایسا نہیں سمجھتے۔

ڈاکٹر رشید جالندھری کے ممدوح مولانا ابوالکلام آزاد کی سن ۱۹۳۹ء میں برتھ کنٹرول کی موافقت میں پیش کردہ رائے کی ہماری پیش کردہ آیات قرآنی واحادیث کی روشنی میں کوئی قیمت

Marfat.com

نہیں، وہ اس وقت الہلال والبلاغ والے اور بیسویں صدی کی دوسری دہائی والے مولانا آزاد نہ تھے بلکہ وہ محض کانگریس کے ایک سرکردہ سیاسی لیڈر بلکہ غالباً کانگریس کے صدر تھے، ان کی نظر اس وقت مسلمانوں کے دینی مسائل پر قطعاً نہ تھی، یہی وہ مولانا آزاد تھے جو پاکستان کے قیام کے گاندھی اور نہرو سے بھی زیادہ مخالف تھے، جیسا کہ انہوں نے اپنی کتاب India Wins Freedom (ہندوستان کو آزادی ملتی ہے) میں لکھا ہے۔

ہماری اس بحث کے بعد سب پر یہ عیاں ہو گیا ہو گا کہ ''عزل'' کے مسئلہ سے ناروا استدلال کرتے ہوئے حکومتی سطح پر خاندانی منصوبہ بندی کی ''اسلام'' میں قطعاً اجازت نہیں ہے۔ ہاں خاص حالات میں قدیم اور موجودہ زمانہ میں بہت سے علماء اور ائمہ دین نے انفرادی طور پر اس کی اجازت دی ہے۔ لیکن مفلسی دور کرنے اور ترقی کے حصول کے لیے یہ نسخہ برائے عمومی استعمال'' کسی نے نہیں بتایا ہے۔ قاہرہ کی موجودہ کانفرنس کا مقصد مفلسی اور بھوک دور کرنا نہیں، بلکہ دنیا میں مغربی اور امریکی اقدار کی اشاعت اور جنسی آزادی کو عام کرنا ہے۔ جو جی چاہے تو مسلمان یا نام نہاد علماء کریں، لیکن قرآن و حدیث کو بازیچہ اطفال نہ بنائیں۔ روح اقبالؒ سے معذرت کے ساتھ عرض ہے۔

ے شیر مردوں سے ہوا بیشہ تحقیق تہی
رہ گئے ''مسٹر ولیڈر'' کے نظام اے ساقی (۱)

اس مضمون میں جس مصری عالم کا ذکر آیا ہے اور جن کو ڈاکٹر رشید جالندھر نے سند بنایا ہے، ان کے بارے میں، میں نے شک کا اظہار کیا تھا، اس مضمون کی اشاعت کے بعد اس نوجوان پاکستانی انجینئر کا جس نے کنڈوم کلچر کے بارے میں مولانا تقی عثمانی صاحب کو معلومات فراہم کی تھیں، اور جو قاہرہ کانفرنس کے انعقاد کے وقت کراچی میں آیا ہوا تھا اور جس نے جنگ میں شائع شدہ میرا مضمون ''مغرب سے آنے والا ایک نیا سیلاب بلا'' پڑھ کر مجھ سے رابطہ کیا تھا، اسی باحمیت صالح نوجوان نے امریکہ سے مجھے خط لکھا اور وہاں شائع ہونے والے ایک میگزین The Minaret (ستمبر، اکتوبر ۱۹۹۴ء) میں شائع شدہ ایک امریکی ریسرچ خاتون Elezabeth Sobo کے ایک مضمون

۱۔ ڈاکٹر رشید جالندھری صاحب اپنی لیڈر بے نظیر بھٹو کے ساتھ اس قاہرہ کانفرنس میں گئے تھے۔

Marfat.com

The Politics of Population کی ایک فوٹو کاپی بھیجی، اس کے صفحہ ۲۶ پر انہی مصری عالم ڈاکٹر عبدالرحیم عمران کے بارے میں بڑے چشم کشا معلومات ہیں، جو یہ ہیں کہ:

''ڈاکٹر عبدالرحیم عمران امریکہ کے مشہور دفاعی ادارے پینٹا گون (وزارت دفاع) Pentagon میں ایک ''ماہر'' کی حیثیت سے کام کرتا ہے، اور یہ Maryland یونیورسٹی میں Center for Development and Conflict Management (CDCM) کا سربراہ ہے۔''

امریکہ کے سرکاری مشہور ادارے US AID نے اس سے ایک کتاب بعنوان A Resource Manual of Islam and Family Planning لکھوائی۔ US AID کے ریکارڈ میں ہے کہ ڈاکٹر عمران کو Pathfinder Fund سے ۸۲ ہزار ڈالر ۱۹۸۷ء اور ۱۹۸۸ء میں دیئے گئے جس سے ۲۵ ہزار ڈالر مذکورہ کتاب کی تصنیف کا معاوضہ اور باقی ایک ''اسلامک ورکشاپ'' کا معاوضہ تھا۔ یہ ہیں وہ امریکہ کے خدمت گزار ''ممتاز مصری عالم'' جن کی تحریر کو ڈاکٹر رشید جالندھری نے سند مانا ہے۔

Marfat.com

ذاتیات

Marfat.com

Marfat.com

مصر کے ڈاکٹر طٰہٰ حسین مرحوم سے ایک ملاقات

مصر کا میرا پہلا سفر بذریعہ بحری جہاز ۱۹۵۳ء میں جدہ سے قاہرہ کے لیے براستہ سوئز پورٹ ہوا۔ اس کے بعد مختلف اوقات میں بذریعہ ہوائی جہاز کبھی لندن سے ریاض آتے ہوئے یا بن غازی (لیبیا) سے کراچی جاتے ہوئے یا بذریعہ کار بن غازی سے قاہرہ براستہ اسکندریہ جانے کا اتفاق ہوا۔ لیکن میرا اہم سفر مصر وہ سفر ہے جس کا میں اوپر ذکر کر چکا ہوں۔ یعنی ۱۹۵۳ء کا پہلا سفر مصر جس میں ڈیڑھ سال سے زیادہ عرصہ تک میرا مصر میں قیام رہا اور یہ وہ دور تھا جب مصر اپنی تاریخ کے ایک اہم سیاسی موڑ سے گزر رہا تھا، یعنی جولائی ۱۹۵۲ء کے انقلاب کے بعد کا دور، اور سیاسی حالات مکمل طور پر جمال عبدالناصر کے لیے مصر کے پہلے صدر جنرل محمد نجیب کے خلاف فوجی بغاوت کے بعد سازگار نہ ہونے پائے تھے، میں نے اس دور کا بڑے قریب سے مشاہدہ کیا، جس میں اخوان المسلمین پر جمال عبدالناصر کا ظلم و تشدد بھی شامل تھا۔ اس وقت میری عمر پچیس سال سے زیادہ نہ تھی۔

میرا یہ پہلا سفر اپنی اہمیت کے اعتبار سے اس لیے بھی اہم ہے کہ اس وقت علم و ادب اور مصر کی تحریک اسلامی کے بڑے بڑے علماء و ادباء اور قائد حضرات بھی بقید حیات تھے، جنہوں نے علم و ادب اور تحریک اسلامی کو ترقی اور جلا بخشی۔ مجھے بھی ان میں سے بعض مشہور و معروف شخصیات سے ملنے، ان سے بات چیت کرنے اور انہیں سننے کا شرف حاصل ہوا۔ ان میں قابل ذکر حضرات یہ ہیں۔

جمعیۃ شبان المسلمین کے صدر صالح حرب بادشاہ، قائد انقلاب الریف (مراکش) امیر عبدالکریم الخطابی کے بھائی میر محمد الخطابی، محمد البشیر الابراہیمی الجزائری، مفتی اعظم فلسطین الحاج امین الحسینی (یہ تینوں مہاجر حضرات مصر کے مہمان تھے) امام حسن البنا شہید کے بعد اخوان المسلمین کے قائد حسن الہضیبی، مشہور اخبار ''الشوریٰ'' کے بانی محمد علی الطاہر، شیخ حسن البنا (اخوان

Marfat.com

المسلمین کے پہلے قائد و بانی) کے والد شیخ عبدالرحمٰن البنا محقق مسند الامام احمد بن حنبل، عظیم محقق محمود محمد شاکر ''الفتح'' میگزین کے مالک و ایڈیٹر محب الدین الخطیب، تاریخ ثقافت اسلامیہ میں ''فجر الاسلام، ضحیٰ الاسلام، وظہر الاسلام سیریز اور اس کے علاوہ ''فیض الخاطر اور مختلف علمی اور ادبی کتب کے مصنف اور ''الثقافہ'' میگزین (جو کہ اپنی ذات میں تمام عالم عرب میں ایک اعلیٰ مقام رکھتا تھا) کے بانی و ایڈیٹر ڈاکٹر احمد امین ''الرسالہ'' میگزین کے بانی و ایڈیٹر احمد حس الزیات، مشہور ادبی ناول نگار توفیق الحکیم، مشہور ادیب و داعی اسلام سید قطب شہید اور عربی ادب کی مشہور شخصیت اور سابق وزیر ڈاکٹر طٰہٰ حسین ہیں جن کے بارے میں تفصیل سے یہاں ذکر کرنا چاہوں گا۔

طٰہٰ حسین اپنی متنازع فیہ شخصیت اور وسیع شہرت کی بنا پر اکثر ادباء وعلماء کے درمیان موضوع بحث رہے۔ خاص کر اسلامی فکر رکھنے والوں کے یہاں قابل ہدف اور ناپسند قرار دیئے گئے جب کہ عام قارئین کرام کے نزدیک بہت قابل احترام اور پسندیدہ قرار دیئے گئے، ان کی تعریف میں بہت کچھ لکھا اور کہا گیا۔ اسی طرح ان کی کتاب ''الایام'' جو ان کے اپنے حالات زندگی پر تحریر تھی دنیا کی مختلف زبانوں میں ترجمہ کی گئی۔ طٰہٰ حسین ادب میں نوبل پرائز کے بھی امیدوار تھے مگر جمال عبدالناصر کے دور کے سیاسی حالات نے موقع نہیں دیا۔

میں یہاں یہ بتانا چاہوں گا کہ میں نے ان کی موت سے دو یا تین سال قبل ایک مصری نشریاتی پروگرام سنا۔ جس میں مشہور مصری براڈ کاسٹر لیلیٰ رستم نے اس سے انٹرویو لیا تھا، میں اس وقت لیبیا میں تھا۔ اس انٹرویو میں جو بات قابل ذکر تھی وہ یہ کہ جب لیلیٰ رستم نے ان کے کمرہ میں ٹیلی ویژن کی عدم موجودگی پر ان سے سوال کیا کہ کیا وہ ٹیلی ویژن کے پروگرام نہیں سنتے تو اس پر ان کا جواب تھا کہ وہ گھر میں ٹی وی کی ضرورت محسوس نہیں کرتے۔ یہاں تک کہ ریڈیو پر بھی وہ صرف قرآنی نشریات کے سوا کچھ نہیں سنتے۔

یہ بات اور آخری عمر میں تحریر کردہ بعض تصنیفات، جیسے ''مرآۃ الاسلام'' وغیرہ، اس بات کی نشاندہی کرتی ہیں کہ وہ اپنے قدیم مغربی لادینی افکار سے دستبردار ہو چکے تھے اور انہوں نے اپنا قبلہ درست کر لیا تھا۔ اور کون جانتا ہے کہ انہوں نے اپنے ان افکار سے جو ان کی کتابوں اور مقالات میں پہلے شائع ہوئے (جیسا کہ ''مستقبل الثقافۃ فی مصر'' اور ''فی الشعر الجاہلی'' وغیرہ) توبہ کر لی ہو اور

Marfat.com

وہ واپس اپنے صحیح عقیدہ اور فکر پر آ گئے ہوں جس کا بیج بچپن میں ہی الازہر میں دوران تعلیم پڑھ چکا تھا۔ اگر ہم اپنے اردگرد کا جائزہ لیں اور وہ حاضر کی تاریخ کا مشاہدہ کریں تو دیکھنے میں آتا ہے کہ بہت سے لوگ اپنی ابتدائی زندگی میں حق سے منحرف رہے اور پھر راہ راست پر آ گئے۔ انہوں نے اللہ سے توبہ کی اور اللہ نے ان کی توبہ قبول فرمائی۔ ''انه هو التواب الرحيم''

طٰہٰ حسین سے میری پہچان ان کی مشہور کتاب ''فی الشعر الجاہلی'' کی بنا پر ہی نہیں ہوئی (جس کے بعد میں کئی ترمیم شدہ ایڈیشن ''فی الادب الجاہلی'' کے نام سے شائع ہوئے) جس کی اشاعت پر کافی تنقید و بحث و مباحثہ ہوا اور اس بناء پر مصر کے عام مسلمان اور دوسرے مسلمان ان کی اس ابتدائی ادبی زندگی کو جو کہ پیرس سے لوٹنے کے بعد شروع ہوئی ناپسندیدگی سے دیکھنے لگے تھے۔ اس کتاب میں جو چیز قابل جدل بنی وہ ''قضية النحل فى الشعر الجاهلى'' (یعنی زمانہ قبل از اسلام کے ذخیرہ شعر کو جعلی قرار دینے کا مسئلہ تھا (جو اس قدر آگے بڑھا کہ اس نے بعض انبیاء سابقین کی شخصیات اور ان کے فرمودات کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ جس کی بناء پر لوگ ان سے بدظن ہونے لگے۔ میری پہچان ان سے ادب اسلامی کی ایک کتاب ''على هامش السيرة'' کی بناء پر ہوئی جسے میں نے اپنے قیام مکہ (۱۹۵۰ء۔۱۹۵۲ء) میں اپنے استاد و مربی مولانا سید ابو الحسن علی الحسنی الندوی کے کہنے پر پڑھا تھا۔

''على هامش السيرة'' نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیرت طیبہ پر قصصی انداز کی کتاب ہے، جس کا اسلوب نہایت ادبی اور سلیس ہے جو کہ طٰہٰ حسین کے اسلوب کی نمایاں خصوصیت کی عکاسی کرتا ہے۔ وہ اسلوب کہ جس میں الفاظ کا ربط، معانی کا تسلسل، روانی، دھیمی اور دل پر اثر انداز ہوں والی نغمگی ہے جو دلوں پر وجدانی کیفیات پیدا کر دیتی ہے اور انسانی شعور کو بیدار کرتی ہے اور جس کا مقصد طٰہٰ حسین لوگوں کے شوق کو ابھارنا اور نوجوانوں کے دلوں میں سیرت طیبہ کی قدیم کتابوں کے مطالعہ کا شوق و ولولہ پیدا کرنا ہے۔ خاص کر سیرت ابن ہشام، اگر ایسا ہو جاتا ہے تو وہ ان کے لیے ایک بڑی سعادت ہے اور اس میں شک نہیں کہ یہ طٰہٰ حسین کی ایک اچھی سوچ اور نیک مقصد تھا۔

''على هامش السيرة'' کے علاوہ میں نے اس دوران ان کی حجم کے اعتبار سے چھوٹی

Marfat.com

اور اثر کے اعتبار سے بہت بڑی دو کتابیں یعنی ''الوعد الحق'' اور ''المعذ بون فی الارض'' پڑھیں اور یہ دونوں صحابہ کرام کی سیرت پر مبنی ہیں۔ ان کا اسلوب بھی قصص ہے جو کہ پڑھنے والے کے دل پر اثر انداز ہوتا ہے اور ایک وجدانی کیفیت پیدا کر دیتا ہے۔ ان کتابوں کے مطالعہ کے بعد میں نے ان کو سیرت طیبہ و سیرت صحابہ ﷺ سے محبت کرنے والا پایا اور میرے دل میں اس وقت ان کتابوں کے مصنف کی صورت بس گئی نہ کہ وہ صورت جو کہ ''فی الشعر الجاہلی'' و''مستقبل الثقافۃ فی مصر کے پڑھنے والوں کے دلوں میں نقش تھی۔ ان دونوں کتابوں کو میں نے بعد میں مصر میں پڑھا اور اسی دوران ان کی خود نوشتہ سوانح حیات بعنوان ''الایام'' پڑھی جس کی بناء پر مجھے ان سے ایک خاص لگاؤ پیدا ہو گیا۔

اپنے قیام قاہرہ کے دوران میں علمی اور ادبی مذاکروں اور پروگراموں میں شریک ہوتا تھا، کیونکہ میرے قیام مصر کے مقاصد میں سے ایک مقصد یہ بھی تھا۔

طٰہٰ حسین کو سننے کا پہلا موقع اس وقت ملا جب اخبارات میں شیخ مصطفیٰ عبدالرزاق (سابق شیخ الجامع الازہر اور اسلامی فلاسفر) کی تعزیت کے سلسلے میں ایک پروگرام کا اعلان ہوا۔ میں بھی اس پروگرام میں جو امریکن یونیورسٹی قاہرہ کے ''ایورٹ میموریل ہال'' میں منعقد ہوا تھا شریک ہوا صرف اس لیے کہ اس میں طٰہٰ حسین بھی خطاب کرنے والے تھے، یہاں میں نے طٰہٰ حسین کو دیکھا اور انہیں سنا، ایسے ادیب کو جو کہ نابینا تھے اور انقلاب مصر سے قبل وفد پارٹی کی حکومت میں وزیر رہ چکے تھے اور آج تک میں ان کی زبان سے اس قدیم عربی شعر کو نہیں بھولا۔ جس میں انہوں نے اپنی تقریر کی ابتدا کی تھی۔

وما كان قيس هلكه هلك واحد ولكنه بنيان قوم تهاما

(یعنی قیس کی موت ایک شخص کی موت نہیں بلکہ اس کی موت پوری قوم کی موت ہے)

اور میرا پہلا تاثر یہ تھا کہ وہ اپنی تقریر میں بالکل اپنی تحریر کی سچی تصویر تھے۔ آہنگی، مٹھاس، تسلسل گویا نہر ہے جو ایک ہموار میدان میں خاموشی سے بہہ رہی ہے، برخلاف دوسرے مصری مقررین کے جو کہ شعلہ بیانی کا انداز رکھتے ہیں اور جن کی آواز میں اتار چڑھاؤ کی کیفیت رہتی ہے۔ دوسری چیز جو کہ میں نے نوٹ کی اور جس نے مجھے حیرانگی اور پسندیدگی کی کیفیت میں مبتلا

Marfat.com

کیا۔ وقت کی پابندی تھی جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے کہ ان کی تقریر کا وقت بیس منٹ طے تھا اور نا بینا ہونے کے باوجود انہوں نے اپنی تقریر ٹھیک بیس منٹ پر ختم کر دی اور وقت مقررہ سے ایک منٹ بھی زیادہ نہیں لیا۔ پھر ایک اور لیکچر سننے کا اتفاق ہوا جو سوشلسٹ پارٹی کے آڈیٹوریم میں ترتیب دیا گیا تھا۔ تقریر کا موضوع تو اس وقت یاد البتہ اتنا یاد ہے کہ اس تقریر میں اعلیٰ سوسائٹی کے با حیثیت خواتین و حضرات شریک تھے، اور تقریر عمومی طور پر بعض ثقافتی اور سماجی مشکلات پر مبنی تھی، اس تقریر میں بھی میں نے انہیں اسی طرح پر سکون کلمات کی ادائیگی اور آواز کے اتار چڑھاؤ میں ٹھہراؤ سے کام لیتے ہوئے پایا۔ تقریر کا وقت ایک گھنٹہ تھا جو ٹھیک ایک گھنٹہ بعد وقت مقرر پر ختم ہوئی۔ مجھے یہ بات بہت پسند آئی۔ اس لیے کہ آج کے دور میں بینا خطباء تک جو اپنی کلائیوں پر گھڑیاں باندھے ہوتے ہیں اس چیز کا خیال نہیں رکھتے۔

۱۹۵۴ء کے شروع کی بات ہے کہ اکثر سابق وزراء اور معزز شخصیات عوام کے سامنے آنے سے کتراتے تھے اور اس نئے انقلابی دور میں سوائے ڈاکٹر طٰہٰ حسین (ادب و سابق وزیر) کے اور کوئی عوام کے سامنے نہیں آتا تھا۔ ڈاکٹر طٰہٰ حسین کے آنے کی وجہ سے ان کا ادبی و علمی دنیا میں مقام تھا، یا پھر اخوان المسلمین کے قائد حضرات یا جمعیت شبان المسلمین جہاں میں اکثر جاتا تھا اور ان کی تقاریب میں اکثر مصر اور عالم عرب کے بڑے بڑے علماء کو سنتا تھا۔ جمعیت کے ثقافتی پروگراموں کے انچارج شیخ احمد الشرباصی (استاد الازہر) میرے مخلص دوستوں میں سے ایک تھے اور میرے بڑے بھائی کی طرح تھے۔

پھر میں نے چاہا کہ طٰہٰ حسین سے شخصی طور پر ملوں اور ان کے ساتھ گفتگو کروں جیسا کہ میں نے دوسرے مصر کے بڑے ادیبوں اور علماء کے ساتھ کیا۔ لیکن مجھے جو مشکل درپیش آئی وہ یہ تھی کہ مجھے ان کا فون نمبر ٹیلیفون ڈائریکٹری میں نہیں ملا اور مجھے ایسا لگا کہ ان کا نمبر خفیہ رکھا گیا ہے تا کہ ملنے والے پریشان نہ کریں، پھر میں ایک جاسوس یا رپورٹر کی مانند ٹیلیفون آفس گیا، جو قاہرہ کے قلب میں شارع عدلی پاشا (جس کا نام اب بدل چکا ہے) پر واقع تھا اور اس نے وہاں موجود افسر سے ڈاکٹر طٰہٰ حسین کے گھر کا فون نمبر معلوم کیا اس پر اس نے معذرت چاہی اور کہا کہ یہ نمبر خفیہ ہے، ہر شخص کو نہیں دیا جاتا۔ میں نے اس افسر سے کہا کہ میں یہاں بہت دور سے آیا ہوا ایک مہمان

Marfat.com

ہوں، میں نے ان سے ہر حالت میں ملنا چاہتا ہوں، اس پر اسے میرے حال پر رحم آ گیا کہ غیر عرب نوجوان جو کہ پاکستان سے آیا ہے اتنی شدید خواہش رکھتا ہے اس نے مجھے ان کا نمبر دے دیا۔ میں نے گھر کا فون ملایا تو سیکرٹری نے بات کی، شروع میں تو اس نے ٹالنا چاہا کہ ایک نامعلوم اجنبی نوجوان کو مصر کے ایک مشہور عالم وادیب سے ملنے کا وقت دیا جائے یا نہیں، لیکن پھر میری شدید خواہش کو دیکھ کر تیار ہو گیا اور اس نے مجھے ڈاکٹر طٰہٰ حسین کا پتا دے دیا جو اس زمانہ میں محلہ الزمالک میں قیام پذیر تھے۔

ایک شام وقت مقررہ پر میں ان کے گھر پہنچا، افسوس کہ میں اپنے پاس وہ تاریخ نوٹ نہ کر سکا، لیکن جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے کہ یہ ملاقات جون ۱۹۵۴ء میں ہوئی اس لیے کہ قاہرہ یونیورسٹی اس وقت طلبہ اور زائرین کے لیے مظاہرات کی وجہ سے بند تھی اور یونیورسٹی کی زیارت ڈاکٹر طٰہٰ حسین کے توسط سے ہی ہوئی تھی۔

میں جب ان کے یہاں گیا تو میں نے ڈاکٹر صاحب کو ان کے ڈرائنگ روم میں بیٹھا ہوا پایا اور ان کے پاس بعض قاہرہ یونیورسٹی کے اساتذہ یعنی ان کے پرانے طلباء حضرات کو موجود پایا جو ان سے محبت رکھتے تھے اور مجھے یاد ہے کہ ان اساتذہ میں سے ایک ڈاکٹر عبدالعزیز الاہوانی (پروفیسر الادب الاندلسی) اور ڈاکٹر عبدالرحمٰن البدوی (پروفیسر فلسفہ) اور ڈاکٹر محمد خلف اللہ (پروفیسر ادب اسکندریہ یونیورسٹی) تھے۔ مصر کے اس بلند پایہ عالم وادیب نے پاکستان کے اس نوجوان کو جو عربی زبان بہت روانی کے ساتھ بول سکتا تھا مرحبا کہا اور محفل میں موجود اساتذہ کا تعارف کرایا، بات چیت کا سلسلہ شروع ہوا جو ایک گھنٹہ جاری رہا۔ میں نے ان سے بہت سے سوالات کئے اور انہوں نے سب سوالوں کا بہت توجہ اور خوش اسلوبی سے جواب دیا۔ بات چیت میں وہاں موجود دوسرے بعض اساتذہ بھی شریک ہو گئے۔

مجھے یاد ہے کہ میں نے ان سے فحش وعریاں ادب کے بارے میں معلوم کیا جو نہ صرف عہد حاضر کی عریاں ادبی کتابوں میں پایا جاتا ہے بلکہ قدیم ادبی کتابوں میں بھی موجود ہے۔ جیسے ابو تمام کی ''دیوان الحماسہ'' ابن عبدربہ کی ''العقد الفرید'' اور اسی طرح ابن قتیبہ کی بعض تالیفات، ابو الفرج الاصفہانی کی ''الاغانی'' ثعالبی کی ''یتیمۃ الدہر'' اور ابوحیان التوحیدی وغیرہ کی تصنیفات۔

Marfat.com

اس کے علاوہ قدماء حکایات ولطیفے اور اشعار اس قدر گندے اور بیہودہ الفاظوں میں لکھ دیتے تھے کہ شرم آجائے، اس پردہ خوب ہنسے اور وضاحت کی کہ عرب زمانہ قدیم میں اس قسم کے الفاظ اپنی زبانوں اور تحریروں میں لاتے ہوئے عار محسوس نہیں کرتے تھے اور ایک مثال صلح حدیبیہ کے ایک واقعہ سے پیش کی جو مجھے یاد تھی۔ جس میں سیدنا ابوبکر صدیق نے قریشی وفد کے سردار عروۃ بن مسعود الثقفی کو جس نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شان میں گستاخی کی تھی اور صحابہ رضی اللہ عنہم کے عدم تعاون سے برے الفاظ میں ڈرایا تھا تو اس پر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے جواب دیا تھا (''چوسو ۔۔۔۔۔اللات، کیا ہم ان کو چھوڑ دیں گے'') جیسا کہ سیرت ابن ہشام میں آیا ہے اور اسی انداز کے سلف کے بعض اقوال۔ میں نے اس ملاقات کے دوران دیکھا کہ انہوں نے سگریٹ پینے کے لیے نکالا اور حاضرین میں سے ایک کھڑا ہوا اور اس نے دیا سلائی جلائی اور انہوں نے بڑے اطمینان کے ساتھ بغیر کسی غلطی کے سگریٹ جلایا جیسے بینا حضرات جلاتے ہیں۔

حاضرین اساتذہ میں سے ایک نے مجھ سے پوچھا کہ پاکستان عربی زبان کو اپنے لیے سرکاری زبان کا درجہ کیوں نہیں دے دیتا، تو میں نے انہیں اس کے نفاذ میں عملی دشواریوں سے آگاہ کیا، طٰہٰ حسین نے بھی اس کی حمایت کی اور اس فکر کو غیر منطقی افکار سے تعبیر کیا اور سورۃ الروم کی ایک آیت پڑھی:

ومن آياته اختلاف السنتكم و الوانكم ان في ذلك لآيات للعالمين.

(اور اس کی نشانیوں میں سے تمہاری زبانوں اور رنگوں کا اختلاف ہے بیشک اس میں جاننے والوں کے لیے نشانیاں ہیں)۔

اس موقع پر فائدہ اٹھاتے ہوئے میں نے قاہرہ یونیورسٹی دیکھنے کے لیے اپنی رغبت کا اظہار کیا، تاکہ وہاں کے بعض اساتذہ سے بھی ملاقات ہوسکے۔ یونیورسٹی مظاہرات کی وجہ سے بند رہی تھی یہ مظاہرات طلباء کے بڑے اجتماع کی بنا پر ہوئے تھے، جسے اخوان المسلمین نے یونیورسٹی کے وسیع میدان میں منعقد کیا تھا اور جس سے حسن روح (صدر طلباء اخوان المسلمین قاہرہ یونیورسٹی) نے خطاب کیا جو یاسر عرفات کے کلاس فیلو اور سیاسی رفیق تھے۔ انہوں نے انقلابیوں کو برطانیہ کے ساتھ گٹھ جوڑ کرنے اور برطانوی فوجوں کو مصری عوام اور خاص کر کے اخوان المسلمین

Marfat.com

کے نزدیک ناپسندیدہ شرائط پر سوئز علاقہ سے نکالنے پر تنقید کی۔ اخوان المسلمین اس علاقہ میں انقلاب آنے سے کئی سال قبل برطانوی فوج سے برسرپیکار تھے، جن کے کافی نوجوان شہید ہو چکے اور شاہ فاروق کے دور میں سزائیں کاٹ چکے تھے۔ اسی وجہ سے وہ چاہتے تھے کہ ان مذاکرات میں شریک ہوں تاکہ برطانوی فوجوں کا اخراج ٹھیک شرائط پر ہو پائے۔ انقلابی حکومت اس پر راضی نہ تھی، کیونکہ اسے اس طرح اپنی حکومت جانے کا خطرہ تھا، اس لیے کہ فوج میں بعض بڑے فوجی افسران کا تعلق اخوان المسلمین سے تھا۔

میں اس جلسے میں شریک تھا اور میں نے طالب علم لیڈر حسن دوح کا ولولہ انگیز اور دلوں کو گرما دینے والی تقریر بھی سنی، جس نے طلباء کے دلوں میں آگ لگا دی تھی۔ جس کے بعد اخوانی طلباء اور دوسرے طلباء نے قاہرہ کی سڑکوں پر زبردست مظاہرہ کیا۔ جسے پولیس نے روکنے کی کوشش کی اور طلباء اور پولیس میں زبردست تصادم ہوا۔ جس کی بنا پر یونیورسٹی بند کر دی گئی۔ صرف اساتذہ اور اسٹاف کو گیٹ پر کارڈ دکھا کر جانے کی اجازت تھی۔

یہ وجہ تھی جس کی بنا پر میں چاہتا تھا کہ ڈاکٹر طٰہٰ حسین میرے لیے سفارش کر دیں اور میں قاہرہ یونیورسٹی دیکھ سکوں۔ وہاں موجود ڈاکٹر عبدالعزیز الاہوانی نے اپنی خدمات پیش کیں۔ ایک دو روز میں یونورسٹی کے ذمہ داران سے کارڈ حاصل کیا، اس طرح میں نے یونیورسٹی دیکھی اور شعبہ عربی کی سیر کی۔ جہاں میرا وہاں موجود بعض اساتذہ سے تعارف کرایا گیا۔ میں نے وہاں کالج فیکلٹی کے نائب سے ملاقات کی کیونکہ ڈین موجود نہ تھے۔ ڈاکٹر الاہوانی نے میری بڑی پذیرائی کی اور اپنے گھر پر دوپہر کے کھانے کی دعوت دی اور اپنا ایک مقالہ جو یورپ اور اندلس کے سیاسی تعلقات کے بارے میں تھا پیش کیا۔ ڈاکٹر الاہوانی کچھ عرصہ بعد وزارت تربیت و تعلیم میں اعلیٰ عہدے پر فائز ہوئے، میں جب لیبیا میں تھا تو ان کے انتقال کی خبر ملی۔ اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے۔

اسی طرح اللہ سے دعا ہے کہ وہ طٰہٰ حسین کی بھی کوتاہیوں کو درگزر فرمائے اور اپنے جوار رحمت میں جگہ عطا فرمائے۔ آمین

Marfat.com

دمشق سے کیمبرج تک

دمشق سے کیمبرج تک کا میرا یہ سفر سن ۱۹۶۰ء میں ہوا تھا جہاں میں نے تعلیم کے چار سال گزارے تھے۔ میرے اس سفر کو مشرق سے مغرب یا ایشیا سے یورپ کا نام بھی دیا جا سکتا ہے۔ یورپ کا میرا یہ پہلا سفر تعلیم کی غرض سے تھا، لیکن اس سفر سے میرے لیے یورپ کا گویا دروازہ کھل گیا کہ اس کے بعد دسویں بار انگلینڈ اور یورپ کے مختلف شہروں میں آنا جانا رہا۔ لیکن یہ پہلا سفر اہم خصوصیات کا حاصل تھا اور اس کے تاثرات و مشاہدات ۳۰ سال بعد آج بھی، ذہن میں ابھرے ہوئے نقوش کی طرح نمایاں ہیں۔ شاید اس کی وجہ یہ بھی ہو کہ دلچسپی، تجسس اور شوق و مشاہدہ کی جو کیفیات انسان کو کسی مقام کے پہلے سفر میں پیش آتی ہیں، بعد کو بار بار کے سفروں میں وہ باقی نہیں رہتیں۔

اس سفر کی ایک بڑی خصوصیت یہ تھی کہ دمشق، حلب کے مختصر فاصلے کو چھوڑ کر سارا کا سارا یہ سفر ریل سے ہوا تھا۔ دمشق، حلب کا سفر بھی زمینی تھا گو ریل سے نہیں، آج تو سرعت پسندی اور فضائی سفر کی عمومیت کے اس دور میں انسان ریل اور سمندری جہاز کے سفر کے لیے ترس جاتا ہے۔ مگر میں اپنی زندگی کے طویل سفروں میں نے چند سفروں میں ان آخر الذکر دونوں مسائل سفر سے کافی لطف اندوز ہوا ہوں۔

جون ۱۹۵۹ء میں دمشق یونیورسٹی میں تعلیم ختم کرنے کے بعد مجھے کیمبرج یونیورسٹی میں پی۔ ایچ۔ ڈی کے لیے داخلہ مل گیا تھا۔ مگر میں اپنی پہلی عربی کتاب ''العزبن عبدالسلام، عصرہ وحیاتہ'' شائع کرانے کے لیے وہاں رکا رہا۔ یہ میرا ایم۔ اے کا مقالہ تھا اور اپنے موضوع پر عربی زبان میں شام کے اس نامور اور منفرد عالم و مصلح پر پہلی کتاب تھی۔ ۱۹۶۰ء میں یہ دار الفکر الاسلامی دمشق سے چھپ گئی اور اگست ۱۹۶۰ء میں، میں اپنے طویل سفر پر براہ استنبول روانہ ہو گیا۔

دمشق سے حلب تک کا سفر ٹیکسی سے ہوا، میرے ایک عزیز دوست و ہم جماعت نجم الدین

Marfat.com

حلبی میرے ساتھ تھے اس رشتہ کی روئیداد قابل ذکر نہیں کہ حماۃ اور حمص کے درمیانی دو اہم اور تاریخی شہر میں پہلے دیکھ چکا تھا۔ حمص میں سیدنا خالد بن ولید، فاتح شام کی قبر کی زیارت بھی کر چکا تھا۔ حلب شام کا دمشق کے بعد دوسرا اہم شہر تھا۔ مجھے یہاں سے لندن تک کا ریل کا ٹکٹ بنوانا تھا، جو تھامس کک (Thomas Cook) کی مشہور عالم ایجنسی سے بنوایا، لیکن پھر یہ طے کیا کہ استنبول سے لندن تک انٹرنیشنل ریل ٹکٹ بنوایا جائے اور حلب سے ترکی کے پہلے سرحدی شہر اضنہ پہنچ کر وہاں سے استنبول تک کا ٹکٹ ترکی کرنسی (لیرہ) میں خریدا جائے۔ جو کافی سستا پڑتا ہے کہ اس زمانہ میں شامی یا سوری لیرہ کے مقابلہ میں ترکی لیرہ کافی سستا تھا۔

میرے عزیز و بے تکلف دوست نجم الدین حلبی نے مجھے رخصت کیا اور میں اس ٹرین پر سوار ہو گیا جو بغداد سے حلب ہوتی ہوئی استنبول جاتی تھی۔ اضنہ کے ریلوے اسٹیشن پر میں نے استنبول کا ٹکٹ خرید لیا۔ ٹرین میں شام و عراق کے کافی مسافر اور کچھ طلبہ بھی تھے، ایک عراقی طالب علم سے دوستی ہو گئی۔ دوسرے دن شام کو ہم استنبول کے ایشیائی ساحل حیدر پاشا کے ریلوے اسٹیشن پر پہنچے۔ ساحل سمندر پر اس اسٹیشن کی عظیم الشان عمارت کو دیکھ کر دل پر قدیم ترکی سلطنت و خلافت کا پہلا نقش مرتسم ہوا۔ بحر مرمرہ روشنیوں سے جگمگا رہا تھا اور عرصۂ دراز تک عربی زبان سے آشنا رہنے والے کان اب ایک نئی زبان سن رہے تھے۔ یار تو کوئی ترکی نہ تھا، لیکن زبان ترکی تھی۔ یہ غنیمت تھا کہ یہاں عربی بھی کسی قدر لوگ سمجھتے تھے۔ چھوٹے سمندری جہاز میں بیٹھ کر ہم استنبول کے یورپی ساحل غلطہ پر آ گئے اور یہاں سے ٹیکسی کے ذریعے روانہ ہو کر میں استنبول کے ایک متوسط درجہ کے ہوٹل میں قیام پذیر ہوا۔ جس کا نام اب پورے ۳۷ سال بعد یاد نہیں۔ ہوٹل بھی کوئی ایسا قابل ذکر نہ تھا جس کا نام ذہن میں محفوظ رہتا، ۱۲، ۱۳ سال بعد جب دوبارہ استنبول جانا ہوا تو چونکہ ایک اعلیٰ ہوٹل میں قیام تھا اور ایک بہت نمایاں جگہ پر، اس لیے اس کا نام اب تک یاد ہے۔ یعنی میدان تقسیم یا تقسیم اسکوائر کا ہوٹل ڈلسن (Dilson)۔

کسی اجنبی ملک کے چھوٹے ہوٹلوں میں زبان کی بڑی دشواری ہوتی ہے، لیکن جلد ہی یعنی دوسرے روز صبح کو میری ملاقات ایک ترکی دوست احسان توکسرے سے ہو گئی، جن کا نام مجھے دمشق یونیورسٹی کے ایک ترکی کلاس فیلو رمزی نے دیا تھا۔ یہ استنبول یونیورسٹی میں قانون کے

Marfat.com

طالب علم تھے اور بعض مساجد میں واعظ کے فرائض انجام دیتے تھے، اور عربی بول سکتے تھے۔ ان سے ملنا کیا تھا گویا کوئی سگا بھائی مل گیا، محبت ہی محبت، خلوص ہی خلوص، ایک خوبرو شادی شدہ نوجوان اور اسلامی جذبہ سے سرشار۔

تین چار روز تک استنبول میں قیام کے دوران یہ برابر میرے ساتھ رہے، استنبول کے ایک قدیم محلے چہار شنبہ میں ان کا مکان تھا، چاہتے تھے کہ مجھے اپنے گھر قیام کے لیے لے جائیں لیکن میں نے شکریہ کے ساتھ معذرت کی۔ وہ ہوٹل روز آتے رہے۔ اپنے گھر کھانے پر لے گئے ان کے مختصر سے فلیٹ میں، میں نے صفائی اور ذوق نفاست کا وہ نمونہ دیکھا جس کا اثر غالباً شامی عربوں کے گھروں میں پہنچا ہے، کیونکہ شام یا سوریہ عرصہ دراز تک ترکوں کے زیر نگین رہا اور وہاں شامی وترکی مخلوط نسل ہے۔

ایک معمولی سا واقعہ جس نے میرے دل پر ترکوں کے حسن اخلاق اور اخوت اسلامی کا گہرا نقش چھوڑا یہ تھا کہ میں نے انہی احسان توکسرے سے کہا کہ مجھے اپنے کپڑے کسی لانڈری میں دھلوانے ہیں، انہوں نے کہا مجھے دے دیں، میں دے دوں گا۔ لیکن حد ہوگئی کہ میرے یہ کپڑے وہ اپنے گھر لے گئے اور اپنی بیوی سے گھر میں مشین سے دھلوا کر اور استری کرا کے مجھے پہنچا دیئے۔ اس کی مجھے ایک ایسے نوجوان سے ہرگز توقع نہ تھی جس سے ایک دو روز قبل ہی پہلی ملاقات ہوئی تھی۔

احسان توکسرے نے (جو بعد میں ترک پارلیمنٹ کے ممبر ہوئے اور اونچے مناصب پر پہنچے) مجھے ترکی کی اہم مساجد، مسجد ایا صوفیا، مسجد سلطان محمد الفاتح، مسجد سلیمانیہ، مسجد سلطان احمد یا نیلی مسجد، اور ینی مسجد اور شاہزادہ مسجد دکھائی۔ عثمانی ترکوں کا استنبول یا قدیم قسطنطنیہ میں سب سے اہم تمدنی و اسلامی کارنامہ یہ تھا کہ انہوں نے اس شہر کو عظیم مساجد کا شہر بنا دیا۔ دنیا کے کسی اسلامی شہر میں ہر طرف مساجد کے مناروں کی وہ کثرت نہیں جو استنبول میں ہے۔ بہت پہلے لیبیا میں، میں نے بی بی سی لندن سے انگریزی میں استنبول کے بارے میں ایک تقریر سنی تھی۔ انگریز صلیبی مقرر کے ایک ایک لفظ سے مساجد کے تذکرے میں رقابت وجلن کا اظہار ہوتا تھا۔

مساجد کے سلسلہ میں ایک یادگار واقعہ پیش آیا جسے میں اپنی زندگی کی چند سعادتوں میں

Marfat.com

ایک اہم سعادت اور توفیق الٰہی سمجھتا ہوں۔ میں جب اپنے دین دار اور پر جوش دوست احسان توکسرے کے ساتھ مسجد ایا صوفیا کی زیارت کے لیے گیا، جس کو کمال اتاترک نے میوزیم بنا دیا ہے اور وہاں نماز ممنوع ہے، تو میرے دل میں شدید خواہش ہوئی کہ اس میں دوگانہ نفل ادا کروں۔ کتنے ہی مسلم اور غیر مسلم سیاح اس میں جوتوں کو ساتھ گھوم رہے تھے کیونکہ فرش وغیرہ ہٹا دیا گیا ہے میں نے اپنے ان ترکی دوست سے اس خواہش کا اظہار کیا۔ انہوں نے کہا ٹھیک ہے، تم دو رکعت نماز پڑھ لو وہ ایک طرف کو ہو گئے۔ میرا وضو تھا اور میں عام ترکوں کی طرح سوٹ میں ملبوس تھا۔ جوتے صاف تھے، جن میں نماز جائز ہے اور بہت سے عرب اور ترک پارکوں میں اسی طرح نماز پڑھتے ہیں، میں نے ایک کونے میں دو رکعت نفل کی نیت باندھ لی۔ جب سلام پھیر کر کھڑا ہوا تو ایک ترک چوکیدار قریب آیا جو دوسرے چوکیداروں کے ساتھ اس وسیع وعریض مسجد میں گھومتا رہتا ہے۔ مجھ سے بات کرانا چاہی ''مگر زبان یار من ترکی'' والی بات پیش آئی۔ احسان توکسرے میرے پاس آ گئے تھے، اس نے ان کے واسطے سے پوچھا کہ میں کون ہوں اور کہاں سے آیا ہوں؟ انہوں نے بتایا کہ پاکستانی ہیں، میرے اس جواب پر اس چوکیدار نے جو بات کہی اس نے مجھے حیران کر دیا اور معلوم ہوا کہ کمال اتاترک اپنی لادینی سیاست میں کس بری طرح ناکام رہا۔ اس حارس یا چوکیدار نے کہا کہ تم نے بہت اچھا کیا، یہاں دوگانہ ادا کیا۔ میں بھی جب موقع ملتا ہے تو چپکے سے دو نفل پڑھ لیتا ہوں (یاد رہے کہ ایا صوفیا میں متعدد چوکیداروں کو اس لیے مامور کیا گیا ہے کہ وہ ایک طرف اس کی حفاظت کریں اور دوسری طرف یہاں مسلمانوں کو نماز ادا نہ کرنے دیں کہ کہیں دوبارہ مسجد نہ بن جائے)۔

جہاں تک یاد پڑتا ہے وہ ترکی چوکیدار بھی ہم دونوں کی طرح ایک نوجوان شخص ہی تھا جو غالباً سعید نورسی کی اسلامی تحریک سے متاثر رہا ہو۔

یہاں یہ بات بھی یاد رکھنے کی ہے کہ ۱۹۶۰ء میں جب استنبول کے اس سفر پر گیا تھا تو اس سے چند ماہ قبل ہی ترکی میں صدر جلال بایار و عدنان مندریس کی حکومت کے خلاف جنرل جمال گورسل کا فوجی انقلاب رونما ہوا تھا کیونکہ اسلامی اقدار کی طرف ان کے جھکاؤ اور بعض دینی اصلاحات کو ''کمال ازم'' سے انحراف سمجھا گیا تھا۔

Marfat.com

یہ بھی عرض کر دوں کہ میں نے اپنا یہ ذاتی واقعہ خودستائی کے لیے نہیں لکھا ہے، بلکہ مقصود یہ ہے کہ ہمارے دوسرے پاکستانی سیاح اسی طرح ایا صوفیا میں دوگانہ ادا کرلیا کریں تو کیا عجب ہے کہ کسی روز دوبارہ اس مسجد میں اذان کی آواز گونجنے لگے جو تقریباً پانچ سو سال تک مسجد رہی اور اس کے مینار ومحراب برسوں سے اذان ونماز کے لیے ترس رہے ہیں، اللہ تعالیٰ اپنے خاص فضل سے اس کو دوبارہ مسجد بنائے، آمین۔

انہی احسان توکسرے نے مجھے استنبول یونیورسٹی دکھائی۔ وہاں بعض اساتذہ سے ملایا۔ سلطان محمد الفاتح کا مشہور ترکی محل توپ قپوسرائے دکھایا جو انیسویں صدی کے وسط تک ترکی کے سلاطین عثمانیہ کی قیام گاہ تھی۔ یہ طویل رقبہ میں پھیلا ہوا مختلف عمارات کا ایک مجموعہ ہے جس میں سلطان کی ذاتی قیام گاہ، زنان خانہ، دفتر حکومت، خزانہ سلطنت، طعام خانہ اور اصطبل وغیرہ کی عمارتیں ہیں۔ قرون وسطی میں اس شہر محل میں تقریباً چار ہزار آدمی رہا کرتے تھے، اس کے ایک خاص حصہ میں اب وہ مشہور میوزیم ہے جس میں وہ نادر ترین اشیاء محفوظ ہیں جن کی حفاظت چالیس فوجی محافظ کرتے تھے اور خود سلطان ترکی ان میں سے ایک تھا۔ میری مراد عہد نبوی وصحابہ کی وہ متبرک اشیاء ہیں جو سلطان سلیم اول نے سولہویں صدی کے اوائل میں شام ومصر کی فتح کے بعد مصر سے حاصل کی تھیں اور کچھ اس کو مکہ شریف سے ملی تھیں۔ جس نے مصر کی فتح کے بعد سلطان سلیم کی باجگزاری قبول کر لی تھی، ان میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا موئے مبارک آپ کا عصائے مبارک آپ کی اور بعض دوسرے خلفائے راشدین کی تلواریں اور دوسری متبرک اشیاء ہیں، یہیں وہ مصحف عثمانی بھی محفوظ ہے، جس کو سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ بن عفان اپنی شہادت کے وقت پڑھ رہے تھے اور وہ صفحہ کھلا رکھا گیا ہے، جس پر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خون کے قطرات گرے تھے۔ یہ محل ایک اونچے پہاڑی ٹیلہ پر ہے جس کے ایک طرف بحر مرمرہ ہے۔ محل کے ایک حصہ میں مغربی طرز کا ایک شاندار ریسٹورنٹ بنا ہوا ہے، جس کو میں نے استنبول کی دوسری سیاحت ۱۹۷۲ء میں دیکھا اور وہاں بیٹھ کر چائے پی۔ یہ محل اور اس کی عمارات ایک مستقل مضمون کی طالب ہیں۔ قدیم مغربی مصنفین نے اس محل کے بارے میں بہت کچھ افسانوی انداز میں لکھا ہے۔

احسان توکسرے نے مجھے جامع مسجد ابی ایوب انصاری کی زیارت بھی کرائی۔ جو قرن

Marfat.com

الذہبی (Golden Horn) کے شمالی کنارے پر ہے۔اس کے باہران جلیل القدر صحابی کی قبر مبارک ہے جنہوں نے قسطنطنیہ پر ۴۹ھ کے پہلے اسلامی حملہ میں وفات پائی تھی اوران کی وصیت کے مطابق ان کو اس جگہ دفن کیا گیا تھا۔ جہاں پہلے شہر قسطنطنیہ کی فصیل تھی۔ حضرت ابوایوب انصاری کے نام سے یہ پورا محلہ آباد ہے۔ترک اس کو''ایوپ'' کے نام سے یاد کرتے ہیں۔

مسجد ابوایوب انصاری میں احسان توکسرے نے مجھے وہ قالین دکھایا جواس مسجد کے وسیع ہال میں بچھا ہوا ہے جس کو عدنان مندریس نے اپنی جیب خاص سے مسجد کو ہدیہ کیا تھا۔ یہاں میں نے یہ بھی دیکھا کہ اس میں سو بچے قرآن کریم کو حفظ کرنے میں مشغول تھے۔یادرہے کہ جلال بایار کے عہد حکومت (۶۰۔۱۹۵۰ء) ہی میں ترکی میں دوبارہ مسلمانوں کو عربی زبان میں قرآن کریم پڑھنے اور پڑھانے کی اجازت ملی تھی۔

مساجد کے علاوہ میرے ترکی دوست نے مجھے قصر یلدز بھی دکھایا جو انیسویں صدی میں بنایا گیا تھا اور سلطان عبدالحمید کی رہائش گاہ تھا اور جمہوری عہد میں میوزیم بن گیا یہ حسین محل محلہ بشکطاش کے ایک وسیع علاقہ میں پھیلا ہوا ہے اور اس کی چھوٹی سی مسجد میں سلطان عبدالمجید اور سلطان عبدالحمید کے ہاتھ کی لکھی ہوئی بعض آیات قرآنی فریم کی ہوئی مسجد کی دیواروں پر آویزاں ہیں۔

اسی صدی کا بنا ہوا دوسرا اور استنبول کا حسین ترین شاہی محل دولمہ باغچہ جو باسفورس کے ساحل پر ہے اور جس کو سلطان عبدالعزیز نے انیسویں صدی میں یورپی محلات کے طرز پر بنایا تھا اس کو یہ نہ دیکھ سکا کیونکہ اس میں ان دنوں فوجی انقلابی کونسل کا دفتر تھا۔

استنبول کے اس مختصر قیام کے یادگار واقعات سے ایک واقعہ یہ ہے کہ میں اپنے انہی ترکی دوست کے ساتھ سروس ٹیکسی میں جمعہ کی نماز کے لیے جارہا تھا۔جس میں تین اور ترک بھی سوار تھے۔ان کو جب معلوم ہوا کہ میں پاکستانی ہوں تو انہوں نے باصرار میرا اور میرے دوست کا کرایہ ادا کیا۔

ایک دوسرا واقعہ یہ ہے کہ ایک سہ پہر کو احسان توکسرے (جو بے ریش نوجوان تھے) ایک مسجد میں بعد نماز عصر خواتین کو وعظ کہنے کے لیے گئے،خواتین میں کافی جوان لڑکیاں بھی تھیں اور

Marfat.com

یورپین لباس کے ساتھ سروں پر رومال باندھے ہوئے تھیں۔ وعظ ترکی زبان میں تھا۔ میں ایک طرف بیٹھ گیا۔ چند منٹ کے بعد وہاں ایک جرمن نوجوان سیاح آ کر بیٹھ گیا۔ میں نے اس سے انگریزی میں پوچھا۔ تم یہاں کیسے؟ تو اس نے بتایا کہ ''راستہ میں میں نے ایک نوجوان خاتون سے ایک جگہ کا پتہ پوچھا تھا۔ انہوں نے کہا میں مسجد میں وعظ سننے جا رہی ہوں۔ تم میرے ساتھ وہاں چلو۔ وعظ کے بعد میرا راستہ بھی تمہاری مطلوبہ جگہ کی طرف ہے۔ میں تم کو وہاں پہنچا دوں گی۔'' میرے لیے یہ حیرت اور قابل تحسین بات تھی کہ کس طرح ایک نوجوان ترکی خاتون ایک مغربی عیسائی سیاح کو مسجد میں لے آئی، جہاں اس نے اپنی آنکھوں سے ترکی میں دینداری کا منظر دیکھا۔ وہی ترکی جس کو کمال اتاترک نے دین سے بیگانہ اور سیکولر بنانا چاہا تھا۔ اس کی کوششیں بقول قرآن سمندروں اور دریاؤں میں پانی پر جھاگ اور خس و خاشاک کی طرح بہہ گئیں ''فاما الزبد فیذهب جفاء'' (سورۃ الرعد) اور ترکی کی تعلیم یافتہ خواتین میں دین کا ذوق باقی رہا۔

ایک تیسرا واقعہ قدیم محلہ چہارشنبہ کی ایک چھوٹی سی مسجد کا ہے، جہاں عشاء کی نماز میں زیادہ تر بوڑھے لوگ تھے۔ میں نے وہاں نماز کے بعد لوگوں سے گفتگو میں کمال اتاترک کے بارے میں پوچھا۔ ایک سفید ریش بزرگ نے ''کافر کافر'' کہا اور پھر ہونٹوں میں چپ کے اشارے کے لیے انگلی رکھی کیونکہ وہ کمال ازم کی حمایت میں تازہ فوجی انقلاب کا زمانہ تھا۔

بہرحال استنبول کا میرا یہ پہلا سفر بڑا خوش گوار اور اثر آفریں تھا جس میں بہت کچھ دیکھا تھا۔ ترکوں کی مہمان نوازی، گھروں میں نفاست پسندی، دینداری، پاکستانیوں سے خاص محبت وہاں کے سلسلہ میں میرے عام تاثرات تھے۔

چار پانچ روز کے قیام کے بعد استنبول کے عظیم اسلامی شہر کو الوداع کہتے ہوئے میں یورپ جانے والی ٹرین سے یونان میں سالونیکی شہر کے لیے روانہ ہو گیا۔ جو میرے راستہ کی دوسری منزل تھی۔ منازل سفر اس طرح معین کی تھیں۔ استنبول، سالونیکی، بلگراڈ، لوازن، پیرس، لندن، کیمبرج۔

میرے عزیز ترکی دوست احسان توکسرے نے مجھے استنبول سے یورپ کو جانے والی ٹرین میں سوار کرا دیا جو یونان کے شہر سالونیکی سے ہوتی ہوئی یوگوسلاویہ اور وہاں سے پیرس جاتی

Marfat.com

تھی، ایک دوسری ٹرین لندن کے مسافروں کے لیے براہ بلغاریہ، رومانیہ، ہنگری، آسٹریا، جرمنی، ہالینڈ جاتی ہے مگر چونکہ مجھے بلگراڈ لوزان (سوئزرلینڈ) اور پیرس جانا تھا اس لیے میں نے یونان کا راستہ اختیار کیا اور اس شہر میں رکنا پسند کیا جو جنگ بلقان ۱۹۱۴ء تک ترکی کی سلطنت عثمانی کا حصہ تھا اور جہاں مصطفیٰ کمال اتاترک کی ولادت ہوئی۔

یورپ کی ٹرین میں بیٹھنے کا میرے لیے پہلا تجربہ تھا اور اسی سفر میں مشرقی یورپ اور مغربی یورپ کی ٹرینوں یا مسافروں کے فرق کا پتہ چل گیا اس ٹرین میں زیادہ تر یونانی لوگ سوار تھے، کچھ ترک بھی تھے، گویا یہ ٹرین ہمارے ملک کی عام ٹرینوں سے کافی بہتر تھی، مگر لوگوں کا سامان، شوروغل، انداز، خوردونوش تقریباً وہی تھا جیسا کہ ہمارے ملک میں ہوتا ہے۔

یونان کی سرحد پر ٹرین ہی میں پاسپورٹ وغیرہ چیک کر لئے گئے۔ پاسپورٹ ٹرین کے عملہ نے رکھ لیے تھے، ہمیں امیگریشن کے کسی آدمی کا سامنا کرنا نہیں پڑا۔ سالونیکی کے راستہ میں جس منظر نے مجھے سب سے زیادہ متاثر کیا وہ مختلف اسٹیشنوں پر عورتوں کا سیاہ لباس اور چلتی ٹرین میں دور سے نظر آتے ہوئے مسجدوں کے ترکی انداز کے منارے تھے، جن کی شکل بریدہ پنسل کی سی ہوتی ہے، میں ٹرین کی کھڑکی سے انتہائی شوق و وارفتگی کے ساتھ ان کے فوٹو لیتا رہا، یاد رہے کہ ترکوں نے یا بالفاظ دیگر سلطنت عثمانی نے تقریباً پانچ سو سال یونان پر حکومت کی ہے اور اب بھی یونان کی ایک مختصر پٹی موجودہ ترکی کا ایک حصہ ہے۔

میں یہ سمجھتا رہا کہ جو عورتیں ترکی مسلمان مندین خواتین کی طرح سیاہ ساتر لباس میں سیاہ دوپٹہ سے سر ڈھانپے ہوئے اسٹیشنوں پر نظر آتی تھیں وہ مسلمان ہیں لیکن ساتھ کے بیٹھے ہوئے ایک مسافر سے معلوم کرنے پر پتہ چلا کہ یہ سب یونانی عیسائی خواتین تھیں جو دیہات کی رہنے والی تھیں۔ بہر حال مجھے ان کے لباس سے اندازہ ہوا کہ ترکی اسلامی تہذیب کا یونانیوں پر کتنا گہرا اثر پڑا ہے، بعد کو متعدد بار ایتھنز جانے پر کھانوں کے معاملہ میں بھی ترکی اثرات کا اندازہ ہوا کہ وہاں سب سے زیادہ مرغوب و عام کھانا وہ ہے جس کو ترک ''ضولمہ'' (دملہ) کہتے ہیں اور جس کو عرب ''محشی'' کے نام سے یاد کرتے ہیں یہ ٹماٹر، انگور کے پتوں، بڑی سبز مرچ وغیرہ میں بھرے ہوئے چاول اور قیمہ کی ایک ڈش ہوتی ہے اور ترکوں کے اثر ہی سے عراق و شام میں بہت عام ہے میں

Marfat.com

نے سب سے پہلے ضولمہ یا محشی بغداد میں شیخ محمود صواف کی ایک ضیافت میں ۱۹۵۵ء میں کھایا تھا۔ ترکوں ہی کے اثر سے شیش کباب (یعنی بوٹی کباب) بھی یہاں بہت عام پایا۔

یوں ترکوں کے اور بھی اثرات یونانیوں کے یہاں مل سکتے ہیں، لیکن عثمانی یونان میں دیہاتی لوگوں میں لباس کا یہ اثر اور ایتھنز میں کھانے کی یہ نقل مجھے بہت نمایاں نظر آئی۔ اسی طرح ترکی قہوہ یا کافی بھی بہت عام پایا جس سے شام میں انسیت ہو چکی تھی۔

یہ معلوم کر کے انتہائی افسوس ہوا کہ دور سے نظر آنے والی مساجد کے میناروں کی جو تصویریں میں نے لی تھیں، ان میں سے بیشتر اب ویران ہیں کہ جنگ بلقان کے نتیجے میں نقل مکانی کے بعد یہاں سے ترک چلے گئے ہیں اور وہاں یونانی مسلمان بہت کم ہیں۔

سالونیکی میں پہنچنے پر ایک ہوٹل میں قیام کیا، جو متوسط درجہ کا ہوٹل ہونے کے باوجود کافی صاف ستھرا تھا، ان دنوں اس شہر میں جو سمندر کے کنارے ہے اور کافی پر فضا ہے ایک بڑی صنعتی نمائش ہو رہی تھی، میں نے دیکھا کہ اس نمائش میں غیر نشہ آور ٹھنڈے مشروبات یعنی پیپسی کولا وغیرہ کے مقابلہ میں انگوری شراب زیادہ سستی تھی اور لوگ بکثرت اسی کو پی رہے تھے اور یہ بوتلوں کے بجائے ایک بڑے ڈرم سے براس کاک کے ذریعے خریداروں کو دی جا رہی تھی۔ جس طرح ہمارے یہاں پانی کے فلٹر گلاس بھرے جاتے ہیں۔ اس کی ایک وجہ غالباً یہ بھی ہو کہ یونان میں شام و ترکی کی طرح انگور بکثرت ہوتے ہیں۔

بہر حال یہاں پہنچنے کے بعد سے کھانے پینے کی ان مشکلات کا آغاز ہو چکا تھا جو ایک مسلمان کو یورپ میں جا کر ہوتی ہیں، میں مچھلی یا انڈے ہی پر اکتفا کرتا رہا۔

سالونیکی شہر ہی وہ مقام ہے جہاں سلطان عبدالحمید خان دوم کے خلاف ہونے والی بغاوت ۱۹۰۸ء کا پلان تیار کیا گیا تھا اور یہیں سے شوکت پاشا کی قیادت میں وہ فوجی دستہ روانہ ہوا تھا جس نے اس طاقتور عثمانی سلطان کو تخت سلطنت سے دست بردار ہونے پر مجبور کیا تھا، یہی مشہور ترکی سیاسی پارٹی ترکیا الفتاۃ (Young Turks) اور پھر انور پاشا وغیرہ کی سیاسی جماعت جمعیۃ اتحاد و ترقی کا مرکز تھا اور یہیں جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا مصطفیٰ کمال (بعد میں کمال اتاترک) کی پیدائش ہوئی تھی۔

Marfat.com

بافسوس کہ اس شہر میں مجھے سوائے ایک عسکری نوعیت کے برج یا ٹاور کے جو ساحل سمندر پر تھا کوئی اور ترکی آثار نظر نہیں آئے۔

بہر حال دو راتوں کے قیام کے بعد میں یہاں سے بلگراڈ کے لیے روانہ ہو گیا، شام بلکہ پوری عرب دنیا میں یوگوسلاویہ کے صدر مارشل ٹیٹو کی وجہ سے یوگوسلاویہ کی بڑی شہرت و مقبولیت تھی کہ اس صدی کی چھٹی دہائی میں جمال عبدالناصر، ٹیٹو اور نہرو غیر جانبدار ملکوں کی تنظیم کے بہت مشہور رہنما تھے اور دوسرے یہ کہ یوگوسلاویہ کئی صدی تک عثمانی سلطنت کے زیرنگیں رہا تھا اور وہاں کافی مسلمان آباد تھے اور اب بھی ہیں۔ دمشق میں یوگوسلاویہ کے سفارت خانہ میں جہاں سے میں نے ویزا لیا تھا وہاں یوگوسلاویہ کی بعض مساجد کے بڑے فوٹو بھی آویزاں تھے۔

سالونیکی سے بلگراڈ تک کی ٹرین میں مسافروں کا جو منظر مجھے نظر آیا اس کی تصویر کشی کو شاید کوئی مبالغہ سمجھے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہاں سے بلگراڈ تک جو مسافر تھے اور جوان کا اندازہ تھا وہ بالکل ہمارے ملک کی تھرڈ کلاس مسافر ریل گاڑی کا تھا، لوگوں نے لباس سے جو زیادہ تر یوگوسلاوی تھے، غربت ظاہر تھی، بہت سے لوگ راہداری میں فرش پر اپنا سامان رکھے براجمان تھے، حتیٰ کہ بیت الخلاء تک کا راستہ ان مسافروں کی کثرت کی وجہ سے بند ہو گیا تھا۔ ان میں سے بہت سے کنڈیوں میں کھانے پینے کا سامان بھی لیے ہوئے تھے، بلگراڈ تک کے اس سفر میں یقین نہیں آتا تھا کہ میں یورپ کی کسی ریل گاڑی میں سوار ہوں لباس کو چھوڑ کر یہی معلوم ہوتا تھا کہ میں پاک و ہند ہی کی کسی ریل گاڑی کا مسافر ہوں۔ بلگراڈ کے اسٹیشن پر اس ملک کی غربت کے مناظر مزید نظر آئے جس کا ذکر آگے آتا ہے۔

اس سفر میں بھی مجھ کو دور سے مختلف بستیوں میں مساجد کے منارے نظر آتے رہے، وہی ترکی انداز کی مساجد اور میں ان کے فوٹو ٹرین میں بیٹھے بیٹھے لیتا رہا، زاغرب میں جو بہت بڑا اور صنعتی شہر ہے اور اس میں مسلمان بکثرت آباد ہیں، کچھ زیادہ ہی مساجد کے مینار نظر آئے۔

ٹرین رات کو نو بجے کے قریب بلگراڈ کے وسیع و عریض ریلوے اسٹیشن پر پہنچی، میرا ارادہ تھا کہ یہاں دو روز ٹھہروں، اسٹیشن پر دفتر معلومات میں کسی ہوٹل کا نام و پتہ دریافت کرنے میں کافی دشواری ہوئی۔ کوئی آدمی ایسا نہیں ملا جو انگریزی بولتا ہو۔ جس سے کچھ پوچھا وہ ''نیخ''، یعنی نہیں کہہ

Marfat.com

دیتا تھا۔ وہاں کے ویٹنگ روم میں دیکھا کہ مرد اور عورتیں میلے معمولی کپڑوں میں، کرسیاں کم ہونے کی وجہ سے زمین پر بیٹھے ہیں، اسٹیشن پر کام کرنے والوں کے پاس سے شراب کی بو آ رہی ہے اور غیر ملکی مسافر سے بے اعتنائی عام ہے اس میں کئی گھنٹے گزر گئے۔ آخر ایک آدمی سے معلوم ہوا کہ اسٹیشن کے باہر ہی کچھ ہوٹل ہیں۔ ایک ٹیکسی میں بیٹھ کر روانہ ہوا۔ متعدد ہوٹلوں میں پوچھا حتیٰ کہ ایک بڑے فرسٹ کلاس ہوٹل میں جا کر معلوم کیا مگر کہیں کمرہ نہیں ملا، آخر پریشان ہو کر اسٹیشن آ کر بیٹھ گیا، اسی میں رات گزر گئی۔ ایک دن ورات کے سفر کے بعد میں بہت تھکا ہوا تھا۔

معلوم ہوا کہ بلگراڈ میں دو ایک کانفرنسیں ہو رہی ہیں۔ اس لیے ہوٹلوں میں جگہ بالکل نہیں، ہوٹل کی تلاش میں شہر میں جو چکر لگایا اس سے نظر آیا کہ تمام عمارات نئی ہیں۔ بلگراڈ کو دوسری جنگ عظیم کے دوران جرمنی کی شدید بمباری نے بالکل تباہ کر دیا تھا اس لیے نوے فیصد عمارات نئی تھیں۔

صبح ہو گئی تو اسٹیشن کے باہر ناشتہ کے لیے گیا۔ دیکھا کہ علی الصبح لوگ انتہائی عجلت کے ساتھ اپنے اپنے کاموں پر جا رہے ہیں اور دودھ کے ساتھ ایک دو بڑے بسکٹ یا سینڈوچ کھا کر اپنا راستہ لیتے ہیں، میں نے کافی طلب کی کہ چائے کا رواج یہاں نہ تھا، مگر جس چیز نے مجھے حیران کیا وہ یہ تھی کہ کافی کے ساتھ ایک چھوٹے گلاس میں یہاں کی مخصوص سفید شراب بھی تھی، میں نے اشارے یا کسی طریقہ سے ویٹر سے کہا کہ میں نے یہ نہیں منگائی ہے تو اس نے بتایا کہ اس کے پیسے نہیں ہوتے ہیں، یہ کافی کے ساتھ یوں ہی ملتی ہے اور واقعی کافی کے ساتھ لوگ یہ شراب پی رہے تھے اس سے مجھے اندازہ ہوا کہ یہاں شراب نوشی کس کثرت سے ہے اور اس کی کیا وجہ ہے، بعد میں جب انگلستان پہنچا تو مشرقی یورپ اور مغربی تہذیب میں نمایاں فرق نظر آیا کہ وہاں صبح کو تمام شراب خانے بند ہوتے ہیں اور ناشتہ کے ساتھ کوئی شراب نہیں پیتا۔

یہ پوری رات آنکھوں میں کٹی اور مارشل ٹیٹو کے پایۂ تخت اور غیر جانبدار تحریک کے اس مرکز سے مجھے سخت بیزاری ہوئی اور پہلی ٹرین ہی سے گیارہ بجے دن کے قریب میں لوزان (سوئزر لینڈ) کے لیے روانہ ہو گیا۔

بلگراڈ سے لندن تک کا راستہ اور مسافر بالکل جدا تھے۔

اب جو مسافر تھے وہ صاف ستھرے اور مہذب تھے، ریل گاڑی میں وہ طوفان بدتمیزی اور

Marfat.com

[illegible]

[illegible]

اب تھکا ہوا تھا، میں دو راتوں سے نہیں سویا تھا اس لیے پاؤں پھیلا کر آرام سے سو گیا۔ حتی کہ مجھے یہ بھی پتہ نہ چلا کہ کب لوزان آیا۔ جب آنکھ کھلی تو معلوم ہوا کہ ابھی لوزان گزر گیا بڑا افسوس ہوا کہ سوئٹزرلینڈ دیکھنے کا موقع نہیں مل سکا، لوزان میں مجھے ایک سوئس پروفیسر بورژو سے ملنا تھا جن سے دمشق میں واقفیت ہوگئی تھی۔ وہ دمشق یونیورسٹی میں فرنچ کے پروفیسر تھے اور فرنچ کے ساتھ انگریزی اور دوسری متعدد زبانیں جانتے تھے اور میرا ان کے گھر آنا جانا تھا وہ بھی میرے کمرہ پر ملنے کے لیے آ چکے تھے اور وہ ایک سادہ اطوار و آزاد منش اور وارفتۂ علم شخص تھے، سنسکرت بھی جانتے تھے اور ہندو مذہب کے ویدانت اور خاص طور پر اپنشاد کے مداح تھے۔ عیسائیت، یہودیت اور اسلام کو سطحی اور غیر فلسفیانہ مذاہب سمجھتے تھے، ایک بار جب میں نے ان کو مولانا جلال الدین رومی کی مشہور زمانہ مثنوی کے ابتدائی چند اشعار:

بشنو از نے چوں حکایت می کند — از جدائیہا شکایت می کند
کز نیستان تا مرا ببریدہ اند — از نفیرم مرد و زن نالیدہ اند

Marfat.com

سنائے تو بہت متاثر ہوئے تھے۔

بہر حال آرام دہ ٹرین اور خوشگوار موسم میں اس خواب خرگوش کی وجہ سے میں لوزان دیکھنے سے محروم رہا، جو وادی آلپس میں واقع ہونے کی وجہ سے جینوا سے زیادہ پرفضا اور سکون بخش شہر ہے، بعد کو جینوا تو دو مرتبہ جانے کا اتفاق ہوا کہ یہ سب فضائی سفر تھے لیکن لوزان میں نہ جا سکا۔

دو دن اور ایک شب کے سفر کے بعد ہم اس ٹرین سے پیرس پہنچ گئے۔

پیرس ہماری ٹرین تقریباً چوبیس گھنٹے بعد صبح گیارہ بجے کے قریب پہنچی، ساؤتھ ریلوے اسٹیشن پر جو (Gar de Sud) کے نام سے یاد کیا جاتا ہے، فرانسیسی میں ریلوے اسٹیشن کو گار (Gar) کہتے ہیں، جب کہ اسٹیشن (Station) (تلفظ استاسیون) بس اسٹاپ اور میٹرو (انڈر گراؤنڈ ٹرین) کے اسٹاپ کے لیے استعمال ہوتا ہے۔

سیاحت کے علاوہ میرے پیرس رکنے کا ایک اہم مقصد حیدر آباد دکن کے مشہور عالم اور مصنف و محقق پروفیسر ڈاکٹر محمد حمید اللہ صاحب سے ملنا تھا، جن کی بعض اردو کتابیں میں نے کافی پہلے مکہ مکرمہ میں پھر ایک انتہائی مشہور کتاب ''الوثائق السیاسیۃ فی العہد النبوی'' دمشق میں پڑھی تھی اور دمشق یونیورسٹی کے کلیۃ الآداب (فیکلٹی اوف آرٹس) کے شعبۂ ادب عربی میں اپنے لبنانی پروفیسر ڈاکٹر صبحی الصالح سے (جو ازہر کے علاوہ سوربون یونیورسٹی پیرس کے Ph. D. تھے) میں نے ڈاکٹر صاحب موصوف کی بہت تعریف سنی تھی۔ مجھے ان سے ملنے کا بہت اشتیاق تھا۔ لہٰذا سب سے پہلے ریلوے اسٹیشن پر ہی ان سے رابطے کی کوشش کی۔

بلگراڈ سے پیرس تک میرا ریل کا پناما کا سیاہ فام رفیق سفر ڈاکٹر حمید اللہ صاحب کا پتہ چلانے میں بہت کام آیا۔ یہ پہلے پیرس آچکا تھا۔ فرنچ زبان جانتا تھا، میرا خیال تھا کہ پاکستانی سفارت خانے کو ٹیلیفون کرنے پر وہاں سے ڈاکٹر صاحب موصوف کا پتہ مل جائے گا، پیرس میں پبلک ٹیلیفون کرنے کے لیے ایک خاص سکہ لینا پڑتا ہے، اس پنامین رفیق سفر نے یہ سکہ حاصل کر کے جو شاید آدھے فرنک کا تھا، اور ٹیلیفون ڈائریکٹری میں پاکستانی سفارتخانہ کا نمبر دیکھ کر ٹیلیفون کیا، میں نے جب بات کی تو وہاں کسی پاکستانی آدمی نے بتایا کہ ان کے پاس ڈاکٹر صاحب کا ٹیلیفون و پتہ نہیں، لیکن اتنی عنایت کی کہ ایک صاحب کا ٹیلیفون نمبر بتایا کہ ان سے آپ

Marfat.com

کوڈاکٹر صاحب کا پتہ مل جائے گا۔

ان صاحب کو ٹیلیفون کرنے پر معلوم ہوا کہ ڈاکٹر صاحب کے یہاں ٹیلیفون نہیں، لیکن انہوں نے مجھے موصوف کی قیام گاہ کا پتہ بتا دیا یعنی بلڈنگ 4, Rue de Tournon, Paris VI میں چوتھی منزل پر ایک فلیٹ۔

یہ پتا معلوم کرنے کے بعد میں اسی پنامی رفیق کے ساتھ ہوٹل کی تلاش میں روانہ ہو گیا اور قدیم پیرس کے مشہور محلے ''کارترلاتاں'' یعنی (Latin Quarter) یا لاتینی محلہ میں ایک درمیانی درجہ کے ہوٹل میں سامان رکھا اور پھر کھانے کے لیے باہر نکل گئے۔ ہنوز مجھے اس پنامی نیگرو رفیق کی رہنمائی حاصل تھی، ایک قریبی ریسٹورنٹ میں گئے، اس پنامی رفیق نے تو بہت معمولی اور ہلکے لنچ پر گزارا کیا، دو ڈھائی یا تین بجے کا وقت تھا، میں سخت بھوکا تھا، ۲۴ گھنٹے ٹرین میں سفر کے دوران ایک سینڈوچ کے سوا کچھ نہیں کھایا تھا، اس نے میں نے مچھلی طلب کی اور فرانسیسی کھانوں میں (Hors-d oeuvre) یعنی (Appitizer) کی تو کتنی ہی انواع چھوٹے پیالوں میں بھری اور سجی ہوتی ہیں، یعنی کھیرا، ٹماٹر، سلاد، کابلی چنے، لوبیا، ابلی ہوئی خشک مچھلی وغیرہ دسیوں چیزیں، ہر آدمی اپنی پسند کی کوئی چیز لے لیتا ہے، قیمت بھی کچھ زیادہ نہیں ہوتی۔ تلی ہوئی مچھلی بہت عمدہ تھی، سیر ہو کر کھانا کھایا۔ بعد میں لندن جانے سے مجھے فرانسیسی اور انگریزی کھانوں کا فرق واضح نظر آیا، خاص طور پر انگلستان میں Fish and Chips وہاں کا عام سستا اور قومی کھانا ہے، جو طعام خانوں کے علاوہ محلہ محلّہ خاص اسی کی دکانوں میں ملتا ہے، مگر جیسی لذیذ مچھلی پیرس میں کھائی تھی، ایسی لندن میں کبھی نہیں کھائی۔ بعد کے یورپ کے متعدد سفروں میں دیکھا کہ یورپ والے اور خاص طور پر فرانس میں انگریزوں کو حقارت سے (Fish and Chips) (مچھلی اور آلو) کھانے والا کہا جاتا ہے۔

میں کھانے کے بعد ڈاکٹر حمید اللہ صاحب کے مکان کی تلاش میں نکل گیا اور ٹیکسی میں بآسانی وہاں پہنچ گیا، پتھر کی پرانی و مضبوط بلڈنگ میں چوتھی منزل پر جا کر ڈاکٹر صاحب کے فلیٹ کی گھنٹی بجائی۔ موصوف باہر خود آئے، میں نے اپنا تعارف کرایا، مجھے اندر لے گئے، چھوٹے سے فلیٹ کا مجلسی کمرہ کتابوں سے بھرا ہوا تھا، ایک تقریباً چالیس سالہ فرنچ خاتون ڈاکٹر صاحب سے

Marfat.com

فارسی کی کوئی کتاب پڑھ رہی تھی۔ تقریباً پانچ بجے کا وقت تھا، جلد ہی ان سے ڈاکٹر صاحب نے فراغت حاصل کر لی۔ میں دنیا کے ایک مشہور اسکالر ڈاکٹر حمید اللہ صاحب کو دیکھ کر بہت حیران ہوا تھا، کیونکہ ڈاکٹر صاحب کا کوئی فوٹو میں نے نہیں دیکھا تھا، ویسے بھی پتا چلا کہ موصوف تصویر کے بہت خلاف ہیں، لیکن ذہن میں ان کے علم وفضل اور شہرت کی وجہ سے ایک بھاری بھرکم شخصیت کا تصور تھا، لیکن دروازہ کھولنے پر میرے سامنے ایک کافی منحنی، باریش متواضع شخص نظر آیا جو ایک پروفیسر اور مشہور مصنف سے بالکل مختلف ایک طالب علم سا نظر آتا تھا، یہ میری زندگی کا بڑا اچنبھا تھا، اور میں نے پھر اس کا ذکر کیمبرج سے اپنے استاذ معظم مولانا سید ابوالحسن علی ندوی صاجب کے نام ایک خط میں بھی کیا تھا، اور انہوں نے بھی اس کی تائید کی تھی کہ ڈاکٹر حمید اللہ صاحب اپنی وجاہت علمی کے بالکل برعکس ایک عام طالب علم جیسے لگتے ہیں اور حقیقت یہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب موصوف "طلب العلم من المهد الى اللحد" کی مجسم تصویر ہیں۔

میں اس وقت ایک طالب علم تھا، اور مزید طلب علم وتحقیق کے لیے انگلستان جا رہا تھا، لیکن ڈاکٹر صاحب موصوف مجھ سے بہت تواضع اور اخلاق کے ساتھ ملے، میں اب تک کسی ایسے عالم یا پروفیسر سے نہیں ملا تھا، جو تواضع اور بے نفسی میں ان کا مشابہ ہو۔ تھوڑی دیر گفتگو کرنے کے بعد میں نے اجازت چاہی، ڈاکٹر صاحب بھی میرے ساتھ آگئے تاکہ میرا غیر معروف چھوٹا ہوٹل دیکھ لیں، جو ان کے مکان سے بہت دور نہیں تھا اور غالباً سینٹ (فرنچ میں) سان جرمن بولیوارڈ کے قریب کسی گلی میں تھا۔ کل کی ملاقات کے وعدے پر ڈاکٹر حمید اللہ صاحب مجھ سے رخصت ہو گئے۔

میں دوروز کا تھکا ہارا تھا، جلد ہی رات کو سو گیا۔ صبح آٹھ ساڑھے آٹھ بجے میں ہوٹل کے مختصر سے ڈائننگ روم میں ناشتہ کر رہا تھا کہ ڈاکٹر صاحب تشریف لے آئے اور میں ان کے ساتھ پیرس کی سیر کو نکل گیا، میرا خیال تھا کہ ناشتہ سے فراغت کے بعد میں خود ہی اس مشہور مصنف و پروفیسر کے پاس جاؤں گا، لیکن ان کے کریمانہ اخلاق کی انتہا تھی کہ میرے پاس تشریف لائے اور مجھے پیرس، اہل علم ودانش ودین کا پیرس، دکھانے لے گئے۔ ڈاکٹر صاحب کی عمر اس وقت ساٹھ برس کے قریب تھی، جب کہ میں تیس بتیس سال کا جوان تھا، لیکن میں نے دیکھا کہ ڈاکٹر حمید اللہ صاحب منحنی الجثہ ہونے اور اس عمر کے باوجود پیدل چلنے کے بہت عادی تھے اور غالباً ہم زیادہ تر

Marfat.com

پیدل ہی چلتے رہے، شاید ایک دو بار بس میں بیٹھے ہوں۔

سب سے پہلے ڈاکٹر صاحب نے مجھے پیرس کی عظیم الشان نیشنل لائبریری (Bibliotheque National) دکھائی جو اپنے علمی خزانوں کے لیے دنیا میں مشہور ہے اور دنیا کے دیگر محققین علماء کی طرح ڈاکٹر صاحب موصوف کے تحقیقی مطالعہ وکام کی آماجگاہ تھی۔ اس لائبریری یا غالباً اس کے نوادرات ومخطوطات کے ریڈنگ روم میں صرف وہی لوگ جا سکتے ہیں جو پروفیسر ہوں، اور اس کے لیے ایک فارم بھرنا پڑتا تھا، ڈاکٹر صاحب نے فرنچ میں وہ فارم بھرا اور مجھے پروفیسر لکھ دیا اور اپنی طرف سے تصدیق بھی کر دی، مجھ سے صرف دستخط کرائے، اس کے بعد ہی میں لائبریری کے اس سیکشن میں داخل ہو سکا، یہ گویا اس مرد درویش کی طرف سے میرے لیے ایک فال نیک تھی کیونکہ ٹھیک تین سال بعد کیمبرج سے پی ایچ ڈی کی ڈگری کے حصول کے فوراً بعد مجھے ریاض کی کنگ سعود یونیورسٹی میں ملازمت یعنی سینئر لیکچرارشپ مل گئی۔ پاکستان میں ایسے لوگ اپنے آپ کو پروفیسر لکھتے ہیں۔

وسیع ریڈنگ روم میں ڈاکٹر صاحب نے مجھے کچھ عربی زبان کی قلمی کتابیں دکھائیں اب کچھ یاد نہیں، لیکن ریفرنس کی کتابیں چاروں طرف الماریوں میں چنی ہوئی دیکھیں، میں پہلی مرتبہ ایک بڑی انٹرنیشنل لائبریری دیکھ رہا تھا، اس سے پہلے قاہرہ کی دارالکتب المصریہ (نیشنل لائبریری) قاہرہ یونیورسٹی کی لائبریری اور دمشق کی المکتبۃ الظاہریہ کی جو لائبریریاں دیکھی تھیں وہ اس کے مقابلے میں بہت چھوٹی تھیں، بعد میں تو پھر انگلستان، ویانا اور امریکہ کی بڑی بڑی لائبریریاں دیکھنے کا اتفاق ہوا لیکن اس وقت میں نیشنل لائبریری، پیرس سے بہت مرعوب ہوا تھا اور مجھے اس پر بڑا فخر بھی محسوس ہوا تھا، یہ ڈاکٹر حمید اللہ صاحب ہی کی عنایت تھی کہ ان کی رہنمائی میں اس کو دیکھ سکا، ورنہ اس وقت میرے لیے یہ ناممکن ہوتا۔

اس کے بعد ڈاکٹر صاحب مجھے پیرس کی مسجد دکھانے لے گئے، جو باہر سے مسجد کا کوئی نقشہ پیش نہیں کرتی تھی، بس ایک عمارت نظر آئی، لیکن اندر کافی آراستہ و پیراستہ اندلسی ومغربی (مراکشی) طرز کی مسجد دیکھی، مسجد میں داخل ہوتے ہی ایک راہداری کمرے میں کچھ دینی کتابیں عربی وفرنچ میں فروخت کے لیے تھیں، کاؤنٹر پر ایک الجزائری نوجوان خاتون کھڑی تھی، تقریباً

Marfat.com

دو ہفتوں سے میں نے عربی نہیں بولی تھی، میری عربیت کی رگ پھڑکی، میں نے اس جزائری لڑکی سے کسی کتاب کے بارے میں پوچھا لیکن افسوس کہ وہ کچھ نہیں سمجھ سکی، ڈاکٹر صاحب نے فرنچ میں ترجمانی کی۔ مجھے اس عرب خاتون کی عربی زبان یا فصیح زبان سے ناواقفیت پر بہت افسوس ہوا، لیکن وہ خاتون معذور تھی، کیونکہ فرانسیسیوں نے سن ۱۸۳۱ء میں الجزائر پر قبضہ کرنے کے بعد اس کو فرانس کا ایک حصہ بنا دیا تھا، وہاں اسکولوں میں عربی زبان کی تعلیم ممنوع تھی، بس دیہاتوں اور صحرا میں عربی باقی رہ گئی تھی۔ اس کا تلخ تجربہ خود مجھے بہت بعد میں الجزائر میں ہوا، جب میں سن ۱۹۶۸ء میں یورپ و شمال افریقہ کے ایک طول سیاحتی سفر میں بذریعہ کار وہاں پہنچا، اگرچہ اس وقت الجزائر آزاد ہو چکا تھا، اور اس کو چھ سات سال ہو چکے تھے، لیکن اس وقت تک وہاں فرنچ ہی سرکاری و تجارتی و ثقافتی زبان تھی، خودمختار جزائری حکومت کو عربی زبان کو دوبارہ رائج کرنے میں بڑی سخت دشواریاں پیش آئی تھیں، عرب ممالک اور خاص طور پر مصر سے انہوں نے ہزاروں استاد عربی سکھانے کے لیے بلائے، تب کہیں جا کر اب ان کے یہاں عربی رائج ہو سکی ہے۔ ویسے فرانسیسی قبضہ کے زمانے میں بھی بعض جزائری علماء و زعماء عربی زبان کی ترویج کے لیے سخت کوششیں کرتے رہے، جن میں ایک مشہور شخصیت شیخ محمد البشیر الابراہیمی مرحوم کی تھی، جن سے راقم الحروف کو سن ۱۹۵۴ء میں قاہرہ میں نیاز حاصل ہوا تھا، یہ اس سے دو تین سال قبل شہید لیاقت علی خاں مرحوم کے عہد میں پاکستان میں منعقد ہونے والی پہلی انٹرنیشنل اسلامی کانفرنس میں آ چکے تھے۔ اب یاد پڑتا ہے کہ میں مرحوم سے دو سال قبل مکہ مکرمہ میں بھی مل چکا تھا۔

پیرس کی مسجد کے ساتھ ڈاکٹر صاحب موصوف نے مجھے اس سے ملحق وہ حصہ بھی دکھایا جہاں ایک اسلامک سینٹر قائم تھا اور یہاں ڈاکٹر صاحب کے لیکچرز بھی ہر ہفتے اسلام پر ہوتے تھے، جو غالباً اس زمانے میں صدر جنرل ڈیگال کے حکم سے بند تھے۔ ڈاکٹر صاحب نے میرے دریافت کرنے پر بتایا تھا کہ تو وہ سن ۱۹۴۸ء میں حیدر آباد دکن سے پاکستان آ گئے تھے، لیکن بیوروکریٹس کی بے اعتنائی اور غیر اسلامی روش سے مایوس ہو کر وہ پیرس چلے آئے، جہاں ڈاکٹر صاحب دوران تعلیم رہ چکے تھے اور یہیں سے انہوں نے غالباً ۱۹۳۴ء میں Ph.D. کیا تھا اور سن ۱۹۳۵ء میں اپنا تحقیقی مقالہ شائع بھی کر چکے تھے، جو عہد نبوی کی دستاویزات سے متعلق فرنچ میں تھا۔

Marfat.com

پیرس کی نیشنل لائبریری سے فراغت کے بعد ڈاکٹر صاحب مجھے چھوٹے سے ایک مخصوص ریسٹورنٹ میں لے گئے، جس کی مالکہ ایک بوڑھی فرنچ خاتون تھی، یہاں ڈاکٹر صاحب نے آرڈر دے کر اپنے اور میرے لیے آملیٹ بنوایا، مجھے کچھ ایسا یاد پڑتا ہے کہ اس ریسٹورنٹ میں ڈاکٹر صاحب موصوف کے علیحدہ سے ایک فرائی پین رکھا ہوا تھا، جس میں ڈاکٹر صاحب کا کھانا بوقت ضرورت تیار کیا جاتا تھا۔

اس سادہ لنچ سے فراغت کے بعد اور ریسٹورنٹ سے باہر آنے پر میں نے ڈاکٹر صاحب موصوف کا ایک یادگار فوٹو لینا چاہا، لیکن انہوں نے معذرت کی، میرے وہم وگمان میں بھی نہ تھا کہ ڈاکٹر حمید اللہ صاحب یورپ میں رہتے ہوئے تصویر کو حرام سمجھتے ہوں گے، جب کہ ہمارے ملکوں اور عرب ممالک میں لوگوں نے تصویر کے جائز ہونے کا فتویٰ دے دیا تھا، اور علماء کے فوٹو بکثرت اخبارات میں چھپتے تھے، کون ہے جس نے مولانا حسین احمد مدنی، مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی، مولانا شبیر احمد عثمانی اور مولانا سید سلیمان ندوی وغیرہ کے فوٹو اخبارات میں نہیں دیکھے ہوں گے۔

بہر حال میں نے اپنی طویل ملکی وغیر ملکی اقامتی زندگی میں دیکھا ہے کہ اجتماعی یعنی سوشل امور میں علماء کے مابین بڑی انفرادیت اور انفرادی فتوے پائے جاتے ہیں۔ ہمارے ملکوں یعنی پاکستان و ہندوستان کے علماء لباس اور پردہ کے بارے میں بڑے سخت ہیں، وہ مردوں کے فرنگی لباس، سوٹ کو حرام نہ سہی تو سخت معیوب سمجھتے ہیں اور عورتوں کے لیے حجابی کو حرام کہتے ہیں، (اگر چہ کچھ سیاسی مولانا عورت کی حکومت تک کو جائز سمجھتے اور پاکستان کی حکمراں خاتون بینظیر بھٹو کے ساتھ کام بھی کرتے رہے ہیں) جب کہ نوے فیصد علماء فوٹو کو حرام نہیں سمجھتے ہیں اور آئے دن اخبارات میں اپنے فوٹو چھپواتے ہیں، ان کا کوئی جلسہ، کوئی میٹنگ فوٹو گرافر کے بغیر مکمل نہیں ہوتی، (اس میں استثناء بھی ہے، لیکن بہت کم) جب کہ اس کے بالکل برخلاف ڈاکٹر حمید اللہ صاحب سوٹ پہنتے، ٹائی باندھتے، اور عورتوں سے آزادانہ ملتے تھے اور ملتے ہیں، اور ظاہر ہے کہ ان کی پتلون ٹخنے سے اونچی نہیں ہوتی ہے، لیکن تصویر کے معاملے میں وہ علماء سے زیادہ متشدد ہیں اور اس کو حرام سمجھتے ہیں۔

مجھے نہ ان کا انداز فکر پسند آیا اور نہ اپنے متشدد و سیاسی علماء کا طرز فکر، ان سنن عادیہ (سوشل

Marfat.com

اطوار) میں مجھے مصر اور شام وغیرہ کے اخوان المسلمین کا انداز فکر زیادہ پسند ہے۔ جو عورتوں کے اسلامی حجاب اور عدم اختلاط کے قائل ہیں اور یہ کہ نہ ڈھیلا ڈھالا عربی لباس، یعنی جبہ و عمامہ یا سعودی ''مشلح وعقال'' پہننے سے تقویٰ پیدا ہوتا ہے اور نہ سوٹ پہننے سے تقویٰ رخصت ہو جاتا ہے۔ اصل چیز یہ ہے کہ مسلمان کا لباس تکبر اور فخر ومباہاۃ کے لیے نہ ہو اور ریشم کا نہ ہو۔ کیونکہ ارشاد خداوندی ہے ''ولباس التقوی ذالك خير'' عربوں نے جب دنیا میں اسلام پھیلایا تو اپنا لباس اس کو نہیں پہنایا کیونکہ لباس کے معاملے میں ان کے اور کفار قریش کے لباس میں کوئی فرق نہیں تھا، صرف اتنا تھا کہ اسراف سے بچنے کے لیے ریشم کا لباس مردوں پر حرام تھا، اسی طرح زمین پر گھسٹنے والی قبا جو عربوں میں تکبیر وخیلاء کے اظہار کا ایک معروف طریقہ تھا ممنوع ہے۔

بہر حال ڈاکٹر حمید اللہ صاحب کا ان معاملات میں اپنا انداز فکر ہے جس کو سب جانتے ہیں، جہاں تک عورتوں کا معاملہ ہے تو انہوں نے عہد نبوی کے ایک واقعہ کی بنا پر مخصوص حالات میں عورت کی نماز میں امامت کی اجازت بھی دی ہے، اور اس کو انہوں نے ایک حافظ قرآن صحابیہ ام ورقہ رضی اللہ عنہا کے حوالے سے اپنی کتاب خطبات بہاولپور میں لکھا ہے، اور جب پانچ سال قبل سن ۱۹۹۲ء میں وہ پاکستان آئے تھے، تو اس موقع پر یہاں ان کی ایسی بعض تصریحات پر بہت لے دے بھی ہوئی تھی۔

کچھ بھی ہو ڈاکٹر صاحب موصوف کے مستقیم الفکر، باعمل اور متقی مسلمان ہونے کے بارے میں دو رائیں نہیں ہو سکتی ہیں، ان کی زندگی اسلام اور اسلامی علوم کے لیے وقف رہی ہے اور انہوں نے اس میدان میں وہ جلیل القدر خدمات انجام دی ہیں جو دینی عربی مدارس کے بہت سے علماء انجام نہیں دے سکے ہیں، ساتھ ہی یہ کہ پیرس میں ان کے ہاتھوں پر سیکڑوں لوگ مسلمان ہوئے ہیں اور عربی زبان وہ بہت سے علماء سے بہتر جانتے ہیں اور لکھتے ہیں۔

دوپہر کے کھانے سے فراغت کے بعد ڈاکٹر حمید اللہ صاحب مجھے پیرس بلکہ دنیا کے ایک مشہور میوزیم Louvre (لوور) لے گئے، جو شاہان فرانس کے اس مشہور محل میں انقلاب فرانس کے بعد سے قائم کیا گیا ہے۔ یہاں دروازے پر چھوڑ کر ڈاکٹر صاحب ۳ بجے کے قریب مجھ سے رخصت ہو گئے، کہ اس میوزیم کو دیکھنے کے لیے بڑا وقت درکار تھا، بلکہ پورا دن اس کو پوری

Marfat.com

طرح سے دیکھنے کے لیے چاہیے۔ میں نے تقریباً دو گھنٹے اس میوزیم میں گزارے، اسی میوزیم میں دنیا کا وہ مشہور فن پارہ ہے جو ''مانالیزا'' کے نام سے مشہور ہے، قرون وسطی کے اطالوی مصور لیونارڈو ڈاونچی نے اس نام کی عورت کی نصف تصویر (Half Portriat) میں اس کے چہرے کی ایک عجیب غیر مرئی مسکراہٹ کا جو اثر پیدا کیا ہے، وہ اس کی جان ہے۔ میں نے دیکھا کہ جس ہال میں یہ تصویر ہے، وہاں مختلف ممالک امریکہ، چین، جاپان، انڈونیشیا، مصر، ہندوستان وغیرہ کے بیسیوں آرٹ کے طالب علم بیٹھے یا کھڑے اس تصویر کی نقل اتارنے میں محو تھے اور لوگ یہاں کھڑے ہوئے اس کو دیکھنے میں گم سم ہوتے ہیں، اس میوزیم میں کیمرہ لے جانا منع ہے، جو گیٹ پر رکھوا لیا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ اس میوزیم میں دنیا کی تہذیبوں کے مختلف نادر آثار دیکھے، سب کچھ دیکھنا تو مشکل تھا، بہر حال بابلی، ساسانی، یونانی اور قدیم مصری و رومن تہذیب کے کچھ آثار عجلت میں دیکھ سکا۔

پیرس کا مشہور ایفل ٹاور اوپر چڑھ کر میں نہیں دیکھ سکا، کیونکہ وہاں مرمت کا کچھ کام ہو رہا تھا، یہ فرانس کے دوسرے اور تیسرے سفر میں دوبارہ دیکھا، البتہ ایک دوسرا لینڈ مارک (Landmark) یعنی (Arc de Triumph) (دروازہ فتح) دیکھا، جو دنیا کا عظیم ترین اور خوبصورت ترین کمان کی شکل کا وہ دروازہ ہے جو نپولین نے اپنی فتوحات کی یادگار کے طور پر پیرس کی ایک انتہائی چوڑی اور عظیم الشان سڑک پر بنوایا تھا، اس کے سامنے نئے دہلی کے انگریزوں کے بنائے ہوئے انڈیا گیٹ کی کوئی حیثیت نہیں۔ اس کے ساتھ پیرس کی انتہائی خوبصورت اور وسیع تجارتی سڑک ''شانزے لیزے'' ہے۔ شام کو میں نے یہاں کی سیر کی، اس سڑک پر وسیع و عریض فٹ پاتھ کے کافی ہاؤس بھی ہیں جو پیرس میں ریستورانوں اور ''قہوہ خانوں'' کا خاص انداز ہے، جس میں کافی کی ایک پیالی پی کر آدمی گھنٹوں سڑک پر آنے جانے والوں کا تماشا دیکھتا ہے، میں بھی ایک ایسے کافی ہاؤس میں بیٹھ گیا، اور دیر تک باہر کے مناظر سے لطف اندوز ہوتا رہا، فرانسیسی اثرات کے تحت ایسے قہوہ خانے بیروت، دمشق اور قاہرہ، اسکندریہ اور تونس وغیرہ میں بہت ہیں جن میں لوگ گھنٹوں بیٹھ کر خوش گپیوں میں مصروف رہتے ہیں، اور یہاں ہلکا کھانا بھی ملتا ہے، بلکہ بیروت میں تو لوگ یہی پسند کرتے ہیں کہ رات کا کھانا ایسے فٹ

Marfat.com

پاتھ کے ریستورانوں میں کھایا جائے، اندر بھی بیٹھنے کا انتظام ہوتا ہے، لیکن زیادہ پسندیدہ جگہ باہر کی ہوتی ہے۔ یہ طریقہ میں نے ایتھنز، روم اور میڈرڈ میں بھی رائج دیکھا، جب کہ انگریزوں کے یہاں باہر بیٹھنا اور کھانا معیوب ہے، اب گزشتہ دس سالوں میں یورپین اتحاد کے سبب لندن میں ایسے ریستورانوں یا قہوہ خانے کھل گئے ہوں تو میں کہہ نہیں سکتا۔

ان قہوہ خانوں کے ذکر سے متعلق ایک ضروری بات اہل پاکستان کے لیے یہ ہے کہ پیرس بلکہ پورے جنوبی یورپ یعنی یونان، اٹلی، اسپین میں کہیں اچھی چائے نہیں ملتی، یہ سب لوگ کافی پینے والے یعنی ٹرکش یا فرنچ کافی پینے والے ملک ہیں، لہٰذا میں بھی اپنے سارے سفر یورپ میں چائے سے یا اچھی چائے سے محروم رہا، چائے کا مزا لندن پہنچ کر ہی دوبارہ ملا۔

دوسرے روز صبح گیارہ بجے میری ریل سے لندن کے لیے روانگی تھی، یا یوں کہئے کہ پیرس سے شمال میں شہر ''کیلے'' اور پھر وہاں سے انگلش چینل میں ''فیری'' یا چھوٹے بحری جہاز سے ڈورر اور پھر لندن۔

ڈاکٹر صاحب نے اس روز بھی عنایت کی اور میرے ہوٹل تشریف لے آئے تا کہ مجھ کو ریلوے اسٹیشن سے رخصت کریں۔ اب شمال کی طرف جانے کے لیے Gar de nord یعنی شمالی ریلوے اسٹیشن جانا پڑا۔ فرانسیسی اپنی زبان وثقافت پر بہت ناز کرتے ہیں، وہ ہمیشہ اپنی ہی زبان بولتے ہیں، انگریزی اگر جانتے ہیں تب بھی اس سے کتراتے ہیں، اول تو انگریزی پڑھنے کی زحمت ہی نہیں کرتے، کہ یہ ان کے نزدیک پست درجہ کی زبان ہے، اور اگر کچھ جانتے بھی ہیں تو ایک جملہ بھی بول کر نہیں دیتے۔

یہ میں ۳۷ سال پرانی بات کر رہا ہوں۔ اب یورپین اتحاد کونسل اور یورپین مارکیٹ کے تحت وہاں انگریزی کا کچھ رواج ہو گیا ہو تو دوسری بات ہے، لیکن سن ۱۹۷۲ء تک پیرس بلکہ پورے فرانس کے سفر میں فرانسیسیوں کا انگریزی سے نفرت کا یہی عالم تھا۔

بہر حال ڈاکٹر حمید اللہ صاحب کی موجودگی کی وجہ سے مجھے پیرس کے عظیم الشان شمالی ریلوے اسٹیشن پر ''کیلے'' کو جانے والی ریل اور پلیٹ فارم وغیرہ معلوم کرنے میں سہولت ہوئی اور یہاں ڈاکٹر صاحب نے مجھے الوداع کہا، یہ میری انتہائی خوش بختی تھی کہ ایک مشہور و عظیم عالم و

Marfat.com

پروفیسر نے مجھے رخصت کیا، میں اس وقت سے ڈاکٹر صاحب کے اخلاق عالیہ کا معترف ہوا۔ پیرس میں تین دن تک مجھے ان کی رفاقت حاصل رہی اور میرے لیے انتہائی شرف کی بات ہے کہ ایک ایسے نابغہ روزگار عالم نے مجھے پیرس کے اہم مقامات دکھائے۔ تین سال بعد لندن سے ریاض (سعودی عرب) تک کے فضائی سفر میں دوسری بار پیرس دوروز کے لیے ٹھہرا اور اب بعض وہ مقامات دیکھے جو عام شوقین سیاح دیکھتے ہیں جیسے مونمارتر، قصر ورسائی اور بعض پارک و میوزیم اور قدیم سوربون یونیورسٹی۔ نوٹرڈم (چرچ) وغیرہ۔

میری پیرس کی اس پہلی سیاحت کا یہ اثر تھا کہ جب بعد کو لندن پہنچا، جس کی عظمت کی ہمارے ملکوں میں بڑی دھوم تھی، تو لندن مجھے بڑا بے ہنگم اور بدصورت شہر لگا، پیرس میں جو عظیم الشان سایہ دار سڑکیں (Boulivard)، انتہائی منظم چوراہے، پارک اور محلات اور پھر حسین دریائے سین اور اس کے مختلف پل ہیں، ان سب کے مقابلے میں لندن ایک غیر منظم، چھوٹا اور بد نما شہر لگا۔ پیرس میں کنکورڈ ایک اسکوائر ہے، جہاں سے سولہ بڑی سڑکیں نکلتی ہیں۔ دراصل یہ بادشاہوں کا شہر رہا ہے، جب کہ لندن تاجروں کا شہر تھا اور ہے۔

شام کو "کیلے" پہنچنے پر وہاں رات ایک ہوٹل میں گزاری اور دوسرے روز صبح کو فیری بوٹ (چھوٹا بحری جہاز) ڈوور کے لیے روانہ ہوگیا، وہاں فوراً ہی لندن جانے والی ٹرین مل گئی۔ رات کو نو بجے ٹرین وکٹوریہ اسٹیشن پہنچی اور لندن میں میرا ورود ہوا۔

دمشق سے ایک سال قبل لندن جانے والے اپنے پاکستانی دوست محمد میاں کو میں نے اپنے لندن پہنچنے کی تاریخ کی اطلاع دے دی تھی، وہ اسٹیشن پر موجود تھے، ٹیکسی کر کے ان کی قیام گاہ پہنچے، جو اسٹیشن سے کافی دور تھی۔ یہاں پہلا تجربہ ٹیکسی کا یہ ہوا کہ پانچ پاؤنڈ کا نوٹ نکالنے اور میرا بڑا بھاری چمڑے کا سوٹ کیس ہونے کی وجہ سے ٹیکسی ڈرائیور نے کچھ زیادہ پیسے مانگے، جو دینے پڑے۔ آج کل پانچ پاؤنڈ اسٹرلنگ کے نوٹ کی کوئی قیمت نہیں، لیکن ۳۷ سال قبل پانچ پاؤنڈ میں آرام سے ہفتہ بھر کھانا کھایا جاسکتا تھا، یہ وہ زمانہ تھا جب لندن کے قلب یعنی لیسٹر اسکوائر یا برٹش میوزیم کے پاس ایک پاؤنڈ یا ایک گنی میں (ایک پاؤنڈ اور ایک شلنگ) Bed and Breakfast ہوٹل میں آدمی رہ سکتا تھا، اب ایک وقت کا کھانا پانچ پاؤنڈ میں ہوتا ہے اور کوئی

Marfat.com

کمرہ پندرہ بیس پاؤنڈ سے کم میں کسی ویسے ہوٹل میں نہیں ملتا۔

دوسرے روز محمد میاں کے ساتھ لندن کی کچھ سیر کی، شام کو جب میں لندن کے مشہور سیاحتی مقام ٹرافالگر اسکوائر Trafalgar Square پہنچا، جہاں ایک انتہائی اونچی لاٹ پر نیلسن کا مجسمہ اور خوبصورت بڑا جیٹ فاؤنٹین ہے، تو مجھے اچانک اپنے بچپن کی وہ تصویر یاد آ گئی جو چاکلیٹ کے ایک ٹین کے چھوٹے ڈبے پر ٹرافالگر اسکوائر کی بنی ہوئی تھی اور اس خالی ڈبے کو بہت دنوں تک میں نے اپنے پاس محفوظ رکھا تھا اور اس مقام کو دیکھنے کا اشتیاق مجھے اس وقت پیدا ہوا تھا۔ وہ تصویری منظر اب حقیقی شکل میں میرے سامنے تھا۔ زندگی میں اللہ تعالیٰ نے میری کیسی کیسی آرزوئیں پوری فرمائی ہیں کہ ان کا ذکر میں نہیں کرسکتا۔ ''واللہ ذوالفضل العظیم'' Ph.D. کرنے کی خواہش بھی ایسی ہی ایک ابتدائے جوانی کی خواہش تھی، جو اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل سے پوری کرائی، وہ بھی ہندوستان میں نہیں بلکہ انگلستان کی ایک اعلیٰ یونیورسٹی کیمبرج میں۔ کسی شاعر نے سچ کہا ہے:

مجھ سے پوشیدہ نہیں ہے تری تقدیر کا راز
جو ترے دل میں نہیں وہ تری قسمت میں نہیں

لندن پہنچنے پر مجھے ایک المناک خبر یہ معلوم ہوئی کہ میرے بزرگ اور محترم دوست جگر مراد آبادی کا ۹ ستمبر کو انتقال ہو گیا، مرحوم سے رام پور، لکھنؤ اور پھر مکہ مکرمہ میں ۱۹۵۳ء اور کراچی کی ملاقاتیں تھیں۔

ایک دن سیر میں گزارنے اور ایک مصری دوست عز الدین ابراہیم (حال، کلچر ایڈوائزر سلطان زاید آل نہیان۔ ابوظبی) وغیرہ سے ملنے کے بعد میں دوسرے روز برٹش میوزیم کے قلمی کتابوں کے سیکشن میں، قرآن کی تفسیر پر وہ قلمی کتاب دیکھنے گیا جس کو مجھے اپنے Ph. D. کے لیے ایڈٹ کرنا اور اس کے مصنف کی زندگی پر انگریزی میں تحقیقی مقالہ لکھنا تھا، بحمد اللہ یہ کام بخوبی محمد میاں کی رہنمائی میں ہو گیا کہ ابھی لندن میں گھومنا پھرنا میرے لیے آسان نہیں تھا، اس طرح میں ابتدائی تیاری کر کے لندن پہنچنے کے تیسرے روز، ٹرین سے اپنی منزل کیمبرج کے لیے روانہ ہو گیا اور غالباً ۴۰ منٹ میں کیمبرج پہنچ گیا، یہ غالباً ۱۳ ستمبر ۱۹۶۰ء کی تاریخ تھی اور اب بیرون ملک

Marfat.com

تعلیم کا میرا تیسرا مرحلہ شروع ہوا، یونیورسٹی کا تعلیمی سال تو پہلی اکتوبر سے شروع ہونے والا تھا لیکن داخلے کے بعض مراحل طے کرنے کے لیے میں دو ہفتے قبل وہاں پہنچ گیا تھا۔ کیمبرج کے نظام تعلیم کے مطابق جس کالج میں مجھے داخلہ ملا تھا، اس کا نام فٹز ولیم ہاؤس (Fitzwilliam House) تھا۔ ہر کالج میں نیا داخلہ لینے والوں کا جو گروپ فوٹو کھینچا جاتا ہے اور جس میں انڈر گریجوایٹ اور پوسٹ گریجوایٹ دونوں طلبہ ہوتے ہیں، اس گروپ فوٹو میں سندھ کے سابق گورنر کمال الدین اظفر کے چھوٹے بنائی جاوید اظفر بھی کھڑے ہیں، جو وہاں بی۔اے آنرز کے طالب علم تھے، بعد کو ان سے دوستی بھی ہو گئی تھی، افسوس کہ جب میں مستقل طور پر پاکستان واپس آیا تو وہ اس دنیائے فانی سے رحلت کر چکے تھے۔

دوسرے ہی روز پروفیسر آربری سے Pembroke College میں ان کے آفس میں ملاقات ہوئی اور میرے دل پر اس صوفی انگریز پروفیسر کے اخلاق کا گہرا نقش قائم ہوا، کیونکہ میں کالج کے احاطہ میں حیران ہو کر اوپر کی منزل میں جانے کا چھوٹا زینہ تلاش کر رہا تھا، پروفیسر نے اوپر کھڑکی سے مجھے دیکھ لیا تھا، کہ میں نے ٹیلی فون سے ملاقات کا وقت لے رکھا تھا، موصوف اوپر سے نیچے اتر کر آئے اور مجھ سے خود کہا ?Mr. Ali میں نے کہا Yes, Sir اور پھر ان کے ساتھ چلا گیا، چونکہ میں اپنے مضمون کی اچھی تیاری کر کے گیا تھا، اس لیے اس پہلی ملاقات کا ان پر بہت اچھا اثر پڑا، وہ خود بھی میرے مضمون پر کچھ تیاری کر چکے تھے اور انہوں نے اس پہلی ملاقات ہی مجھے ڈبلن (آئرلینڈ) کی چسٹر بیٹی Chestrbeatty لائبریری میں مصنف کی ایک کتاب کے ایک قلمی نسخہ کا پتا دیا، جو مجھے پہلے معلوم نہیں تھا۔

کیمبرج کی زندگی ایک علیحدہ مضمون کی متقاضی ہے، لیکن چونکہ میں اپنے موضوع پر پہلے عربی میں کچھ کام کر چکا تھا، اس لیے مجھے ایک سال کا Exemption مل گیا اور اس طرح Ph.D. میں نے دو سال ہی میں کر لیا۔ آں جہانی پروفیسر آربری Arberry مجھ سے بڑی محبت کرتے تھے، میری کمزور مالی حالت کے سبب انہوں نے ایک سال کے لیے مجھے مڈل ایسٹ سینٹر میں ریسرچ اسسٹنٹ کے طور پر رکھ لیا، جس میں میرے ساتھ اردن کے شاہ حسین کے نوجوان چچا پرنس رعد بن زید بن الملک الفیصل بھی کام کرتے تھے۔ (یہ اب شاہ حسین کے دفتر

Marfat.com

میں بڑے عہدے پر ہیں) ان کے والد لندن میں رہتے تھے، ساتھ ہی ایک سال میں نے کیمبرج میں بی۔اے آنرز پارٹ I اور پارٹ II کے آٹھ طلبہ کو فارسی بھی پڑھائی، کیونکہ فارسی کا لیکچرار Peter Avery اس سال ۱۹۶۱ء۔۱۹۶۲ء چھٹی لے کر امریکہ گیا ہوا تھا۔

یورپ کے اس تعلیمی سفر کے بعد تدریسی سفروں میں میں نے چوبیس سال گزارے اور یورپ وامریکہ وشرق اقصیٰ کی سیاحت بھی متعدد بار کی۔ جس تعلیمی غریب الوطنی کا آغاز سن ۱۹۵۰ء میں مکہ مکرمہ کے سفر سے ہوا تھا، اس زندگی اور تدریسی وسیاحتی زندگی کا اختتام اگست ۱۹۸۷ء میں ہوا، جب میں ریاض کی امام محمد اسلامک یونیورسٹی سے استعفاء دے کر وطن واپس آگئے، اس طرح میری یہ سفری زندگی ۳۷ سال پر محیط ہے اور اس کا ذکر کیا جائے تو ''سفینہ چاہیے اس بحر بیکراں کے لیے۔''

Marfat.com

ڈاکٹر محمد حمید اللہ۔ نقوش و تاثرات

ڈاکٹر محمد حمید اللہ صاحب عالم اسلام کی ایک منفرد شخصیت ہیں، جو عظیم علمی خدمات موصوف نے انجام دی ہیں وہ کسی اور نے نہیں دیں، یوں علماء اور محققین و مصنفین تو عالم اسلام میں بہت ہیں لیکن جو متنوع علمی و تحقیقی تصنیفات ڈاکٹر محمد حمید اللہ صاحب زید مجدہ کے قلم سے نکلی ہیں وہ کسی دوسرے عالم و محقق کے یہاں نہیں ملتیں۔ وہ بیک وقت قرآن، حدیث، فقہ، تاریخ، سیرت، ادب، تقابل ادیان اور انٹرنیشنل لاء وغیرہ کے موضوعات پر متعدد کتابوں کے مصنف ہیں، اس امتیازی شان کے علاوہ موصوف کا دوسرا امتیاز یہ ہے کہ انہوں نے بیک وقت انگریزی، فرنچ، جرمن، اردو، عربی اور پانچ زبانوں میں لکھا ہے۔ غالباً ترکی زبان میں بھی ان کی ایک آدھ تصنیف ہے لیکن یہ میں وثوق سے نہیں کہہ سکتا۔ ایک فرنچ خاتون کو فارسی کی ایک علمی کتاب پڑھاتے ہوئے انہیں کافی عرصہ پہلے میں نے خود دیکھا تھا۔ یقیناً وہ ہفت زبان ہیں، یا اس سے بھی زیادہ زبانیں جانتے اور بولتے ہیں۔ ان کا تیسرا امتیاز یہ ہے کہ میرے علم کے مطابق وہ پہلے مسلمان ہیں جنہوں نے قرآن کریم کا ترجمہ فرانسیسی زبان میں کیا ہے۔ ان کی چوتھی امتیازی شان یہ ہے کہ ان کے ہاتھ پر بیسیوں یا سیکڑوں لوگوں نے پیرس میں اسلام قبول کیا ہے۔

اس عظیم عالمانہ و محققانہ شان کے ساتھ اور نصف صدی سے یورپ میں رہنے کے باوجود سختی سے اسلامی احکام پر کاربند ہیں، بعض لوگوں کے نزدیک غلو کی حد تک۔ پاکستان سے زیادہ ان کے معتقدین و پرستار عالم عرب اور ترکی و یورپ میں ہیں۔

میری اس تحریر کا مقصد ڈاکٹر صاحب موصوف کے کمالات علمی کا ذکر نہیں کہ ''سفینہ چاہیے اس بحر بیکراں کے لیے'' یہ دوسرے لوگ مجھ سے بہتر طریقے پر انجام دے سکتے ہیں اور مجلہ عثمانیہ کے اس شمارے میں دیں گے۔ میں تو محترم مظہر ممتاز قریشی کی تحریک پر یہاں اپنے تاثرات قلم بند کرنا چاہتا ہوں۔

Marfat.com

ڈاکٹر محمد حمید اللہ صاحب کی بعض تحریروں کے ذریعہ موصوف سے میرا غائبانہ تعارف تقسیم ہند سے پہلے ہو چکا تھا لیکن مجھے یاد ہے کہ میں نے ان کی جو پہلی کتاب اپنے اولین سفر حجاز اگست ۱۹۵۰ء سے قبل خریدی اور ہمیشہ اپنے ساتھ رکھی اور آج بھی وہ ۱۹۴۸ء سے میرے پاس محفوظ ہے وہ ہے ''عہد نبوی ﷺ کے میدان جنگ'' جو سب سے پہلے ۱۹۳۹ء میں فرانسیسی میں چھپی تھی، اس کا اردو ترجمہ خود ڈاکٹر صاحب نے کیا تھا جو ۱۹۴۰ء میں حیدر آباد دکن سے شائع ہوا تھا۔ مجھے یہ کتاب اس لیے پسند آئی تھی کہ ڈاکٹر صاحب موصوف نے یہ کتاب دوسری تصنیفات کی مدد سے نہیں بلکہ اپنے سفر حجاز کے دوران غزوات الرسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مواقع ومیادین، بدر، احد، حنین، حدیبیہ، تبوک وغیرہ کی زیارت کے بعد لکھی تھی اور اس میں ان مقامات کے فوٹو بھی شامل تھے۔

ڈاکٹر صاحب سے پہلے مصر کے مشہور مصنف اور سیاسی لیڈر محمد حسین ہیکل نے بھی اپنی عربی کتاب ''فی منزل الوحی'' میں بعض غزوات کے میادین کے فوٹو دیئے ہیں لیکن وہ اتنے جامع نہیں اور نہ ان میں وہ عسکری تفصیلات ہیں جو ڈاکٹر حمید اللہ صاحب کی کتاب میں پائی جاتی ہیں۔

ڈاکٹر صاحب موصوف کی دوسری کتاب جو میں نے شوق سے پڑھی اور اس نے مجھے بہت متاثر کیا، وہ ان کی عربی تصنیف ''الوثائق السیاسیة فی العهد النبوی'' ہے، جو میں نے اپنے دمشق (شام) کے طویل تعلیمی سفر (چار سال) کے دوران پڑھی، اور جس سے میں ان کا گرویدہ ہو گیا، اس کتاب کے متعدد ایڈیشن مصر و بیروت سے شائع ہو چکے ہیں۔ میری ذاتی لائبریری میں بیروت کا مطبوعہ چوتھا ایڈیشن ہے۔ جس کا نام مصنف نے نئے اضافوں کے بعد ''الوثائق السیاسیة فی العهد النبوی والخلافة الراشدة'' رکھا ہے۔ (یعنی عہد نبوی و عہد خلافت راشدہ کی سیاسی دستاویزات) عالم عرب میں ڈاکٹر حمید اللہ صاحب کی یہ کتاب انتہائی مقبول ہے اور علمی حلقوں میں حوالے (Reference) کی کتاب مانی جاتی ہے۔ یوں اس موضوع پر کتابیں تو ڈاکٹر صاحب موصوف سے پہلے بھی ہندوستان اور عالم عرب میں پرانے اور موجودہ زمانے میں متعدد لوگوں نے لکھی ہیں جو جامعیت اور حسن ترتیب ان کی کتاب (اور خاص طور پر اس ایڈیشن) میں ہے، وہ دوسری کتابوں میں نہیں۔

ڈاکٹر صاحب کی شخصیت سے واقف لوگ جانتے ہیں کہ وہ عثمانیہ یونیورسٹی، حیدر آباد دکن

Marfat.com

میں بنیادی طور پر بین الاقوامی قانون (International Law) کے طالب علم رہے ہیں، اوراس موضوع پر انہوں نے پیرس کی مشہور زمانہ یونیورسٹی سوربون سے ڈاکٹریٹ بھی کیا تھا اوران کی جمع کردہ یہ نبوی دستاویزات فرنچ ترجمہ کے ساتھ دو جلدوں میں پیرس سے ۱۹۳۵ء میں چھپی تھی۔ اسلام کے بین الاقوامی قانون اور خاص طور پر امام محمد بن حسن الشیبانی شاگرد امام ابوحنیفہؒ کی کتاب ''السیر الکبیر'' نے ان کو عربی علوم کا متخصص (Expert) بنادیا۔ امام محمد الشیبانی امام اعظم کے تمام شاگردوں میں سے سب سے نمایاں ہیں۔ اس حیثیت سے کہ انہوں ہی نے امام ابوحنیفہؒ کے علم کو اپنی مختلف تصنیفات کے ذریعے پھیلایا، دوسری صدی ہجری میں سب سے زیادہ فقہی تصنیفات امام محمدؒ ہی کی ہیں، جیسے کتاب المبسوط، الجامع الکبیر، الزیادات اور الجامع الصغیر وغیرہ۔ قاضی ابو یوسف اور وہ صاحبین کہلاتے ہیں، یعنی امام ابوحنیفہؒ کے متعدد ممتاز شاگردوں میں یہ دونوں ان کے رفیق تھے، خلیفہ ہارون الرشید ان کا بہت احترام کرتا تھا اوران کی صحبت کو بہت پسند کرتا تھا۔ ہارون الرشید کے ساتھ سفر کے دوران شہر رے (موجودہ شاہ عبدالعظیم، قریب تہران) میں سن ۱۸۹ھ میں ان کا انتقال ہوا۔ امام شافعیؒ نے مدینہ منورہ میں امام مالکؒ کی شاگردی کے بعد بغداد میں امام محمدؒ کی شاگردی کی اور زیادہ تر فقہ کا علم ان ہی سے حاصل کیا، امام صاحب نے ان کی مالی مدد بھی بہت کچھ کی۔

ان کی کتاب ''السیر الکبیر'' بین الاقوامی کی دنیا میں پہلی کتاب ہے یہ پہلی بار سن ۱۳۳۵ھ میں حیدرآباد دکن سے چار جلدوں سے چھپی تھی، پھر دوسری بار پانچ جلدوں میں ڈاکٹر صلاح الدین المنجد کی تحقیق سے عرب لیگ کی طرف سے ۱۹۵۷ء میں چھپی، میرے پاس یہی نسخہ ہے اور حقیقت یہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب کی تحریروں کی بدولت ہی اس کو پڑھنے کا شوق مجھے ہوا۔

میں نے عرض کیا کہ اس کتاب کے مطالعہ نے ڈاکٹر حمید اللہ صاحب کو عربی علوم کا متخصص یا ماہر بنادیا، پھر تو انہوں نے ''الوثائق السیاسیة'' کے علاوہ کتنی ہی قدیم عربی کتابیں یا اصلی مآخذ اپنی تحقیق سے زندہ کیے، جن میں خاص طور پر قابل ذکر تیسری صدی ہجری کے مشہور مورخ البلاذری کی کتاب انساب الاشراف کی پہلی جلد ہے، جو سیرت نبوی ﷺ پر ایک بہت اہم کتاب ہے، اس کتاب کی چوتھی اور پانچویں جلد (کچھ حصہ) ایک یہودی مستشرق گوئٹین، القدس (یروشلم) سے

Marfat.com

شائع کر چکا تھا، ایک دوسری انتہائی بنیادی کتاب سیرت نبوی ﷺ پر ان اسحاق کی کتاب ''المبتداء والمبعث والمغازی'' ہے۔ڈاکٹر حمید اللہ صاحب نے مراکش کے قدیم شہر فاس کی جامع قرویین کے کتاب خانے میں اس کا ایک حصہ تلاش کر کے شائع کیا، یہ بہت بڑی خدمت ہے، جس کو عالم عرب نے سراہا، اب اس کا اردو ترجمہ ہو چکا ہے اور لاہور سے شائع ہوا ہے۔

انہوں نے ایک اور اہم کتاب یعنی علم نباتات پر تیسری صدی ہجری کے ایک مشہور مورخ و ادیب ابوحنیفہ الدینوری کی نایاب کتاب ''النباتات'' کی بھی ایک جلد ایڈٹ کی۔اس کی تیسری اور پانچویں جلد کا حصہ ایک جرمن مستشرق برنہارڈ لیوین ایڈٹ کر چکا تھا، ڈاکٹر صاحب کی تحقیق کردہ یہ دوسری جلد ۱۹۹۳ء میں کراچی کے ''مدینة الحکمة'' نے شائع کی۔ یہ نباتات کے علاوہ ادب کی ایک اہم کتاب ہے کہ اس میں عربی کے سیکڑوں اشعار پائے جاتے ہیں۔

انگریزی اور اردو میں سیرت نبوی ﷺ پر ڈاکٹر حمید اللہ صاحب کی جو مختلف کتابیں ہیں ان سے برصغیر کے لوگ واقف ہیں، اس کے علاوہ موصوف نے دنیا کے اہم علمی مجلات میں سیکڑوں تحقیقی مقالات لکھے ہیں، جن کو اگر جمع کر کے شائع کیا جائے تو کئی جلدیں تیار ہو جائیں گی۔

ڈاکٹر صاحب موصوف سے ملنے کا اشتیاق مجھے سن ۱۹۵۹ء میں دمشق میں ہوا، جہاں میں نے ان کی مذکورہ بالا کتاب ''الوثائق السیاسیة'' مطالعہ کی تھی اور دمشق یونیورسٹی میں میرے ایک لبنانی الاصل پروفیسر ڈاکٹر صبحی الصالح نے جو مصر کی جامعہ الازہر کے فاضل ہونے کے علاوہ پیرس کی مشہور زمانہ یونیورسٹی سوربون کے .Ph. D تھے، انہوں نے دوران تعلیم ڈاکٹر صاحب کو پیرس نیشنل لائبریری میں کام کرتے دیکھا تھا۔وہ کہتے تھے کہ ''دکتور حمید اللہ'' اپنی کرسی پر پانچ گھنٹے تک ایسے جمے بیٹھے رہتے ہیں جیسے کسی نے کرسی میں کیل گاڑ دی ہو۔

بہر حال دمشق یونیورسٹی میں اپنی تعلیم ختم کرنے اور سن ۱۹۶۰ء میں شام و مصر کی ایک عظیم دینی و فقہی شخصیت سلطان العلماء العز بن عبدالسلام پر اپنی پہلی کتاب شائع کرنے کے بعد ڈاکٹریٹ کی تعلیم کے لیے ستمبر ۱۹۶۰ء میں دمشق سے براہ استنبول (ترکی) بذریعہ ریل کیمبرج کے لیے روانہ ہوا تو راہ میں یونان، یوگوسلاویہ اور سوئزرلینڈ کے بعد میرے پروگرام کے مطابق لندن

Marfat.com

سے قبل چوتھا اسٹیشن پیرس تھا، یہاں مجھے دو چیزیں دیکھنا تھیں، ایک پیرس شہر اور دوسرے ڈاکٹر حمید اللہ صاحب کی زیارت۔

بلگریڈ (بلغراد) سے ٹرین کے کمپارٹمنٹ میں پناما (سینٹرل امریکا) کے ایک سیاہ فام نوجوان سے میرا تعارف ہوگیا، وہ پہلے بھی پیرس جا چکا تھا، پیرس کے عظیم الشان ریلوے اسٹیشن Gare De Sud (ساؤتھ ریلوے اسٹیشن) پر اترنے کے بعد اسی پناما کے رفیق کی رہنمائی میں فرانسیسی پبلک ٹیلی فون کے ذریعہ جس کو ایک مخصوص سکہ کے ذریعے ہی استعمال کیا جا سکتا تھا، پاکستانی سفارت خانہ سے رابطہ قائم کیا تا کہ ڈاکٹر صاحب کا پتا معلوم کرسکوں، افسوس کہ اس سلسلے میں ان سے کوئی رہنمائی نہیں مل سکی، البتہ انہوں نے کسی صاحب کا پتہ بتایا کہ وہ آپ کو اس بابت کچھ بتا سکیں گے، پناما کے رفیق نے میری بڑی مدد کی، اب ان پاکستانی صاحب سے ٹیلی فون پر رابطہ ہوا تو انہوں نے بتایا کہ ڈاکٹر صاحب کے مکان پر کوئی ٹیلی فون نہیں اور وہ پیرس کی فلاں سڑک پر فلاں بلڈنگ میں چوتھے فلور پر رہتے ہیں۔

بہر حال پتے کی یہ مہم سر کر کے میں اسی پناما کے نوجوان کے ساتھ کسی ہوٹل کی تلاش میں روانہ ہوا، اور پیرس کے قدیمی علمی محلے کارتے لاتاں Quartier Latin میں ایک عام چھوٹے ہوٹل میں قیام کیا، یہ دوپہر کا وقت تھا کھانے کے بعد ڈاکٹر صاحب کے گھر کے پتے 4.Rue De Tournon کے لیے روانہ ہوگیا، پرانی مضبوط بلڈنگ کی چوتھی منزل پر جب موصوف کے فلیٹ پر پہنچا تو میرے ذہن میں ان کی شخصیت کا جو تصور تھا وہ یہ تھا کہ وہ ایک پُر جسامت اور بارعب انسان ہوں گے، اب دیکھا کہ سامنے ایک کافی منحنی شخص جناح کیپ اور سوٹ میں ملبوس کھڑا ہے، میری زندگی کی یہ ایک دلچسپ حیرانی تھی۔ ڈاکٹر صاحب مجھے اندر لے گئے وہاں ایک تقریباً چالیس سالہ فرنچ خاتون ڈاکٹر صاحب سے فارسی کی کوئی کتاب پڑھ رہی تھیں، چھوٹے سے کمرے میں چاروں طرف الماریوں میں کتابیں تھیں۔ فرنچ خاتون کی تعلیم سے ڈاکٹر صاحب جلد ہی فارغ ہوگئے، تفصیلی تعارف و گفتگو ہوئی، اس کے بعد ڈاکٹر صاحب واپسی کے لیے ہوٹل تک میرے ساتھ آئے، جو بہت زیادہ دور نہیں تھا تا کہ میرا ہوٹل دیکھ لیں، جو انگلستان کے Bed and Breakfast ہوٹلوں کی طرح تھا اور ایک بوڑھی عورت

Marfat.com

اسے چلاتی تھی کرایہ کم اور ایک طالب علم کے لیے مناسب تھا۔ بلگراڈ سے ریل کے شبانہ روز طویل سفر کے بعد میں آرام سے سویا، صبح کو فرنچ ناشتے (پاؤ بھر گرم دودھ ایک چائے دانی میں دو کپ کافی اور فرنچ بریڈ، کروساں اور جام) کے بعد ہی تقریباً ساڑھے آٹھ، نو بجے ڈاکٹر صاحب میرے کمرے میں تشریف لے آئے، اور ان کے ساتھ میں پیرس کی علمی و سیاحتی گشت کے لیے روانہ ہو گیا۔

آپ نے دیکھا کہ پیرس میں میرا پہلا کام ڈاکٹر صاحب کی زیارت تھی، جو انتہائی خوشگوار اور ڈاکٹر صاحب کی متواضع شخصیت کے سبب قدرے حیران کن تھی۔ مجھے یہ شرف حاصل ہے کہ پیرس کی پہلی مختصر سیر مجھے اس عظیم علمی شخصیت نے کرائی۔ اس کے بعد دوبار میں پھر پیرس گیا لیکن اس حسین و عظیم شہر کی میری وہ پہلی سیر بڑی خصوصیت کی حامل تھی، ایک تو یہ کہ میں نے اس میں ڈاکٹر صاحب سے ملاقات کی، تعلق پیدا کیا، اور دوسری یہ کہ میں ان کے توسط سے پیرس کی مشہور لائبریری Bibleotheque National (نیشنل لائبریری) میں جاسکا، اس لائبریری کے اس خاص سیکشن و مطالعہ روم میں جہاں مخطوطات (قلمی کتابیں دیکھی جاسکتی ہیں) صرف پروفیسر ہی جاسکتے ہیں، ڈاکٹر صاحب نے اپنی مہربانی سے فرانسیسی زبان کا فارم بھرتے ہوئے مجھے پروفیسر لکھا اور اپنی طرف سے سفارش بھی لکھ دی کہ فارم میں یہ ضروری تھا، اس طرح میں Would-Be Professor (آئندہ پروفیسر) ہو گیا اور خدا کی شان کہ تین سال بعد کیمبرج سے Ph. D. کرتے ہی مجھے ریاض کی کنگ سعود یونیورسٹی میں ملازمت بھی مل گئی اور ڈاکٹر صاحب موصوف کے قلم سے جو بات نکلی تھی وہ مبارک ثابت ہوئی۔

پیرس میں کسی اسکالر کے لیے سب سے اہم بات یہی ہے کہ اس کو وہاں کی اس نیشنل لائبریری کی زیارت نصیب ہو، سو وہ انہوں نے مجھے کرادی، اس وقت کوئی خاص عربی قلمی کتاب میں مختصراً دیکھی تھی، اب یاد نہیں، بہر حال ڈاکٹر حمید اللہ صاحب تو اس لائبریری میں برسوں مطالعہ و تحقیق کرتے رہے، وہ وہاں ایک بڑی جانی پہچانی شخصیت تھے۔

اس کے بعد ڈاکٹر صاحب موصوف نے مجھے پیرس کی مشہور مسجد دکھائی، محلے کا نام اب یاد نہیں لیکن اندر سے مسجد اندلس کا اور مغربی (مراکش طرز کی تھی اور اس میں دیواروں اور چوبی منبر

Marfat.com

وغیرہ پر نقش ونگار اسی طرز کے تھے، مسجد کی عمارت میں داخل ہوتے ہی اصل مسجد سے قبل ایک چھوٹے سے کمرہ داخلہ (انٹرنس روم) میں کتابوں کا ایک اسٹال تھا، اور کاؤنٹر پر ایک الجزائری لڑکی کھڑی تھی، میں نے حلب چھوڑنے کے بعد استنبول یونیورسٹی میں ایک عراقی طالب علم سے عربی زبان میں گفتگو کے بعد تقریباً دس روز سے عربی نہیں بولی تھی، میری عربی زبان کی رگ پھڑکی اور میں نے اس خاتون سے کتابوں کے بارے میں کچھ پوچھا، لیکن افسوس کہ وہ فصیح عربی زبان سے نابلد تھی، بلکہ غالباً عربی ہی سے نابلد تھی، اس وقت الجزائر پر فرانس کی حکومت تھی، اور عربی زبان مین تعلیم وہاں ممنوع تھی، ڈاکٹر حمید اللہ صاحب نے فرانسیسی زبان میں اس کو میری بات سمجھائی۔ پیرس کی یہ وہی مسجد ہے جس کے بارے میں علامہ اقبالؒ نے ضرب کلیم میں ایک مختصر قطعہ (پیرس کی مسجد) میں کہا ہے:

حرم نہیں ہے ، فرنگی کرشمہ بازوں نے
تن حرم میں چھپادی ہے روح بت خانہ

افسوس کہ اس وقت میں نے ڈاکٹر حمید اللہ صاحب سے اس شعر کا ذکر کر کے اس کی توضیح نہیں معلوم کی لیکن آج تک مجھے معلوم نہ ہوسکا کہ اقبال نے پیرس کی اس مرکزی اور اس وقت تنہا مسجد پر اس قدر شدید طنز کیوں کیا تھا؟ پیرس سے انگلستان پہنچنے کے بعد میں نے لکھنؤ اپنے بزرگ اور علمی مرشد اور اقبال پر عربی زبان میں ایک کتاب کے مصنف مولانا سید ابو الحسن علی ندوی صاحب سے استفسار بھی کیا تھا وہ بھی اس طنز کی کوئی توجیہ نہ کر سکے تھے۔ اس وقت تک مولانا مدظلہ نے یورپ کا سفر نہیں کیا تھا، اس کے بعد سن ۱۹۶۳ء سے تو مولانا متعدد بار یورپ گئے اور آکسفورڈ کے اسلامک سینٹر کے چیئر مین کی حیثیت سے تو اب دس پندرہ سال سے ہر سال دو سال بعد ادھر جاتے ہیں۔

معلوم نہیں کہ اقبال اس کی اندرونی زیب وزینت سے خوش نہیں ہوئے، یا یہ کہ اس کی زمین حکومت فرانس نے دی تھی اور وہاں ان کے زمانے میں کچھ پابندیاں تھیں یا یہ کہ مسجد کا کوئی گنبد یا مینارہ نہیں تھا، اور وہ باہر سے کوئی مسجد نہیں لگتی تھی، بہر حال پتا نہیں کہ کس وجہ سے ڈاکٹر اقبال نے اس مسجد پر شدید طنز کیا۔ اب کوئی ماہر اقبالیات اس شعر کی توضیح کر سکے تو بہت اچھا ہو۔

Marfat.com

بہر حال اس مسجد کے ایک ملحقہ حصہ اندر ہی بیٹھتے ہیں۔

ہے ڈاکٹر صاحب ہر اتوار کو قرآن اور اسلام پر اس مجھے ٹرین سے کیلئے (Kalaise) اور وہاں سے لندن
برسوں دیتے رہے اور یہیں ان کے ہاتھوں بیسیوں فرا کیمبرج پہنچنا ضروری تھا تا کہ وہاں اپنے کالج
ایک خیر و برکت کا ذریعہ ہی تھی، اگر چہ ڈیگال کے عہد حکومت مکمل کر سکوں، لندن بھی دو تین دن ٹھہرنا تھا
مخصوص چھوٹے سے ایک ریستوران میں مجھے لنچ کھلایا، جہاں میں ایک قلمی کتاب دیکھ لوں۔ اس
خاتون نے ہم لوگوں کو آملیٹ بنا کر دیا، غالباً اس کے پاس ڈاکٹر صاری ہو گئی تھی کہ ڈاکٹر حمید اللہ
فرائنگ پین بھی تھا، اب اچھی طرح یاد نہیں۔

کھانے سے فراغت کے بعد میں ڈاکٹر صاحب کی ایک تصویر باہر لینا چاہا، رہوٹل تشریف لے
نے اس سے عذر کر دیا، وہ تصویر کے بارے میں بڑے سخت تھے اور اب بھی ہیں، نواز شریف نے دیکھا کہ
عہد حکومت میں سن ۱۹۹۲ء میں جب کراچی آئے تو بعض محفلوں میں دیکھا کہ وہ فوٹو گرافر کو ابتدا شروع
سے منع کرتے رہے۔ اگر چہ اب صرف عرب علماء ہی نہیں بلکہ برصغیر کے نوے فیصد علماء تصویر کو
جائز سمجھتے ہیں اور آئے دن ان کی تصاویر اخبارات میں چھپتی رہتی ہیں اور ان کی ہر میٹنگ و محفل
میں فوٹو گرافروں کا ہونا ضروری ہے۔

اسی طرح ڈاکٹر حمید اللہ صاحب ذبیحہ کے بارے میں سخت معلوم ہوئے، میری اس سلسلہ میں ان سے کوئی بات تو نہ ہوئی، لیکن تجربہ سے ثابت ہوا کہ وہ عیسائیوں کے ذبیحہ کو جائز نہیں سمجھتے ہیں، جب کہ ہمارے ملک کے علماء مردوں کے ٹخنے سے اونچے لباس اور عورتوں کے پردے کے بارے میں بڑے متشدد ہیں، اب ڈاکٹر صاحب پیرس میں رہ کر ٹخنے سے اونچی پتلون تو نہیں پہن سکتے تھے، بلکہ ٹائی بھی باندھتے ہیں، جس کو ہمارے علماء بہت ہی برا سمجھتے ہیں، لیکن اسلامی احکام میں زمان و مکان کے اعتبار سے بڑی لچک ہے اور ڈاکٹر صاحب اس پر سوائے فوٹو کے کاربند تھے اور صدق دل و خلوص نیت سے۔

راقم الحروف نے پیرس میں ہوٹلوں میں مچھلی یا انڈا ہی کھایا اور اس طرح تین چار ماہ تک انگلستان میں بھی، لیکن پھر وہیں عربی مآخذ میں اس موضوع پر کافی کچھ پڑھنے کے بعد اور قدیم و جدید علمائے عرب کے دلائل سے مطمئن ہونے کے بعد میں نے مرغی کو چھوڑ کر دنبے اور بیل

Marfat.com

آئے۔ایک بات یہ بھی عرض کردوں کہ فرانسیسی زبان میں اسٹیشن Station کا لفظ بس اسٹاپ یا میٹرو (انڈرگراؤنڈ ٹرین) اسٹاپ کے لیے استعمال ہوتا ہے، صرف اس کا تلفظ انگریزی سے مختلف ہے "استاسیون" ہے۔ جب کہ ریلوے اسٹیشن کو گار (Gare) کہتے ہیں۔

کیمبرج پہنچنے کے بعد کچھ عرصہ میری ڈاکٹر صاحب سے مراسلت رہی، وہ عام طور پر پوسٹ کارڈ لکھتے تھے، سفید رنگ کا اور خط بہت باریک ہوتا تھا، کیمبرج سے میں نے مولانا علی میاں صاحب مدظلہ (مولانا سید ابوالحسن علی ندوی) کو جو خط لکھا تھا، اس میں، میں نے ڈاکٹر صاحب کی شخصیت کے بارے میں علامہ اقبال کا یہ شعر لکھا تھا:

ہوا ہے گو تند و تیز لیکن چراغ اپنا جلا رہا ہے
وہ مرد درویش جس کو حق نے دیے ہیں انداز خسروانہ

میں اس بات سے بہت متاثر ہوا کہ ایسا عظیم محقق و مصنف اور ہفت زبان پروفیسر ایسی سادہ زندگی گزارتا ہے۔ڈاکٹر صاحب کی زندگی واقعی "العلم من المهد الى اللحد" (علم کے طالب گہوارے سے قبر تک رہنا چاہیے) کی تصویر تھی اور ہے۔

پھر جب کیمبرج سے ڈاکٹریٹ کے بعد ریاض کی کنگ سعودی یونیورسٹی میں ۱۹۶۳ء میں لیکچرار ہو کر آیا تو میں یونیورسٹی کے چانسلر اور نوجوان وزیر تعلیم شیخ حسن آل شیخ سے ایک ملاقات میں ڈاکٹر صاحب کو اس نئی قائم شدہ یونیورسٹی میں بلانے کے لیے کہا، جس پر وزیر موصوف نے کہا وہ ہماری یونیورسٹی میں پڑھانے کے لیے آ جائیں جو تنخواہ کہیں گے، دی جائے گی۔ میں نے ڈاکٹر صاحب کو پیرس لکھا، اس سعودی پیشکش کا جواب ڈاکٹر صاحب کی طرف سے بہت درویشانہ، خوددارانہ اور انتہائی مفید تھا، جس پر افسوس کہ سعودی وزیر نے لبیک نہیں کہا۔ڈاکٹر صاحب نے لکھا تھا کہ آج کل سیاہ فام افریقہ کے مختلف ملک آزاد ہو رہے ہیں (یادر ہے کہ یہ چھٹی دہائی کے ابتدائی برسوں کی بات ہے) ان ملکوں میں کافی مسلمان ہیں، بعض ملک اسلامی ہی ہیں، میں چاہتا ہوں کہ ان ملکوں کے باشندوں کی رہنمائی کے لیے فرانسیسی زبان میں ایک ماہوار علمی رسالہ نکالا جائے گا تا کہ ان آزاد ہونے والے اور فرنچ تسلط و تعلیم کے سبب اسلام سے بے خبر ممالک کی ذہنی و علمی تربیت ہو سکے، سعودی حکومت اگر اس منصوبہ کو فائنانس کرے تو میں ایسے میگزین کی ادارت و ذمہ

Marfat.com

داری سنبھالنے کے لیے اپنی خدمات پیش کرتا ہوں مجھے اپنے لیے تنخواہ ملازمت کی ایسی طلب نہیں، لیکن دس سال تک سعودی یونیورسٹیوں میں پڑھانے کے بعد میرا یہ خیال پختہ ہوا کہ وہ ایسے مفید وآزاد منصوبوں کو بروئے کار لانے کے لیے پیش قدمی نہیں کرتے ۔ وہ ایسے مدرسوں، اداروں اور اشخاص کی مدد کرتے ہیں جو ان کی تعریف کے گن گائیں، یا پھر خود ایسے کالج اور اسلامک یونیورسٹیاں اور اسلامک سینٹر افریقہ، امریکہ وغیرہ میں قائم کرتے ہیں، جہاں ان کے سلفی افکار اور محدود نقطۂ نظر کی حمایت کی جائے۔ وہ اسلام کا انقلابی اور مغرب کو چیلنج کرنے والا تصور نہیں رکھتے ہیں، جو اقبال اور اخوان المسلمین (مصر) کی تحریک وافکار میں پایا جاتا ہے۔

یہ بھی ملحوظ رہے کہ اس وقت یورپ کی عیسائی مشنریوں نے ان ممالک میں اپنے افکار پھیلانے کے لیے ثقافتی یلغار کر رکھی تھی، بیس بائیس سال بعد سعودی عرب نے سینیگال میں ایک اسلامی یونیورسٹی قائم کی جو ایک عربی مدرسے کی طرح ہے، جیسے ہمارے ملک میں اسلام آباد کی انٹرنیشنل اسلامک یونیورسٹی، جس کا پاکستان میں کوئی فکری و تحقیقی (Contribution) نہیں، اور وہاں وہی بے سود اذہری طریقہ تعلیم رائج ہے۔

بتیس سال بعد دوبارہ میری ڈاکٹر حمید اللہ صاحب سے کراچی ۱۹۹۲ء میں ملاقات ہوئی، جب نواز شریف صاحب نے مرحوم برادر محمد صلاح الدین کی کوششوں سے ڈاکٹر صاحب کو پاکستان بلایا تھا اور انہوں نے یہاں مختلف شہروں کے علمی واجتماعی اداروں میں لیکچر دیئے تھے، اب ڈاکٹر صاحب کافی اونچا سنتے تھے، حافظہ کچھ کمزور ہو گیا تھا، میں نے ان سے اسٹیٹ گیسٹ ہاؤس میں ایک صبح ملاقات کی وہ مجھے پہچان نہ سکے اور پیرس کی ملاقات اور بعد کی مراسلات بھول چکے تھے لیکن چھیاسی سال کی عمر میں بھی وہ کافی چاق و چوبند تھے اور ان کا ذہن علمی معاملات میں حاضر (Alert) تھا۔

افسوس کہ درس نظامی کے کنویں میں محدود علماء نے ان کی پذیرائی نہیں کی، حالانکہ ڈاکٹر صاحب موصوف حدیث کی قدیم ترین کتاب صحیفہ ہمام بن منبہ کافی پہلے اپنی تحقیق سے شائع کر چکے تھے، یہ محدث یمن کے ایک مشہور تابعی اور حضرت ابو ہریرہ کے شاگرد تھے (وفات ۱۳۰ھ)۔ پاکستان کے علماء کو تو ان کے اس اہم تحقیقی کام سے خوش ہونا چاہیئے تھا، مگر افسوس کہ ان کا زاویہ نظر

Marfat.com

بہت محدود ہے، صرف کتاب خوانی کراتے ہیں، نہ خود کوئی اپنی دینی و علمی تحقیقی کام کرتے ہیں اور نہ ایسے طلباء پیدا کرتے ہیں جو یہ کر سکیں، بس وہ اپنے مذہبی احترام و تقدس پر قانع ہیں، اس لیے اقبال نے کہا تھا:

اٹھا میں مدرسہ و خانقاہ سے نمناک
نہ زندگی ، نہ محبت ، نہ معرفت نہ نگاہ

مجھے یاد ہے کہ میں نے پیرس میں ڈاکٹر صاحب سے ستمبر ۱۹۶۰ء میں اپنی اس پہلی ملاقات میں پوچھا تھا کہ آپ پاکستان میں کیوں مقیم نہ رہے، یاد رہے کہ پاکستان بننے کے بعد ڈاکٹر صاحب فوراً ہی یا غالباً ۱۹۴۸ء میں یہاں آ گئے تھے لیکن افسوس کہ ہمارے آئی سی ایس بیوروکریٹس یعنی طبقہ افسران نے ایک عظیم عالم کی قدر نہیں کی اور ان کی کام کرنے کی سہولتیں مہیا نہیں کیں سو وہ بددل ہو کر پیرس چلے گئے، جہاں ان کے علم کی قدر کی گئی اور وہ اطمینان سے ایک مہاجر کی زندگی گزارتے رہے بلکہ بعد کو بھی پاکستان میں ان کی قدر نہیں کی گئی جب کہ ترکی میں وہ پیرس سے برسوں بحیثیت وزیٹنگ پروفیسر انقرہ اور پھر ارض روم وغیرہ کی یونیورسٹیوں میں جاتے رہے۔

مرحوم شہید ضیاء الحق صاحب نے ان کو بہاولپور کی یونیورسٹی میں بلایا اور یہاں ان کے خطبات بہاولپور کافی مشہور ہوئے، مگر افسوس کہ اسلام آباد کی انٹرنیشنل یونیورسٹی نے ان کا خیر مقدم نہیں کیا، اگر شروع ہی سے ایک ازہری عالم کے بجائے ڈاکٹر صاحب موصوف کو اس یونیورسٹی کا وائس چانسلر بنایا جاتا تو یہاں اب تک کافی تحقیقی کام ہو چکا ہوتا۔

اب گزشتہ سال ڈاکٹر صاحب بہ سبب پیرانہ سالی کافی بیمار ہو گئے تھے، معلوم ہوا کہ آج کل وہ اپنے بھتیجے عطاء اللہ صاحب کی لڑکی محترمہ سدیدہ شفیق کے یہاں فلاڈلفیا امریکہ میں ہیں اور روبہ صحت ہیں، لیکن اہل حیدرآباد کے لیے کرنے کی بات یہ ہے کہ ان کی علمی کاموں کے از سر نو اور شایان شان طریقہ پر شائع کرنے کے لیے تیس چالیس لاکھ روپے کا ایک فنڈ قائم کیا جائے اور ان کے بکھرے ہوئے مضامین کو Complete Works کی شکل میں شائع کیا جائے اور ان کا سرمایۂ کتب پاکستان میں بہادر یار جنگ اکیڈمی میں منتقل ہو جائے اور تحقیقی کام کیا جائے۔

Marfat.com

ماہر القادری مرحوم۔نقوش وتاثرات

مرحوم ماہر القادری صاحب کو میں نے نصف صدی بلکہ اس سے بھی چند سال قبل اپنی ابتدائی جوانی میں سابقہ ریاست رامپور کے ایک مشاعرے میں دیکھا اور سنا تھا۔ وہ حیدر آباد دکن سے آئے تھے۔ اہل علم وادب جانتے ہیں کہ دہلی اور پھر لکھنؤ کی انگریزوں کے ہاتھوں تباہی کے بعد رامپور شعروادب کا مرکز بن گیا تھا۔ یوں تو اس سے قبل غالب بھی جو نواب یوسف علی خان والی رامپور کے استاد تھے، رامپور آ کر رہ چکے تھے اور پھر وہ نواب کلب علی خان کے عہد میں بھی رامپور آ کر رہے، لیکن لکھنؤ کی تباہی کے بعد جب امیر مینائی اسیر اور جلال وغیرہ جیسے مشہور شعراء واساتذہ سخن نے رامپور کو اپنا مسکن بنایا اور والیان ریاست نے ادب نوازی اور علم پروری کو اپنا شعار بنایا تو رامپور شعروادب کا تیسرا مرکز بن گیا اور وہاں شعروسخن کا ایسا چرچا ہوا کہ غالباً ہر چوتھا پانچواں شخص شاعر یا شعر فہم بن گیا۔ میرے مرحوم بڑے بھائی بھی شاعر تھے اور عشرت تخلص کرتے تھے۔ خدا کا شکر کہ عہد جوانی میں زندگی میں ایک دینی انقلاب اور پھر عربی زبان ودینی علوم کی طرف توجہ کے سبب میں اس سے محفوظ رہا ورنہ شعر گوئی کے ''جراثیم'' میرے اندر بھی موجود تھے۔ میرے خیال میں ایک خاندان میں ایک شاعر ہی کافی ہے۔

بہر حال گھریلو ماحول اور رامپور کی عام شعرانہ روش کے سبب مشاعروں میں شرکت کا شوق مجھے اپنے بھائیوں کی طرح بچپن ہی سے تھا اور تقسیم ہند سے قبل رامپور کے مختلف آل انڈیا اور دیگر گھریلو مشاعروں میں میں نے جن مشاہیر شعرائے برصغیر کو دیکھا اور سنا ان میں جگر مراد آبادی، جوش، ماہر القادری، سائل دہلوی، قلمبند داغ، نوح ناروی، روش صدیقی، جذبی، شکیل بدایونی، خمار بارہ بنکوی، جاں نثار اختر، فراق گورکھپوری، مجاز، اقبال صفی پوری وغیرہ بیسیوں شعراء اور پھر رامپور کے شعراء میں شاد عارفی، محشر عنایتی، سحر رامپوری، محمد علی خان اثر اور شرف زیدی وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

میری خوش قسمتی کہ ان مشہور شعراء میں دو کے ساتھ، جو میرے بزرگوں میں تھے، بعد

Marfat.com

کو میرے گہرے مراسم بھی قائم ہوئے اور مجھے ان کی شفقتیں، رفاقتیں اور عنایات بھی حاصل ہوئیں۔ ان میں پہلے جگر مرحوم اور دوسرے ماہر القادری مرحوم تھے۔ جگر صاحب کی تو میزبانی کا شرف بھی مجھے مکہ مکرمہ میں حاصل رہا اور بعض عرب ادباء کے سامنے مجھے ان کی غزلوں کے ترجمے کا بھی موقع ملا۔ جب وہ سن ۱۹۵۳ء میں حج کے لیے آئے تھے اور میں مکہ مکرمہ میں تین سال سے مقیم تھا۔

ماہر القادری صاحب سے میرا پہلا تعارف فروری سن ۱۹۵۵ء میں ہوا جب میں حجاز مقدس اور مصر کے اپنے پہلے پانچ سالہ سفر کے بعد پہلی بار پاکستان آیا تھا۔ اس تعارف میں مرحوم مولانا ظفر انصاری کی عنایت شامل تھی جن سے پہلی بار حرم شریف (مکہ مکرمہ) میں سن ۱۹۵۱ء میں نیاز حاصل ہوا تھا اور پھر یہ تعلق تقریباً چالیس سال تک قائم رہا۔

ماہر صاحب نے اپنے فلیٹ میں جو گارڈن ایسٹ میں تھا، مجھے چائے پر مدعو کیا تھا۔ بچپن میں جن ماہر صاحب کو میں نے دیکھا اور سنا تھا وہ بے ریش و جواں سال تھے اور جب اس موقع پر ان کو دیکھا تو ان کے چہرے پر ایک خوش نما مختصر داڑھی تھی لیکن مجھے ان کو پہچاننے میں دقت نہیں ہوئی۔ ماہر صاحب اس نوجوان کے ساتھ بہت محبت اور نگہت کے ساتھ ملے جو اس دور میں حجاز و مصر میں طویل عرصے رہ کر واپس آیا تھا جب اس وقت نہ وہ وہاں گئے تھے اور نہ جماعت اسلامی کے دیگر اصحاب (بشمول مرحوم مولانا مودودی) میں سے کوئی گیا تھا سوائے چوہدری غلام محمد مرحوم کے۔ ان کی نوازش و توجہ مجھ پر اس لیے دو چند تھی کہ مصر میں میرا اخوان المسلمین کے ساتھ گہرا ربط رہا تھا اور میری آمد سے چند ماہ قبل ہی مصر میں اخوان بڑے سخت ابتلاء اور قید و بند اور پھانسیوں کے جاں گسل و المناک مراحل سے گزرے تھے جن میں میرے بعض نوجوان مصری احباب بھی تھے۔ میں خوش قسمتی سے بچا رہا۔ اگرچہ قاہرہ کی ایک مسجد میں جمال عبدالناصر کی پولیس کی فائرنگ کے وقت میں وہاں موجود تھا۔ اس لیے اس محفل میں شعر و ادب سے زیادہ ماہر صاحب، مولانا ظفر انصاری اور ان کے فرزند ظفر اسحاق انصاری کی طرف سے اخوان المسلمین اور ان کی تحریک سے متعلق سوالات کے میں جوابات دیتا رہا۔ ماہر صاحب اس وقت سے ہی جماعت اسلامی کے مویدین و ہمدردوں میں شامل تھے اور جماعت بڑی حد تک اخوان سے مماثلت رکھتی تھی (گو جماعت کے افراد میں اخوان المسلمین جیسی عمومی اسلامی مودت واخوت اور یگانگت کا فقدان تھا)

Marfat.com

اس لیے اس سے متعلق افراد کا اخوان کے حالات کے بارے میں جویا ہونا ایک طبعی امر تھا۔

پھر ماہر صاحب سے دوسری بار میرا مضبوط اور مستقل تعلق دس سال بعد سن ۱۹۶۵ء میں قائم ہوا جب میں نے اپنے دوسرے طویل سفر یعنی دمشق و کیمبرج میں اپنی باقاعدہ تعلیم اور ریاض کی کنگ سعود یونیورسٹی کی دو سالہ ملازمت کے بعد واپس آیا۔ یہ بھی دو ماہ کا مختصر وقفہ تھا کیونکہ اس کے بعد میں لیبیا یونیورسٹی میں ملازمت کے لیے چلا گیا تھا۔ بہرحال اس وقت ماہر صاحب ناظم آباد کے اپنے ایک بنگلے میں منتقل ہو چکے تھے۔ یہاں پھر انہوں نے میری ایک پرتکلف چائے کی دعوت کی جس میں ان کے اور کچھ احباب بھی مدعو تھے۔ اس کے بعد سے یہ تعلق استوار ہوتا چلا گیا۔ میں بن غازی یونیورسٹی لیبیا چلا گیا تھا۔ ماہر صاحب عنایت کرتے تھے اور مجھے اپنا مجلّہ فاران پابندی سے بھیجتے تھے اور جب میں ہر سال یا دو سال بعد موسم گرما کی تعطیلات میں کراچی آتا تھا تو زمرہ شعراء و ادباء میں سے ماہر صاحب ہی وہ تنہا شخص تھے جن سے ملاقات رہتی تھی اور اس طرح ان سے گہرا قلبی تعلق قائم ہو گیا اور مجھ پر ان کے فکری و اخلاقی جوہر کھلتے گئے۔

شاعر و مصنف اور ماہر زبان کی حیثیت سے تو ان کو بہت سے لوگ جانتے تھے۔ لیکن مجھ پر ان کی انسانی ہمدردی کا وصف ایک ذاتی معاملے میں کھلا جس پر وہ غالباً حدیث نبوی ''کان اللہ فی عون العبد ما کان العبد فی عون اخیہ'' (یعنی جب تک کوئی بندہ اپنے (مسلمان) بھائی کی مدد میں لگا رہتا ہے اللہ اس کی مدد کرتا رہتا ہے کے مطابق عامل تھے) تفصیل اس کی یہ ہے کہ میں نے اپنی بیرون ملک کی کمائی سے ایک ہزار گز پر ایک بنگلہ فیڈرل بی ایریا میں بنایا تھا۔ جیسے ہی سن ۱۹۷۱ء میں بمشکل تمام یہ بن کر تیار ہوا، بھٹو صاحب کے عہد میں حکومت نے اس پر ریکیوزیشن Requisition کے نام پر قبضہ کر لیا اور اس میں گلبرگ تھانہ بنا دیا۔ میں ہر سال دو سال تعطیلات میں واپس آ کر اس کی واگزاشت کی کوشش کرتا رہا مگر بے سود۔ ماہر صاحب کو معلوم ہوا تو وہ مجھے ذوالفقار علی بھٹو دور کے مشہور انسپکٹر جنرل پولیس فضل حق صاحب کے پاس خود لے کر گئے۔ بغیر کسی سابق Appiontment کے۔ میں نے دیکھا کہ ان آئی جی صاحب نے جو بڑے جابر مشہور تھے، جلد ہی دوسرے منتظرین کو چھوڑ کر ماہر صاحب اور مجھے باریابی بخشی، چائے سے ہماری تواضع کی اور میری کہانی سننے کے بعد درخواست پر فوراً اپنے سرخ قلم سے حکم جاری کر دیا کہ رضوان صاحب کا بنگلہ فوراً خالی کر دیا جائے اور تھانہ کہیں اور منتقل کر دیا جائے۔ ساتھ ہی ڈی

Marfat.com

آئی جی معین کو ٹیلیفون بھی کر دیا۔

تعلق صرف اتنا تھا کہ بقول ماہر صاحب ان آئی جی صاحب نے کسی مشاعرے میں ان کا کلام سنا تھا اور علیک سلیک ہوگئی تھی کہ وہ خود بھی شاعر تھے۔ ماہر صاحب نے تو اپنا فرض ادا کر دیا تھا۔ یہ دوسری بات ہے کہ بعد کو پولیس افسران نے اپنی کارستانیوں کے ذریعے اس حکم پر عمل رو کے رکھا اور میرا گھر نو سال بعد اس وقت خالی کیا جب وہ تقریباً کھنڈر بن چکا تھا اور اس میں سے پولیس والے جھاڑ فانوس پنکھے وغیرہ تک چرا کر لے گئے تھے اور پانی و بجلی کے بھاری بل چھوڑ گئے تھے۔

ماہر صاحب چاہتے تھے کہ میں لیبیا سے واپس آ جاؤں اور اپنی صلاحیتوں سے ملک کی خدمت انجام دوں۔ سو انہوں نے کسی محفل میں میرا تذکرہ اس وقت کے کراچی یونیورسٹی کے وائس چانسلر محترمی ڈاکٹر احسان رشید صاحب سے کر دیا۔ ان کے کہنے سے میں ڈاکٹر صاحب موصوف سے ان کے آفس میں ملا۔ نہ معلوم ماہر صاحب نے کس تعریف و توصیف سے موصوف سے میرا ذکر کیا تھا کہ وہ انتہائی احترام اور یگانگت کے ساتھ مجھ سے ملے کہ اپنی کرسی چھوڑ کر میرے ساتھ صوفے پر آ کر بیٹھ گئے۔ ہوسکتا ہے کہ یہ ان کا معمول ہو مگر پاکستان میں اس کا تجربہ مجھے پہلی بار ہوا۔ اس کے بعد زندگی میں دو ہی تجربے ایسے اخلاق کے اور ہوئے۔ اسلام آباد میں شہریار خان (اس وقت کے ایڈیشنل سیکرٹری) اور کنگ سعود یونیورسٹی ریاض میں اپنے ایک سابق شاگرد کے پاس جو اس وقت فل پروفیسر اور اپنے شعبہ کا چیئرمین تھا۔

اپنا گھر خالی نہ ہو سکنے اور کوئی ٹھکانہ نہ ہو سکنے کے سبب میں اس وقت ملک واپس تو نہ آ سکا لیکن ماہر صاحب کی نوازش اور انسانی ہمدردی کا یہ دوسرا جاں فزا نقش میرے دل پر مرتسم ہوا۔ بہت ممکن ہے کہ وہ دوسروں کے ساتھ بھی ایسی ہی ہمدردی اور ذاتی توجہ کا رویہ رکھتے ہوں لیکن میں یہاں اپنے تاثرات قلمبند کر رہا ہوں۔

ماہر صاحب مرحوم کو جیسا کہ سب جانتے ہیں ..... صحت الفاظ کا بڑا اہتمام تھا اور بڑی بات یہ کہ وہ بایں ہمہ علم و فضل اس جستجو میں منہمک رہتے تھے۔ آج کے زمانے میں جب ہم صحافت اور ٹیلی ویژن میں بے شمار الفاظ کا غلط املا پڑھتے اور سنتے ہیں۔ جیسے نقض امن، علانیہ، عظام اور لسانی، املاک حکومت، قمیص اور استثناء وغیرہ غلط طور پر نقص امن، اعلانیہ، عظام، لسانی، املاک حکومت، قمیض اور استثنٰی وغیرہ لکھے اور بولے جاتے ہیں تو مجھے ماہر صاحب بہت یاد آتے ہیں۔

Marfat.com

ان کی لغوی جستجو کا یہ عالم تھا کہ جب انہوں نے میری زبان سے متعدد بار مستقبَل (ب پر زبر کے ساتھ) سنا تو کہنے لگے کہ آپ اس طرح بولتے ہیں، کیوں؟ ہم تو اس کو مستقبِل (ب پر زیر کے ساتھ) پڑھتے اور بولتے ہیں۔ میں نے کہا کہ یہ لفظ عربی ہے اور عربی میں اس کا ہمارے یہاں کے معروف معنی میں یہی تلفظ ہے اور اسی طرح عربوں کو میں نے بولتے سنا ہے کہ مستقبَل اسم مفعول ہے اور یہ آئندہ زمانے کو کہتے ہیں۔ جب کہ مستقبِل (ب کے زیر کے ساتھ) اسم فاعل ہے۔ اور یہ استقبال کرنے والے کو کہا جاتا ہے۔ ان معلومات سے وہ مطمئن اور خوش ہوئے اور انہوں نے مجھ سے کوئی تکرار نہیں کی۔

اسی طرح انہوں نے مجھ سے ایک لفظ کے بارے میں جو اب مجھے یاد نہیں، پوچھا کہ گھروں میں آپ کے یہاں عورتیں اس کو کس طرح بولتی ہیں۔ میں نے اپنی والدہ کے حوالے سے بتایا تو انہوں نے اس لفظ کی صحت کی تصدیق کر لی۔

ماہر صاحب اگرچہ اپنی زندگی کے دوسرے دور میں مولانا ماہر القادری کے لقب سے مشہور تھے۔ یہ شاید ان کے فکری و عملی دینی رجحان کی وجہ سے یا ان کی مختصر داڑھی کی وجہ سے تھا۔ لیکن جاننے والے جانتے ہیں کہ وہ زاہد خشک نہ تھے بلکہ بہت خوش گفتار اور بذلہ سنج انسان تھے۔ انہوں نے مجھے اپنا ایک لطیفہ سنایا کہ جب وہ حج پر گئے تو جدہ میں انہوں نے کسی پیٹرول پمپ پر لکھا دیکھا ''المرکز الحدیث'' وہ اپنی پاکستانی ثقافت کی وجہ سے سمجھے کہ یہاں کوئی حدیث کا مرکز ہے جہاں حدیث کا درس ہوتا ہے۔ (ان کو یہ معلوم نہیں تھا کہ حدیث کے معنی ماڈرن کے بھی ہیں)۔ کہنے لگے کہ میں نے اپنی ٹوٹی پھوٹی عربی اور کچھ انگریزی میں پیٹرول پمپ کے مالک سے کہا کہ ہمیں بھی حدیث نبوی کا شوق ہے۔ کب یہاں درس ہوتا ہے کہ ہم بھی یہاں حاضری دیں۔ وہ عرب حیران ہوا اور اس نے اشاروں کنایوں سے بتایا کہ یہ ایک ماڈرن پیٹرول پمپ اور ورکشاپ ہے۔ یہاں حدیث کا درس نہیں ہوتا ہے۔

ان کی اس خوش مذاق طبیعت اور اس صنف سخن سے دلچسپی کا جس کو مطایبات کہتے ہیں، مجھے ایک یادگار تجربہ ہوا۔ عربی میں اس کو ملح کہتے ہیں۔ (میم پر پیش اور لام پر زبر کے ساتھ) تقریباً پچیس سال کے انقطاع کے بعد وہ مجھے ایک نجی مشاعرے میں لے گئے۔ ناظم آباد سے وہ

Marfat.com

شان الحق حقی صاحب کی کار میں مجھے شہید ملت روڈ سے لینے آئے۔ مشاعرہ ایک صنعت کار طالب رسول صاحب کے یہاں تھا، پی ای سی ایچ ایس کے بلاک ٦ میں۔ اس میں صرف پچیس تیس حاضرین تھے۔ پر تکلف عشائیہ کے بعد لان میں مشاعرہ منعقد ہوا۔ یہیں پہلی بار میری اسماعیل مینائی صاحب مرحوم سے ملاقات ہوئی۔ یہاں کشور ناہید کو بھی پہلی اور آخری بار دیکھا۔ یہ غالباً سن ۱۹۷۲ء یا ۱۹۷۳ء کی بات ہے۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ تقریباً تیس سال کے بعد میں نے اس مشاعرے میں راز مرادآبادی ایم اے علیگ کو دیکھا۔ جن سے تعارف اگر نہیں کرایا جاتا تو شاید ان کو نہ پہچان پاتا۔ بہر حال ان کو دیکھ کر میری زبان حال پر تھا ''محو حیرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا'' ہو بھی گئی، کیونکہ تیس سال قبل رامپور کے ایک مشاعرے میں دیکھے ہوئے اس خوبرو نوجوان کے سر کے بال اب غائب تھے، توند نکلی ہوئی تھی۔ ابتدائے جوانی میں سنی ہوئی ان کی غزل کے مطلع کا مصرع اولین اب تک مجھے یاد ہے ''جلوہ فرما ہے کوئی ماہ مبیں آج کی رات'' اور پھر اس غزل کا یہ شعر:

نغمہ و مے کا یہ طوفان تلاطم اللہ

گھر ہوا ہے مرا خیام کا گھر آج کی رات

یہاں مشاعرے کے دور اولیں کے بعد جب کچھ لوگ اور خاتون شاعرہ رخصت ہو گئیں اور گنے چنے لوگ رہ گئے تو میں نے زندگی میں پہلی بار بعض ثقہ اور غیر ثقہ معمر شعراء سے ایسی غزلیں سنیں جیسی میں نے کافی عرصہ پہلے سن ۱۹۶۱ء میں کیمبرج میں اتفاق سے جعفر زٹلی کے دیوان میں پہلی بار پڑھی تھی۔ لیکن ان مہذب محفل میں مینائی صاحب اور ماہر صاحب و دیگر حضرات کی زبان پر فحش کلمات نہیں آئے اور اس کے بجائے وہ ڈیش Dash کہہ کر مصرع یا شعر پورا کر دیتے تھے۔ انسانی تہذیب کا یہ بھی ایک عجیب پہلو ہے۔ عربی زبان میں تو انتہائی سنجیدہ قدیم عربی ادب کی کتابوں میں ایسے بے شمار قصائد و لطائف ہیں جن کو آج ہم اپنی زبان سے ادا بھی نہیں کر سکتے اور یہ فحشیات Pronography کے زمرے میں آتے ہیں بلکہ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما تک سے ایسے مطایبات مشہور ہیں۔ وہ اس کو احماض یعنی ترشی یا منہ کا مزا بدلنا کہتے تھے۔ سنجیدہ علمی دروس کے بعد حاضرین سے کہتے تھے ''احمضوا'' یعنی اب منہ کا چٹخارا لو۔ اسی طرح فارسی زبان میں ایک قدیم ایرانی شاعر عبید زاکانی کا دیوان ہے جو ایک اعلیٰ پائے کا شاعر و ادیب تھا۔

Marfat.com

اس کے کلیات میں سنجیدہ نثر و نظم کے نمونوں کے ساتھ وہ ادب بھی کافی ہے جس کو اردو میں زٹلیات کا نام دیا گیا ہے اور ہندو تو اس صنف سخن میں سب سے ہی بڑھے ہوئے ہیں۔

ماہر صاحب مرحوم کو جذب دروں رکھنے والے سچے مسلمان کی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے عشق تھا۔ ان کا پرخلوص واثر انگیز نعتیہ کلام اس کا گواہ ہے اور اسی طرح اسلام وقرآن سے ان کو گہرا شغف تھا۔ ان کی مشہور نظم ''قرآن کی فریاد'' اور شاعری کا ایک شاہکار ہے، ماہر صاحب کا ماہوار رسالہ ''فاران'' برسوں کراچی سے نکلتا رہا۔ انہوں نے اپنے اس رسالے کے ذریعے شعر و شاعری سے زیادہ دین وعلم کی خدمت کی انہوں نے طالب ہاشمی صاحب کو اپنے اس رسالے کے صفحات مہیا کئے جس میں انہوں نے تواتر کے ساتھ برسوں صحابہ کے سوانح حیات لکھے اور بالآخران کو جمع کر کے صحابہ وصحابیات کے نام سے کتابی شکلوں میں شائع کیا۔ اسی طرح انہوں نے ایک سابق آئی سی ایس افسر حبیب صاحب سے سائنس میں قدیم مسلمانوں کی خدمات و کارناموں پر تسلسل کے ساتھ مضامین لکھوائے اور پھر اس کو موتمر اسلامی کراچی نے کتابی شکل میں شائع کیا۔ ان دونوں کتابوں سے مسلمانوں کو جو فائدہ پہنچا ہے اور پہنچے گا اس کے ثواب میں یقیناً ماہر صاحب بھی شریک ہوں گے۔ پھر اپنے اسی رسالے میں انہوں نے پرویزی فتنے کا بھی ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ ان کی زندگی اقبال کے اس شعر کی تصویر تھی:

ہو حلقہ یاراں تو بریشم کی طرح
زرم حق و باطل ہو تو فولاد ہے مومن

شعروادب میں ماہر صاحب کا جو اعلیٰ مقام تھا۔ اس پر مجھے کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ البتہ میں یہاں ان کی ایک شاہکار غزل کے دو شعر ضرور پیش کروں گا جو مجھے رامپور کے اسی یادگار مشاعرے سے یاد ہیں جس میں تقسیم ہند سے پہلے میں شریک تھا اور جس کا ذکر میں نے ابتداء میں کیا ہے۔ ان میں ماہر صاحب نے زندگی کی تلخ حقیقتیں انتہائی رواں اور خوشگوار انداز میں بیان کی ہیں اور یہ اردو شاعری کے اس اسلوب میں ہے جسے سہل ممتنع کہا جاتا ہے۔ سنئے:

دل میں کپٹ اور میٹھی باتیں
کیسی دنیا دار ہے دنیا

Marfat.com

اور دوسرا شعر تو ایسا حقیقت پسندانہ ہے کہ اس کا دوسرا مصرع گویا ضرب المثل ہے:

وقت پڑے تو کام نہ آئے
لکڑی کی تلوار ہے دنیا

اور اسی قدیم مشاعرے میں، میں نے ان سے ان کی مشہور نظم ''مامتا کی لاش'' بھی سنی تھی جس میں انہوں نے ایک دیہاتی ''سروپی لال'' کے دولت کمانے کے لالچ میں شہر آنے اور پھر اس کی موت کی عبرتناک اور بڑی حقیقت آمیز داستان نظم کی ہے اور ساتھ ہی ان کی ایک دوسری رومان پرور نظم ''گنگا کے کنارے۔''

تقریباً تیس سال کے بعد ایک بار موسم گرما کی تعطیلات میں جب میں کراچی آیا ہوا تھا تو میں نے اپنی قیام گاہ پر ان کو رات کے کھانے پر مدعو کیا اور فرمائش کر کے ان سے یہ دونوں نظمیں سنیں جو انہوں نے اپنے مخصوص ترنم کے ساتھ سنائیں اور میں نے ان کو ٹیپ ریکارڈ میں محفوظ کر لیا۔ اس کو بھی اب بیس سال سے زائد ہو چکے ہیں۔

ماہر صاحب کو ان کی دین داری، نیک نیتی، خلوص اور دین سے سچی لگن کا یہ انعام ملا کہ ان کی وفات حجاز مقدس میں ہوئی اور مکہ مکرمہ کا مشہور متبرک قبرستان ''جنۃ المعلیٰ'' ان کا آخری مرقد بنا۔ یہی وہ مبارک قبرستان ہے جہاں ام المومنین حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا اور بعض دیگر صحابہ و بزرگان دین کی قبور ہیں۔ سیرت نبوی پر اپنی کتاب ''درِ یتیم'' کے مصنف ماہر القادری مرحوم یقیناً ان لوگوں میں سے ہیں جن کے لیے شاعر نے ''خدا رحمت کند ایں عاشقان پاک طینت را'' کی دعا کی ہے، ہم سب اس دعا میں شریک ہیں۔

افسوس یہ ہے کہ اپنی تنہائی طویل مسافرانہ زندگی کے بعد جب میں مستقل طور پر وطن واپس لوٹا تو میرے یہ مخلص بزرگ اور دوست اس دار فانی سے دار بقا کو ہمیشہ کے لیے جا چکے تھے۔ میری زبان پر قدیم عربی شاعر کا یہ شعر تھا:

اذا زرت ارضاً بعد طول اجتنابها
فقدت صدیقی و البلاد کماھیا

(جب میں طویل گریز پائی کے بعد اپنی سرزمین واپس آیا تو ملک تو ویسا ہی تھا لیکن میرا دوست دنیا سے جا چکا تھا)

Marfat.com

مصنف کا مختصر سوانحی خاکہ

۱۔ پیدائش: رام پور، انڈیا ۱۹۲۸ء

۲۔ تعلیم۔ پہلا مرحلہ: حفظ قرآن بعمر دس سال۔ منشی فاضل، پنجاب یونیورسٹی ۱۹۴۵ء، کامل (فارسی) الہ آباد ۱۹۴۶ء۔

تعلیم۔ دوسرا مرحلہ: ابتدائی عربی تعلیم ادارۂ تعلیمات اسلام لکھنؤ ۱۹۴۸ء، ڈپلومہ ''عالمیت'' دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ ۱۹۴۹ء۔ تعلیمی سفر حجاز مصر (۱۹۵۰ء۔۱۹۵۵ء)۔ حرم مکہ وحرم مدنی میں حدیث وتفسیر کے حلقہ ہائے دروس میں مشارکت واستفادۂ مکہ مکرمہ کے سرکاری اسکول المعھد العلمی السعودی میں مصری اساتذہ کے دروس نحو وادب میں شرکت واستفادہ۔ مصر میں اگست ۱۹۵۳ء اور فروری ۱۹۵۵ء کے درمیان، علمی وادبی شخصیات سے روابط اور بیسویں صدی کی عظیم ترین تحریک اخوان المسلمین سے وابستگی اور دوسری دینی واجتماعی تحریکات کا مطالعہ۔

تعلیم۔ تیسرا مرحلہ: دسمبر ۱۹۵۵ء میں دمشق کا تعلیمی سفر، دمشق یونیورسٹی کے کلیۃ الشریعہ (شریعت فیکلٹی) سے چار سالہ کورس کے بعد لیسانس (M.A.) کی ڈگری، تحقیقی مقالے ''العز بن عبد السلام'' میں امتیاز کے ساتھ حاصل کی۔ ۱۹۶۰ء میں انگلستان روانگی، ۱۹۶۳ء میں کیمبرج یونیورسٹی سے اسلامک اسٹڈیز میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی۔

۳۔ تدریسی خدمات: کیمبرج میں ریسرچ کے دوران ایک سال (۱۹۶۱ء۔۱۹۶۲ء) بی۔ اے آنرز کے انگریز طلبہ کو فارسی پڑھائی اور ایک سال (۱۹۶۲ء۔۱۹۶۳ء) مڈل ایسٹ سینٹر میں ریسرچ اسسٹنٹ کی حیثیت سے کام کیا۔

۱۹۶۳ء سے ۱۹۸۷ء تک چوبیس سال برابر سعودی عرب، لیبیا اور پھر سعودی عرب کی یونیورسٹیوں میں اسلامی تاریخ وتمدن اور دیگر اسلامی مضامین کی تدریس، ۱۹۷۷ء میں فل پروفیسر شپ کا عہدہ۔ مجموعی طور پر دس سال سعودی عرب (ریاض ومکہ مکرمہ) اور چودہ سال بنغازی، لیبیا

Marfat.com

میں گزارے۔

۱۹۸۷ء میں استعفاء دے کر ریاض سے کراچی واپسی ہوئی۔ ۱۹۹۰ء تا ۱۹۹۳ء کراچی یونیورسٹی میں نئی قائم شدہ، برھان الدین عربک چیئر پر بحیثیت ڈائریکٹر چیئر پروفیسر کام کیا اور برصغیر میں عربی زبان وادب کی بارہ سو سالہ تاریخ وشخصیات پر عربی زبان میں ایک کتاب تصنیف کی، جو کراچی یونیورسٹی کی طرف سے ۱۹۹۵ء میں شائع ہوئی۔

Marfat.com

مصنف کی دیگر تصنیفات وتالیفات

۱۔ تحریک اخوان المسلمین (اردو ترجمہ) دارالحسنات، رام پور، انڈیا۔ ۱۹۵۷ء۔ دوسرا ترمیم شدہ ایڈیشن بہ عنوان "تحریک اخوان المسلمین ماضی و حال" مجلس نشریات اسلام، کراچی ۱۹۹۹ء

۲۔ العزّ بن عبدالسلام (عربی) دارالفکر، دمشق ۱۹۶۰ء

۳۔ فوائد فی مشکل القرآن (عربی) سلطان العلماء عزالدین بن عبدالسلام السلمی (المتوفی ۶۶۰ھ) تحقیق وتحشیہ۔ وزراۃ الأوقاف والشؤن الاسلامیۃ، الکویت۔ ۱۹۶۷ء، طبع دوم الاوفست (مسروقہ) مطابع کویت تایمز، ۱۴۰۲ھ۔ ۱۹۸۲ء۔ ترمیم شدہ دوسرا ایڈیشن، دار الشروق جدہ۔ ۱۴۰۲ھ۔ ۱۹۸۲ء۔

۴۔ استنبول وحضارۃ الامبراطوریۃ العثمانیۃ (انگریزی سے عربی ترجمہ مع توضیحی وتنقیدی حواشی) جامعۃ بن غازی، بنغازی، لیبیا ۱۹۷۳ء۔ ترمیم شدہ ایڈیشن۔ الدار السعودیۃ، جدہ ۱۹۸۲ء۔

۵۔ السلطان محمد الفاتح (عربی) الدار السعودیۃ للنشر والتوزیع۔ جدہ۔ ۱۹۸۲ء۔

۶۔ دول العالم الاسلامی فی العصر العباسی (عربی) ایک دوسرے استاد کی شرکت میں۔ جامعۃ الامام محمد بن سعود الاسلامیۃ الریاض ۱۴۰۲ھ (۱۹۸۲ء)

۷۔ العلوم والفنون عند العرب (عربی) دار المریخ۔ الریاض ۱۹۸۷ء۔

۸۔ اللغۃ العربیۃ وآدابھا فی شبہ القارۃ الہندیۃ الباکستانیۃ عبر القرون (عربی) جامعہ کراچی۔ ۱۹۹۵ء۔

۹۔ Izz al-Din al-Sulami, His Life and Works, Islamic

Marfat.com

Research Institute, Islamabad. 1978, 2nd revised edition, Adam Publishers, New Dehli-2, India.

۱۰۔ خانوادۂ نبوت وعہد بنوامیہ (اردو)، کراچی، ۲۰۰۴ء۔

۱۱۔ قدیم وجدید اسلامی فرقے اور ان کے اثرات ہمارے ماضی وحال پر، کراچی ۲۰۰۳ء۔

۱۲۔ قرآن کی روشنی میں، مرکز فہم القرآن، کراچی، ۲۰۰۵ء

۱۳۔ Spread of Islam in the Sub-Continent, Karachi University, 2009

Marfat.com